اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِیْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِیْنَکُمْ

بے شک یہ علم دین ہے، پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور • کراچی • پاکستان

إنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (صحیح مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

# تفہیم المسائل

جلد یازدہم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | تفہیم المسائل جلد یازدہم |
| مصنف | : | پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن |
| ناشر | : | محمد حفیظ البرکات شاہ |
| | | ضیاء القرآن پبلی کیشنز |
| کمپوزنگ | : | حافظ محمد جمشید ہاشمی |
| اشاعت | : | باراول، فروری 2020ء |
| تعداد | : | ایک ہزار |
| کمپیوٹر کوڈ | : | FQ25 |


ملنے کے پتے


داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37225085-37247350

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:021-32212011-32630411۔فیکس:۔021-32210212

e-mail: info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

# تحدیثِ نعمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ، سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَعَلٰی صَحَابَتِہِ الصِّدِّیْقِیْنَ الْکَامِلِیْنَ، وَعَلٰی اَوْلِیَاءِ اُمَّتِہٖ وَعُلَمَاءِ مِلَّتِہٖ مِنَ الْفُقَھَاءِ الْمُجْتَھِدِیْنَ وَالْمُفَسِّرِیْنَ وَالْمُحَدِّثِیْنَ اَجْمَعِیْنَ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ! تفہیم المسائل کی گیارہویں جلد پیشِ خدمت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرصتِ حیات اور ہمت وتوفیق عطا فرمائی، تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، ان شاء اللہ العزیز!۔

اس کتاب کی تدوین وتبویب اور حوالہ جات نکالنے میں مفتی عبدالرزاق نقشبندی کا تعاون شامل حال رہا ہے اور اس کی کمپوزنگ اور تسوید وتبییض کے تمام مراحل میں حافظ محمد جمشید ہاشمی نے کافی محنت کی ہے، کیونکہ یہ کتاب بار بار نظرِ ثانی کے مراحل سے گزرتی ہے۔

ابتدائی مسوّدے کی پروف ریڈنگ اور تصحیح مولانا حافظ علی عمران صدیقی اور مولانا بختیار علی نے کی، ہمارے شیخ الحدیث علامہ احمد علی سعیدی نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھا اور مفید مشوروں سے نوازا، اسی طرح حضرت علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی نے تصحیح واضافات کی بابت مفید رہنمائی کی۔ آخر میں ہمارے قابلِ فخر جوان عالم شارحِ ترمذی واستاذِ حدیث علامہ حافظ قاری محمد عبداللہ نے نہایت توجہ سے پڑھا اور اُن کی نشاندہی پر بعض جگہ ہم نے مفید اضافات کیے۔

میں اپنے ان تمام ذی علم و ذی وقار رُفقائے کرام کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ اپنے حبیبِ مکرّم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طفیل ان سب کی عمر، علم اور فیوض میں برکات نصیب فرمائے۔ تفہیم المسائل کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا

ہے اور بعض اہلِ علم کتابت کی اغلاط اور فروگزاشتوں کی جانب متوجہ بھی فرماتے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ میری تحریروں کو نہایت توجہ سے پڑھتے ہیں، میں ان سب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اِحْسَانِهٖ! تفہیم المسائل کی تمام جلدیں اور اصلاحِ عقائد و اعمال ہندوستان سے بھی طبع ہو چکی ہیں، یہ ہمارے لیے اعزاز اور سعادت کی بات ہے کہ وہاں کے اہلِ علم اور دینی ذوق رکھنے والی شخصیات سے ہمارا بالواسطہ علمی و روحانی رشتہ قائم ہو رہا ہے، کئی جرائد ہمارے بعض کالموں اور فتاویٰ کو بھی شائع کرتے ہیں، میں اُن سب کا ممنون و متشکّر ہوں۔

بشری استطاعت کی حد تک یہ کتاب اغلاط سے پاک ہے، لیکن تسامحات کا امکان ہمیشہ رہتا ہے، اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کسی بھی فروگزاشت پر مطّلع ہوں تو ضرور نشاندہی فرمائیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ یہ سلسلۂ خیر جاری رکھے اور اس کی افادیت میں برکت عطا فرمائے۔ اس موقع پر میں قارئین کرام سے ملتمس ہوں کہ وہ میری اور میرے برادرِ عزیز ڈاکٹر محبوب الرحمٰن کی صحت کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر معذوری اور محتاجی سے امان عطا فرمائے۔ ضیاء الرحمٰن، میرے والدین کریمین اور اساتذۂ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں کہ وہ انہیں اپنی مغفرتِ کاملہ سے نوازے، ان کے درجات بلند فرمائے اُن کو اور ہم سب کو آخرت میں شفاعتِ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نصیب فرمائے۔

المفتقر الی اللہ الغنی

منیب الرحمٰن

# فہرست

# عقائد کے مسائل

# عالمِ دین کا کہنا: ہم احمدی ہیں

**سوال:**

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین مسئلہ ھٰذا میں کہ بکر کہتا ہے کہ احمدیہ ہم ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام مبارک احمد ہے، اس لیے احمدیہ ہم ہیں، قادیانی احمدیہ نہیں ہیں۔ زید نے کہا: احمدیہ قادیانیوں اور مرزائیوں کو کہتے ہیں اور ہمارے عرف میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر آپ احمدیہ کہلواتے ہو، تو وہابی بھی کہلوا لو، کیونکہ وہاب اللہ عزوجل کا نام مبارک ہے۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ دونوں میں کس کا قول راجح ہے اور بکر امامت بھی کرواتا ہے، (سائل: محمد امجد رضوی، لاہور)۔

**جواب:**

یہ بات درست ہے کہ قرآنِ کریم میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دو اسمائے گرامی مذکور ہیں:

(۱) **احمد**، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ''۔

ترجمہ: ''اور (یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور اُس (عظیم) رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے، پس جب وہ ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو (کافروں) نے کہا: یہ کھلا جادو ہے، (الصّف:6)''۔

(۲) **محمد**، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''، ترجمہ: ''محمد اللہ کے رسول ہیں، (الفتح:29)''۔

حدیث پاک میں ہے: ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَحْمَدُ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں محمد اور احمد ہوں، (صحیح البخاری:3532)''۔
محمد کے معنی ہیں: ''جس کی بہت زیادہ تعریف کی گئی ہو'' اور احمد کے معنی ہیں: ''بہت زیادہ تعریف کرنے والا''۔ آپ ﷺ کا رب قرآنِ کریم کی آیاتِ مبارکہ میں آپ کی جا بجا تعریف فرماتا ہے اور آپ اپنے ربِ کریم کی تعریف فرماتے ہیں، ملائکہ اور جن وانس میں سے اہلِ ایمان آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

پس نبی کریم ﷺ کے اَعلامِ مبارکہ کی طرف منسوب کر کے معنوی طور پر کوئی صاحبِ ایمان اپنے آپ کو احمدی یا محمدی کہہ سکتا ہے، لیکن چونکہ ہمارے خطے میں منکرینِ ختمِ نبوت یعنی قادیانی طبقہ اپنے آپ کو ''احمدی'' کے نام سے متعارف کراتا ہے، اس لیے احمدی کہنے سے گریز کرنا لازم ہے، سارے مخاطبین اہلِ علم نہیں ہوتے، کوئی یہ گمان بھی کرسکتا ہے کہ اس شخص کا تعلق منکرین ختمِ نبوت سے ہے اور کوئی اپنے آپ کو احمدی کہلانے والا قادیانی یہ کہہ سکتا ہے: ''فلاں مولانا صاحب نے بتایا ہے کہ ہم احمدی ہیں، تو میں اُن کی تقلید میں ایسا کر رہا ہوں''، اس لیے عوام میں اپنے آپ کو بطورِ احمدی متعارف کرانے سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ ہر بار اور ہر شخص کے سامنے آپ تقریر کر کے اس کی وضاحت نہیں کر پائیں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا قول ہے: ''اِیَّاكَ وَمَا یَسْبِقُ اِلَی الْعُقُوْلِ اِنْکَارُہٗ وَاِنْ کَانَ عِنْدَكَ اِعْتِذَارُہٗ''۔ ترجمہ: ''ایسی بات کرنے سے بچو جس کا عام لوگ فوراً رد کرنے پر آمادہ ہو جائیں، اگرچہ آپ کے پاس اس بات کی کوئی (قابلِ قبول) توجیہ بھی ہو، (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ج:1، ص:680)''۔

علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مَنْ سَلَكَ مَسَالِكَ الظَّنِّ اُتُّهِمَ وَرَوَاہُ ''الْخَرَائِطِیُ'' فِیْ ''مَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ'' مَرْفُوْعًا بِلَفْظِ ''مَنْ اَقَامَ نَفْسَہٗ مَقَامَ التُّھَمِ فَلَا یَلُوْمَنَّ مَنْ اَسَاءَ الظَّنَّ بِہٖ''۔

ترجمہ: ''جو (بد) گمانوں کی راہوں پر چلے گا، وہ تہمت کا ہدف بنے گا اور ''مکارمِ اخلاق'' میں خرائطی نے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا: ''جو مقامِ تہمت پر ٹھہرا، اُسے چاہیے

کہ بدگمانی کرنے والوں کو ملامت نہ کرے، (کشف الخفاء ومزیل الالباس، الجزء الاول، ص:44)"، یعنی اُس نے اپنے آپ کو ہدفِ ملامت بنانے کا موقع خود فراہم کیا۔

علامہ علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں:

"مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یَقِفَنَّ مَوَاقِفَ التُّھَمِ"۔

ترجمہ: "جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ تہمت کے مقامات پر نہ ٹھہرے، (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، ج:3، ص:77)"۔ نیز مقاصدِ شریعہ میں ایک سَدُّ الذَّرَائِع بھی ہے، یعنی جس بات سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہو، جواز کی گنجائش کے باوجود اس سے اجتناب بہتر ہے۔ لیکن اگر کوئی صحیح العقیدہ عالم اپنی تاویل اور توجیہ کے ساتھ اپنے آپ کو احمدی کہے تو اس پر کوئی فتویٰ لگانا درست نہیں ہے، تاہم ان کو احسن انداز میں سمجھایا جائے کہ حکمتِ دین کے تحت اور دفعِ مفاسد کے لیے انہیں اس شعار سے گریز کرنا چاہیے، ایسے عالم کی اقتدا میں نماز پڑھنے میں حرج نہیں ہے، بشرطیکہ کوئی اور شرعی سبب مانع نہ ہو۔

## کیا ہر صحابی پر ایمان لانا ارکانِ ایمان میں داخل ہے

**سوال:**

اسلامی عقائد و ایمانیات کتنے ہیں، اللہ تعالیٰ پر، اس کے ہر ایک فرشتے، ہر ایک کتاب، ہر ایک نبی، قیامت کے دن اور تقدیر پر ایمان لانے کے علاوہ آخری نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہر ایک صحابی پر ایمان لانا ارکان ایمان میں داخل ہے، سائل کا استفتاء ہر ایک صحابی کے صحابی ہونے پر ایمان رکھنے کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ہر ایک صحابی پر ایمان لانے کے بارے میں ہے، (مولانا خطیب الرحمٰن، یوکے)۔

**جواب:**

اسلامی عقائد کا بیان قرآنِ کریم کی متفرق آیات میں موجود ہے، ذیل میں ہم دو آیاتِ مبارکہ درج کر رہے ہیں:

(۱) "لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ"۔

ترجمہ: "نیکی (کا مرتبۂ کمال) یہ نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق یا مغرب کی جانب پھیر دو، ہاں! (کامل) نیکی اُس شخص کی ہے جو اللہ، قیامت کے دن، فرشتوں، (الہامی) کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے، (البقرہ:177)"۔

(۲) "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ"۔

ترجمہ: "رسول اُس (کلام) پر ایمان لائے جو اُن کی طرف اُن کے رب کی جانب سے نازل ہوا اور مومن (بھی ایمان لائے)، سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر (یہ کہتے ہوئے) ایمان لائے کہ ہم (ایمان لانے میں) اس کے رسولوں میں کوئی امتیاز نہیں برتتے اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تجھ سے بخشش کے طلبگار ہیں اور (ہمیں) تیری ہی طرف لوٹنا ہے، (البقرہ:285)"۔

سورۃ البقرہ:4 میں آخرت پر یقین رکھنے کا بھی ذکر ہے۔ موت کے برحق ہونے اور تقدیر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا ۝۷۸ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ"۔

ترجمہ: "تم جہاں کہیں بھی ہو، موت تم کو پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں (محفوظ) ہو، اور اگر اُن کو کچھ اچھائی پہنچے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی جانب سے ہے اور (اے رسول!) اگر اُن کو کوئی برائی پہنچے تو کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے، آپ کہیے: ہر چیز اللہ کی طرف

سے ہے، تو ان لوگوں کو کیا ہوا کہ یہ کوئی بات سمجھ نہیں پاتے، (اے مخاطب!) تم کو جو اچھائی پہنچتی ہے، سو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور تم کو جو برائی پہنچتی ہے، تو وہ تمہاری ذات کے سبب ہے، (النساء:79-78)"۔

ہمارے ہاں جو ابتدائی قاعدے یا نماز کی کتاب پڑھائی جاتی ہے، اُن میں انہی مسلّمہ عقائد کو ایمانِ مُجمَل اور ایمان مُفصَّل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے، یہ تو معلوم نہیں ہے کہ ابتدا میں اسے کن صاحبِ علم نے ان عنوانات سے مرتّب کیا، لیکن یہ بہر حال قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں اور معنوی طور پر بالکل درست ہیں۔ جن کتبِ الٰہی کے نام قرآنِ مجید میں صراحت کے ساتھ مذکور ہیں، اُن پر تعیین کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے اور باقی کتب سماوی پر اجمالی طور پر ایمان لانا ضروری ہے، قرآنِ کریم میں سورۃ الاعلیٰ میں صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى "علیہما السلام" کا بھی اجمالاً تذکرہ کیا گیا ہے۔ اجمالی ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں مختلف ادوار میں نازل فرمائیں، وہ سب حق ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ"۔

ترجمہ: "اور بے شک ہم نے (وقتاً فوقتاً) آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے اور ہم نے بعض کے حالات آپ کے سامنے بیان کیے ہیں اور بعض کے حالات بیان نہیں کیے، (المومن:78)"۔

سو جن انبیائے کرام اور رُسُلِ عظام کے اسمائے مبارکہ قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ میں تعیین کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اُن پر نام بنام اور تعیین کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے اور جن انبیائے کرام کے اسمائے مبارکہ قرآن وحدیث میں بیان نہیں ہوئے، اُن پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے۔ بعض روایات کی رُو سے انبیائے کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم وبیش)، رُسلِ عظام کی تعداد تین سو تیرہ (یا کم وبیش) اور الہامی کتابوں اور صحیفوں کی تعداد ایک سو دس (یا کم وبیش) ہے، وَاللهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

اسی طرح ملائکہ میں سے بعض کے نام قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، جن میں چار ملائک کا

تذکرہ واضح طور پر آیا ہے، بعض کا حاملینِ عرش کے طور پر آیا، بعض کا ملائکۃ المقربین کے نام سے ذکر آیا ہے، بعض کا کراماً کاتبین کے طور پر آیا ہے، جہنم کے نگہبان فرشتے کا نام مالک بتایا گیا ہے وغیرہم۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی حقیقی اور قطعی تعداد قرآنِ کریم یا احادیثِ صحیحہ میں بیان نہیں فرمائی گئی، اس لیے اُن سب پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے۔

ہر صحابی پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، جن کی صحابیت احادیث وروایات سے ثابت ہو، انہیں صحابیِ رسول ماننا لازم ہے اور ہوسکتا ہے کہ کئی ایسے صحابہ وصحابیات ہوں جن کے اسمائے گرامی احادیث وآثار میں مذکور نہیں ہیں، اُنہیں اجمالی طور پر ماننا لازم ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہر صحابی پر ایمان لانا ضروری ہے، تو کسی صحابی کی صحابیت سے انکار پر کفر لازم آئے گا۔ بعض صحابۂ کرام کی طرف قرآنِ کریم میں اشارات موجود ہیں، بطورِ خاص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تذکرہ سفرِ ہجرت کے موقع پر غارِ ثور کے حوالے سے قرآن میں بیان فرمایا اور "صَاحِب" کہہ کر اُن کا ذکر کیا گیا ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے کہ اس کے مصداق وہی ہیں، یہاں تک کہ اہلِ تشیّع بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ غار میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی اور تھا ہی نہیں اور اس آیت میں چھ مرتبہ اُن کا ذکر ہوا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ التوبہ:40 کی تفسیر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور خصائص کی من جملہ وجوہ میں سے لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کا وصف بیان کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صاحب ہیں اور یہ اُن کی کمالِ فضیلت پر دلالت کرتا ہے، حسین بن فضیل بجلی نے کہا: جو ابوبکر کی صحابیت کا انکار کرے، وہ کافر ہے، کیونکہ امت کا اس پر اجماع ہے: "إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ" کا مصداق ابوبکر صدیق ہی ہیں اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کا وصف "صاحِب" بتایا"۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اس آیت (التوبہ:40) میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ حضرت ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کے صاحب ہیں اور یہ نصِ قطعی ہے، اس کا انکار کفر ہے اور تمام صحابہ میں صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحابیت منصوص ہے اور آپ کے صحابی ہونے کا انکار کفر ہے"۔
(تبیان القرآن، ج:5،ص:141)

امام احمد رضا قادری نے لکھا ہے:
"یہ فقہائے کرام کے نزدیک ہے، متکلمین یعنی ماہرینِ علم العقائد کے نزدیک کفر نہیں ہے، (جِدُّ الْمُمْتَار، ج:3،ص:42)"۔

سورۃ الاحزاب میں حضرت زید کا نام کے ساتھ ذکر ہوا، بعض دیگر اجلّہ صحابۂ کرام کو بھی بعض آیات کا مصداق قرار دیا گیا ہے، مہاجرین وانصار، اہلِ بدر واُحُد، بیعتِ رضوان، فتحِ مکہ ودیگر غزوات کے حوالے سے صحابۂ کرام کا ذکر متعدد مقامات پر قرآنِ مجید میں ہے، چند آیاتِ مبارکہ پیش کی جاتی ہیں:

(۱) "لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا"۔(الفتح:18)

ترجمہ:"بے شک اللہ ایمان والوں سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، سو اللہ جانتا تھا جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، پس اللہ نے ان کے دلوں پر طمانیت نازل فرمائی اور ان کو عنقریب آنے والی فتح کا انعام دیا"۔

(۲) "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾"۔(الانفال:74-75)

ترجمہ:"اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی نصرت کی، یہی لوگ برحق مومن ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی

اور تمہارے ساتھ جہاد کیا، سو وہ بھی تم میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

(۳) "لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۱۰﴾"۔

ترجمہ: "(اے مسلمانو!) تم میں سے کوئی بھی ان کے برابر نہیں ہوسکتا جنہوں نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور (کافروں سے) قتال کیا، ان کا (ان مسلمانوں سے) بہت بڑا درجہ ہے جنہوں نے بعد میں (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور (کافروں سے) قتال کیا، اللہ نے ان سب سے اچھے انجام کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تمہارے تمام کاموں کی خوب خبر رکھنے والا ہے، (الحدید:10)"۔

(۴) "وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ"۔ (التوبہ:100)

ترجمہ: "اور مہاجرین اور انصار میں سے (نیکی میں) سبقت کرنے والے اور سب سے پہلے ایمان لانے والے اور جن مسلمانوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے"۔

(۵) "مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا"۔ (الفتح:29)

ترجمہ: "محمد اللہ کے رسول ہیں، جو ان کے اصحاب ہیں کفار پر بہت سخت ہیں، آپس میں نرم

دل ہیں، (اے مخاطب!) تو ان کو رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گا، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں، ان کی نشانی ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان (انوار) ہیں، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت یہ ہے: جیسے ایک کھیتی ہو، اس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اس نے طاقت پکڑی، پھر وہ دبیز ہوئی، پھر وہ اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی، کاشت کاروں کو بھلی لگتی ہے تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کے دل جلیں، ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان سے بخشش اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے"۔

لیکن یہ ذکر عمومی اعتبار سے ہے، ہر صحابی کا ذکر شخصی طور نہیں ہے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کی صحابیت کا شخصی طور پر اعتقاد رکھنا ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہے، لیکن جملہ انبیائے کرام علیہم السلام کی طرح اجمالی اعتقاد یقیناً ہے۔ الغرض صحابہ کرام کے عمومی فضائل قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، اُن پر سبّ وشتم اور تبرّا کرنے والا ضالّ، مُضلّ اور مبتدع ہے۔

## اسمِ جلالت کی ہیئت میں پنجتن پاک کے نام لکھنا

**سوال:**

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کی تعمیر نو ہوئی ہے اور اس کے محراب میں شیشہ کا کام ہوا ہے، محراب کی چھت میں کاریگر نے فن خطاطی سے اسمائے پنجتن پاک کو اس طرح ڈھالا ہے کہ بداھۃً اسم اللہ عزوجل معلوم ہوتا ہے اور غور وفکر کے بعد اسمائے مبارکہ پنجتن پاک۔ ایک مفتی صاحب نے کہا کہ یہ ان غالی شیعوں سے تشابہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ یا پنج تن پاک کو ہی اللہ مانتے ہیں اور اس میں تَشَبُّهٌ فِي التَّوْحِيْد ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ دوسرے مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ یہ اظہار محبت اہل بیت کا بہترین انداز ہے اور دیوبندیوں وھابیوں کو چڑانے کا خوبصورت مرقعہ ہے، اب آپ حضرات کو اس تبحر علمی کا واسطہ جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے ہماری رہنمائی کریں اور مفصل

اور مدلل فتویٰ عنایت کریں۔ (سائل: حافظ محمد رمضان مصطفائی، ٹنڈو محمد خان، سندھ)۔

**جواب:**

پنجتن پاک کے اسمائے مبارکہ کو اس انداز میں لکھنا کہ اسمِ جلالت اللہ کی ہیئت نظر آئے، اگر اس بناء پر ہو کہ اَلْعِیَاذُ بِاللہ! اللہ تبارک وتعالیٰ ان پانچ مقدس ہستیوں میں حلول کیے ہوئے ہے، جیسا کہ بعض غالی رافضیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی میں حلول کیے ہوئے ہے، تو یہ صریح کفر ہے۔ اللہ رب العزت، کسی مخلوق میں، خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی عظیم تر کیوں نہ ہو، حلول کرنے سے پاک اور منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ جسم، جسمانیات، اُن کے متعلقات اور تقاضوں سے قطعی طور پر پاک اور مبرّا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عیسائیوں کے اسی عقیدے کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(۱) ''وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾''۔ (المائدہ:116)

ترجمہ: ''اور جب اللہ فرمائے گا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا: مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود مان لو، وہ عرض کریں گے: تو (شریک سے) پاک ہے، میری یہ مجال نہیں تھی کہ میں وہ بات کہتا جس کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر (بفرضِ محال) میں نے یہ بات کہی ہوتی تو ضرور تو اُسے جانتا، تو ہر وہ بات جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں ہر وہ بات نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے، بے شک تو ہی سب غیبوں کا جاننے والا ہے''۔

(2) ''لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ''۔ (المائدہ:73)

ترجمہ: ''بیشک وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا: بلاشبہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے''۔

اس آیت کی تفسیر میں صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”یہ قول نصاریٰ کے فرقہ مرقوسیہ ونسطوریہ کا ہے۔ اکثر مفسّرین کا قول ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اللہ اور مریم اور عیسیٰ تینوں اِلٰہ ہیں اور اِلٰہ ہونا ان سب میں مشترک ہے۔ متکلّمین فرماتے ہیں: نصاریٰ کہتے ہیں کہ باپ، بیٹا، روح القدس یہ تینوں ایک اِلٰہ ہیں“۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

”اِنَّ الْمُتَکَلِّمِیْنَ حَکَوْا عَنِ النَّصَارٰی اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ جَوْھَرٌ وَّاحِدٌ، ثَلَاثَۃُ اَقَانِیْمَ اَبٌ، وَابْنٌ، وَرُوْحُ الْقُدُسِ، وَھٰذِہِ الثَّلَاثَۃُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ، کَمَا اَنَّ الشَّمْسَ اِسْمٌ یَتَنَاوَلُ الْقُرْصَ وَالشُّعَاعَ وَالْحَرَارَۃَ، وَعَنَوْا بِالْاَبِ الذَّاتَ، وَبِالْاِبْنِ الْکَلِمَۃَ، وَبِالرُّوْحِ الْحَیَاۃَ، وَاَثْبَتُوا الذَّاتَ وَالْکَلِمَۃَ وَالْحَیَاۃَ، وَقَالُوْا: اِنَّ الْکَلِمَۃَ الَّتِیْ ھِیَ کَلَامُ اللہِ اخْتَلَطَتْ بِجَسَدِ عِیْسٰی اِخْتِلَاطَ الْمَاءِ بِالْخَمْرِ، وَاخْتِلَاطَ الْمَاءِ بِاللَّبَنِ، وَزَعَمُوْا اَنَّ الْاَبَ اِلٰہٌ وَالْاِبْنَ اِلٰہٌ وَالرُّوْحَ اِلٰہٌ وَالْکُلُّ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ، وَاعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا مَعْلُوْمُ الْبُطْلَانِ بِبَدِیْھَۃِ الْعَقْلِ، فَاِنَّ الثَّلَاثَۃَ لَا تَکُوْنُ وَاحِدًا، وَالْوَاحِدَ لَا یَکُوْنُ ثَلَاثَۃً، وَلَا یُرٰی فِی الدُّنْیَا مَقَالَۃٌ اَشَدُّ فَسَادًا وَّاَظْھَرُ بُطْلَانًا مِّنْ مَّقَالَۃِ النَّصَارٰی“۔

ترجمہ: ”متکلّمین نے نصاریٰ کے حوالے سے بیان کیا ہے: (الوہیت) ایک جوہر ہے اور (اس کی) تین اقنوم (یعنی اصلیں) ہیں: باپ، بیٹا، اور روح القدس، اور یہ تینوں (بحیثیت مجموعی) ایک خدا ہیں، جیسے سورج قُرص، شعاع اور حرارت تینوں پر مشتمل ہے اور انہوں نے باپ سے ذات، بیٹے سے کلمہ اور روح القدس سے حیات مراد لی ہے۔ انہوں نے ذات، کلمہ اور حیات کو ثابت کیا اور کہا: کلمہ اللہ کا کلام ہے جو حضرت عیسیٰ کے جسم میں حلول کر گیا، جیسے پانی شراب یا دودھ میں مل جاتا ہے اور انہوں نے گمان کیا: باپ (بھی) خدا ہے، بیٹا (بھی) خدا ہے اور روح (بھی) خدا ہے اور اس کے باوجود سب ایک ہی خدا ہیں۔ اور جان لو کہ نصاریٰ کا یہ عقیدہ بداہۃً باطل ہے (یعنی اس کے بطلان کو سمجھنے کے لیے کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے)، کیونکہ تین ایک نہیں ہوتا اور ایک تین نہیں ہوتے اور نصاریٰ کے اس قول سے زیادہ فاسد اور واضح طور پر باطل بات دنیا میں اور کوئی نہیں ہے“۔

محدث اعظم پاکستان علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"نصاریٰ میں سے ایک فرقہ یعقوبیہ ہے، جس کا عقیدہ ہے کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے، وہ کہتے ہیں: اللہ تین اقانیم (اصلوں) سے مرکب ہے: باپ، بیٹا اور روح القدس۔ باپ اللہ ہے، بیٹا مسیح ہے اور باپ (اللہ) بیٹے (مسیح) میں حلول کر کے اسکے ساتھ متحد ہو گیا اور روح القدس بن گیا اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا عین ہے۔ ان کے اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح ہی اللہ ہے، حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی جو کلمہ سب سے پہلے کہا، وہ یہ تھا: "میں اللہ کا بندہ ہوں"۔ (تبیان القرآن، ج:3، ص:260، فرید بک اسٹال، لاہور)

الغرض عیسائیوں کے مذکورہ باطل عقیدے کی طرح بعض غالی روافض بھی پنجتن پاک بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اللہ تعالیٰ کا حلول مانتے ہیں جو کہ صریح کفر ہے، پس اسمائے پنجتن پاک کو اس طرح لکھنے میں اس کفریہ عقیدے کا ایہام پایا جارہا ہے اور کسی کفریہ معنی کا ایہام ہی اس بات کے ممنوع ہونے کے لیے کافی ہے، اگرچہ اس کی کوئی صحیح تاویل بھی موجود ہو۔ رہی یہ توجیہ کہ پنجتن پاک کا نام عقیدت ومحبت کے اظہار کے لیے لکھا جاتا ہے، تو اُس کے لیے ایسا پیرایہ اختیار کرنا چاہیے کہ جس میں اس طرح کا نہ کوئی ایہام اور اشتباہ پیدا ہو اور نہ ہی لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع ملے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اَنَّ مُجَرَّدَ اِیْهَامِ الْمَعْنَی الْمُحَالِ کَافٍ فِی الْمَنْعِ عَنِ التَّلَفُّظِ بِهٰذَا الْکَلَامِ وَاِنِ احْتَمَلَ مَعْنًی صَحِیْحًا"۔

ترجمہ: "عبارت سے محض محال معنی کا وہم پیدا ہونا ہی ایسے کلام کو منع کرنے کے لیے کافی ہے، خواہ (کسی کے نزدیک) وہ صحیح معنی کا احتمال بھی رکھتا ہو"۔

(ردالمحتار: ج:9، ص:625)

الغرض پنجتن پاک کا نام اسمِ جلالت کی ہیئت میں لکھنا کبھی بھی مسلمانوں کا شِعار نہیں رہا اور ہمیں کوئی ایسا انداز اختیار کرنے سے احتراز کرنا چاہیے جو مسلمانوں میں کسی بھی

درجے میں افتراق وانتشار کا باعث بنے اور اس سے دینِ حق اسلام اور مسلکِ حق اہلسنت وجماعت کو کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہو۔ خصوصاً اس پرفتن دور میں دینی مصلحت وحکمت کے تحت اس طرح کے اندازِ تحریر سے اجتناب لازم ہے، حدیث پاک میں ہے:

(1)''عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ،قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ:إِذَا صَلَّيْتَ فَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ وَلَا تَتَحَدَّثَنَّ بِكَلَامٍ تَعْتَذِرُ مِنْهُ غَدًا، قَالَ أَبُو بَكْرٍ وَقَالَ بَعْضُ الْحُكَمَاءِ:إِيَّاكَ وَمَا يُعْتَذَرُ مِنْهُ، وَمَا يُسْتَحْيَا مِنْ ذِكْرِهِ، فَإِنَّمَا يُعْتَذَرُ مِنَ الذَّنْبِ، وَيُسْتَحْيَا مِنَ الْقَبِيحِ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نماز پڑھو (تو اس انہماک سے پڑھو کہ گویا یہ تمہاری زندگی کی) آخری نماز ہے اور ہر ایسی بات سے بچو جس پر بعد میں تمہیں عذرخواہی کرنی پڑے، ابوبکر نے کہا: کسی دانا کا قول ہے: ہر اُس چیز سے بچو، جس سے عذرخواہی کرنی پڑے اور اس کے ذکر سے حیا آئے، کیونکہ گناہ پر عذرخواہی کرنی پڑتی ہے اور قبیح بات (بیان کرنے) سے حیا آتی ہے''۔
(مکارم الاخلاق للخرائطی:484)

(2):''عَنْ أَبِي الْحَوْرَاءِ السَّعْدِيِّ قَالَ:قُلْتُ:لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا مَاحَفِظْتَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ،قَالَ:حَفِظْتُ مِنْ رَّسُولِ اللّٰهِ ﷺ:دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلٰى مَالَا يَرِيبُكَ، فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَإِنَّ الْكَذِبَ رِيبَةٌ''۔

ترجمہ:''ابوحوراء بیان کرتے ہیں: میں نے حسن بن علی سے کہا: آپ نے رسول اللہ ﷺ سے (سب سے مفید بات) کون سی یاد رکھی ہے؟، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے (اہم بات یہ) یاد کر رکھی ہے:''جو چیز تمہیں شک میں ڈالے، اسے چھوڑ دو اور اس کے بجائے اس بات کو اختیار کرو جو تمہیں شک میں نہ ڈالے (یعنی اس کی صحت واضح ہو)، کیونکہ سچائی میں طمانیتِ قلب ہے اور جھوٹ میں بے اطمینانی ہے، (سنن ترمذی:2518)''۔

البتہ ہمارے لیے حکم یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن سے کام لیں اور

جب تک کسی کے کفریہ عقیدے کا قطعی اور صریح ثبوت ہمارے علم میں نہ ہو، ہم ان پر کفر کا حکم لگانے سے اجتناب کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ٘ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ''۔

ترجمہ: اے ایمان والو! بہت گمانوں سے بچو، بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، (الحجرات: 12)''۔حدیث پاک میں ہے: ''إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ''۔

ترجمہ: ''بدگمانی سے بچو، پس بے شک بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے''۔
(صحیح البخاری:5143)

اگر کوئی یہ فاسد استدلال کرے کہ مخلوق میں اللہ کے حلول کا تصور قرآنِ کریم میں موجود ہے، چنانچہ فرمایا:

''فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا٘ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾''۔(القصص:30-29)

ترجمہ: پس جب موسیٰ نے اپنی مدت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر (مصر کی جانب) چلے تو انہوں نے طور کی طرف سے ایک آگ دیکھی، اپنی اہلیہ کو فرمایا: تم یہیں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا آگ کا کوئی شعلہ لاؤں تاکہ تم تپش حاصل کرو، پھر جب موسیٰ آگ کے پاس حاضر ہوئے تو میدان کے دائیں کنارے سے برکت والے مقام میں ایک درخت سے پکارا گیا: اے موسیٰ! بے شک میں ہی اللہ رب العالمین ہوں''۔

اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ العیاذ باللہ تعالیٰ! اللہ تعالیٰ نے درخت میں حلول کر لیا تھا، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے برتر اور پاک ہے، ہاں! وہ اس بات پر قادر ہے کہ کہیں سے بھی اُس کی جانب سے ندا آئے، اُس کی ذات کی طرح اس کی صوت (آواز)

بھی جسم اور جسمانی تقاضوں اور مادّی عوارض سے پاک ہے۔

ہوسکتا ہے کوئی اس حدیثِ مبارک کا بھی حوالہ دے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ اللهَ قَالَ: مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِيْ لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيْذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِيْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس شخص نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی تو میں اس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں اور میری محبوب ترین چیز جس سے میرا بندہ میرا تقرُّب حاصل کرتا ہے، وہ عبادات ہیں جو میں نے اس پر فرض کی ہیں اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان ہوجاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی وہ آنکھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کے وہ ہاتھ ہوجاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے وہ پیر ہوجاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور اس کو عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ میں آنا چاہے تو میں ضرور اُسے پناہ دیتا ہوں اور میں کسی کام میں جس کو میں کرنے والا ہوں، ایسا تردُّد نہیں کرتا جیسا تردُّد میں مومن کی روح کو قبض کرنے میں کرتا ہوں کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اُسے رنجیدہ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں''۔

(صحیح البخاری:6502)

حاشا وکلّا! یہاں تردُّد سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ فیصلہ نہیں کر پاتا، جیسا کہ بعض اوقات بندے کو تردُّد لاحق ہوتا ہے، بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ اُس کی اجل میں تاخیر فرما دیتا ہے

اور مہلت دیتا ہے، اسی کو ''تقدیرِ معلّق'' کہتے ہیں، قرآن کریم کی یہ آیتِ مبارکہ: ''وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا''، ترجمہ: ''اور جب کسی شخص کی اَجَل (موت کا مقررہ وقت) آجائے تو اللہ اسے ہرگز مہلت نہیں دے گا، (المنافقون: 11)''۔ یہ آیت تقدیرِ مُبرم کے بارے میں ہے اور تقدیرِ مبرم یقیناً نہیں ٹلتی، بلکہ نافذ ہو کر رہتی ہے۔

اس حدیث کے تحت کسی نے بھی یہ قول نہیں کیا کہ معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ بندے میں حلول فرمالیتا ہے، بلکہ محدثین کرام نے اس کی توجیہات کی ہیں، علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ بندے کے کان اور آنکھیں ہوجاتا ہے، اس کی کیا توجیہ ہے، عام طور پر شارحین اور علماء نے یہ کہا ہے کہ بندہ اپنے کانوں سے وہی سنتا ہے جس کے سننے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اپنی آنکھوں سے وہی دیکھتا ہے جس کے دیکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو بندے کا سننا، اللہ کا سننا اور بندے کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہوتا ہے، اس لیے فرمایا: میں اس کے کان ہوجاتا ہوں اور اس کی آنکھیں ہوجاتا ہوں، لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا محبوب نہیں بنے گا جب تک کہ اس کا سننا، اس کا دیکھنا، اس کا تصرف کرنا اور اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق نہ ہو اور جب اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنالے گا تو پھر اللہ اس کے کان ہوجاتا ہے اور اس کی آنکھیں ہوجاتا ہے کا معنی یہ نہیں ہوسکتا، اس حدیث کی بہترین توجیہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''بندہ جب عبادات پر دوام کرتا ہے تو وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اس کی آنکھ ہوجاتا ہوں اور اس کے کان ہوجاتا ہوں، پس جب اللہ کا نور جلال اس کے کان ہوجاتا ہے تو وہ قریب اور دور سے سن لیتا ہے اور جب اس کا نور جلال اس کی آنکھ ہوجاتا ہے تو وہ قریب اور بعید کو دیکھ لیتا ہے اور جب اس کا نور اس کے ہاتھ ہوجاتا ہے تو وہ مشکل اور آسان چیزوں پر اور قریب اور بعید کی چیزوں کے تصرف پر قادر ہوجاتا ہے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا ولی فرائض پر دوام اور نوافل پر پابندی کرنے سے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوجاتا ہے، لیکن بندہ، بندہ ہی رہتا ہے خدا نہیں ہوجاتا، جیسے آئینے میں کسی چیز کا عکس ہوتو آئینہ وہ چیز نہیں بن جاتا، اس کی صورت کا مظہر ہوجاتا ہے، بلاتشبیہ وتمثیل جب بندہ کامل کی اپنی صفات فنا ہوجاتی ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہوجاتا ہے، (تبیان القرآن، ج:5،ص:418)''۔

## اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر کہنا

**سوال:**

اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر کہنا درست ہے؟، (حافظ محمد جمشید ہاشمی، کوٹ اڈو)۔

**جواب:**

اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات توقیفی ہیں، توقیفی سے مراد یہ ہے کہ یہ نقل وسماع پر موقوف ہیں، یعنی جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں، کسی نے اپنی عقل سے مقرر نہیں کیے۔ پس حاضر وناظر اللہ تعالیٰ کے اسمائے توقیفیہ میں سے نہیں ہے، ان کے بعض معانی شانِ اُلوہیت کے منافی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر نہیں کہنا چاہیے، لیکن اگر کسی نے تاویل کرکے حاضر کو جاننے والے اور ناظر کو دیکھنے والے کے معنی میں کہا تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے: ''وَیَا حَاضِرُ یَا نَاظِرُ لَیْسَ بِکُفْرٍ''۔

ترجمہ: ''اور یَا حَاضِرُ یَا نَاظِرُ کہنا کفر نہیں ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَإِنَّ الْحُضُوْرَ بِمَعْنَی الْعِلْمِ شَائِعٌ: ''مَا یَکُوْنُ مِنْ نَجْوٰی ثَلٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ''، وَالنَّظَرُ بِمَعْنَی الرُّؤْیَةِ: ''أَلَمْ یَعْلَمْ بِأَنَّ اللهَ یَرٰی''، فَالْمَعْنَی: ''یَا عَالِمُ مَنْ یَرٰی''، بَزَّازِیَّةٌ''۔

ترجمہ: ''کیونکہ حضور علم کے معنی میں اور نظر رویت کے معنی میں شائع اور معروف ہے اور یہ قرآنِ کریم کی ان آیات سے مستفاد ہیں: ''مَا یَکُوْنُ مِنْ نَجْوٰی ثَلٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ''

ترجمہ: ''جہاں تین آدمی سرگوشی کریں، (وہاں) چوتھا اللہ اُن کے ساتھ ہے، (المجادلہ:7)''
''أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرٰى''، ترجمہ: ''کیا اس نے یہ نہ جانا کہ بے شک اللہ (سب کچھ) دیکھ رہا ہے، (العلق:14)''، پس یَا حَاضِرُ یَا نَاظِرُ کا معنیٰ ہوا: ''اے جاننے والے، اے دیکھنے والے!، بحوالہ ''بزازیہ''، (ردّالمحتار علی الدّرالمختار، جلد 13، ص:126، دمشق)''۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لیے شہید و بصیر کے کلمات آئے ہیں:

(۱) ''وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ''۔
ترجمہ: ''اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے، (البروج:9)''۔

(۲) ''اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ''۔
ترجمہ: ''بے شک وہی بہت سننے والا، بہت دیکھنے والا ہے، (الاسراء:1)''۔

(۳) ''وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ''۔
ترجمہ: ''اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس کو اللہ خوب دیکھنے والا ہے، (البقرہ:96)''۔

الغرض اللہ کے لیے رویت کے معنی میں ناظر اور بصیر کے کلمات استعمال کرنا قرآنِ کریم سے ثابت ہیں، لیکن ہم کہیں گے: ہمارا ان کے حق ہونے پر ایمان ہے، اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانی اعضا سے پاک ہے، ان کلمات کے معنی اور مراد ہم اللہ تعالیٰ کے علم پر تفویض کرتے ہیں اور اس کے مصداق کے تعیّن کے ہم مکلف نہیں ہیں۔

حاضر کا معنیٰ عربی کی مشہور لغت ''المنجد'' اور ''مختار الصحاح'' میں یہ ہیں: نزدیکی، صحن، حاضر ہونے کی جگہ، جو چیز کھلم کھلا بے حجاب آنکھوں کے سامنے ہو اور ناظر کے معنی ''مختار الصحاح'' میں ''آنکھ کے ڈھیلے کی سیاہی'' کے ہیں، جبکہ نظر کے معنیٰ ہیں: ''کسی امر میں تفکر وتدبر کرنا اور آنکھ سے کسی چیز میں تامل کرنا'' ہیں۔ لغوی معنیٰ کے اعتبار سے ان دونوں لفظوں کے معانی سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، بغیر تاویل کے اللہ تعالیٰ کے لیے ان الفاظ کو نہیں بولا جاسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ مبارکہ ''توقیفی'' یعنی نقل وسماع پر موقوف

ہیں اور اسماءِ حُسنیٰ میں یہ دونوں کلمات (حاضر وناظر) بطور اسم یا صفت شامل نہیں ہیں، قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے نہ یہ الفاظ آئے ہیں اور نہ صحابہ کرام، تابعین وائمۂ مُجتہدین نے استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات میں "مُعلِّم" تو نہیں آیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے تعلیم فرمانے کے بارے میں آیات آئی ہیں:

(۱) "اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝"۔

ترجمہ: "رحمٰن نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا (اور) اسے اظہار کی صلاحیت سکھائی، (الرحمٰن:1-4)" میں اللہ تعالیٰ کے لیے تعلیم دینے کا کلمہ آیا ہے۔

(۲) "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا"۔

ترجمہ: "اور اس نے آدم کو سب مُسَمَّیات (چیزوں) کے نام سکھائے، (البقرہ:31)"۔

(۳) "وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا"۔

ترجمہ: "اور جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے، وہ آپ کو سکھایا اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے"۔ (النساء:113)

اسی طرح قرآن کریم میں بعض طبقات کے لیے اللہ تعالیٰ کی نظرِ رحمت سے محرومی کا ذکر ہے:

(۱) "اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"۔ (آل عمران:77)

ترجمہ: "بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت لے لیتے ہیں، ان لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان سے کوئی کلام کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظرِ (رحمت) فرمائے گا اور نہ ان کو پاکیزہ کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ: رَجُلٌ حَلَفَ عَلٰى سِلْعَةٍ لَقَدْ أُعْطِيَ بِهَا أَكْثَرَ مِمَّا أُعْطِيَ وَهُوَ كَاذِبٌ، وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلٰى يَمِينٍ كَاذِبَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ، لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ رَجُلٍ مُسْلِمٍ، وَرَجُلٌ مَنَعَ فَضْلَ مَاءٍ فَيَقُولُ اللّٰهُ الْيَوْمَ أَمْنَعُكَ فَضْلِي كَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ مَا لَمْ تَعْمَلْ يَدَاكَ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تین آدمیوں سے قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا اور نہ اُن کی طرف نظرِ (رحمت) فرمائے گا: ایک وہ شخص جس نے قسم کھائی کہ اسے اِس سودے کی قیمت اس سے زیادہ دی جارہی تھی، جتنی اب دی جارہی ہے اور وہ اس قسم میں جھوٹا تھا، دوسرا وہ شخص جس نے عصر کے بعد جھوٹی قسم پر حلف اٹھایا تاکہ اس قسم کے ذریعہ کسی مسلمان شخص کا مال لے لے، تیسرا وہ شخص جس نے اپنی ضرورت سے زائد پانی سے کسی کو منع کیا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: آج میں تجھے اپنے فضل سے اسی طرح محروم کردوں گا، جس طرح تو نے اپنی ضرورت سے زائد (پانی دوسرے ضرورت مند کو دینے) سے منع کیا تھا، حالانکہ اس چیز کو تو نے پیدا نہیں کیا تھا"۔ (صحیح بخاری:2369)

(۲) "عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ إِلٰى مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ"۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص تکبّر سے کپڑا گھسیٹ کر چلے، اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ (رحمت) نہیں فرمائے گا، (صحیح مسلم:2085)"۔ نظرِ رحمت کی بابت اور بھی احادیث ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض محبوب بندوں پر نظرِ رحمت فرماتا ہے، لیکن اسے ناظر کہنا درست نہیں ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"لَمْ يَزَلْ وَلَا يَزَالُ بِأَسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ الذَّاتِيَّةِ وَالْفِعْلِيَّةِ، أَمَّا الذَّاتِيَّةُ فَالْحَيَاةُ وَالْقُدْرَةُ وَالْعِلْمُ وَالْكَلَامُ وَالسَّمْعُ وَالْبَصَرُ وَالْإِرَادَةُ"۔

ترجمہ: "وہ اپنے اسماء اور اپنی صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ فعلیہ کے ساتھ ہمیشہ موصوف رہا ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا اور صفاتِ ذاتیہ یہ ہیں: حیات، قدرت، علم، کلام، سننا، دیکھنا اور

ارادہ، (الفقہ الاکبر، ص:25-24)"۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ائمۂ اربعہ اور دیگر متقدمین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی آنکھیں بھی ہیں اور اس کے ہاتھ بھی ہیں، لیکن وہ ہماری طرح جسمانی اعضا نہیں ہیں، بلکہ مخلوقات اور ممکنات میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، قرآن مجید میں ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" ترجمہ: "اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے، (الشوریٰ: 11)"۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو ید، عین اور ساق وغیرہ کے کلمات آئے ہیں، ہم اُن پر ایمان لاتے ہیں، اُن کی نفی نہیں کرتے اور نہ ان میں کوئی تاویل کرتے ہیں، اس کے ہاتھ، آنکھیں اور پنڈلی ہیں جیسے اس کی شان کے لائق ہیں لیکن ممکنات اور مخلوقات میں ان کی کوئی مثال نہیں ہے، وہ جسم اور جسمانی اعضاء سے مُبرّا، مُنزّہ اور پاک ہے، یہ ہمارے لیے متشابہات میں سے ہیں، (تبیان القرآن، جلد 11، ص:584)"۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حیات، قدرت، سننا، دیکھنا، کلام، علم اور ارادہ اُس کی صفاتِ ذاتیہ ہیں، مگر کان، آنکھ، زبان سے اُس کا سننا، دیکھنا، کلام کرنا نہیں کہ یہ سب اَجسام ہیں اور اَجسام سے وہ پاک ہے۔ ہر پست سے پست آواز کو سنتا ہے، ہر باریک سے باریک کو کہ خُوردبین سے محسوس نہ ہو، وہ دیکھتا ہے، بلکہ اُس کا دیکھنا اور سننا انہیں چیزوں پر منحصر نہیں، ہر موجود کو دیکھتا ہے اور ہر موجود کو سنتا ہے، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:7)"۔

فتاویٰ فیض الرسول میں ہے:

"اگر حاضر وناظر بہ معنیٰ شہید وبصیر اعتقاد رکھتے ہیں یعنی ہر موجود اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے اور وہ ہر موجود کو دیکھتا ہے، تو یہ عقیدہ حق ہے، مگر اس کی تعبیر حاضر وناظر سے کرنا یعنی اللہ تعالیٰ کے بارے میں حاضر وناظر کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے، لیکن اگر پھر بھی کوئی شخص اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بولے تو وہ کفر نہ ہوگا، جیسا کہ درمختار مع شامی جلد سوم، ص:307 میں ہے: يَا حَاضِرُ يَا نَاظِرُ لَيْسَ بِكُفْرٍ وَهُوَ أَعْلَمُ، (جلد اول، ص:3)"۔

## نماز کی توہین کفر ہے

**سوال:**

میرے شوہر کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، اُن کے پیٹ کا نظام اکثر خراب رہتا ہے، جس کی وجہ سے اُنہیں ٹھیک طریقے سے نیند نہیں آتی اور چڑچڑاہٹ کا شکار ہوجاتے ہیں، اِسی دوران اُن کے منہ سے عیدالاضحیٰ سے دو یا تین دن پہلے یہ الفاظ نکل گئے: ''بھاڑ میں جائے عید کی نماز، اگر میں سوجاؤں تو نہ اُٹھانا''، لیکن پھر اُنہوں نے نماز بھی پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے معافی بھی بہت مانگی، اس بارے میں اُن کے لیے کیا حکم ہے وہ شادی شدہ اور بچوں والے ہیں، (ایک دینی بہن، کراچی)

**جواب:**

آپ کے شوہر نے نماز کے متعلق جو نازیبا کلمات کہے ہیں، وہ کفریہ کلمات ہیں، کیونکہ نماز شعائرِ اسلام میں سے ہے اور شعائرِ اسلام کی توہین کفر ہے، سواُن پر واجب ہے کہ اُس سے توبہ کریں اور تجدیدِ ایمان وتجدیدِ نکاح بھی کریں۔ تجدیدِ ایمان یہ ہے کہ صدقِ دل کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھیں اور تجدیدِ نکاح یہ ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں نئے مہر کے ساتھ نیا نکاح کریں۔ نکاح ایجاب وقبول کا نام ہے اور اس کے لیے صرف دو گواہ کافی ہیں جو دونوں مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، لوگوں کو اکٹھا کرنا ضروری نہیں ہے اور گھر کے افراد مثلاً: بالغ بیٹے اور بیٹیاں یا بھائی بہن بھی گواہ بن سکتے ہیں۔

## نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے راستے میں کوڑا پھینکنے والی عورت کا واقعہ

**سوال:**

واعظین وخطباء اپنے بیانات میں اکثر یہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے راستے میں ایک عورت کوڑا پھینکتی تھی، ایک دن اس نے کوڑا نہ پھینکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس کے گھر کو صاف کیا، پانی وغیرہ بھرا، وہ عورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حسنِ اخلاق کو دیکھ کر مسلمان ہوگئی۔ اس واقعہ کی تحقیق مطلوب ہے، کسی کتاب میں ہے

یا سنی سنائی بات ہے؟، (ضیاء احمد، ملتان روڈ، لاہور)۔

**جواب:**

ہماری معلومات کے مطابق حدیث وسیرت کی مستند اور معتبر کتابوں میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے، یہ واقعہ ویسے ہی مشہور ہوگیا ہے، کسی بھی کتاب میں اس کی کوئی سند نہیں ملتی، حتیٰ کہ معروف مراجع ومصادر میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ بعض لوگ ایسی روایت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بھی بیان کرتے ہیں، لیکن ہمیں اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ملا۔

ایک وسیع المطالعہ بزرگ، خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند، شارح بخاری علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ سے اس روایت کے بارے میں سوال ہوا، اس کے جواب میں آپ نے لکھا: ''کوڑا کرکٹ ڈالنے کی روایت اس وقت یاد نہیں ہے (لہٰذا) اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، (فتاویٰ شارح بخاری، جلد 1، ص:415)''۔ ہر دور میں واعظین لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے اس طرح کے واقعات وضع کرتے رہے ہیں، اسی لیے مُحدثین کرام نے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ الحمدللہ علی احسانہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت طیبہ کے سچے اور مستند واقعات بہت ہیں، ہمیں انہی واقعات پر اکتفا کرنا چاہیے، جھوٹ یا خلافِ واقعہ بات نیک نیتی سے بیان کی جائے یا بدنیتی سے دونوں صورتوں میں اس کا جواز نہیں بنتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ''۔

ترجمہ: ''جس شخص نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی، اُسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، (صحیح بخاری:110، 6197، صحیح مسلم:4)''۔ ایک اور حدیثِ پاک میں ہے: ''کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا أَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ''۔

ترجمہ: ''کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ (تحقیق کیے بغیر) ہر سنی سنائی بات لوگوں کے سامنے بیان کرتا پھرے، (صحیح مسلم:7)''، یعنی محض سنی سنائی

بات کو تیقُّن کے ساتھ حق اور حقیقت کے طور پر بیان کرنا درست نہیں ہے، البتہ جس سے سنا ہے، اس کے حوالے سے بیان کرے تو اس پر جھوٹ کا اطلاق نہیں ہوگا، اسی کو ہمارے ہاں اردو محاورے میں اس طرح تعبیر کرتے ہیں: ''دروغ بر گردنِ راوی''، یعنی اس کو صحیح ثابت کرنے کی ذمے داری راوی پر ہے، میں یہ ذمے داری اپنے سر نہیں لیتا۔

''عَنْ جُنْدَبِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ''۔

ترجمہ: حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے قرآن مجید میں اپنی رائے سے صحیح بات بھی کہی، تو اس نے خطا کی، (سنن ترمذی: 2952)''۔ نوٹ: ''جُندب'' کے لفظ کو دال کی زبر اور پیش کے ساتھ یعنی دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

## صحابی کی تعریف

### سوال:

صحابی کسے کہتے ہیں، کیا جنات میں بھی صحابہ ہیں، کیا صحابیت کا شرف صرف بالغ افراد کو حاصل ہے یا اطفال اور غیر ممیز صبیان کی طرف بھی اس شرف کی نسبت کی گئی ہے، نیز آیا ملائکہ بھی نسبت صحابیت سے مشرف ہوئے، اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا اُن کی طرف آپ ﷺ کی بعثت اِرسالِ تکلیفی ہے یا محض تشریعی، اسی طرح دیگر مخلوقات کی طرف ارسال کی نوعیت کیا ہے، (ابو عمیر قاری محمد نوید اختر، کراچی)

### جواب:

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہ متوفی 852ھ صحابی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''أَصَحُّ مَا وَقَفْتُ عَلَیْهِ مِنْ ذٰلِكَ أَنَّ الصَّحَابِیَّ مَنْ لَقِیَ النَّبِیَّ ﷺ مُؤْمِنًا بِهِ، وَمَاتَ عَلَی الْإِسْلَامِ''۔

ترجمہ: ''صحابی کی سب سے زیادہ صحیح تعریف جس سے میں واقف ہوا، یہ ہے: صحابی اُس شخص

کو کہا جاتا ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھنے کی حالت میں آپ سے ملاقات کی اور اسلام پر اس کی وفات ہوئی، خواہ درمیان میں (بدقسمتی سے) مرتد ہو گیا، لیکن پھر اسلام قبول کر لیا ہو، یہی تعریف زیادہ صحیح ہے، (اَلْاِصَابَہ فِی تَمْیِیْزِ الصَّحَابَہ، ج:1، ص:158)"۔

علامہ حافظ ابن حجر اپنی اس تعریف میں مذکور قیودات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(1) "فَیَدْخُلُ فِی "مَنْ لَقِیَهٗ" مَنْ طَالَتْ مُجَالَسَتُهٗ أَوْ قَصُرَتْ، وَمَنْ رَوٰی عَنْهُ أَوْ لَمْ یَرْوِ، وَمَنْ غَزَا مَعَهٗ أَوْ لَمْ یَغْزُ، وَمَنْ رَآهُ رُؤْیَةً وَلَمْ یُجَالِسْهُ، وَمَنْ لَمْ یَرَهٗ لِعَارِضٍ کَالْعَمٰی"۔

ترجمہ: "صحابی کی تعریف میں "نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات" کی قید (عام ہے، لہٰذا اس قید کی رُو) سے ہر وہ شخص صحابی کی تعریف میں داخل ہو جاتا ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی ہو، خواہ اُس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں طویل عرصہ گزارا ہو یا تھوڑا، اُس نے آپ سے روایت کی ہو یا نہ کی ہو، آپ کے ساتھ غزوات میں شریک رہا ہو یا نہیں، یا صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہو لیکن آپ کے ساتھ ہمنشی نہ کی ہو، یونہی وہ شخص بھی صحابی کی اِس تعریف میں داخل ہے جس نے آپ سے ملاقات کی ہو، لیکن کسی عارضے مثلاً نابینا ہونے کی وجہ سے آپ کو نہ دیکھ پایا ہو (یعنی ملاقات کے باوجود رویتِ بصری سے محروم رہا ہو، (اَلْاِصَابَہ فِی تَمْیِیْزِ الصَّحَابَہ، ج1 ص158)"۔

شرفِ صحابیت کے ثبوت کے لیے کتنی دیر کی صحبت کافی ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں:

"اُخْتُلِفَ فِی حَدِّ الصَّحَابِیِّ: فَالْمَعْرُوفُ عِنْدَ الْمُحَدِّثِیْنَ أَنَّهٗ کُلُّ مُسْلِمٍ رَاٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، وَعَنْ أَصْحَابِ الْأُصُوْلِ أَوْ بَعْضِهِمْ أَنَّهٗ مَنْ طَالَتْ مُجَالَسَتُهٗ عَلٰی طَرِیْقِ التَّبَعِ، وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ أَنَّهٗ لَا یُعَدُّ صَحَابِیًّا إِلَّا مَنْ أَقَامَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَنَةً أَوْ سَنَتَیْنِ أَوْ غَزَا مَعَهٗ غَزْوَةً أَوْ غَزْوَتَیْنِ، فَإِنْ صَحَّ عَنْهُ فَضَعِیْفٌ، فَإِنَّ مُقْتَضَاهُ أَنْ لَا یُعَدَّ جَرِیْرٌ الْبَجَلِیُّ وَشِبْهُهٗ صَحَابِیًّا، وَلَا خِلَافَ أَنَّهُمْ صَحَابَةٌ"۔

ترجمہ: ''صحابی کی تعریف میں اختلاف ہے، محدثین کے نزدیک معروف تعریف یہ ہے: ''ہر وہ مسلمان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا، وہ صحابی ہے'' اور بعض اصحاب الاصول کے نزدیک تعریف یہ ہے: ''جس نے بہ طریق متابعت نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طویل مجلس حاصل کی ہو'' اور سعید بن مسیب سے یہ تعریف منقول ہے: ''صحابی صرف وہ مسلمان ہے جو آپ کے ساتھ ایک یا دو سال رہا ہو یا جس نے آپ کے ساتھ ایک یا دو غزوات میں شرکت کی ہو، یہ تعریف ضعیف ہے، کیونکہ اس تعریف کی رو سے حضرت جریر بن عبداللہ البجلی اور ان جیسے (حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہما) صحابی نہیں رہیں گے، حالانکہ ان کے صحابی ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، (تَدْرِیْبُ الرَّاوِیْ فِیْ شَرْحِ تَقْرِیْبِ النَّوَوِی: ج:2، ص:667)''۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ عَلِیُّ بْنُ الْمَدِیْنِیِّ: مَنْ صَحِبَ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم أَوْ رَاٰهُ وَلَوْ سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ فَهُوَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم''۔

ترجمہ: ''علی بن المدینی نے کہا: ''جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مجلس میں بیٹھا یا آپ کو دیکھا، خواہ یہ دن کی ایک ساعت میں ہو، تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابی ہیں، (فتح الباری: ج:7، ص:5)''۔

الغرض یہ کہ صحابیت کے ثبوت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات ضروری ہے، خواہ ملاقات طویل عرصے رہی ہو یا کچھ دیر کے لیے، صحابی ہونے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ طویل عرصے کی صحبت یا آپ کے ساتھ غزوات میں شرکت ضروری نہیں۔

(2) صحابی کی تعریف میں مذکور دوسری قید ''مُؤْمِنًا'' کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَیَخْرُجُ بِقَیْدِ الْإِیْمَانِ مَنْ لَقِیَهٗ کَافِرًا وَلَوْ أَسْلَمَ بَعْدَ ذٰلِكَ إِذَا لَمْ یَجْتَمِعْ بِهٖ مَرَّةً أُخْرٰی''۔

ترجمہ: ''صحابی کی تعریف میں ایمان کی قید سے وہ شخص خارج ہو گیا جس نے کفر کی حالت میں آپ سے ملاقات کی ہو، خواہ اِس ملاقات کے بعد وہ اسلام لے آیا ہو، بشرطیکہ وہ دوبارہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جمع نہ ہوا ہو، (اَلْاِصَابَہ فِی تَمْیِیْزِ الصَّحَابَہ، ج:1،ص:158)''۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمَنْ رَاٰہُ کَافِرًا ثُمَّ أَسْلَمَ بَعْدَ مَوْتِہٖ کَرَسُوْلِ قَیْصَرَ فَلَا صُحْبَۃَ لَہٗ''۔

ترجمہ: ''اور جس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفر کی حالت میں دیکھا اور آپ کی وفات کے بعد اسلام لایا، جیسے قیصر کا ایلچی، تو اُنہیں صحابیت کا شرف حاصل نہیں ہے، (تَدْرِیْبُ الرَّاوِیْ فِیْ شَرْحِ تَقْرِیْبِ النَّوَوِی: ج:2،ص:667-668)''۔

بعض اہلِ علم حضرات نے صحابی ہونے کے لیے بلوغت کی شرط بھی عائد کی ہے، لیکن صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ صحابی ہونے کے لیے بالغ ہونا ضروری نہیں ہے، چنانچہ علامہ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَالصَّحِیْحُ أَنَّ الْبُلُوْغَ لَیْسَ شَرْطًا فِیْ حَدِّ الصَّحَابِیِّ وَإِلَّا لَخَرَجَ بِذٰلِكَ مَنْ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی عَدِّهِمْ فِی الصَّحَابَةِ کَعَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَیْرِ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمْ''۔

ترجمہ: ''اور صحیح یہ ہے کہ صحابی کی تعریف میں بلوغ کی شرط نہیں، ورنہ جن شخصیات کی صحابیت پر علماء کا اجماع ہے، وہ صحابیت سے خارج ہو جائیں گے، جیسے امام حسن اور امام حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، (اَلتَّقْیِیْدُ وَالْاِیْضَاحُ شَرْحُ مُقَدَّمَہ اِبْنُ الصَّلَاح: ص295)''۔

البتہ امام یحییٰ بن معین، امام ابوزرعہ، امام ابوحاتم، امام ابوداؤد اور علامہ ابن عبدالبر وغیرہ بعض محدثین نے صحابی ہونے کے لیے ''سِنِّ تمییز'' (اچھے برے میں فرق کی صلاحیت کی عمر کو پہنچنا، جو کہ کم از کم چار برس ہے) کی شرط عائد کی ہے، چنانچہ علامہ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَأَمَّا التَّمْیِیْزُ فَظَاهِرُ كَلَامِهِمْ اِشْتِرَاطُهٗ كَمَا هُوَ مَوْجُوْدٌ فِیْ كَلَامِ یَحْیَی بْنِ مَعِیْنٍ وَأَبِیْ زُرْعَةَ وَأَبِیْ حَاتِمٍ وَأَبِیْ دَاوٗدَ وَابْنِ عَبْدِ الْبَرِّ وَغَیْرِهِمْ وَهُمْ جَمَاعَةٌ أُتِیَ بِهِمُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَهُمْ أَطْفَالٌ فَحَنَّكَهُمْ وَمَسَحَ وُجُوْهَهُمْ أَوْ تَفَلَ فِیْ أَفْوَاهِهِمْ فَلَمْ یَكْتُبُوْا لَهُمْ صُحْبَةً، كَحُمَدِ بْنِ حَاطِبِ بْنِ الْحَارِثِ وَعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّیْمِیِّ وَمَحْمُوْدِ ابْنِ الرَّبِیْعِ

وَعُبَيْدِ اللهِ بْنِ مَعْمَرٍ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ وَمُحَمَّدِ بْنِ ثَابِتِ بْنِ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ وَيَحْيَى بْنِ خَلَّادِ بْنِ رَافِعٍ الزُّرَقِيِّ وَمُحَمَّدِ بْنِ طَلْحَةَ ابْنِ عُبَيْدِ اللهِ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ ثَعْلَبَةَ بْنِ صَعِيْرٍ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ عَامِرِ بْنِ كُرَيْزٍ وَعَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ عَبْدِ الْقَارِيِّ وَنَحْوِهِمْ''۔

ترجمہ: ''رہی (خیر وشر میں) تمیز کی صلاحیت تو بظاہر یہ شرط ہے، جیسا کہ یہ شرط یحییٰ بن معین، ابوزرعہ، ابوحاتم، ابوداؤد، ابن عبدالبر وغیرہ کے کلام میں موجود ہے، ان حضرات نے غیر ممیز بچے کو صحابی قرار نہیں دیا، اِس سے مراد وہ بچے ہیں جنہیں بچپن میں نبی ﷺ کے پاس لایا گیا، آپ نے انہیں گھٹی دی، ان کے چہروں کو (پیار سے) چھوایا ان کے منہ میں لعابِ دہنِ مبارک ڈالا، لیکن انہیں صحابہ میں شمار نہیں کیا گیا جیسے: محمد بن حاطب بن حارث، عبدالرحمٰن بن عثمان التیمی، محمود بن ربیع، عبیداللہ بن معمر، عبداللہ بن حارث بن نوفل، عبداللہ بن ابی طلحہ، محمد بن ثابت بن قیس بن شماس، یحییٰ بن خلاف بن رافع الزرقی، محمد بن طلحہ بن عبیداللہ، عبداللہ بن ثعلبہ بن صعیر، عبداللہ بن عامر بن کریز اور عبدالرحمٰن بن عبدالقاری اور اس طرح کے دوسرے بچے، (اَلتَّقْيِيْدُ وَالْاِيْضَاح، ص:292)''۔

اس کے برعکس اکثر اہلِ علم کے نزدیک صحابی ہونے کے لیے سن تمیز کو پہنچنا شرط نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''إِلَّا أَنَّهُ هَلْ يُشْتَرَطُ فِي الرَّائِيْ أَنْ يَكُوْنَ بِحَيْثُ يُمَيِّزُ مَا رَاٰهُ أَوْ يُكْتَفٰى بِمُجَرَّدِ حُصُوْلِ الرُّؤْيَةِ مَحَلُّ نَظَرٍ، وَعَمَلُ مَنْ صَنَّفَ فِي الصَّحَابَةِ يَدُلُّ عَلَى الثَّانِيْ، فَإِنَّهُمْ ذَكَرُوْا مِثْلَ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ، وَإِنَّمَا وُلِدَ قَبْلَ وَفَاةِ النَّبِيِّ ﷺ بِثَلَاثَةِ أَشْهُرٍ وَأَيَّامٍ كَمَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيْحِ أَنَّ أُمَّهُ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ وَلَدَتْهُ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ قَبْلَ أَنْ يَدْخُلُوْا مَكَّةَ وَذٰلِكَ فِيْ أَوَاخِرِ ذِي الْقَعْدَةِ سَنَةَ عَشْرٍ مِنَ الْهِجْرَةِ وَمَعَ ذٰلِكَ، فَأَحَادِيْثُ هٰذَا الضَّرْبِ مَرَاسِيْلُ''۔

ترجمہ: ''کیا نبی ﷺ کا دیدار کرنے والے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ جو دیکھے اس کی تمیز

کرسکتا ہو یا صرف دیکھنے پر اکتفا کیا جائے گا، یہ محلِ نظر ہے اور جن علماء نے صحابہ کے حالات پر کتابیں لکھی ہیں ان کا عمل دوسرے پر دلالت کرتا ہے، انہوں نے محمد بن ابوبکر صدیق کا ذکر صحابہ میں کیا ہے، حالانکہ وہ نبی ﷺ کی وفات سے تین ماہ کچھ دن قبل پیدا ہوئے تھے، یہ بات حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ ان کی ماں اَسماء بنتِ عُمیس نے ان کو ۱۰ ہجری ماہ ذوالقعدہ میں حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ داخل ہونے سے پہلے جنا تھا، باوجود اس شرف کے ان حضرات کی بیان کردہ احادیث مراسیل ہیں، (فتح الباری: ج:7،ص:3)"۔

نیز لکھتے ہیں:

"مَنْ لَّمْ یُمَیِّزْلَا تَصِحُّ نِسبَۃُ الرُّؤْیَۃِ إِلَیْہِ، نَعَمْ یَصْدُقُ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ رَآہُ فَیَکُوْنُ صَحَابِیًّا مِنْ ھٰذِہِ الْحَیْثِیَّۃِ، وَمِنْ حَیْثُ الرِّوَایَۃِ یَکُوْنُ تَابِعِیًّا"۔

ترجمہ: "جو نبی کریم ﷺ کی حیات میں سن تمیز کو نہ پہنچا ہو، اُس کی طرف نبی کریم ﷺ کو دیکھنے کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، ہاں یہ بات درست ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اُسے دیکھا ہو، پس وہ اِس حیثیت سے صحابی ہوگا اور روایت کے اعتبار سے وہ تابعی ہوگا"۔

علامہ عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں:

"وَالْمُرَجَّحُ ھُوَ دُخُولُہٗ فِیْھِمْ نَعَمْ حَدِیْثُھُمْ مُرْسَل لٰکِنَّہٗ مُرْسَلٌ" "مَقْبُوْلٌ"۔

ترجمہ: "ان کے صحابہ میں داخل ہونے کا قول راجح ہے، ہاں ان کی روایت کردہ احادیث مرسل، لیکن مرسل مقبول ہیں، (ظَفَرُ الْاَمَانِی فِی مُخْتَصَرِ الْجُرجَانی: 307)"۔

اسی طرح مجنون کا حکم ہے کہ وہ تبعاً صحابی قرار پائے گا، وہ تمام اطفال جو عہد طفولیت میں نبی ﷺ کی ملاقات سے مشرف ہوئے، ان کا تبعاً مسلم ہونا ظاہر ہے کہ ان کے والدین مسلم بلکہ صحابہ تھے اور اگر کسی مجنون کو بھی نبی ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، جس کے والدین دونوں یا ان میں سے ایک مسلمان ہو تو وہ بھی یقیناً مسلم ہوا، لہٰذا مجنون اور اطفال دونوں "مُسْلِمًا" کی قید سے خارج نہیں ہوئے۔

(3) صحابی کی تعریف میں مذکور تیسری قید "بِہٖ" کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ حافظ ابن

حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَقَوْلُنَا ''بِهٖ '' يَخْرُجُ مَنْ لَقِيَهٗ مُؤْمِنًا بِغَيْرِهٖ، كَمَنْ لَقِيَهٗ مِنْ مُؤْمِنِي أَهْلِ الْكِتَابِ قَبْلَ الْبَعْثَةِ''۔

ترجمہ: ''خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے کی قید سے وہ تمام لوگ صحابی کی تعریف سے خارج ہوگئے، جنہوں نے (اعلان نبوت سے قبل) دیگر انبیاء کرام پر ایمان رکھنے کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کی ہو (اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے ہوں)''۔

(اَلْاِصَابَه فِي تَمْيِيْزِ الصَّحَابَه، ج 1 ص 158)

ایمان کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کی قید سے وہ تمام اشخاص صحابی کی تعریف سے خارج ہوگئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں آپ پر ایمان لائے، مگر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکے، جیسا کہ خیر التابعین حضرت اویس قرنی، جو کہ اپنی والدہ کی خدمت میں منہمک ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات نہ کر سکے، اسی طرح حبشہ کے بادشاہ أصحمہ نجاشی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لے آئے تھے، مگر آپ سے ملاقات حاصل نہ ہو سکی۔

محدثین کرام نے یہ شرط بھی عائد کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ ملاقات آپ کی حیاتِ دنیوی اور بیداری میں ہو، لہٰذا جس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آپ کے وصال کے بعد دفن سے پہلے دیکھا، جیسا کہ ابوذؤیب خویلد بن خالد ہذلی، یا جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دنیوی حیات میں یا آپ کے پردہ فرمانے کے بعد خواب میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا، تو وہ صحابی نہیں کہلائے گا، علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَهٰذَا كُلُّهٗ فِيْمَنْ رَاٰهُ وَهُوَ فِي قَيْدِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَوِيَّةِ، أَمَّا مَنْ رَاٰهُ بَعْدَ مَوْتِهٖ وَقَبْلَ دَفْنِهٖ، فَالرَّاجِحُ أَنَّهٗ لَيْسَ بِصَحَابِيٍّ وَإِلَّا لَعُدَّ مَنِ اتَّفَقَ أَنْ يَرٰى جَسَدَهُ الْمُكَرَّمَ وَهُوَ فِي قَبْرِهِ الْمُعَظَّمِ وَلَوْ فِي هٰذِهِ الْاَعْصَارِ وَكَذٰلِكَ مَنْ كُشِفَ لَهٗ عَنْهُ مِنَ الْاَوْلِيَاءِ فَرَاٰهُ كَذٰلِكَ عَلٰى طَرِيْقِ الْكَرَامَةِ''۔

ترجمہ: ''اور یہ تمام صورتیں اُس شخص کے متعلق ہیں جس نے آپ کو حیات دنیوی میں دیکھا اور جس نے آپ کو وفات کے بعد اور دفن سے پہلے دیکھا، تو راجح قول کے مطابق وہ صحابی نہیں ہے، ورنہ اس کو بھی صحابی شمار کیا جائے گا جس کے بارے میں اتفاق ہو کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسد مکرم کو آپ کی قبر معظم میں دیکھا، خواہ وہ اِسی زمانے میں ہو اور اسی طرح وہ اولیاءِ کرام جن کو کشف کی صورت میں آپ کی زیارت کرائی گئی ہو، اسی طرح کرامت کے طور پر آپ کی زیارت کرائی گئی ہو، (فتح الباری: ج:7،ص:6)''۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمَنْ رَاٰہُ بَعْدَ مَوْتِہٖ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قَبْلَ الدَّفْنِ، وَقَدْ وَقَعَ ذٰلِكَ لِاَبِیْ ذُؤَیْبٍ خُوَیْلِدِ بْنِ خَالِدٍ الْھُذَلِیِّ، فَاِنَّہٗ لَا صُحْبَۃَ لَہٗ''۔

ترجمہ: ''اور جس شخص نے آپ کی وفات کے بعد دفن ہونے سے پہلے دیکھا، جیسے ابوذویب خُویلد بن خالد ہذلی، تو اُنہیں صحابیت کا شرف حاصل نہیں ہے۔ (تَدْرِیْبُ الرَّاوِیْ فِیْ شَرحِ تَقْرِیْبِ النَّوَوِی: ج:2،ص:667-668)''۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں، جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعلانِ نبوت سے قبل آپ سے ملاقات کی اور آپ کی بعثت ورسالت کی خبر دیتے ہوئے آپ پر ایمان بھی لائے، مثلاً: بحیرا راہب وغیرہ، تو آیا ایسے اشخاص صحابی کہلائیں گے یا نہیں، اس حوالے سے علامہ حافظ ابن حجر مضطرب نظر آتے ہیں اور اُنہوں نے ایسے اشخاص کے صحابہ میں سے ہونے نہ ہونے کی کوئی تعیین نہیں کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وَھَلْ یَدْخُلُ مَنْ لَقِیَہٗ مِنْھُمْ وَآمَنَ بِاَنَّہٗ سَیُبْعَثُ اَوْ لَا یَدْخُلُ؟ مَحَلُّ اِحْتِمَالٍ وَمِنْ ھٰؤُلَاءِ بُحَیْرَا الرَّاھِبُ وَنَظْرَاؤُہٗ''۔

ترجمہ: '' جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کی متوقع بعثت پر ایمان لائے، آیا وہ صحابی کہلائیں گے یا نہیں، اس میں احتمال ہے، اس نوع سے بحیرا راہب اور

اُن جیسے دیگر لوگ تعلق رکھتے ہیں، (اَلْاِصَابَه فِی تَمْیِیْزِ الصَّحَابَه، ج 1 ص 158)''، یعنی علامہ حافظ ابن حجر نے قطعیت کے ساتھ ان کے صحابی ہونے کا قول نہیں کیا۔

جبکہ بعض محدثین نے اُن تمام اشخاص کو صحابہ میں داخل مانا ہے جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعلان نبوت سے قبل ملت حنفیہ پر قائم رہتے ہوئے ایمان کی حالت میں آپ سے ملاقات کی، مثلاً زید بن عمرو بن نفیل یا آپ کی متوقع بعثت پر ایمان لائے، جیسا کہ بحیرا راہب، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی ''شرح التحریر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وَالصَّحَابِیُّ عِنْدَ الْمُحَدِّثِیْنَ وَبَعْضِ الْاُصُوْلِیِّیْنَ: مَنْ لَقِیَ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مُسْلِمًا وَمَاتَ عَلَی الْاِسْلَامِ اَوْ قَبْلَ النُّبُوَّةِ وَمَاتَ قَبْلَهَا عَلَی الْحَنِیْفِیَّةِ کَزَیْدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَیْلٍ''۔

ترجمہ: ''محدثین اور بعض اصولیین کے نزدیک صحابی وہ ہے، جس نے اسلام کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کی اور اسلام پر وفات پائی یا ملاقات کا یہ شرف اعلان نبوت سے پہلے حاصل ہوا اور اعلان نبوت سے پہلے ملتِ ابراہیمی پر فوت ہوئے، جیسے زید بن عمرو بن نفیل، (رَدُّ الْمُحْتَار عَلَی الدُّرِّ الْمُخْتَار: ج:1، ص:13)''۔

علامہ ابن عابدین شامی، علامہ جلال الدین سیوطی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قَالَ: وَهَلْ یُشْتَرَطُ لَقْیُهٗ فِیْ حَالِ النُّبُوَّةِ اَوْ اَعَمَّ مِنْ ذٰلِكَ، حَتّٰی یَدْخُلَ مَنْ رَاٰهُ قَبْلَهَا وَمَاتَ عَلَی الْحَنِیْفِیَّةِ، کَزَیْدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ نُفَیْلٍ، وَقَدْ عَدَّهٗ ابْنُ مَنْدَة فِی الصَّحَابَةِ، وَکَذَا لَوْ رَاٰهُ قَبْلَهَا، ثُمَّ اَدْرَكَ الْبَعْثَةَ وَاَسْلَمَ وَلَمْ یَرَهٗ''۔

ترجمہ: ''کیا یہ ملاقات اعلان نبوت کے بعد شرط ہے یا یہ عام ہے (یعنی اعلان نبوت سے قبل کی ملاقات کو بھی شامل ہے) حتیٰ کہ اس میں وہ بھی داخل ہو جائیں جنھوں نے اعلان نبوت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا اور ان کی موت دین حنیف پر ہوئی، جیسے زید بن عمرو بن نفیل وغیرہ، ابن مندہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے اور اسی طرح جس نے آپ کو اعلان نبوت سے پہلے دیکھا پھر بعثت کا زمانہ پایا اور اسلام قبول لیکن پھر آپ

کو نہیں دیکھا''۔(رَدُّ الْمُحْتَار عَلَی الدُّرِّ الْمُخْتَار: ج ا ص 13)

حافظ ابن حجر صحابی کی تعریف میں ''مُؤْمِنًا بِہٖ'' کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یَدْخُلُ فِیْ قَوْلِنَا مُؤْمِنًا بِہٖ کُلُّ مُکَلَّفٍ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ''۔

ترجمہ: ''ہمارے اس قول ''وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے والا ہو'' میں جنّ وانس میں سے تمام مکلفین صحابی کی تعریف میں داخل ہوجاتے ہیں''۔

(اَلْاِصَابَہ فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَہ، ج:1، ص:158)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کرنے والے فرشتوں پر صحابیت کے اطلاق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وَأَمَّا الْمَلَائِکَۃُ فَیُتَوَقَّفُ عَدُّھُمْ فِیْھِمْ عَلٰی ثُبُوْتِ بَعْثَتِہٖ اِلَیْھِمْ، فَاِنَّ فِیْہِ خِلَافًا بَیْنَ الْاُصُوْلِیِّیْنَ، حَتّٰی نَقَلَ بَعْضُھُمُ الْاِجْمَاعَ عَلٰی ثُبُوْتِہٖ وَعَکَسَ بَعْضُھُمْ''۔

ترجمہ: ''اور ملائکہ کو صحابہ میں شمار کرنا اس پر موقوف ہے کہ آیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ان کی طرف بھی ہوئی ہے، پس اس مسئلہ میں اصولیین کے درمیان اختلاف ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے''۔

(اَلْاِصَابَہ فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَہ، ج:1، ص:158)

اس کی مزید تفصیل ووضاحت یہ ہے کہ اہلِ علم کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ جنات بھی انسانوں کی طرح مکلف ہیں اور ان میں مومن اور منکر دونوں قسم کے افراد پائے جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جنّات کے حوالے سے اُن کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا: ''وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ ؕ کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا''۔

ترجمہ: ''اور بے شک ہم میں سے بعض نیک ہیں اور بعض دوسری طرح کے، یوں ہم مختلف راہوں پر گامزن ہیں، (الجنّ: 11)''۔

اِس بات پر بھی اہلِ علم متفق ہیں کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ورسالت تمام انسانوں کے لیے ہے، اِسی طرح آپ جنات بلکہ فرشتوں اور تمام مخلوقاتِ الٰہیہ کے بھی

رسول ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ''۔

ترجمہ: ''بہت ہی بابرکت ہے وہ ذات، جس نے اپنے مکرّم بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈر سنانے والے ہوں، (الفرقان:1)''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ''أُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً''، ترجمہ: مجھے تمام مخلوق کی جانب رسول بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ اس حدیث میں اگرچہ صرف ''اَلْخَلْق'' کا عموم ہی انسان وجنات اور ملائکہ سمیت تمام مخلوقات کو شامل تھا، اس کے باوجود لفظِ ''كَافَّةً'' کا اضافہ کر کے اس بات کو واضح اور مستحکم کر دیا گیا کہ لفظ ''اَلْخَلْق'' اپنے کامل عموم پر باقی ہے اور اِس سے کوئی مخلوق خارج نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ارشاد فرماتے ہیں:

''قَالَ لِمُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: وَمَا أَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ، فَأَرْسَلَهٗ اِلَى الْاِنْسِ وَالْجِنِّ''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق فرمایا: ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تمام انسان وجنات کے لیے رسول بنایا ہے، (المعجم الکبیر:11610)''۔

لہٰذا وہ انسان وجنات جنہوں نے ایمان کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کی، وہ آپ کے صحابہ میں داخل ہیں اور اُن کی جانب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ورسالت ارسالِ تکلیفی ہے اور وہ شریعت کے فروعی احکام کے مکلف ہیں۔

شیخ ابو محمد علی بن احمد ابن حزم اُندلسی قرطبی متوفی 456ھ لکھتے ہیں:

''وَقَدْ نَصَّ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى أَنَّ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ آمَنُوْا وَسَمِعُوا الْقُرْآنَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهُمْ صَحَابَةٌ وَفُضَلَاءُ''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ جنات کا ایک گروہ ایمان لایا اور اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قرآن کریم کو سُنا، پس وہ صحابہ اور فضلاء ہیں''۔

(اَلْمُحَلّٰى بِالْآثَار: ج:8، ص:432)

علامہ ابن حجر وعلامہ عینی کے شیخ حافظ زین الدین عبدالرحیم العراقی متوفی 806ھ لکھتے ہیں:

''اَلْجِنُّ مِنْ جُمْلَةِ الْمُكَلَّفِيْنَ الَّذِيْنَ شَمِلَتْهُمُ الرِّسَالَةُ وَالْبَعْثَةُ فَكَانَ ذِكْرُ مَنْ عُرِفَ اسْمُهٗ مِمَّنْ رَآهُ حَسَنًا''۔

ترجمہ: ''جنات من جملہ مکلّفین میں سے ہیں، جنہیں رسالت وبعثت شامل ہے، پس جنات میں جن کا نام معلوم ہوا اُنہیں صحابہ میں ذکر کرنا عمدہ ہے''۔

(اَلتَّقْيِيْدُ وَالْاِيْضَاح، ص:295)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کرنے والے فرشتوں کے حوالے سے عام اہلِ علم کا موقف یہ ہے وہ صحابہ میں داخل نہیں ہیں، جبکہ محققین اہلِ علم نے اُنہیں بھی صحابہ میں داخل مانا ہے، اس اختلاف کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آیا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ورسالت فرشتوں کے لیے ہوئی ہے یا نہیں اور آیا فرشتے احکام شریعت کے مکلف ہیں یا نہیں۔ پس جو اہلِ علم حضرات فرشتوں کو غیر مکلّف اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت ورسالت کو انسان وجنات اور فرشتوں کے لیے عام ماننے کے بجائے فقط انس وجن کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں، اُس کے نزدیک فرشتے صحابہ میں داخل نہیں ہیں۔

چنانچہ علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ مُرْسَلًا إِلَى الْمَلَائِكَةِ''۔

ترجمہ: ''نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرشتوں کی طرف رسول بنا کر مبعوث نہیں کیا گیا، (اَلْاِصَابَه فِي تَمْيِيْزِ الصَّحَابَه: ج:1، ص:158، نَظْمُ الدُّرَرِ فِي تَنَاسُبِ الْآيَاتِ وَالسُّوَرِ: ج:7، ص:72)'' اور وہ اہلِ علم جو فرشتوں کو صحابہ میں داخل مانتے ہیں، اُن کے نزدیک آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت انسان وجنات اور فرشتوں سمیت تمام مخلوقات الٰہیہ کو عام اور شامل ہے اور فرشتے بھی انسان وجنات کی طرح مکلف ہیں، البتہ فرشتوں کا مکلف ہونا انسان وجنات کی طرح نہیں بلکہ اُن کی اپنی شان کے مطابق ہے اور بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ انسان وجنات کی طرف آپ کی بعثت ارسالِ تکلیفی کی نوع سے ہے کہ وہ احکامِ شریعت کے مکلف

ہیں اور فرشتوں کے لیے ارسالِ تشریفی ہے، کہ فرشتوں کی جانب آپ کو مبعوث کر کے فرشتوں کو صحابیت کے شرف سے مشرف کیا گیا۔

علامہ احمد بن محمد صاوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ متوفی 1241ھ لکھتے ہیں:

''رِسَالَتُهٗ عَامَّةٌ لِلْاِنْسِ وَالْجِنِّ وَالْمَلَائِكَةِ وَجَمِيْعِ الْخَلْقِ ،لٰكِنْ اِرْسَالُهٗ لِلْاِنْسِ وَالْجِنِّ اِرْسَالُ تَكْلِيْفٍ اِجْمَاعًا وَاِرْسَالُهٗ لِلْمَلَائِكَةِ قِيْلَ اِرْسَالُ تَكْلِيْفٍ بِمَا يَلِيْقُ بِهِمْ، وَقِيْلَ اِرْسَالُ تَشْرِيْفٍ ،وَاِرْسَالُهٗ لِمَا عَدَاهُمْ مِنَ الْحَيَوَانَاتِ الْغَيْرِ الْعَاقِلَةِ وَالْجَمَادَاتِ اِرْسَالُ تَشْرِيْفٍ وَرَحْمَةٍ''۔

ترجمہ: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت انس وجن ،فرشتوں اور تمام مخلوق کو عام ہے، لیکن انسانوں وجنات کے لیے آپ کا ارسال اجماعاً ارسالِ تکلیف ہے اور فرشتوں کے لیے آپ کے ارسال کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بھی ارسالِ تکلیف ہے اور فرشتے اپنے حال کے لائق مکلف ہیں اور کہا گیا ہے کہ اُن کی طرف آپ کا اِرسال، اِرسالِ تشریف ہے، اور ان کے علاوہ دیگر غیر ذوی العقول حیوانات اور جمادات کے لیے آپ کا ارسال، ارسالِ تشریف ورحمت ہے، (حَاشِيَةُ الصَّاوِيْ عَلَى الْجَلَالَيْنِ، ج:4،ص:77)''۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''رَجَّحَ الشَّيْخُ تَقِيُّ الدِّيْنِ السُّبْكِيُّ أَنَّهٗ كَانَ مُرْسَلًا إِلَيْهِمْ''۔

ترجمہ: ''شیخ تقی الدین سُبکی نے اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرشتوں کی جانب بھی مبعوث کیا گیا تھا، (اَلْاِصَابَه فِيْ تَمْيِيْزِ الصَّحَابَه، ج1 ص158)''۔

علامہ فخر الدین رازی کے قول کا جواب دیتے ہوئے علامہ ابراہیم بن عمر البقاعی متوفی 885ھ فرماتے ہیں:

''امام رازی پر تعجب ہے کہ اُنہوں نے ایسی بات نقل کی ہے جو کہیں اور نہیں پائی جاتی اور اُن کا یہ قول خود اُن کے اپنے دوسرے قول کے معارض ہے، چنانچہ اُنہوں نے اپنی تفسیر میں جہاں بنی آدم کے قابلِ احترام ہونے کی وجوہات تحریر کی ہیں، وہاں اُنہوں نے چوتھی وجہ

یہ بیان کی ہے:

''أَنَّهُ جَعَلَ أَبَاهُمْ رَسُوْلاً إِلَى الْمَلَائِكَةِ، حَيْثُ قَالَ: أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ، وَقَدْ تَقَرَّرَ أَنَّ كُلَّ كَرَامَةٍ كَانَتْ لِنَبِيٍّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ فَلِنَبِيِّنَا ﷺ مِثْلُهَا أَوْ أَعْظَمُ مِنْهَا''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ بنوآدم کے والد حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے لیے رسول بنایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم ان چیزوں کے نام فرشتوں کو بتاؤ۔ اور یہ بات متحقق ہے کہ جو بھی کرامت وخصوصیت انبیاء کرام میں سے کسی نبی کو عطا کی گئی ہے تو اُسی کے مثل یا اُس بڑھ کر کرامت وخصوصیت ہمارے نبی ﷺ کو بھی دی گئی ہے''۔

(نَظْمُ الدُّرَرِ فِي تَنَاسُبِ الْآيَاتِ وَالسُّوَرِ، ج:7،ص:ص72)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''علماء فرماتے ہیں: رسالت والا کا تمام جن وانس کو شامل ہونا اجماعی ہے اور محققین کے نزدیک ملائکہ کو بھی شامل، کَمَا حَقَّقْنَاهُ بِتَوْفِيْقِ اللهِ تَعَالٰى فِي رِسَالَةِ 'اِجْلَالُ جِبْرِيْلَ''۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ حجر وشجر وارض وسماء وجبال وبحار تمام ماسوا اللہ اس کے احاطہ عامہ ودائرۂ تامہ میں داخل اور خود قرآن عظیم لفظ ''عَالَمِيْنَ'' اور روایتِ صحیح مسلم میں لفظ ''خَلْق'' وہ بھی مؤکد بکلمہ ''کَافَّةً''، اس مطلب پر احسن الدلائل طبرانی معجم کبیر میں یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے راوی، حضور سید المرسلین ﷺ فرماتے ہیں: ''مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَعْلَمُ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ إِلَّا كَفَرَةَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ''، ترجمہ: ''کوئی چیز نہیں جو مجھے رسول اللہ نہ جانتی ہو، مگر بے ایمان جن وآدمی، (فتاویٰ رضویہ، ج:30،ص:134)''۔

علامہ غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بلکہ حق یہ ہے کہ فرشتوں کے حق میں آپ کا ارسال صرف ارسالِ تشریف نہیں، ارسالِ تکلیف بھی ہے، فروعِ شریعت کے ساتھ مکلف نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دائرہ تکلیف سے ہی خارج ہوجائیں، حتیٰ کہ آپ کی رسالت کے کسی باب میں محتاج نہ رہیں، بلکہ عرفان الٰہی کے مدارج طے کرنے میں جن وانس کی طرح فرشتوں کو بھی آپ کی رسالت

کی احتیاج ہے، (بشیر القاری، ص125)''۔

(4) علامہ حافظ ابن حجر صحابی کی تعریف میں مذکور قید ''وَمَاتَ عَلَی الْإِسْلَامِ'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وَخَرَجَ بِقَوْلِنَا ''وَمَاتَ عَلَی الْإِسْلَامِ'' مَنْ لَقِیَهٗ مُؤْمِنًا بِهٖ ثُمَّ ارْتَدَّ، وَمَاتَ عَلٰی رِدَّتِهٖ''۔ یعنی وہ اشخاص صحابہ میں داخل نہیں ہیں، جنہوں نے ایمان کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی، لیکن پھر مرتد ہوگئے اور اُن کی موت حالتِ ارتداد میں ہی ہوئی، جیسا کہ عبداللہ بن جحش نے اپنی اہلیہ حضرت اُم حبیبہ کے ہمراہ اسلام قبول کیا تھا اور حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی لیکن پھر وہ مرتد ہوگیا اور نصرانیت پر اُس کی موت واقع ہوئی، اِسی نوع سے عبداللہ بن خطل، ربیعہ بن اُمیہ بن خلف بھی تعلق رکھتے ہیں، کہ یہ بھی اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگئے تھے۔

رہے وہ اشخاص جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد مرتد ہوگئے تھے، لیکن اُنہوں نے پھر دوبارہ اسلام قبول کرلیا تھا اور اسلام پر ہی اُن کی وفات ہوئی تھی، تو آیا ایسے لوگ صحابہ کی جماعت میں شامل ہوں گے یا نہیں، اس حوالے سے تفصیل ہے:

(الف) اگر ارتداد اور تجدیدِ اسلام دونوں ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہو، پس اگر اُس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کرلی ہو، تو وہ بالاجماع صحابی ہیں، جیسا کہ عبداللہ بن ابی سرح، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

''أَمَّا مَنْ رَجَعَ إِلَی الْإِسْلَامِ فِی حَیَاتِهٖ کَعَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِی سَرْحٍ، فَلَا مَانِعَ مِنْ دُخُولِهٖ فِی الصُّحْبَةِ''۔

ترجمہ: ''رہا وہ شخص جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں اسلام کی طرف رجوع کرلیا تھا جیسا کہ عبداللہ بن ابی سرح ہیں، تو اُن کے صحابہ میں داخل ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے، (تَدْرِیبُ الرَّاوِی فِی شَرْحِ تَقْرِیبِ النَّوَوِی: ج:2، ص:668-667)'' اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات نہ کی ہو تو فقہ حنفیہ کے قاعدے کی رُو سے ایسا شخص صحابہ میں

داخل نہیں ہوگا، جبکہ جمہور محدثین اسے بھی صحابہ میں داخل مانتے ہیں۔
(ب) ارتداد و تجدیدِ ایمان دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال فرمانے کے بعد ہوں۔
(ج) ارتداد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں ہو اور تجدید اسلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد ہو، جیسا کہ اَشعث بن قیس دس ہجری میں اپنی قوم کے ہمراہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد مرتد ہو گئے اور پھر حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں اسلام قبول کرلیا۔ مؤخر الذکر صورتوں کے متعلق ایسے شخص کے صحابی ہونے پر اتفاق ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فَلَوِ ارْتَدَّ ثُمَّ عَادَ اِلَی الْإِسْلَامِ لٰكِنْ لَمْ يَرَهُ ثَانِيًا بَعْدَ عَوْدِهٖ فَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَعْدُودٌ فِي الصَّحَابَةِ لِإِطْبَاقِ الْمُحَدِّثِينَ عَلٰى عَدِّ الْاَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ وَنَحْوِهٖ مِمَّنْ وَقَعَ لَهٗ ذٰلِكَ وَإِخْرَاجِهِمْ أَحَادِيثَهُمْ فِي الْمَسَانِيدِ"۔

ترجمہ: "پس اگر وہ مرتد ہوگیا اور پھر اسلام کی طرف لوٹ آیا، لیکن اسلام لانے کے بعد دوبارہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہیں دیکھا تو صحیح بات یہ ہے کہ اُس کا بھی صحابہ میں شمار کیا جائے گا، کیونکہ محدثین کا اَشعث بن قیس اور ان جیسے دیگر اشخاص کے صحابی ہونے پر اتفاق ہے، جو کہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے اور پھر انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اُنہوں نے مسانید میں ان کی احادیث کی تخریج کی ہے، (فتح الباری، ج 7ص 4)"۔

خلاصہ بحث یہ ہے:

(۱) جس نے ایمان کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کی اور ان کی وفات ایمان پر ہوئی، اگر خدانخواستہ درمیان میں مرتد ہو گیا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے توبہ کر کے پھر اسلام قبول کرلیا اور اسلام کی حالت میں وفات ہوئی، وہ صحابی ہے۔
(۲) محدثین کرام کے نزدیک معروف تعریف یہ ہے کہ وہ خوش نصیب جس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت کی ہو، بعض اصولیّین نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے

کہ متابعت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ طویل صحبت اختیار کی ہو، حضرت سعید بن مسیّب نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ایک یا دو برس ایک یا دو غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صحبت رہی ہو، لیکن یہ ضعیف قول ہے، کیونکہ اس قول کی بنیاد پر لازم آئے گا کہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی اور وائل بن حجر ایسے اصحاب صحابیت کی تعریف سے خارج ہو جائیں گے، حالانکہ وہ بالاتفاق صحابی ہیں۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رؤیت یا دیدار سے محض رؤیت عینی مراد نہیں ہے ورنہ نابینا ہونے کے سبب حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم ایسے حضرات صحابیت کی تعریف سے خارج ہو جائیں گے، پس ان کے لیے محض ملاقات اور صحبت کافی ہوگی، کیونکہ وہ رؤیت عینی کے مکلف ہی نہیں ہیں اور یہ بالاتفاق صحابی ہیں، جیسے عدم قدرت کے سبب گونگا شخص نماز میں قراءت لفظی کا مکلّف نہیں ہے۔

(۴) وہ لوگ صحابی نہیں جنہوں نے کفر کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی، پھر آپ کے وصال مبارک کے بعد اسلام قبول کیا، جیسا کہ قیصر کا قاصد۔

(۵) جنات بھی انسانوں کی طرح مکلف ہیں اور ان میں مومن اور منکر دونوں قسم کے افراد ہیں، لہٰذا ان میں سے جنہوں نے حیات ظاہری میں ایمان کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی، وہ صحابی ہیں۔

(۶) اسی طرح ایسے بچے جنہوں نے شیر خوارگی یا بچپن کے لاشعوری دور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا اور ان کے شعوری دور سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال فرمالیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض بچوں کو اپنے لعاب دہن مبارک میں چبائی ہوئی کھجور یا مٹھاس ملا کر گھٹی دی، یہ بچے تبعاً صحابہ میں شمار ہوتے ہیں، کیونکہ بچے اپنے آباء یا اختلاف دین کی صورت میں خیر الآباء کے تابع ہوتے ہیں، لیکن اگر یہ کوئی حدیث بیان کریں تو وہ مرفوع نہیں ہوگی، بلکہ مرسلِ مقبول ہوگی۔

(۷) عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے مجنون، جن کے آباء دونوں یا کوئی ایک مسلمان

تھا، تبعاً مسلمان سمجھے جائیں گے اور ان کی طرف صحابیت کی نسبت کی جا سکے گی۔

(۸) ملائکہ اگرچہ مکلّف نہیں ہیں، لیکن اگر انہوں نے حیات ظاہری میں آپ کی زیارت کی ہے، تو مختار قول کے مطابق وہ بھی صحابہ میں شمار ہوں گے، امام النحو علامہ غلام جیلانی کی توجیہ کے مطابق وہ صحابی کہلائے جا سکتے ہیں، اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ ملائک تو معصوم ہیں، انہیں نسبت صحابیت سے کیا فیض متوقع ہو سکتا ہے، اس کی بابت علامہ غلام جیلانی میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا: ''ان کے درجات بلند ہو سکتے ہیں''۔

(۹) صحابیت کی نسبت کا تعلق صرف ذوی العقول سے ہوتا ہے، غیر ذوی العقول، جیسے جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ جن سے حیات ظاہری میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واسطہ پڑا، آپ کی نسبت سے متبرک ہوں گے، لیکن ان کی طرف صحابیت کی نسبت نہیں کی جا سکے گی۔

## کیا ورقہ بن نوفل صحابی تھے

**سوال:**

حضرت ورقہ بن نوفل کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ثابت ہے اور بعض روایات میں ان کے ایمان اور تصدیق بالرسالت کا بھی ذکر ہے، تو سوال یہ ہے کہ کیا ان کو بھی صحابیت کا شرف حاصل ہے، (نیاز احمد، جہلم)۔

**جواب:**

ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قُصَیّ القرشی الاسدی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے رشتے میں چچا زاد تھے۔ حضرت ورقہ بن نوفل ایمان لائے تھے یا نہیں اور آیا وہ صحابی ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

علماء کے ایک گروہ کا یہ کہنا ہے کہ حضرت ورقہ، زید بن عمرو بن نفیل کی طرح دین حنیف اور ملت ابراہیمی کے پیروکار رہے تھے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ نے نصرانیت کو اختیار کیا تھا اور وہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ابتدائے وحی کے احوال

بیان کیے گئے ہیں کہ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بت پرستی سے متنفر ہوکر نصرانیت اختیار کی تھی اور ان کے پاس تورات کا علم تھا، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ورقہ مُوَحِّد تھے، بتوں کی عبادت سے متنفر تھے، ملت ابراہیمی کے پیروکار تھے اور انہوں نصرانیت کو اختیار کرلیا تھا، لیکن ان کی وفات نصرانیت پر ہوئی یا اسلام پر اور آیا وہ صحابی ہیں یا نہیں، اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ حضرت ورقہ کی وفات نصرانیت پر ہوئی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث عثمان بن عطاء خراسانی کی سند سے روایت ہے اور علماء حدیث کے نزدیک عثمان ایک ضعیف راوی ہیں، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں: اور ایک روایت میں جو یہ لفاظ آئے ہیں: ''فَمَاتَ وَرَقَةُ عَلٰی نَصرَانِیَّتِہٖ لٰکِن عُثمَانَ ضَعِیف''۔

ترجمہ: ''پس ورقہ کا انتقال دین نصرانیت پر ہوا، لیکن یہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ یہ عثمان بن عطاء خراسانی کی روایت ہے اور انہیں محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، (اَلْاِصَابَة فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَة: ج:6،ص:476)''۔ اس لیے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کی وفات اسلام پر ہی ہوئی ہے اور اس کی تائید ابتدائے وحی والی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا واقعہ سن کر انہوں نے جواب دیا:

''ھٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ نَزَّلَ اللّٰہُ عَلٰی مُوْسٰی، یَا لَیْتَنِیْ فِیْھَا جَذَعًا، لَیْتَنِیْ اَکُوْنُ حَیًّا اِذْ یُخْرِجُكَ قَوْمُكَ''۔

ترجمہ: ''یہ تو وہی ناموس (معزز راز داں فرشتہ) ہے، جسے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی دے کر بھیجا تھا، کاش کہ جب اعلان نبوت کے موقع پر آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکالے گی، میں جوان عمر ہوتا (اور آپ کی مدد کرتا)، (بخاری:3)''۔

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں: ''فَھٰذَا ظَاھِرُہٗ اَنَّہٗ اَقَرَّ بِنُبُوَّتِہٖ''۔ ترجمہ: ''اس کا ظاہری مفہوم یہی

ہے کہ حضرت ورقہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کا اقرار کرلیا تھا''۔

(اَلْاِصَابَۃ فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَۃ: ج:6،ص:675)

علامہ آجری اور علامہ بیہقی حدیث ذکر کرتے ہیں:

''فَقَالَ لَہٗ وَرَقَۃُ: اَبْشِرْ، ثُمَّ اَبْشِرْ، فَاَنَا اَشْھَدُ اَنَّکَ الَّذِیْ بَشَّرَ بِہٖ ابنُ مریم، وَاِنَّکَ عَلٰی مِثْلِ نَامُوْسِ مُوْسٰی، وَاِنَّکَ نَبِیٌّ مُرْسَل، وَاِنَّکَ سَوْفَ تُؤْمَرُ بِالْجِھَادِ بَعْدَ یَوْمِکَ ھٰذَا، وَاِنْ یُّدْرِکْنِیْ ذٰلِکَ لَاُجَاھِدَنَّ مَعَکَ. فَلَمَّا تُوُفِّیَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: لَقَدْ رَاَیْتُ الْقَسَّ فِی الْجَنَّۃِ عَلَیْہِ ثِیَابُ الْحَرِیْرِ، لِاَنَّہٗ آمَنَ بِیْ وَصَدَّقَنِیْ''۔

ترجمہ: ''ورقہ نے جواب میں کہا: بشارت ہو، پھر بشارت ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی نبی ہیں جس کی بشارت عیسیٰ بن مریم نے دی تھی اور آپ کی شریعت موسیٰ کی شریعت کی مانند ہوگی اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ نَبِیٌّ مُرْسَل ہیں اور عنقریب آپ کو جہاد کا حکم دیا جائے گا، اگر میں نے اس وقت کو پالیا تو میں آپ کے ساتھ مل کر جہاد کروں گا، جب وہ فوت ہوگئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں نے ورقہ کو جنت میں ریشمی لباس میں دیکھا، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے میری تصدیق کی تھی''۔

(اَلْاِصَابَۃ فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَۃ: ج:6،ص:675)

علامہ بیہقی نے اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک انقطاع سے صحت اور حجیت میں کچھ خلل نہیں آتا، علامہ علی القاری لکھتے ہیں:

''وَقَالَ اَبُوْ دَاؤدَ: ھٰذَا مُرْسَل: اَیْ نَوْعٌ مُرْسَلٌ وَھُوَ الْمُنْقَطِعُ لٰکِنَّ الْمُرْسَلَ حُجَّۃٌ عِنْدَنَا وَعِنْدَ الْجُمْھُوْرِ''۔

اور ابوداؤد نے کہا: یہ حدیث مرسل یعنی منقطع ہے، جو مرسل کی قسم ہے، لیکن ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک مرسل حجت ہے، (مرقاۃ: ج:1،ص:368)'' اور ایک روایت میں جو الفاظ آئے ہیں: ''فَمَاتَ وَرَقَۃُ عَلٰی نَصْرَانِیَّتِہٖ لٰکِنْ عُثْمَانُ ضَعِیْفٌ''۔ پس ورقہ کا انتقال دین نصرانیت پر ہوا، لیکن یہ روایت ضعیف ہے کہ عثمان بن عطاء خراسانی اس کے

راوی ہیں جن کو علماء نے ضعیف قرار دیا ہے"۔

(اَلْاِصَابَۃُ فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَۃ: ج:6،ص:476)

حضرت ورقہ کے جنتی ہونے کے بارے میں کتب احادیث میں متعدد روایات موجود ہیں، جو ان کے مومن ہونے پر دلالت کرتی ہیں:

"عَنْ عَائِشَۃَ، أَنَّ خَدِیْجَۃَ سَأَلَتْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ وَرَقَۃَ بْنِ نَوْفَلٍ، فَقَالَ: قَدْ رَأَیْتُہٗ فِی الْمَنَامِ، فَرَأَیْتُ عَلَیْہِ ثِیَابُ بَیَاضٍ، فَأَحْسِبُہٗ لَوْ کَانَ مِنْ أَھْلِ النَّارِ، لَمْ یَکُنْ عَلَیْہِ بَیَاضٌ"۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے حضرت ورقہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا: تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں نے ان کو خواب میں اس حال میں دیکھا کہ ان کے جسم پر سفید لباس تھا، میرا گمان ہے (کہ وہ جنتی ہیں) اگر وہ اہل جہنم میں سے ہوتے تو ان کے جسم پر سفید لباس نہ ہوتا، (مسند احمد: 24367)"۔

امام ابویعلیٰ روایت کرتے ہیں:

"عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ: سُئِلَ عَنْ وَرَقَۃَ بْنِ نَوْفَلٍ، قَالَ: أَبْصَرْتُہٗ فِیْ بُطْنَانِ الْجَنَّۃِ عَلَیْہِ سُنْدُسٌ"۔

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حضرت ورقہ کے بارے میں پوچھا گیا: تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں نے ان کو جنت کے نشیب میں ریشمی لباس پہنے دیکھا، (مسند ابی یعلیٰ: 2047)"۔

"عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا: أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَسُبُّوْا وَرَقَۃَ فَإِنِّیْ رَأَیْتُ لَہٗ جَنَّۃً أَوْ جَنَّتَیْنِ"۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ورقہ کو برا نہ کہو، کیونکہ میں نے ان کے لیے ایک جنت یا دو جنتیں دیکھی ہیں، (مستدرک للحاکم: 4211)"۔

الغرض حضرت ورقہ کا ایمان ثابت ہے، لیکن صحابی ہونے میں اختلاف ہے اور علماء کی

ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ حضرت ورقہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت یعنی علانیہ دعوت سے پہلے وفات پا چکے تھے، حدیث میں ہے:

"فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ: هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللهُ عَلٰى مُوسٰى، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعًا، لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ، فَقَالَ رَسُولُ صلى الله عليه وسلم: أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ، قَالَ: نَعَمْ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ، وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا، ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ، وَفَتَرَ الْوَحْيُ"۔

ترجمہ: "یہ تو وہی ناموس (معزز راز داں فرشتہ) ہے، جسے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی دے کر بھیجا تھا، کاش میں آپ کی دعوت کے شروع ہونے پر جوان عمر ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب کہ آپ کی قوم آپ کو اس شہر سے نکال دے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر تعجب سے پوچھا: کیا وہ لوگ مجھ کو نکال دیں گے، ورقہ نے کہا: ہاں جو شخص بھی آپ کی طرح دعوت حق لے کر آیا، اس کے عہد کے لوگوں نے اس سے عداوت کی، اگر میں نے آپ کی دعوت کا زمانہ پایا، تو میں پوری قوت سے آپ کی مدد کروں گا، مگر پھر کچھ عرصہ بعد ورقہ وفات پا گئے اور وحی کا سلسلہ کچھ عرصے تک منقطع رہا، (بخاری:3)"۔

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

"فَهٰذَا ظَاهِرُهُ أَنَّهُ أَقَرَّ بِنُبُوَّتِهِ، وَلٰكِنَّهُ مَاتَ قَبْلَ أَنْ يَدْعُوَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم النَّاسَ إِلَى الْإِسْلَامِ، فَيَكُونُ مِثْلَ بَحِيرَا وَفِي إِثْبَاتِ الصُّحْبَةِ لَهُ نَظَرٌ"۔

ترجمہ: "اس کا ظاہر مفہوم یہی ہے کہ انہوں نے نبوت کا اقرار کیا تھا، لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لوگوں کو دعوت عام دینے سے پہلے وفات پا گئے، تو وہ بَحیرا راہب کی طرح ہو گئے اور ان کی صحابیت کا ثبوت محلِّ نظر ہے، (الاصابۃ: ج:6، ص:475)"۔

مومن یا مسلم اسی شخص کو کہتے ہیں، جس نے دعوت کے بعد اسلام قبول کیا ہو، حضرت ورقہ دعوت سے پہلے انتقال کرنے کے سبب جب مسلم نہیں ہوئے، تو صحابی نہیں ہو سکتے کہ صحابی کی تعریف میں مسلم ہونے کی قید ہے، ہاں اہل فترت میں سے ہیں، جیسے بحیرا راہب

اور دَلَائِلُ النُّبُوَّۃ کی مذکورہ بالا روایت میں ان کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور تصدیق کا جو ذکر ہے، اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ تصدیق دعوت سے پہلے کی ہو، لیکن حضرت ورقہ کی وفات کا سن اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خفیہ دعوت کے بعد فوت ہوئے اور اس صورت میں آپ صحابی ہیں، علامہ حلبی حضرت ورقہ کی سن وفات کے متعلق لکھتے ہیں:

''فَفِی الْإِمْتَاعِ: اَنَّ وَرَقَۃَ مَاتَ فِی السَّنَۃِ الرَّابِعَۃِ مِنَ الْمَبعَثِ''۔

ترجمہ: ''اور'' امتاع'' میں ہے: حضرت ورقہ بعثت کے چوتھے سال وفات پاگئے تھے، (سِیْرَتُ الْحَلْبِیَۃ: ج:1، ص: 357)''۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ورقہ نے خفیہ دعوت کا زمانہ پایا تھا اور ان کی زندگی میں وحی کا نزول تین سال تک موقوف رہنے کے بعد جاری بھی ہوگیا تھا، علامہ حلبی لکھتے ہیں:

''وَفِیْ کَلَامِ صَاحِبِ کِتَابِ الْخَمِیْسِ فِی الصَّحِیْحَیْنِ اَنَّ الْوَحْیَ تَتَابَعَ فِی حَیَاۃِ وَرَقَۃَ وَاَنَّہٗ آمَنَ بِہٖ''۔

ترجمہ: ''اور کتاب الخمیس کے مصنف کے قول کے مطابق صحیحین میں ہے: ورقہ کی زندگی میں نزول وحی کا سلسلہ (انقطاع کے بعد) دوبارہ شروع ہوگیا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے تھے، (سِیْرَتُ الْحَلْبِیَۃ: ج:1، ص:359)''۔

پس یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نے علانیہ دعوت کا زمانہ بھی پایا ہے، چنانچہ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

''عَنْ عُرْوَۃَ بنِ الزُّبَیْرِ، قَالَ: کَانَ بِلَالٌ لِجَارِیَۃٍ مِنْ بَنِیْ جُمَحٍ، وَکَانُوا یُعَذِّبُوْنَہٗ بِرَمْضَاءِ مَکَّۃَ یَلْصِقُوْنَ ظَھْرَہٗ بِالرَّمْضَاءِ لِکَیْ یُشْرِكَ، فَیَقُوْلُ: أَحَدٌ، اَحَدٌ، فَیَمُرُّ بِہٖ وَرَقَۃُ وَھُوَ عَلٰی تِلْكَ الحَالِ، فَیَقُوْلُ: اَحَدٌ اَحَدٌ یَا بِلَالُ، وَاللّٰہِ لَئِنْ قَتَلْتُمُوْہُ لَاَتَّخِذَنَّہٗ حَنَّانًا، وَھٰذَا مُرسَلٌ جَیِّدٌ، یَدُلُّ عَلٰی اَنَّ وَرَقَۃَ عَاشَ إِلٰی اَنْ دَعَا النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِلَی الْإِسْلَامِ حَتّٰی اَسْلَمَ بِلَالٌ وَالْجَمْعُ بَیْنَ ھٰذَا وَبَیْنَ حَدِیْثِ عَائِشَۃَ أَنْ یُّحْمَلَ قَوْلُہٗ: وَلَمْ یَنْشَبْ وَرَقَۃُ اَنْ تُوُفِّیَ، اَیْ قَبْلَ اَنْ یَّشْتَھِرَ الإِسلَامُ وَیُؤْمَرَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِالْجِھَادِ''۔

ترجمہ: حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: حضرت بلال بنی جمح کے مظالم کا شکار تھے اور وہ انہیں مکہ کی شدید دھوپ میں گرم زمین پر لٹا کر اذیت دیتے تھے تاکہ وہ اسلام چھوڑ کر مشرک ہو جائیں، پس بلال ''احد احد'' کہتے تھے، اس حال میں حضرت ورقہ کا ان کے پاس سے گزر ہوتا، تو وہ کہتے: اے بلال ''احد، احد'' اور کفار سے کہتے: بخدا اگر تم نے ان کو قتل کر دیا تو میں اس کی قبر کو برکت حاصل کرنے کی جگہ بنا دوں گا اور یہ حدیث عمدہ مرسل ہے اور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ورقہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسلام کی طرف دعوت عام تک زندہ رہے، حتیٰ کہ بلال اسلام لائے اور اس حدیث اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے: ''حضرت ورقہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور وفات پاگئے''، اس قول کو اس پر محمول کریں گے کہ اسلام کے مشتہر ہونے اور جہاد کا حکم آنے سے پہلے وہ فوت ہو گئے، (اَلْاِصَابَۃُ فِیْ تَمْیِیْزِ الصَّحَابَۃ: ج:۶، ص۴۷۶)''۔

اور حضرت بلال کو اذیت دینے کا عمل علانیہ دعوت کے بعد شروع ہوا تھا، علامہ حلبی ان کی صحابیت کے بارے تصریح کرتے ہیں:

''وَحَیْثُ أَدْرَكَ الرِّسَالَۃَ فَقَدْ أَسْلَمَ، وَحِیْنَئِذٍ یَکُوْنُ صَحَابِیًّا''۔

ترجمہ: ''اور جب دعوت عام کا زمانہ پایا تو مسلمان ہوئے اور جب اسلام ثابت ہو گیا تو اس صورت میں صحابی ہو گئے، (سِیْرَتُ الْحَلَبِیَۃ: ج:1، ص: 360)''۔

مندرجہ بالا تمام روایات کی روشنی میں خلاصہ کلام یہ ہے حضرت ورقہ بن نوفل کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) آپ کی وفات دین نصرانیت پر ہوئی، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

(۲) آپ کی وفات ایمان واسلام پر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت عام سے پہلے ہوئی اوران کے حسن عاقبت کی بشارات احادیث اور روایات میں موجود ہیں اور یہ قول یقیناً راجح ہے علامہ ابن حجر نے صحابیت کے قول کے بارے میں کہا: یہ محل نظر ہے۔

(۳) انہوں نے دعوت عام کا ابتدائی دور پایا ہے، حضرت بلال کا واقعہ اس پر شاہد ہے، لہٰذا

وہ صحابی ہیں، علامہ حلبی، علامہ طبری، علامہ بغوی اور ابن السکن اسی کے قائل ہیں شارح بخاری علامہ غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے نعمۃ الباری فی شرح البخاری: ج:۱، ص:۷۔۱۳ میں تمام اقوال نقل کردیے ہیں لیکن صحابیت کے قول کو راجح قرار دینے کی بابت کوئی تصریح نہیں کی اور نہ اسے رد کیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ حاصل کلام یہ کہ جہاں کسی مسئلے کے بارے میں ایک سے زائد اقوال ہوں اور کسی ایک کو اختیار کرنے سے کوئی شرعی خرابی لازم نہ آئے، وہاں مسئلے کے تمام پہلوؤں کی نشاندہی کرکے کسی ایک قول کو قطعی اور حتمی قرار دینے کے بجائے اہلِ علم پر چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ کبھی مقابلہ حق اور باطل یا صحیح اور غلط میں ہوتا ہے اور کبھی بہ اور بہتر میں یا راجح اور مرجوح میں ہوتا ہے۔

## ملک الموت کا کیا نام ہے

**سوال:**

ملک الموت کا کیا نام ہے؟، (منور احمد، ملیر کراچی)۔

**جواب:**

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ''۔

ترجمہ: ''آپ کہیے: تمہیں موت کا فرشتہ وفات دیتا ہے جو تم پر مقرر ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے، (السجدہ: 11)''۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وَاَمَّا مَلَكُ الْمَوْتِ فَلَیْسَ بِمُصَرَّحٍ بِاسْمِهٖ فِی الْقُرْاٰنِ وَلَا فِی الْاَحَادِیْثِ الصِّحَاحِ وَقَدْ جَاءَ تَسْمِیَتُهٗ فِیْ بَعْضِ الْاٰثَارِ بِعِزْرَائِیْلَ''۔

ترجمہ: ''ملک الموت کا نام قرآن اور صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوا، البتہ بعض آثار میں اُن کا نام عزرائیل آیا ہے، (البدایہ والنہایہ، ج:1، ص:49)''۔

السجدہ: 11 کی تفسیر میں مزید لکھتے ہیں:

"وَقَدْ سُمِّيَ فِي بَعْضِ الْآثَارِ بِعِزْرَائِيلَ وَهُوَ الْمَشْهُوْرُ، قَالَهُ قَتَادَةُ وَغَيْرُ وَاحِدٍ وَلَهُ أَعْوَانٌ"۔

ترجمہ: "بعض آثار میں اُن کا نام عزرائیل آیا ہے اور یہی مشہور ہے اور قتادہ اور کئی محدثین نے کہا: اُن کے مددگار (دیگر فرشتے) بھی ہوتے ہیں، (تفسیر ابن کثیر، ج: 6 ص: 322)"۔ حضرت عزرائیل کے تحت قبضِ ارواح کے شعبے سے اور بھی فرشتے وابستہ ہیں۔

علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالَّذِي ذَهَبَ إِلَيْهِ الْجُمْهُوْرُ أَنَّ مَلَكُ الْمَوْتِ لِمَنْ يَّعْقِلُ وَمَا لَا يَعْقِلُ مِنَ الْحَيَوَانِ وَاحِدٌ وَهُوَ عِزْرَائِيْلُ وَمَعْنَاهُ عَبْدُ اللهِ"۔

ترجمہ: "جمہور کا قول یہ ہے کہ ذی عقل اور غیر ذی عقل جانداروں کے لیے ملک الموت ایک ہی ہیں اور وہ عزرائیل ہیں اور عزرائیل کے معنی ہیں: اللہ کا بندہ"۔

(روح المعانی، ج: 11، ص: 124)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ سَابِطٍ: تَدْبِيْرُ أَمْرِ الدُّنْيَا إِلٰى أَرْبَعَةٍ، جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَمَلَكِ الْمَوْتِ وَاسْمُهُ عِزْرَائِيْلُ وَإِسْرَافِيْلَ، فَأَمَّا جِبْرِيْلُ فَمُوَكَّلٌ بِالرِّيَاحِ وَالْجُنُوْدِ، وَأَمَّا مِيْكَائِيْلُ فَمُوَكَّلٌ بِالْقَطْرِ وَالنَّبَاتِ، وَأَمَّا مَلَكُ الْمَوْتِ فَمُوَكَّلٌ بِقَبْضِ الْأَنْفُسِ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، وَأَمَّا إِسْرَافِيْلُ فَهُوَ يَنْزِلُ بِالْأَمْرِ عَلَيْهِمْ، وَلَيْسَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ أَقْرَبُ مِنْ إِسْرَافِيْلَ، وَبَيْنَهُ وَبَيْنَ الْعَرْشِ مَسِيْرَةُ خَمْسِمِائَةِ عَامٍ"۔

ترجمہ: "عبدالرحمٰن بن سابط نے کہا: دنیا کے (تکوینی) امور کی تدبیر چار فرشتوں کے ذمے ہے، (وہ ہیں:) جبریل، میکائیل اور ملک الموت اور اُن کا نام عزرائیل ہے اور اسرافیل علیہم السلام، جبریل ہواؤں اور لشکروں پر مقرر ہیں اور میکائیل بارش اور نباتات پر مقرر ہیں اور ملک الموت برّ و بحر میں روحیں قبض کرنے پر مقرر ہیں اور اسرافیل ان فرشتوں پر (اللہ کا

حکم لے کر نازل ہوتے ہیں اور ملائکہ میں سب سے زیادہ (عرش کے) قریب اسرافیل ہیں اور اُن کے اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

(تفسیر قرطبی، ج:19، ص:194)

مذکورہ بالا مفسرین کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کریم واحادیث صحیحہ میں ملک الموت کا نام مذکور نہیں ہے، البتہ بعض آثارِ صحابہ وتابعین میں ملک الموت کا نام عزرائیل آیا ہے اور جمہور کے نزدیک یہی معروف ومشہور ہے۔

# طہارت کے مسائل

## ٹھوس نجاست سے آلودہ خشک زمین کا حکم

**سوال:**

زمین پر ٹھوس نجاست لگ گئی، پھر وہ نجاست خشک ہوگئی، کیا اب اس پر تیمم کیا جاسکتا ہے، (حیدر علی)۔

**جواب:**

زمین پر کوئی ٹھوس نجاست گری، جیسے: انسان کا براز (پاخانہ)، جانور کی گوبر وغیرہ اور خشک ہوگئی، اگر وہ ٹھوس نجاست وہاں موجود ہے تو اس سے تیمم نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ عین نجاست ہے، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْاَرْضُ إِذَا أَصَابَتْهَا النَّجَاسَةُ فَيَبِسَتْ وَذَهَبَ أَثَرُهَا لَايَجُوْزُ التَّيَمُّمُ بِهَا، كَذَا فِيْ ''فَتَاوٰى قَاضِيْ خَان''۔

ترجمہ: ''زمین کو نجاست پہنچی اور خشک ہوگئی اور اس کا اثر زائل ہوگیا، (تب بھی) اس سے تیمم جائز نہیں ہے، ''فتاویٰ قاضی خان'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:1، ص:26)''۔ ایسی جگہ پر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اگر کسی انسان یا جانور نے پیشاب کیا اور سورج کی گرمی سے وہ زمین خشک ہوگئی ہو، تو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ مائع (Liquid) کا ٹھوس وجود نہیں ہوتا اور وہ دھوپ کی حرارت سے بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''فَتَاوٰى الْحُجَّةِ'' میں ہے: کپڑے کو جسم رکھنے والی نجاست پہنچی اور خشک ہوگئی تو رگڑنے سے پاک ہوجاتا ہے، جس طرح موزہ پاک ہوجاتا ہے، ''مضمرات'' میں اسی طرح ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے: زمین خشک ہونے اور نجاست کا اثر زائل ہونے سے نماز کے لیے پاک ہوجاتی ہے، تیمم کے لیے نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دھوپ سے خشک ہوئی یا آگ سے یا ہوا اور سائے سے، ''کافی'' اور ''البحر الرائق'' میں اسی طرح

ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:1، ص:44)‘‘۔

## طہارت کا ایک مسئلہ

**سوال:**

کموڈ استعمال کرتے وقت پاکی کیسے حاصل کریں، نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

(غلام مرتضیٰ، لاہور)

**جواب:**

استنجا کرنے کے لیے کموڈ استعمال کرنا درست ہے، کموڈ پر بیٹھتے وقت آدمی کے بدن کا جو حصہ کموڈ سے مس کرتا ہے، اگر اس پر ناپاک چھینٹے ہوں تو ٹشو پیپر یا کسی چیز سے اسے خشک کر لیں۔ کموڈ ایسے اجزا سے بنا ہوتا ہے جو مسام دار نہیں ہوتے اور اس میں پانی جذب نہیں ہوتا، اس لیے اگر اس پر بالفرض ناپاک قطرے ہوں تو ٹشو سے خشک کرنے سے وہ صاف ہو جاتا ہے۔ استنجا پانی سے کیا جا سکتا ہے، کیونکہ آج کل مسلم شاور دستیاب ہیں اور صفائی میں مبالغے اور احتیاط کے لیے ٹشو پیپر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ مسجد قبا والوں کے لیے قرآن کریم میں تعریفی کلمات آئے ہیں، فرمایا:

’’لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ‘‘۔

ترجمہ: ’’البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے روز سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے مرد ہیں جو خوب پاکیزہ ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ زیادہ پاکیزگی حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، (التوبہ:108)‘‘۔

حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ’’اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم أَتَاهُمْ فِي مَسْجِدِ قُبَاءَ فَقَالَ: إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَدْ أَحْسَنَ عَلَيْكُمُ الثَّنَاءَ فِي الطُّهُورِ فِي قِصَّةِ مَسْجِدِكُمْ، فَمَا هٰذَا الطُّهُورُ الَّذِي تَطَّهَّرُونَ بِهِ، قَالُوا: وَاللهِ يَا رَسُولَ اللهِ! مَا نَعْلَمُ شَيْئًا إِلَّا أَنَّهُ كَانَ لَنَا جِيرَانٌ مِنَ الْيَهُودِ، فَكَانُوا يَغْسِلُونَ أَدْبَارَهُمْ مِنَ الْغَائِطِ فَغَسَلْنَا كَمَا

غَسَلُوا"۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے اہل قبا سے فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے سنا کہ وہ تمہاری پاکیزگی حاصل کرنے کی تعریف فرماتا ہے، تم کس طرح پاکیزگی حاصل کرتے ہو، انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! ہمیں اور کسی چیز کا پتا نہیں، لیکن ہم نے دیکھا کہ ہمارے یہودی پڑوسی براز سے فارغ ہونے کے بعد پانی سے استنجا کرتے ہیں، پس ہم بھی اس طرح کرتے ہیں، (مسند احمد: 15485)"۔

(2) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: یہ آیت (التوبہ: 108) اہل قبا کے متعلق نازل ہوئی ہے، وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے تو ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی، (سنن ترمذی: 3100)"۔

## وضو کے بارے میں ایک پیچیدہ مسئلہ

**سوال:**

میں نے سنا ہے کہ پیشاب کی جگہ یعنی شرمگاہ سے گیس خارج ہوتی ہے اور وضو ٹوٹ جاتا ہے، اگر ایسا ہے تو میرے ساتھ یہ سلسلہ بہت زیادہ ہے اور نماز کی حالت میں بہت زیادہ ہوتا ہے، میرے لیے اس بارے میں کیا حکم ہے؟، (جاوید اقبال، لاہور)

**جواب:**

ریح کے خارج ہونے سے وضو فقط اُسی صورت میں ٹوٹتا ہے، جب وہ پچھلے مقام سے خارج ہو اور اس سے بھی وضو تب ٹوٹتا ہے جب اُس کے خارج ہونے کا یقین ہو، محض ظن وگمان کی وجہ سے وضو ختم نہیں ہوتا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الْمَسْجِدِ فَوَجَدَ رِيحًا بَيْنَ أَلْيَتَيْهِ فَلَا يَخْرُجْ حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا"۔

ترجمہ: "جب تم میں سے کوئی مسجد میں ہو اور وہ اپنے پچھلے مقام سے ریح کا خارج ہونا

محسوس کرے تو وہ مسجد سے نہ نکلے یہاں تک کہ اس کی آواز سُن لے یا بدبو محسوس کرے"۔ (صحیح مسلم:362، سنن ترمذی:75)

اِس حدیث میں جو فرمایا کہ جب تک ریح کے خارج ہونے کی آواز نہ سُن لی جائے یا بو محسوس نہ ہو جائے تو اس وقت تک مسجد سے نہ نکلا جائے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریح خارج ہونے کی صورت میں وضو کا ٹوٹنا اُس کی آواز سننے یا بُو کے پائے جانے سے مشروط ہے، بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کو جب تک اپنے وضو ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے، اُس وقت تک وہ مسجد سے نہ نکلے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَقَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ: إِذَا شَكَّ فِي الْحَدَثِ، فَإِنَّهُ لَا يَجِبُ عَلَيْهِ الْوُضُوْءُ حَتّٰى يَسْتَيْقِنَ اسْتِيقَانًا يَقْدِرُ أَنْ يَحْلِفَ عَلَيْهِ"۔

"عبداللہ بن مبارک نے کہا: اس پر وضو واجب نہیں ہے تاوقتیکہ اسے اس حد تک یقین ہو جائے کہ قسم کھا سکے، (سنن ترمذی، تحت حدیث:75)"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ"، ترجمہ: "جب تم میں سے کسی شخص کی ریح خارج ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ وضو کر لے، (مسند احمد:34)"۔

شرمگاہ کے اگلے حصے سے ریح کے خارج ہونے کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا، چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الرِّيْحُ الْخَارِجَةُ مِنَ الذَّكَرِ وَفَرْجِ الْمَرْأَةِ، فَإِنَّهَا لَا تَنْقُضُ الْوُضُوْءَ عَلَى الصَّحِيْحِ"

ترجمہ: "صحیح قول کے مطابق مرد کے عضوِ تناسل یا عورت کی شرمگاہ سے خارج ہونے والی ریح سے وضو نہیں ٹوٹتا، (البحر الرائق، جلد:1، ص:31)"۔

فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے کہ پچھلے مقامِ سے ریح خارج ہونے کی صورت میں وضو ٹوٹنے کی وجہ یہ نہیں کہ نفسِ ریح ناپاک و نجس ہے، کیونکہ اگر نفسِ ریح کو ناپاک اور نجس قرار

دیا جائے تو پھر شلوار کا ناپاک ہونا لازم آئے گا، حالانکہ اِس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، سو معلوم ہوا کہ نفسِ ریح نجس نہیں ہے، بلکہ اِس کی وجہ سے وضو اس لیے ٹوٹتا ہے کہ یہ نجاست اور گندگی کے مقام سے گزر کر آتی ہے۔ اور وہ ریح جو اگلے مقام سے خارج ہوتی ہے، یہ عام ریح ہے، اس کا تعلق کھانے کے فُضلات، آنت یا پچھلے مقام سے نکلنے والی ریح سے نہیں ہے، یہ محض اختلاج یعنی شرمگاہ کے عضلات اور پٹھوں کی حرکت کی وجہ سے ہوتا ہے، سو اِس لیے یہ ناقض وضو نہیں ہے۔

البتہ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ بعض عورتیں مُفضاۃ ہوتی ہیں، یعنی اُن کے پیشاب اور پاخانے کا مقام یا پیشاب اور ہمبستری کا مقام مل کر ایک ہو جاتے ہیں، اُن کی بابت علامہ ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''پس اگر کسی عورت کی یہ حالت ہو تو جب اُسے اگلے مقام سے ریح نکلتی محسوس ہوئی ہو تو اُسے احتیاطاً وضو کر لینا چاہیے اور بعض فقہائے کرام نے اِس صورت میں وضو کو واجب قرار دیا ہے، چنانچہ امام محمد سے مروی ہے کہ ایسی عورت کے لئے اس صورت میں وضو کرنا واجب ہے اور اسی قول کو احتیاطاً امام ابوحفص نے بھی لیا ہے اور فتح القدیر میں اسی قول کو راجح قرار دیا گیا ہے کیونکہ ہوا اکثر پچھلے مقام سے خارج ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں اگلے راستے سے ہوا کا خروج نہ ہونے کے برابر ہے اور احتیاط بھی اسی میں ہے، لہٰذا غلبہ ظن یقین کے حکم میں ہوگا اور اس صورت میں وضو واجب ہوگا، (البحر الرائق، جلد 1، ص:60)''۔

بعض خواتین کی بڑی آنت میں زخم پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے دُبُر اور بڑی آنت کے درمیان شگاف پیدا ہو جاتا ہے اور اُس میں سے ریح شرمگاہ کی طرف سرایت کرتی ہے، سو اگر ایسی صورتحال ہے تو یہ پچھلے مقام سے خارج ہونے والی ریح کے حکم میں ہے، صرف اتنی بات ہے کہ یہ اپنے فطری مَخرج کے علاوہ سے خارج ہوئی ہے، اِس کے لیے ماہر امراضِ نسواں لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ کرا لیا جائے اور اللہ نہ کرے اگر ایسی ہی صورتحال ہے تو پھر اِس ریح کے خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

# نماز کے مسائل

## نمازی کا اپنے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کا حکم

**سوال:**

جو نمازی کے آگے سے گزرے، اس کو کس طرح اور کون کون روک سکتا ہے، اس سے جہاد کس طرح ثابت ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نمازی سامنے گزرنے والے پر اپنا ہاتھ بھی استعمال کر سکتا ہے، (سلمان لودھی)۔

**جواب:**

اگر نمازی کے سامنے سُترہ قائم نہیں اور کوئی شخص گزرنا چاہتا ہے یا سُترہ ہے، مگر وہ شخص نمازی اور سُترہ کے درمیان سے گزرنا چاہتا ہے تو نمازی کو رخصت ہے کہ اُسے گزرنے سے روکے، خواہ سبحان اللہ کہے یا (مغرب، عشاء اور فجر میں) جہر سے قراءت کرے یا ہاتھ یا سر یا آنکھ کے اشارے سے منع کرے، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں مثلاً کپڑا پکڑ کر جھٹکنا یا مارنا، اگر کوئی ایسا عمل کیا جو عملِ کثیر میں شمار ہوتا ہے تو نماز جاتی رہی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب باندھا: "بَابٌ يَرُدُّ الْمُصَلِّيْ مَنْ مَّرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ" (نمازی اپنے سامنے سے گزرنے والے کو ہٹائے) پھر اس باب کے تحت ایک تعلیق بیان فرمائی: "وَرَدَّ ابْنُ عُمَرَ فِي التَّشَهُّدِ وَفِي الْكَعْبَةِ، وَقَالَ إِنْ أَبَى إِلَّا أَنْ تُقَاتِلَهُ فَقَاتِلْهُ" (اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کعبہ میں اپنی نماز کے تشہد میں سامنے سے گزرنے والے کو دور کیا اور فرمایا: اگر گزرنے والا بغیر لڑائی کے باز نہ آئے تو اس سے لڑو، صحیح بخاری: کتاب الصلاۃ)"۔

(1): "عَنْ نَّافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: لَا تَدَعْ أَحَدًا يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْكَ وَأَنْتَ تُصَلِّيْ، فَإِنْ أَبَى إِلَّا أَنْ تُقَاتِلَهُ فَقَاتِلْهُ"۔

ترجمہ: "حضرت نافع بیان کرتے ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو شخص نماز میں تمہارے سامنے سے گزرے اس کو مت چھوڑو، اگر وہ لڑائی کے بغیر باز نہ آئے تو اس سے

لڑو، (مُصنّف عبدالرزاق: 2325)"۔

(2) "عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ قَالَ: مَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيِ ابْنِ عُمَرَ، وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ، فَارْتَفَعَ مِنْ قُعُودِهِ، ثُمَّ دَفَعَ فِي صَدْرِي"۔

ترجمہ: "عمرو بن دینار بیان کرتے ہیں: میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے سے گزرا، وہ نماز کے قعدے میں تھے، وہ قعدے سے کھڑے ہوگئے، پھر مجھے دھکا دیا"۔

(مُصنّف ابن ابی شیبہ: 2921)

(3) "حَدَّثَنَا أَبُو صَالِحٍ السَّمَّانُ، قَالَ: رَأَيْتُ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ يُصَلِّي إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ شَابٌّ مِنْ بَنِي أَبِي مُعَيْطٍ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَدَفَعَ أَبُو سَعِيدٍ فِي صَدْرِهِ، فَنَظَرَ الشَّابُّ فَلَمْ يَجِدْ مَسَاغًا إِلَّا بَيْنَ يَدَيْهِ، فَعَادَ لِيَجْتَازَ، فَدَفَعَهُ أَبُو سَعِيدٍ أَشَدَّ مِنَ الْأُولَى، فَنَالَ مِنْ أَبِي سَعِيدٍ، ثُمَّ دَخَلَ عَلَى مَرْوَانَ، فَشَكَا إِلَيْهِ مَا لَقِيَ مِنْ أَبِي سَعِيدٍ، وَدَخَلَ أَبُو سَعِيدٍ خَلْفَهُ عَلَى مَرْوَانَ، فَقَالَ: مَا لَكَ وَلِابْنِ أَخِيكَ يَا أَبَا سَعِيدٍ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَلْيَدْفَعْهُ فَإِنْ أَبَى فَلْيُقَاتِلْهُ فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ"۔

ترجمہ: "ابوصالح السّمّان بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن کسی چیز کو لوگوں سے سُترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے، بنو ابی مُعَیط کے ایک نوجوان نے ان کے سامنے سے گزرنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابوسعید نے اس کے سینے پر دھکا دیا، اس نوجوان نے ادھر اُدھر دیکھا، مگر اس نے حضرت ابوسعید کے سامنے کے علاوہ کوئی جگہ نہ پائی، وہ دوبارہ ان کے سامنے سے گزرنے لگا، حضرت ابوسعید نے اُس کو پہلی بار سے زیادہ زور سے دھکا دیا، اس نے حضرت ابوسعید سے تکلیف اٹھائی، اس نے مروان کے پاس جا کر حضرت ابوسعید سے پہنچنے والی تکلیف کی شکایت کی، حضرت ابوسعید بھی اس کے پیچھے پیچھے مروان کے پاس آئے، مروان نے کہا: اے ابوسعید! آپ کے اور آپ کے بھتیجے کے

درمیان کیا معاملہ ہوا؟، انہوں نے بیان کیا: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز کو لوگوں سے سُترہ بنا کر نماز پڑھے، پھر کوئی شخص اس کے سامنے سے گزرنے کا ارادہ کرے، تو وہ اس کو دفع کرے، اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے لڑے کیونکہ وہی شخص شیطان ہے، (صحیح بخاری: 509)''۔

علامہ ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَيَدْرَأُ الْمَارَّ إِذَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ سُتْرَةٌ أَوْ مَرَّ بَيْنَهُ وَبَيْنَ السُّتْرَةِ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: إِدْرَءُوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ وَيَدْرَأُ بِالْإِشَارَةِ كَمَا فَعَلَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِوَلَدَيْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَوْ يَدْفَعُ بِالتَّسْبِيْحِ''۔

ترجمہ: ''جب نمازی کے سامنے سُترہ نہ ہو اور کوئی اس کے سامنے سے گزرے یا اس کے سامنے سُترہ ہو اور کوئی اس کے اور سُترے کے درمیان سے گزرے تو نمازی اس کو منع کرے اور اس کو اشارے سے منع کرے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے دو بچوں کے ساتھ کیا یا سبحان اللہ پڑھ کر ان کو گزرنے سے منع کرے۔

(ہدایہ، جلد 1، ص: 274)

علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَهُوَ مَا فِي أَبِيْ دَاوُدَ إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ شَيْئًا، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنْصِبْ عَصًا وَإِنْ لَمْ يَكُنْ مَعَهُ عَصًا فَلْيَخُطَّ خَطًّا وَلَا يَضُرُّهُ مَا مَرَّ أَمَامَهُ، وَاخْتَارَ الْمُصَنِّفُ الْأُوْلٰى وَالسُّنَّةُ أَوْلٰى بِالْاِتِّبَاعِ''۔

ترجمہ: ''اور وہ جو ابوداؤد میں روایت ہے: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے، تو اپنے سامنے کوئی چیز رکھ لے اور اگر اور کوئی چیز نہ ملے تو عصا رکھ لے، وہ بھی نہ ہو تو خط کھینچ لے، پھر آگے سے گزرنے والے کی پرواہ نہ کرے''، مُصنّف نے پہلے قول کو اختیار کیا، حدیث کا اتباع کرنا اَولیٰ ہے، (فتح القدیر، جلد 1، ص: 418)''۔

شیخ التفسیر والحدیث علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''یہ حدیث اگرچہ ضعیف اور

مضطرب ہے لیکن اس پر عمل کیا جاسکتا ہے کیونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے، (شرح صحیح مسلم، جلد 1، ص: 1324)''۔

علامہ ابن نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَیَدْرَؤُہٗ إِنْ لَمْ یَکُنْ سُتْرَۃٌ أَوْ مَرَّ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا لِلْأَحَادِیثِ الْوَارِدَۃِ وَھُوَ بِالْإِشَارَۃِ بِالْیَدِ أَوْ بِالرَّأْسِ أَوْ بِالْعَیْنِ أَوْ بِالتَّسْبِیحِ، وَزَادَ الْوَلْوَالِجِیُّ أَنَّہٗ یَکُونُ بِرَفْعِ الصَّوْتِ بِقِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ وَیَنْبَغِیْ أَنْ یَّکُوْنَ مَحَلُّہٗ فِی الصَّلَاۃِ الْجَھْرِیَّۃِ فِیْمَا یُجْھَرُ فِیْہِ مِنْھَا''۔

ترجمہ: ''فقہائے کرام نے کہا: نمازی کے سامنے سُترہ نہیں یا سُترہ ہے اور کوئی شخص نمازی اور سُترہ کے درمیان سے گزرنا چاہتا ہے تو نمازی اس کو گزرنے سے روکے، کیونکہ یہ حکم احادیث میں ہے: وہ ہاتھ کے اشارے سے روکے یا سر سے اشارہ کر کے روکے یا آنکھوں کے اشارے سے روکے یا تسبیح (سبحان اللہ) پڑھے اور ''ولوالجی'' نے یہ اضافہ کیا ہے کہ آواز سے قرآن کی قراءت کرے، بہتر یہ ہے کہ جہری (یعنی فجر، مغرب اور عشاء کی) نماز پڑھ رہا ہو تو اس میں (منفرد) اونچی آواز سے قراءت کرے''۔

(البحر الرائق، جلد 2، ص: 32)

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''آیا نمازی سے آگے گزرنے والے کو دفع کرنا واجب ہے یا مستحب، تو امام نووی نے کہا ہے: یہ امر مستحب ہے اور اس کی تاکید ہے اور میرے علم میں نہیں ہے کہ فقہائے کرام میں سے کسی نے اسے واجب قرار دیا ہے، میں (عینی) کہتا ہوں: اہل ظاہر نے ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے اسے واجب قرار دیا ہے، ہوسکتا ہے امام نووی کو اس کا علم نہ ہو۔۔۔ مزید لکھتے ہیں:

''سامنے سے گزرنے والے کو اپنی جگہ سے آگے چل کر روکنا اگرچہ جائز ہے، لیکن بہتر ہے کہ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے روکے، کیونکہ نماز میں چلنے کا بگاڑ نمازی کے آگے سے گزرنے کے بگاڑ سے زیادہ ہے، لہٰذا اس کے لیے اتنا ہی دفع کرنا مباح ہے جتنا کہ وہ اپنی

جگہ کھڑے کھڑے کر سکے اور اگر گزرنے والا فاصلے پر ہے اور نمازی اپنی جگہ کھڑے کھڑے نہیں روک سکتا تو اشارے سے روکے یا سبحان اللہ کہے، دونوں طریقے اختیار نہ کرے، (عمدۃ القاری، ج:4،ص:426)"۔

الغرض حدیثِ مبارک میں نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو روکنے کے لیے لڑنے کے الفاظ اس مسئلے کی شدت کو بیان کرنے کے لیے ہیں، عملاً ایسا نہیں کرنا چاہیے اور عملِ کثیر ویسے ہی مُفسدِ نماز ہے، البتہ اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والا ہاتھ کی پہنچ میں ہے تو ایک ہاتھ بڑھا کر اسے روک سکتا ہے۔

## نمازِ جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

### سوال:

نمازِ جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

(انعام الحق، لاہور)

### جواب:

احادیثِ مبارکہ میں جمعۃ المبارک کے دن قبولیتِ دعا کی ایک ساعت بتائی گئی ہے، اس کے بارے میں روایات یہ ہیں:

(۱) "عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: فِيهِ سَاعَةٌ، لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي، يَسْأَلُ اللهَ تَعَالَى شَيْئًا إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن کا ذکر کیا اور فرمایا: اس میں ایک ایسی ساعت ہے کہ جو مسلمان بندہ اس ساعت کو پالے اور وہ اس ساعت میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز عطا فرما دیتا ہے اور آپ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ ساعت بہت تھوڑی ہے، (صحیح بخاری:935)"۔

(۲) ''عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ فِیْ شَانِ سَاعَةِ الْجُمُعَةِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: هِیَ مَا بَیْنَ أَنْ یَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلٰی أَنْ تُقْضَی الصَّلَاةُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن دعا کی قبولیت کی ساعت کے بارے میں بیان کرتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: یہ ساعت امام کے (منبر پر) بیٹھنے سے لے کر نماز کے اختتام تک ہے، (صحیح مسلم: 853)''۔

(۳) ''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ یَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ: إِذَا دَخَلَ أَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ وَالْإِمَامُ عَلَی الْمِنْبَرِ، فَلَا صَلَاةَ وَلَا کَلَامَ، حَتّٰی یَفْرُغَ الْإِمَامُ''۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو بیان کرتے ہوئے سنا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو اور امام (خطبے کے لیے) منبر پر بیٹھ چکا ہے، تو نہ نماز پڑھی جائے اور نہ کلام کیا جائے، یہاں تک کہ امام نماز سے فارغ ہو جائے (یعنی توجہ سے خطبہ سنا جائے)، (المعجم الکبیر للطبرانی: 13708)''۔ایک روایت بعد نماز عصر کی بھی ہے۔

(۴) ''عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَ قَالَ: إِنِّیْ لَأَرْجُوْ أَنْ تَکُوْنَ السَّاعَةُ الَّتِیْ فِی الْجُمُعَةِ إِحْدٰی هٰذِهِ السَّاعَاتِ إِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ أَوِ الْإِمَامُ عَلَی الْمِنْبَرِ أَوْ عِنْدَ الْإِقَامَةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: مجھے امید ہے کہ جمعہ کے دن (دعا کی قبولیت) کی ساعت ان تین میں سے ایک ہے: جب موذن اذان دے یا امام منبر پر ہو یا اقامت کے وقت، (مصنف ابن ابی شیبہ: 5466)''۔

لہٰذا دو خطبوں کے درمیان امام دعا کر سکتا ہے اور مقتدی بھی دل میں یا آہستہ آواز میں دعا کر سکتے ہیں۔

امام ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''قاضی عیاض نے کہا: دو خطبوں کے درمیان جلسے میں دعا مقبول ہے اور حاضرین کے لیے اس جلسے میں دعا میں مشغول رہنا سنت ہے، کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ اس وقت دعا مقبول ہوتی ہے اور مقتدی آہستہ دعا کریں، کیونکہ اونچی آواز سے دعا کرنے میں

دوسروں کی توجہ بٹے گی اور آہستہ دعا کرنا افضل ہے، سوا اس کے کہ کوئی امر عارض ہو"۔

(الفتاویٰ الفقهية الكبرىٰ، ج:1،ص:252)

شیخ محمد بن صالح ابن عثیمین لکھتے ہیں:

ترجمہ:"دو خطبوں کے درمیان دعا خیر اور مستحب ہے، کیونکہ یہ قبولیتِ دعا کا وقت ہے، پھر انہوں نے صحیح مسلم کی مندرجہ بالا حدیث کا حوالہ دیا اور کہا: جہاں تک رفع یدین کا سوال ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ دعا کے آداب میں سے رفع یدین ہے، سو کوئی دعا کے وقت ہاتھ اٹھائے تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر نہ اٹھائے تو بھی حرج نہیں ہے، دو خطبوں کے درمیان کوئی مخصوص دعا یا ذکر وارد نہیں ہے، لیکن انسان اپنی پسندیدہ کوئی بھی دعا کر سکتا ہے، کیونکہ حدیث کی رُو سے یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔

(فتاویٰ نور علی الدرب، صلاة الجمعة)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطورِ خاص دو خطبوں کے درمیان ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت نہیں ہے، لیکن فی نفسہٖ دعا کے آداب میں یہ ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرے، ہتھیلی کا رُخ اوپر کی طرف ہو اور دعا کے بعد ہاتھ چہرے پر پھیر لے، احادیثِ مبارکہ یہ ہیں:

(۱)"عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سَلُوا اللهَ بِبُطُوْنِ أَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا، فَإِذَا فَرَغْتُمْ، فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ"۔

ترجمہ:"اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا کر اللہ سے سوال کرو، اپنے ہاتھوں کی پشت کو پھیلا کر سوال نہ کرو، پھر جب دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر مَل لو، (ابوداؤد:1485)۔

(2)"اَلْمَسْأَلَةُ أَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَ مَنْكِبَيْكَ أَوْ نَحْوَهُمَا"۔

ترجمہ:"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (اللہ تعالیٰ سے) سوال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے ہاتھ کندھوں کے برابر یا (کم وبیش) اٹھاؤ، (ابوداؤد:1489)"۔

(3)"إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم كَانَ إِذَا دَعَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ، مَسَحَ وَجْهَهُ بِيَدَيْهِ"۔

ترجمہ: ''سائب بن یزید اپنے والد سے بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ جب دعا کرتے تو اپنے ہاتھ بلند کرتے اور اپنے ہاتھ اپنے چہرہ مبارک پر پھیر لیتے، (ابوداؤد:1492)''۔

(4) ''إِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى حَيِيٌّ كَرِيمٌ، يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ، أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا''۔

ترجمہ: ''حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب تبارک وتعالیٰ بہت حیا فرمانے والا کریم ہے، جب اس کا بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھالے، تو وہ اپنے بندے سے حیا فرماتا ہے کہ اُس کے ہاتھ خالی لوٹا دے، (ابوداؤد:1488)''۔

الغرض جمعے کے دن دو خطبوں کے درمیان امام کے لیے دعا بالاتفاق جائز ہے، فقہ حنفی میں امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک دو خطبوں کے درمیان دعا مقتدی کے لیے بھی جائز ہے اور امام اعظم سے بھی ایک روایت جواز کی ہے، لیکن مقتدی دل میں یا زبان سے آہستہ دعا کریں۔ مقتدی ہاتھ اٹھا کر دعا کا التزام نہ کریں تاکہ اسے جمعے کا شِعار نہ سمجھ لیا جائے، کبھی ہاتھ اٹھا کر بھی دعا کر سکتے ہیں کہ اس کی ممانعت نہیں ہے اور ہاتھ اٹھانا آدابِ دعا میں سے ہے۔

چنانچہ مفتی مصر شیخ محمد رشید رضا متوفّٰی 1354ھ لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''دو خطبوں کے درمیان دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا اور بلند آواز سے دعا کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے اور اگر یہ تاثر پیدا نہ ہو لوگ کسی دلیل کے بغیر اسے سنت سمجھ کر کر رہے ہیں، تو (اپنی اصل کے اعتبار سے) ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، آثار سے یہ ثابت ہے کہ جب امام منبر پر کلام کرے تو خاموش رہ کر سنا جائے اور اسی سبب ہم کہتے ہیں: ''جب امام خاموش ہو تو دعا میں حرج نہیں ہے، لیکن دعا آہستہ کرے تاکہ دوسروں کے لیے تکلیف (اور توجہ بٹنے) کا سبب نہ بنے اور سب لوگ ہاتھ بھی نہ اٹھائیں کہ لوگ اسے جمعے کا شِعار نہ سمجھ لیں اور جب امام دوسرے خطبے کے لیے اٹھے تو دعا موقوف کر دیں اور خطبہ سنیں، (مجلّۃ المنار، ج:6،ص:792،)''۔ اصل سے مراد یہ ہے کہ مطلقاً دعا میں ہاتھ اٹھانا سنت

سے ثابت ہے۔

امام اہلسنت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے جمعۃ المبارک کے دن دو خطبوں کے درمیان دعاؤں کے بارے میں سوال ہوا کہ آیا یہ مکروہِ تحریمی ہے یا تنزیہی یا جائز ہے، ایک صاحب اسے بدعت اور حرام بتاتے ہیں، آپ نے تفصیلی جواب لکھا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''دو خطبوں کے درمیان امام کا دعا مانگنا بالاتفاق جائز ہے، بلکہ خطبے کے درمیان بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہاتھ اٹھا کر بارش کے لیے دعا مانگنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ فقہِ حنفی میں دو خطبوں کے درمیان مقتدی کے لیے دعا مانگنا صاحبین کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے، امام اعظم سے بھی ایک قول کے مطابق اس کا جواز ثابت ہے اور امام شافعی کے نزدیک بھی جائز ہے، تاہم آپ نے لکھا: ''یہ کوئی ایسا امر نہیں جس پر شدت اختیار کی جائے، نرمی سے سمجھایا جائے، اگر کوئی نہ مانے تو اس کی بنا پر فتنہ اٹھانا اور گروہ بندی کی حاجت نہیں ہے، آپ نے اس موضوع پر ''رِعَایَۃُ الْمَذھَبِین فِی الدُّعَاءِ بَیْنَ الْخُطْبَتَیْن'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:8، ص:397 و477 تا494، ملخصاً، بتصرف)

## اِقامت کا مفصل و مدلل مسئلہ

**سوال:**

چند روز قبل ہماری مسجد کے امام صاحب نے مسئلہ بیان فرمایا کہ: ''اِقامت نماز سے قبل پڑھی جاتی ہے، بیٹھ کر سننا سنت ہے اور ''حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ'' پر کھڑا ہونا چاہیے، اس سے قبل نمازی کا کھڑا ہونا مکروہ عمل ہے''۔ میں اس دن سے عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا ہوں، اپنی 67 سالہ عمر میں اللہ اکبر کے ساتھ ہی کھڑا ہوا کرتا تھا، اگر میرا یہ عمل مکروہ ہے تو اس عرصہ میں ادا کی گئی نمازوں کا کیا ہوا۔ حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہوئی، وہاں بھی اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ ہی صفیں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ کروڑوں مسلمانوں کو اللہ اکبر کے

ساتھ مساجد میں صف بندی کرتے ہوئے دیکھا ہے، ان کی نمازوں کا کیا ہوگا۔ مجھے امام صاحب کی علمی کمی یا ان پر بالادستی مطلوب نہیں، اپنے اعمال کی درستگی اور گزشتہ نمازوں کی فکر ہے کیونکہ میرے نزدیک مکروہ عمل کے آغاز کے ساتھ کسی عبادت کی قبولیت ممکن نہیں ہوسکتی، (سرفراز احمد، قیوم آباد، کراچی)۔

**جواب:**

لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ جماعت کھڑی ہونے والی ہے، اِقامت کہی جاتی ہے، یہ امرِ مشروع ہے اور سنّتِ مُتوارثہ ہے، اس کے کلمات حدیث سے ثابت ہیں، اسی کو ہمارے عرف میں ''تکبیر'' بھی کہا جاتا ہے اِقامت کی اصطلاح ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ'' کے کلمے سے اور ''تکبیر'' کی اصطلاح ''اللہ اکبر'' سے مستفاد ہے۔ جماعت کے لیے اقامت کے وقت مقتدی کب کھڑے ہوں، اس کے بارے میں احادیث مبارکہ میں کوئی صریح حکم مذکور نہیں ہے، ماسوا صحیح مسلم کی اس حدیث کے کہ ''لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ'' (جب تک تم مجھے دیکھ نہ لو، مت کھڑے ہو)۔ دراصل رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ جماعت کھڑی ہونے کے وقت حجرۂ انور سے باہر تشریف لاتے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نظریں حجرۂ انور کی طرف جمی رہتیں، جوں ہی آپ ﷺ نکلتے، وہ اقامت شروع کردیتے تھے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِیْ قَتَادَۃَ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ: إِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاۃُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: جب نماز کے لیے اِقامت کہی جائے، تو جب تک تم مجھے دیکھ نہ لو، مت کھڑے ہو''۔

(صحیح مسلم: 604)

اس حدیث کے تحت امام یحییٰ بن شرف نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایات بیان کی ہیں:

''عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَۃَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ أُقِيْمَتِ الصَّلَاۃُ، فَقُمْنَا فَعَدَلْنَا الصُّفُوْفَ قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ

إِلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَفِيْ رِوَايَةٍ: أَنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ تُقَامُ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ قَبْلَ أَنْ يَقُوْمَ النَّبِيُّ ﷺ مَقَامَهُ وَفِيْ رِوَايَةِ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: كَانَ بِلَالٌ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يُؤَذِّنُ إِذَا دَحَضَتْ وَلَا يُقِيْمُ حَتّٰى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ فَإِذَا خَرَجَ أَقَامَ الصَّلَاةَ حِيْنَ يَرَاهُ''۔

ترجمہ: ''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے: ''نماز کے لیے اقامت کہی گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (اپنے حجرۂ انور سے) نکلنے سے پہلے ہم کھڑے ہوئے اور ہم نے صفیں درست کیں''۔ اور ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اقامت کہی جاتی، تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کھڑے ہونے سے پہلے لوگ صفیں درست کرنے لگ جاتے''۔

(۲) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب سورج ڈھل جاتا تو بلال اذان دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکلنے سے پہلے اِقامت نہ کہتے، پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلتے تو انہیں دیکھ کر اِقامت کہتے''۔

اس کی شرح میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ الْقَاضِيْ عِيَاضٌ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى: يُجْمَعُ بَيْنَ مُخْتَلَفِ هٰذِهِ الْأَحَادِيْثِ بِأَنَّ بِلَالًا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَانَ يُرَاقِبُ خُرُوْجَ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ حَيْثُ لَا يَرَاهُ غَيْرُهُ أَوْ إِلَّا الْقَلِيْلُ فَعِنْدَ أَوَّلِ خُرُوْجِهٖ يُقِيْمُ وَلَا يَقُوْمُ النَّاسُ حَتّٰى يَرَوْهُ، ثُمَّ لَا يَقُوْمُ مَقَامَهُ حَتّٰى يَعْدِلُوا الصُّفُوْفَ، وَقَوْلُهُ فِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فَيَأْخُذُ النَّاسُ مَصَافَّهُمْ قَبْلَ خُرُوْجِهٖ لَعَلَّهُ كَانَ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ وَنَحْوَهُمَا لِبَيَانِ الْجَوَازِ أَوْ لِعُذْرٍ وَلَعَلَّ قَوْلَهُ ﷺ: فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ، قَالَ الْعُلَمَاءُ: وَالنَّهْيُ عَنِ الْقِيَامِ قَبْلَ أَنْ يَرَوْهُ لِئَلَّا يَطُوْلَ عَلَيْهِمُ الْقِيَامُ وَلِأَنَّهُ قَدْ يَعْرِضُ لَهُ عَارِضٌ فَيَتَأَخَّرُ بِسَبَبِهٖ، وَاخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ مِنَ السَّلَفِ فَمَنْ بَعْدَهُمْ مَتٰى يَقُوْمُ النَّاسُ لِلصَّلَاةِ وَمَتٰى يُكَبِّرُ الْإِمَامُ، فَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى وَطَائِفَةٍ أَنَّهُ يُسْتَحَبُّ أَنْ لَا يَقُوْمَ أَحَدٌ حَتّٰى يَفْرُغَ الْمُؤَذِّنُ مِنَ الْإِقَامَةِ، وَنَقَلَ الْقَاضِيْ عِيَاضٌ عَنْ مَالِكٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى وَعَامَّةِ الْعُلَمَاءِ: أَنَّهُ

يُسْتَحَبُّ أَنْ يَقُوْمُوْا إِذَا أَخَذَ الْمُؤَذِّنُ فِي الْإِقَامَةِ وَكَانَ أَنَسٌ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى يَقُوْمُ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ: قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ، وَبِهِ قَالَ أَحْمَدُ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى، وَقَالَ أَبُوْ حَنِيْفَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: اَلْكُوْفِيُّوْنَ يَقُوْمُوْنَ فِي الصَّفِّ إِذَا قَالَ: ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' فَإِذَا قَالَ: ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ''، كَبَّرَ الْإِمَامُ، وَقَالَ جُمْهُوْرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ لَا يُكَبِّرُ الْإِمَامُ حَتّٰى يَفْرُغَ الْمُؤَذِّنُ مِنَ الْإِقَامَةِ، قَوْلُهُ: قُمْنَا فَعَدَّلْنَا الصُّفُوْفَ، إِشَارَةٌ إِلٰى أَنَّ هٰذِهِ سُنَّةٌ مَعْهُوْدَةٌ عِنْدَهُمْ وَقَدْ أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى اسْتِحْبَابِ تَعْدِيْلِ الصُّفُوْفِ وَالتَّرَاصِّ فِيْهَا، وَقَدْ سَبَقَ بَيَانُهُ فِي بَابِهِ، قَوْلُهُ فَأَتٰى رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حَتّٰى إِذَا قَامَ فِي مُصَلَّاهُ قَبْلَ أَنْ يُكَبِّرَ ذَكَرَ فَانْصَرَفَ وَقَالَ لَنَا: مَكَانَكُمْ فَلَمْ نَزَلْ قِيَامًا نَنْتَظِرُهُ حَتّٰى خَرَجَ إِلَيْنَا وَقَدِ اغْتَسَلَ''۔

ترجمہ: ''قاضی عیاض کہتے ہیں: ان احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ ایسی جگہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھ رہے ہوتے، جہاں سے اور صحابہ نہ دیکھ پاتے یا بہت کم لوگ دیکھ پاتے، پس حضرت بلال آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نکلتے ہوئے دیکھتے ہی اقامت شروع کردیتے اور لوگ (عام نمازی) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خود نہ دیکھتے کھڑے نہ ہوتے، پھر جب تک صحابہ صفیں برابر نہ کرلیتے، آپ مصلائے امامت پر نہ کھڑے ہوتے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نکلنے سے پہلے لوگ صفیں بنانے لگ جاتے، شاید یہ ایک دو یا چند بار بیان جواز کے لیے یا کسی عذر کے سبب ہوا ہوگا (کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تاخیر سے نکلے) اور شاید اسی کے بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہوگا: ''جب تک مجھے (خود) نہ دیکھ لو، مت کھڑے ہوا کرو''۔ علماء نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھنے سے پہلے کھڑے ہونے سے روکنے کا سبب شاید یہ ہوگا کہ ان کا قیام طویل نہ ہوجائے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کبھی کوئی حاجت درپیش ہونے کے سبب نکلنے میں تاخیر فرمادیتے۔ سو اس باعث علمائے سلف اور ان کے بعد والوں میں اختلاف رائے ہوا کہ لوگ نماز کے لیے کب کھڑے ہوں اور امام تکبیر تحریمہ کب کہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض علماء کا مذہب یہ

ہے کہ مؤذن کے اِقامت ختم ہونے سے پہلے لوگ کھڑے نہ ہوں۔اور قاضی عیاض نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور عام علماء سے روایت کیا: جب مؤذن اقامت شروع کرے تو مستحب یہ ہے کہ لوگ کھڑے ہو جائیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ اس وقت کھڑے ہوا کرتے تھے جب مؤذن ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ'' کہتا اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور علمائے کوفہ نے کہا: اور جب مؤذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ'' کہے، تو لوگ کھڑے ہوں اور جب وہ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ'' کہے، تو امام تکبیر تحریمہ کہے، اور سَلَف سے لے کر خَلَف تک جمہور علماء نے کہا ہے: مؤذن کے اقامت سے فارغ ہونے تک امام تکبیرِ تحریمہ نہ کہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''ہم کھڑے ہوئے اور صفیں برابر کیں''، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہاں یہ طریقہ رائج تھا۔اور تمام علماء کے نزدیک صفیں برابر کرنا اور مل کر کھڑا ہونا مُستحب ہے اور صحیح مسلم: 605 میں ہے: ابوہریرہ کا یہ قول: ''پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اِقامت کے بعد امامت کی جگہ تشریف لے آئے، پھر آپ کچھ یاد آنے پر چلے گئے، اور ہم سے فرمایا: ''اپنی جگہ کھڑے رہو''، پھر ہم قیام کی حالت میں انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ غسل فرما کر تشریف لے آئے، (صحیح مسلم بشرح النووی، جلد 5، ص: 88-87)''۔اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت اقامت کے بعد تکبیر تحریمہ کے لیے معمولی تاخیر کی جاسکتی ہے، پس اگر امام محسوس کرے کہ صفیں درست نہیں ہوئیں، تو وہ چند ثانیے یا ایک دو منٹ تاخیر بھی کرسکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی مُتوفّٰی 620ھ لکھتے ہیں:

''وَیُسْتَحَبُّ أَنْ یَّقُوْمَ اِلَی الصَّلَاۃِ عِنْدَ قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃِ''، وَبِھٰذَا قَالَ مَالِکٌ، قَالَ ابْنُ الْمنذر عَلٰی ھٰذَا أَھلُ الْحَرَمَیْنِ، وَقَالَ الشَّافِعِی: یَقُوْمُ اِذَا فَرَغَ الْمُؤَذِّنُ مِنَ الْاِقَامَۃِ''۔

ترجمہ: ''اور مستحب یہ ہے کہ نماز کے لیے مؤذن کے قول ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ'' پر کھڑا ہوا جائے اور امام مالک نے بھی یہی کیا، ابن المنذر نے کہا: اِسی پر اہل حرمین کا تعامل ہے اور

امام شافعی نے کہا: مؤذن کے اقامت سے فارغ ہونے کے بعد کھڑا ہوگا"۔

مزید لکھتے ہیں:

"وَاِنَّمَا قُلْنَا اَنَّهُ يَقُوْمُ عِنْدَ قَوْلِهٖ: "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ"، لِاَنَّ هٰذَا خَبَرٌ بِمَعْنَى الْاَمْرِ، وَمَقْصُوْدُهُ الْاِعْلَامُ، لِيَقُوْمُوْا، فَيُسْتَحَبُّ الْمُبَادَرَةُ اِلَى الْقِيَامِ اِمْتِثَالًا لِلْاَمْرِ، وَتَحْصِيْلًا لِلْمَقْصُوْدِ، وَلَا يُكَبِّرُ حَتّٰى فَرَغَ الْمُؤَذِّنُ، لِاَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِنَّمَا كَانَ يُكَبِّرُ بَعْدَ فَرَاغِهٖ"۔

ترجمہ: "یہ جو ہم نے کہا: وہ "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ" کہتے وقت کھڑا ہوگا، تو یہ اس لیے کہ یہ خبر حکم کے معنیٰ میں ہے اور اس کا مقصد اِعلام (بتانا) ہے تاکہ لوگ کھڑے ہوں، تو اُمر کی تعمیل اور مقصد کے حصول کے لیے کھڑے ہونے میں جلدی کرنا مستحب ہے، اور امام اُس وقت تک تکبیر تحریمہ نہ کہے، جب تک مؤذن اقامت سے فارغ نہ ہوجائے، اس لیے کہ نبی ﷺ بھی مؤذن کے فارغ ہونے کے بعد تکبیر کہا کرتے تھے۔

(المغنی، جلد 2، ص:6، قاہرہ)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

"لَا يَقُوْمُ الْمُصَلُّوْنَ لِلصَّلَاةِ عِنْدَ الْاِقَامَةِ حَتّٰى يَقُوْمَ الْاِمَامُ أَوْ يُقْبِلَ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: اِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ، وَأَمَّا تَعْيِيْنُ وَقْتِ قِيَامِ الْمُؤْتَمِّيْنَ اِلَى الصَّلَاةِ فَقَالَ الْمَالِكِيَّةُ: يَجُوْزُ لِلْمُصَلِّيْ اَلْقِيَامُ حَالَ الْاِقَامَةِ أَوْ أَوَّلَهَا أَوْ بَعْدَهَا، فَلَا يُطْلَبُ لَهٗ تَعْيِيْنُ حَالٍ، بَلْ بِقَدْرِ الطَّاقَةِ لِلنَّاسِ، فَمِنْهُمُ الثَّقِيْلُ وَالْخَفِيْفُ، وَقَالَ الْحَنَفِيَّةُ: يَقُوْمُ عِنْدَ "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" وَبَعْدَ قِيَامِ الْاِمَامِ، وَقَالَ الشَّافِعِيَّةُ: يُسْتَحَبُّ أَنْ يَّقُوْمَ الْمُصَلِّيْ بَعْدَ اِنْتِهَاءِ الْاِقَامَةِ اِذَا كَانَ الْاِمَامُ مَعَ الْمُصَلِّيْنَ فِي الْمَسْجِدِ، وَكَانَ يَقْدِرُ عَلَى الْقِيَامِ بِسُرْعَةٍ، بِحَيْثُ يُدْرِكُ فَضِيْلَةَ تَكْبِيْرَةِ الْاِحْرَامِ، وَالْاَقَامَ قَبْلَ ذٰلِكَ بِحَيْثُ يُدْرِكُهَا"۔

ترجمہ: "لوگ اقامت کے وقت نماز کے لیے نہ کھڑے ہوں، یہاں تک کہ امام کھڑا ہوجائے یا آگے بڑھے، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب نماز کے لیے اقامت کہی جائے

تو جب تک تم (خود) مجھے دیکھ نہ لو، مت کھڑے ہو"۔ جہاں تک مقتدیوں کا جماعت کے لیے کھڑے ہونے کے وقت کی تعیین کا معاملہ ہے، تو مالکیہ نے کہا: نمازی کے لیے اقامت کے دوران یا اس سے پہلے یا اس کے بعد تمام صورتوں میں کھڑا ہونا جائز ہے، کسی خاص مرحلے پر کھڑا ہونے کی تعیین کا مطالبہ نہ کیا جائے، بلکہ لوگ اپنے حسبِ حال کھڑے ہو سکتے ہیں، کیونکہ کوئی بھاری (جسامت والا) ہوتا ہے اور کوئی ہلکا۔ اَحناف نے کہا: "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" پر اور امام کے کھڑے ہونے کے بعد کھڑے ہوں اور شافعیہ کا قول یہ ہے کہ جب امام نمازیوں کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو نمازی اقامت کے ختم ہونے پر کھڑے ہوں، نمازی فوری کھڑے ہونے پر قدرت رکھتا ہے، تو وہ تکبیرِ تحریمہ کی فضیلت کو پالے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ پہلے سے کھڑا ہو جائے تاکہ اس فضیلت کو پالے،

(الفقہ الاسلامی وأدلتہ، ب جلد 1، ص:719، دمشق)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ عِنْدَ الْاِقَامَۃِ یُکْرَہُ لَہُ الْاِنْتِظَارُ قَائِمًا وَلٰکِنْ یَقْعُدُ، ثُمَّ یَقُوْمُ اِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ قَوْلَہٗ "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کَذَا فِی "الْمُضْمَرَاتِ"۔

ترجمہ: "جب کوئی شخص اقامت کے وقت مسجد میں داخل ہو، تو اُسے کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے، بلکہ بیٹھ جائے، جب مؤذن "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" پر پہنچے، تو کھڑا ہو، جیسا کہ "مُضمرات" میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:57)"۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"آج کل اکثر جگہ رواج پڑ گیا ہے کہ وقتِ اقامت سب لوگ کھڑے رہتے ہیں بلکہ اکثر جگہ تو یہاں تک ہے کہ جب تک امام مُصلّے پر کھڑا نہ ہو، اُس وقت تک تکبیر نہیں کہی جاتی، یہ خلافِ سنّت ہے، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:471)"۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال کیا گیا: "زید دعویٰ کرتا ہے کہ جب تک سب مقتدی کھڑے نہ ہولیں اور صف سیدھی نہ ہو اور امام اپنی جانماز پر کھڑا نہ ہو، تب تک

اقامت نہ کہی جائے۔ اور عمر و دعویٰ کرتا ہے کہ مقتدی اور امام کو پہلے ہی سے کھڑا ہونا ضروری نہیں بلکہ جب اقامت کہتے ہوئے مؤذن "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" تک پہنچ جائے، اُس وقت امام و مقتدی کھڑے ہوجائیں اور جس وقت "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ" کہے، تب امام تکبیر کہے، اب ان دونوں میں کون حق پر ہے؟۔ آپ نے جواب میں لکھا: "عمر و حق پر ہے، کھڑے ہوکر تکبیر سننا مکروہ ہے، یہاں تک کہ علماء حکم فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد میں آیا اور تکبیر ہورہی ہے، وہ اس کے تمام تک کھڑا نہ رہے، بلکہ بیٹھ جائے، یہاں تک کہ مکبّر "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" تک پہنچے، اُس وقت کھڑا ہو، "وِقایہ" میں ہے: "یَقُوْمُ الْاِمَامُ وَالْقَوْمُ عِنْدَ "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" وَیَشْرَعُ عِنْدَ "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ"۔ ترجمہ: "امام اور نمازی "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" پر کھڑے ہوں اور "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ" کے الفاظ پر امام نماز شروع کردے"۔

"محیط" و "ہندیہ" میں ہے:

"یَقُوْمُ الْاِمَامُ وَالْقَوْمُ اِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ: "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" عِنْدَ عُلَمَائِنَا الثَّلٰثَةِ، هُوَ الصَّحِیْحُ۔

ترجمہ: "ہمارے تینوں ائمہ کے نزدیک جب اقامت کہنے والا "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کہے، تو اُس وقت امام اور تمام نمازی کھڑے ہوں اور یہی صحیح ہے"۔

"جامع المضمرات" و "عالمگیریہ" و "ردالمحتار" میں ہے:

"اِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ عِنْدَ الْاِقَامَةِ یُکْرَهُ لَهُ الْاِنْتِظَارُ قَائِمًا وَلٰکِنْ یَّقْعُدُ ثُمَّ یَقُوْمُ اِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ قَوْلَهٗ "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" ترجمہ: "جب کوئی نمازی تکبیر کے وقت آئے تو وہ بیٹھ جائے کیونکہ کھڑے ہوکر انتظار کرنا مکروہ ہے پھر جب مؤذّن "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" کہے تو اس وقت کھڑا ہو"۔

اسی طرح بہت کتب میں ہے:

"اَقُوْلُ: وَلَا تَعَارُضَ عِنْدِیْ بَیْنَ قَوْلِ "الْوِقَایَةِ" وَاَتْبَاعِهَا یَقُوْمُوْنَ عِنْدَ "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" وَالْمُحِیْطِ وَالْمُضْمَرَاتِ وَمَنْ مَّعَهُمَا عِنْدَ "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" فَاِنَّا اِذَا حَمَلْنَا

الْأَوَّلَ عَلَى الِانْتِهَاءِ وَالْآخَرَ عَلَى الِابْتِدَاءِ اتَّحَدَ الْقَوْلَانِ، أَيْ يَقُوْمُوْنَ حِيْنَ يَتِمُّ الْمُؤَذِّنُ ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' وَيَأْتِيْ عَلَى الْفَلَاحِ وَهٰذَا مَا يُعْطِيْهِ قَوْلُ ''الْمُضْمَرَاتِ'' يَقُوْمُ إِذَا بَلَغَ الْمُؤَذِّنُ ''حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ'' وَلَعَلَّ هٰذَا أَوْلٰى مِمَّا فِيْ ''مَجْمَعُ الْأَنْهُرِ'' مِنْ قَوْلِهِ وَفِي ''الْوِقَايَةِ'' وَيَقُوْمُ الْإِمَامُ وَالْقَوْمُ عِنْدَ ''حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ'' أَيْ قُبَيْلَهٗ''۔

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں: صاحبِ ''وِقایہ'' اور اُن کے متّبعین کے اس قول کہ مقتدی مؤذن کے ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ'' کہنے پر کھڑے ہوں اور صاحبِ ''محیط'' و ''مضمرات'' اور ان کی جماعت کے اس قول کہ مقتدی مؤذن کے ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' کہنے پر کھڑے ہوں، میں میرے نزدیک کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ جب ہم پہلے قول کو انتہا اور دوسرے کو ابتدا پر محمول کریں، تو دونوں قولوں میں اتحاد حاصل ہوجاتا ہے یعنی جب مؤذن ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ'' پورا کرکے ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' کہے، تو کھڑے ہوں اور اس کی تائید ''مضمرات'' کے ان الفاظ سے ہوتی ہے: اس وقت کھڑا ہو، جب مؤذن ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' پر پہنچے اور یہ اس سے بہتر ہے، جو ''مَجْمَعُ الْاَنْهُر'' میں ان کا قول ہے: ''وقایہ'' میں ہے: امام اور نمازی ''حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ'' کے وقت یعنی اس سے تھوڑا سا پہلے کھڑے ہوں''۔

یہ اس صورت میں ہے کہ امام بھی تکبیر کے وقت مسجد میں ہو، اور اگر وہ حاضر نہیں ہے، تو مؤذن جب تک اُسے آتا نہ دیکھے، تکبیر نہ کہے، نہ اُس وقت تک کوئی کھڑا ہو ''لِقَوْلِهٖ ﷺ: لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ (کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: تم نہ کھڑے ہوا کرو، یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو)، پھر جب امام آئے اور تکبیر شروع ہو، اس وقت دو صورتیں ہیں: (۱) اگر امام صفوں کی طرف سے داخلِ مسجد ہو تو جس صف سے گزرتا جائے، وہی صف کھڑی ہوتی جائے، (۲) اور اگر سامنے سے آئے تو اُسے دیکھتے ہی سب کھڑے ہوجائیں اور اگر خود امام ہی تکبیر کہے تو جب تک پُوری تکبیر سے فارغ نہ ہولے مقتدی اصلاً کھڑے نہ ہوں، بلکہ اگر اس نے تکبیر مسجد سے باہر کہی تو فراغ پر بھی کھڑے نہ ہوں جب وہ مسجد میں قدم رکھے اُس وقت قیام کریں، ''ہندیہ'' میں اس عبارت کے بعد مذکور ہے:

''فَاَمَّا اِذَا کَانَ الْاِمَامُ خَارِجَ الْمَسْجِدِ، فَاِنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ مِنْ قِبَلِ الصُّفُوْفِ فَکُلَّمَا جَاوَزَ صَفًّا، قَامَ ذٰلِکَ الصَّفُّ وَاِلَیْهِ مَالَ شَمْسُ الْاَئِمَّةِ الْحُلْوَانِیُّ وَالسَّرَخْسِیُّ وَشَیْخُ الْاِسْلَامِ خَوَاهَرْزَادَه، وَاِنْ کَانَ الْاِمَامُ دَخَلَ الْمَسْجِدَ مِنْ قُدَّامِهِمْ یَقُوْمُوْنَ کَمَا رَأَوُا الْاِمَامَ وَاِنْ کَانَ الْمُؤَذِّنُ وَالْاِمَامُ وَاحِدًا، فَاِنْ اَقَامَ فِی الْمَسْجِدِ فَالْقَوْمُ لَا یَقُوْمُوْنَ مَا لَمْ یَفْرُغْ عَنِ الْاِقَامَةِ، وَاِنْ اَقَامَ خَارِجَ الْمَسْجِدِ فَمَشَایِخُنَا اتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّهُمْ لَا یَقُوْمُوْنَ مَا لَمْ یَدْخُلِ الْاِمَامُ الْمَسْجِدَ وَیُکَبِّرُ الْاِمَامُ قُبَیْلَ قَوْلِهٖ ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ''، قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ شَمْسُ الْاَئِمَّةِ الْحُلْوَانِیُّ وَهُوَ الصَّحِیْحُ هٰکَذَا فِی ''الْمُحِیْط''۔

ترجمہ: ''پس جب امام مسجد سے باہر ہو، سو اگر وہ صفوں کی جانب سے مسجد میں داخل ہو، تو جس صف سے وہ گزرے، وہ صف کھڑی ہو جائے، شمس الائمہ حلوانی، امام سرخسی اور شیخ الاسلام خواہر زادہ اسی طرف گئے ہیں اور اگر امام اُن کے سامنے سے مسجد میں داخل ہو، تو اسے دیکھتے ہی تمام مقتدی کھڑے ہو جائیں، اگر مؤذن اور امام ایک ہی ہے، پس اگر اُس نے مسجد کے اندر ہی تکبیر کہی تو قوم اس وقت تک کھڑی نہ ہو، جب تک وہ تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے اور اگر اس نے خارج از مسجد تکبیر کہی، تو ہمارے تمام مشائخ اس پر متفق ہیں کہ لوگ اس وقت تک کھڑے نہ ہوں، جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو اور امام ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ'' سے تھوڑا پہلے تکبیر تحریمہ کہے، امام شمس الائمہ حلوانی کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے، محیط میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 379 تا 382)''۔

ایک اور سوال ہوا: ''تکبیر کے شروع ہونے کے وقت امام ومقتدی کو کھڑا رہنا چاہیے یا بیٹھ جانا چاہیے اور بیٹھ جانے میں کیا فضیلت ہے اور کھڑا رہنے میں کیا نقصان ہے؟''۔

الجواب: ''امام کے لیے اس میں کوئی خاص حکم نہیں، مقتدیوں کو حکم ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں، ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' پر کھڑے ہوں، کھڑے کھڑے تکبیر سننا مکروہ ہے، یہاں تک کہ عالمگیری میں فرمایا: ''اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد میں آئے کہ تکبیر ہو رہی ہو، فوراً بیٹھ جائے اور ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' پر کھڑا ہو اور اس میں راز مکبر کے اس قول ''قَدْ قَامَتِ

الصَّلَاۃُ'' کی مطابقت ہے کہ اِدھر اُس نے ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' کہا: 'آؤ مراد پانے کو'، اُدھر جماعت کھڑی ہوئی، اُس نے کہا: ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ'' جماعت قائم ہوگئی، واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد 5، ص: 421)''۔

الغرض جب جماعت کے لیے اقامت کہی جارہی ہو تو مقتدی اس وقت کھڑے ہوں، جب مؤذّن ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' کہے، یہ مُستحب ہے اور آدابِ اِقامت وصلوٰۃ میں سے ہے۔ شروع ہی سے کھڑے ہوکر اقامت سننے کو ہمارے اکابر فقہائے کرام نے مکروہ کہا ہے اور اس سے مراد مکروہِ تنزیہی ہے۔ فقہِ حنفی میں یہ مسئلہ مختلَف فیہ نہیں ہے، نہ یہ دیوبندی بریلوی خلافیات کا مسئلہ ہے، لہٰذا اسے مساجد میں فساد کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اگر اکثریت کھڑی ہوگئی ہے تو ایک یا چند آدمیوں کے بیٹھے رہنے سے صفوں میں خلل واقع ہوگا اور جہاں اکثریت بیٹھی رہتی ہے، وہاں ایک یا چند آدمیوں کو اپنا تفرُّد اور پارسائی ظاہر کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہونا چاہیے، یہ خالص فقہی مسئلہ ہے اور اس میں انا پرستی کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ آپ پریشان نہ ہوں، آپ کی گزشتہ نمازیں صحیح ادا ہوگئیں اور امام کا موقف بھی درست ہے۔ مُستحبات اور اَولیٰ واَفضل کاموں پر عمل کرنا باعثِ اجر ہے، لیکن اُن کے ترک پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ جہاں تک اقامت کے وقت حرمینِ طیّبین کے معمولات کا تعلق ہے، اُن کا تعلق فقہِ حنبلی سے ہے اور فقہِ حنبلی میں جو کتاب ماخذ کا درجہ رکھتی ہے، وہ ''مغنی لابن قُدامہ'' ہے اور اس کا حوالہ آچکا ہے کہ جب مؤذن ''قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ'' کہے، تو مقتدی اس وقت کھڑے ہوں اور ائمۂ اَربعہ میں سے فقط امام مالک کا قول یہ ہے کہ مقتدیوں کا اِقامت کے شروع میں کھڑا ہونا مُستحب ہے، ممکن ہے وہ اس مسئلے میں امام مالک کے قول پر عمل کرتے ہوں۔ اَقوالِ ائمہ چار ہیں:

(۱) مقتدی اِقامت کے شروع میں کھڑے ہوں (امام مالک) (۲) قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ کے کلمے پر کھڑے ہوں (امام احمد بن حنبل) (۳) اِقامت کے ختم پر کھڑے ہوں (امام شافعی) (۴) ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ'' پر کھڑے ہوں (امام اعظم ابوحنیفہ)۔ ان میں سے کسی

بھی قول پر عمل کرنے سے نماز کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اختلافات افضلیت میں ہے اور اَحناف کے نزدیک "حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ" پر کھڑا ہونا افضل ہے اور شروع میں کھڑا ہونا مکروہِ تنزیہی ہے۔

یہاں تک لکھا جاچکا تھا کہ ایک صاحب نے فتاویٰ نوریہ کے حوالے سے فقیہ العصر علامہ نور اللہ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ ذیل فتوے کی طرف متوجہ کیا، آپ سے سوال ہوا:

"ایسا نمازی جو اقامتِ نماز کے دوران مسجد میں آیا جب کہ امام بھی آچکا ہو تو کیا اس کا بیٹھ جانا ضروری ہے کہ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ پر کھڑا ہو، کیونکہ اس وقت قیام مستحب ہے جو قعود پر موقوف ہے، حالانکہ مستحب کا موقوف علیہ بھی مستحب ہوتا ہے، (المستفتی: محمد اجمل نوری عفی عنہ)"۔ آپ نے جواب میں لکھا:

"حضور پرنور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکم دیا ہے کہ جب کوئی تمہارا مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرے اور یوں بھی آیا کہ دو رکعتوں کے پڑھنے تک نہ بیٹھے (متفق علیہ)۔ اس حکم کی بنا پر ہمارے ائمہ کرام اور جمہور کے نزدیک نماز تحیۃ المسجد مستحب مؤکد ہے، بلکہ ہمارے مشائخِ کرام نے یہ تصریح بھی فرمائی کہ سنت ہے جو کسی بھی سنت یا فرض نماز سے بھی ادا ہوجاتی ہے، جس سے پہلے بیٹھنا تاکیدی مستحب بلکہ سنت کا خلاف اور غیر اولیٰ ہے، لہٰذا ایسا داخل ہونے والا جس کے متعلق سوال ہے، اداءِ نماز سے قبل نہ بیٹھے اور چونکہ امام حاضر ہے، لہٰذا حدیث لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ کا تقاضا بھی نہیں کہ قیام نہ کرے۔ رہا سائل کا استدلال کہ ہمارے نزدیک حی علی الفلاح پر قیام مستحب ہے جو قعود پر موقوف ہے، لہٰذا قعود بھی مستحب ہوا، تو یہ محض باطل ہے، کیونکہ یہ قیام مستحب تو مقدمہ ہے اسی قیام کا جو بحکم قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ نماز فرض میں فرض ہے، حالانکہ منفرد یا امام ومقتدی پر فرض نماز سے قبل قعود قطعاً فرض نہیں بلکہ منفرد کے لیے تو کسی نے مستحب تک بھی نہیں کہا تو معلوم ہوا کہ قیام قعود پر موقوف نہیں ورنہ قعود بھی قیام کی طرح فرض ہوتا، وَلَمْ یَقُلْ بِہٖ اَحَدٌ اور یہیں سے واضح ہوا کہ مضمرات شرح قدوری میں مولانا صوفی یوسف بن عمر کا دوری کا ایسے داخل مسجد

کے لیے قعود کا حکم دینا اور قیام مکروہ بتانا بے دلیل ہے اور صحیح نہیں، اس میں حضور پر نور روحی فداہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم مذکور کی صریح خلاف ورزی ہے جو ہمارے کسی بھی امام کا قول ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا، لہٰذا مقبول نہیں اور ہندیہ اور دُرّ وغیرہ کا مضمرات سے نقل کرنا بھی صحیح نہیں بنا سکتا کہ غیر صحیح نقل کردینے سے صحیح نہیں بن جاتا۔

تعجب ہے کہ امام کی موجودگی کی صورت میں تکبیر سے پہلے حاضرین کے لیے قیام عندالفلاح ہمارے ائمہ کرام کے نزدیک مستحب تو ہے مگر مستحب کا خلاف دلیل خاص کے بغیر مکروہ نہیں بن سکتا، کما صرح بہ الشامی وغیرہ تو وقت پر آنے والے کے لیے کیوں مکروہ ہوا؟ اس مبارک اور صحیح حدیث کو بکثرت ائمہ دین نے اپنی اپنی مبارک تصنیف میں باسانید معتبرہ متصلہ روایت فرمایا ہے، چنانچہ مؤطا امام مالک ص ۱۴۶ (طبع اصح)، موطا امام محمد ص ۱۱۹ (یوسفی) مسند امام احمد، ج:۵، ص: ۲۹۵، ۲۹۶، ۳۰۳ صحیح بخاری ص: ۶۳ باسنادین صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۴۸، سنن ابی داؤد ص ۶۷ (مجیدی) باسنادین ترمذی ج ۱ ص ۴۳، ۷۷ (اصح)، ابن ماجہ ص: ۷۲ (اصح)، شرح السنہ ج: ۲، ص: ۳۶۵ وغیرہا میں بکلماتِ متقاربہ ہے: ''وَالنَّظْمُ مِنَ الْبُخَارِيِّ وَغَيْرِهٖ عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ السُّلَمِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَّجْلِسَ، مصنف عبدالرزاق، ج:۱، ص:۴۲۸، بخاری، ج:۱، ص:۱۵۶، مسلم، ج:۱، ص:۲۴۸، میں بایں کلماتِ متقاربہ بھی ہے: ''اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِس حَتّٰى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ، اور ابن ماجہ ص: ۷۲ میں حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع میں بھی یہی کلماتِ مبارکہ ہیں، وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ جَلَّ جَلَالُ رَبِّيْ وَحْدَهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِهِ الَّذِيْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ''۔

(فتاویٰ نوریہ، ج:1، ص:304-302)

چنانچہ اس سلسلے میں درج ذیل گزارش ہے:

حضرت مفتی نوراللہ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے کو پڑھنے کے بعد آپ پر آشکار ہوگا انہوں نے چند سوالات اٹھائے ہیں: (۱) اگر بیٹھ کر اقامت سننا اور ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ'' پر کھڑے

ہونا مستحب ہے، تو ممنوعات میں مستحب کا مقابل ''خلافِ اولیٰ'' ہے۔ انہوں نے لکھا: سب سے پہلے ''جامع المضمرات والمشکلات'' کے مصنف امام یوسف بن عمر بن یوسف الکادوری نے یہ مسئلہ لکھا ہے اور اس کے بعد سب نے اُس کی پیروی کی اور نقل کرتے چلے گئے، اس کی علت پر توجہ نہیں دی۔ علامہ نور اللہ بصیر پوری کے بقول اُن سے سہو ہوا اور باقی نے آنکھیں بند کر کے اُن کا اتباع کیا، لہٰذا کھڑے ہو کر اقامت سننے کو مکروہ کہنا درست نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ خلافِ اولیٰ کہہ سکتے ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْحَاصِلُ أَنَّ السُّنَّةَ إِنْ كَانَتْ مُؤَكَّدَةً قَوِيَّةً لَا يَبْعُدُ كَوْنُ تَرْكِهَا مَكْرُوهًا تَحْرِيمًا، وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ مُؤَكَّدَةٍ فَتَرْكُهَا مَكْرُوهٌ تَنْزِيهًا وَأَمَّا الْمُسْتَحَبُّ أَوِ الْمَنْدُوبُ فَيَنْبَغِي أَنْ يُكْرَهَ تَرْكُهُ أَصْلًا، لِقَوْلِهِمْ يُسْتَحَبُّ يَوْمَ الْأَضْحٰى أَنْ لَا يَأْكُلَ أَوَّلًا إِلَّا مِنْ أُضْحِيَّتِهٖ، وَلَوْ أَكَلَ مِنْ غَيْرِهَا لَمْ يُكْرَهْ، فَلَمْ يَلْزَمْ مِنْ تَرْكِ الْمُسْتَحَبِّ ثُبُوتُ الْكَرَاهَةِ إِلَّا أَنَّهُ يُشْكِلُ عَلَيْهِ قَوْلُهُمُ الْمَكْرُوهُ تَنْزِيهًا مَرْجِعُهُ إِلٰى خِلَافِ الْأَوْلٰى، وَلَا شَكَّ أَنَّ تَرْكَ الْمُسْتَحَبِّ خِلَافُ الْأَوْلٰى''۔

ترجمہ: ''حاصل یہ ہے کہ سنت اگر قوت کے ساتھ مؤکدہ ہو، تو بعید نہیں کہ اس کا ترک مکروہِ تحریمی ہو اور اگر غیر مؤکدہ ہے تو اس کا ترک مکروہِ تنزیہی ہو اور رہا مستحب یا مندوب تو چاہیے کہ اس کا ترک اصلاً مکروہ ہو، کیونکہ فقہائے کرام نے فرمایا: یوم الاضحیٰ کو مستحب یہ ہے کہ نمازِ عید سے پہلے نہ کھائے اور قربانی کے گوشت سے کھائے اور اگر قربانی کے گوشت کے علاوہ کوئی اور چیز کھائی تو مکروہ نہیں ہے، سو ترکِ مستحب سے کراہت کا ثابت ہونا لازم نہیں آتا، سوائے اس کے کہ اس پر فقہائے کرام کے اس قول پر اشکال ہوتا ہے کہ مکروہِ تنزیہی کا مرجع (یعنی مآل) ''خلافِ اولیٰ'' ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مستحب کا ترک کرنا خلافِ اولیٰ ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، ج:2، ص:367)''۔ اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے تو ترکِ مستحب کو خلافِ اولیٰ کہنا چاہیے، لیکن چونکہ مکروہِ تنزیہی کا

مآل بھی خلافِ اولیٰ ہے، لہٰذا ترکِ مستحب کو بھی مکروہِ تنزیہی کہہ سکتے ہیں، یعنی دلیلِ خاص کے بغیر بھی مکروہِ تنزیہی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَالْوُضُوْءُ لِمُطْلَقِ الذِّكْرِ مَنْدُوْبٌ وَتَرْكُهُ خِلَافُ الْأَوْلٰى، وَهُوَ مَرْجِعُ كَرَاهَةِ التَّنْزِيْهِ''۔

ترجمہ: ''مطلق ذکر کے لیے وضو مستحب ہے اور اس کا ترک خلافِ اولیٰ ہے اور یہی کراہتِ تنزیہی کا مآل ہے''، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''(قَوْلُهُ: وَهُوَ مَرْجِعُ كَرَاهَةِ التَّنْزِيْهِ) أَيْ فَلِذَا قَيَّدَ بِقَوْلِهِ أَيْ تَحْرِيمًا، وَقَصَدَ بِذٰلِكَ الرَّدَّ عَلٰى قَوْلِ الْبَحْرِ، وَتَرْكُ الْمُسْتَحَبِّ لَا يُوْجِبُ كَرَاهَةً''۔

ترجمہ: علامہ علاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول: ''خلافِ اولیٰ کا مرجع کراہتِ تنزیہی ہے''، یعنی اسی لیے علامہ حصکفی نے حالتِ جنابت ونفاس میں دعا پڑھنے کے بارے میں کہا کہ یہ مکروہِ تحریمی نہیں ہے، ''تحریما'' کی قید سے علامہ حصکفی نے علامہ ابن نجیم کے اس قول کا رد کیا ہے کہ ترکِ مستحب سے کراہتِ تحریمی لازم نہیں آتی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:1، ص: 174)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض صورتوں میں ترکِ مستحب پر کراہتِ تنزیہی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہاتِ صلوٰۃ بیان کرتے ہوئے لکھا:

''وَتَرْكُ كُلِّ سُنَّةٍ وَمُسْتَحَبٍّ''، ترجمہ: ہر سنت اور مستحب کا ترک مکروہ ہے، (الدرالمختار، ج:1، ص:653)''۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد مکروہِ تنزیہی ہے، پس معلوم ہوا کہ ترکِ مستحب پر بھی فقہائے کرام بعض اوقات مکروہِ تنزیہی کا اطلاق کردیتے ہیں۔

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثَانِيْهِمَا الْمَكْرُوْهُ تَنْزِيْهًا وَمَرْجِعُهُ إِلٰى مَا تَرْكُهُ أَوْلٰى وَكَثِيْرًا مَا يُطْلِقُوْنَهُ كَمَا ذَكَرَهُ الْعَلَّامَةُ الْحَلَبِيُّ فِيْ مَسْأَلَةِ مَسْحِ الْعَرَقِ فَحِيْنَئِذٍ إِذَا ذَكَرُوْا مَكْرُوْهًا فَلَا بُدَّ مِنَ النَّظَرِ

فِیْ دَلِیْلِہٖ فَإِنْ کَانَ نَھْیًا ظَنِّیًّا یُحْکَمُ بِکَرَاھَۃِ التَّحْرِیْمِ اِلَّا لِصَارِفٍ لِلنَّھْیِ عَنِ التَّحْرِیْمِ اِلَی النَّدْبِ فَإِنْ لَّمْ یَکُنِ الدَّلِیْلُ نَھْیًا بَلْ کَانَ مُفِیْدًا لِلتَّرْکِ الْغَیْرِ الْجَازِمِ فَھِیَ تَنْزِیْھِیَّۃٌ"۔

ترجمہ: "ان میں سے دوسرا مکروہِ تنزیہی ہے اور اس کا مآل ترکِ اولیٰ ہے اور فقہائے کرام ترکِ اولیٰ پر اکثر مکروہِ تنزیہی کا اطلاق کرتے ہیں، جیسا کہ علامہ حلبی نے "پسینہ پونچھنے" کے مسئلے پر اس کا اطلاق کیا ہے، پس نتیجہ یہ نکلا کہ جب فقہائے کرام کسی بات کو مکروہ بیان کریں، تو اس کی دلیل پر غور کرنا ضروری ہے، سو اگر دلیل "نہیِ ظنّی" ہے تو کراہتِ تحریمی کا اطلاق کیا جائے گا، ورنہ نہی کو تحریم سے (ترکِ) مستحب پر محمول کیا جائے گا، پس اگر دلیلِ نہی نہ ہو بلکہ تاکید کے ساتھ ترک کا حکم نہ ہو تو وہ تنزیہی ہے، (البحر الرائق، ج:2،ص: 20)"۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

"فقہائے کرام نے علت یہ بیان کی ہے کہ اس میں سنت کا ترک ہے اور یہ مکروہِ تنزیہی کا فائدہ دیتا ہے، کیونکہ اس میں "نہیِ خاص" نہیں ہے کہ مکروہِ تحریمی قرار دیا جاتا"۔
(البحر الرائق، ج:2،ص:40)

علامہ وحید الزماں لکھتے ہیں:

"لَا تَقُوْمُوْا حَتّٰی تَرَوْنِیْ (مسجد میں جب تم لوگ بیٹھے ہو تو) اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک مجھ کو نہ دیکھو (یعنی نماز کے لیے پہلے سے کھڑے ہو جانا بے فائدہ بات ہے، جب امام آجائے اس وقت لوگ کھڑے ہوں۔ بعضوں نے کہا: یہ حکم ہر ایک مجلس کے لیے عام ہے) (لغات الحدیث، باب القاف مع الواو، ص:184، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)"۔

علامہ مفتی سعید احمد پالن پوری لکھتے ہیں:

"دوسرا مسئلہ: اگر امام مسجد میں موجود ہو تو لوگ اقامت کے ساتھ ہی کھڑے ہو سکتے ہیں، کیونکہ اقامت کے معنی ہیں: کھڑا کرنا، پس جب کھڑا کرنا پایا گیا تو کھڑے ہونے کی گنجائش ہے، البتہ اگر کوئی بیٹھا رہے تو حی علی الصلاۃ پر ضرور کھڑا ہو جائے، ورنہ اللہ کے داعی کی مخالفت لازم آئے گی۔ علامہ احمد طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی عبارت یقوم الناس عند حی علی

الصلاۃ کا یہی مطلب لکھا ہے، (حاشیہ طحطاوی علی الدر المختار، ج:1،ص:215)، (تحفۃ الالمعی، ج:1،ص:511)''۔ مزید لکھتے ہیں:

''اور اگر امام مسجد سے ملحق کمرہ میں ہو تو جب تک امام کمرہ سے نہ نکلے لوگ کھڑے نہ ہوں، کیونکہ اقامت سے امام کا نکلنا متخلف ہو سکتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہی نصیحت فرمائی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے تکبیر شروع کرنے پر آپ حضرات کھڑے نہ ہوں، بلکہ جب مجھے حجرہ سے نکلتا دیکھیں، تب کھڑے ہوں، کیونکہ اس کا امکان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم گھر میں کسی کام میں مشغول ہوں یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نیت بندھی ہوئی ہو، پس لوگوں کو کھڑے کھڑے نماز کا انتظار کرنا پڑے گا، جو مکروہ ہے۔

فائدہ (1): اگر اقامت سے امام کا نکلنا متخلف ہو جائے تو مؤذن کو بھی بیٹھ جانا چاہیے، پھر اگر امام فوراً نکل آئے تو تکبیر کا اعادہ ضروری نہیں اور امام کو نکلنے میں تاخیر ہو تو تکبیر دوبارہ کہنی چاہیے اور تھوڑے اور زیادہ وقفہ کا فیصلہ رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دیا گیا ہے، یعنی لوگ خود ہی اس کا فیصلہ کریں۔

فائدہ (2): اسی طرح یہ جو طریقہ چل پڑا ہے کہ لوگ پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں اور امام صاحب بھی مصلی پر پہنچ جاتے ہیں، پھر تکبیر شروع ہوتی ہے، یہ بھی غلط طریقہ چل پڑا ہے۔ جب تک اقامۃ (کھڑا کرنا) نہ پایا جائے، کھڑے ہونے کے کیا معنی ؟، اور کھڑے کھڑے اقامت کا انتظار کرنا مکروہ ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت ہے۔ پس لوگوں کو چاہیے کہ وہ گھڑی میں وقت ہونے پر کھڑے نہ ہوں، نہ امام صاحب نہ مقتدی۔ بلکہ پہلے اقامہ (تکبیر) شروع کی جائے، پھر لوگ کھڑے ہوں''۔

(تحفۃ الالمعی، ج:1،ص:511، زمزم پبلشرز کراچی)

امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے پوچھا گیا:

''علمائے دین اس مسئلے میں کہ تکبیر کے شروع ہونے کے وقت امام ومقتدی کو کھڑا رہنا چاہیے یا بیٹھ جانا چاہیے اور بیٹھ جانے میں کیا فضیلت ہے اور کھڑا رہنے میں کیا نقصان ہے''

کے جواب میں لکھتے ہیں:

''امام کے لیے اس میں کوئی خاص حکم نہیں، مقتدیوں کو حکم ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح پر کھڑے ہوں، کھڑے کھڑے تکبیر سننا مکروہ ہے یہاں تک کہ عالمگیری میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد میں آئے کہ تکبیر ہو رہی ہو فوراً بیٹھ جائے اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح پر کھڑا ہو اور اس میں راز مکبّر کے اس قول کی مطابقت ہے: ''قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ''، اُدھر اس نے حَیَّ عَلَی الْفَلَاح کہا کہ آؤ مراد پانے کو جماعت کھڑی ہوئی، اس نے کہا: قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ، جماعت قائم ہوگئی، (فتاویٰ رضویہ، ج:5،ص:421)۔

مزید لکھتے ہیں:

''اگر امام تکبیر ہوتے میں چلا تو اُسے بیٹھنے کی بھی حاجت نہیں، مصلّے پر جائے اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاح یا ختمِ تکبیر پر تکبیر تحریمہ کہے، یونہی بعد خطبہ اسے اختیار ہے، کہیں منقول نہیں کہ خطبہ فرما کر تکبیر ہونے تک جلوس فرماتے، یہ حکم قوم کے لیے ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج:5،ص:419)

آپ سے پوچھا گیا: ''زید کہتا ہے کہ امام اور مقتدی بیٹھ کر تکبیر سنیں الخ''، آپ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''مقتدیوں کو حکم یہ ہے کہ تکبیر بیٹھ کر سنیں، جب مکبّر حَیَّ عَلَی الْفَلَاح پر پہنچے تو اس وقت کھڑے ہوں، (فتاویٰ رضویہ، ج:5،ص:422)''۔

## رمضان میں عشاء کی نماز تنہا پڑھنے والے شخص کی وتر کی جماعت میں شمولیت کا جواز

ماہِ رمضان میں تنہا عشاء کے فرض پڑھنے والے شخص کے لیے وتر کی جماعت میں شامل ہونے کا مسئلہ فقہائے احناف کے مابین مختلف فیہ ہے اور یہ نزاع اور اختلاف بھی محض اَوْلَوِیَّت اور غیر اَوْلَوِیَّت کے اعتبار سے ہے، یعنی اختلاف محض اس بات میں ہے کہ تنہا عشاء کے فرض پڑھنے والے کے لیے آیا وتر کی جماعت میں شامل ہونا اَولیٰ ہے یا خلاف

اَولیٰ ہے اور بطورِ عادت ہو تو زیادہ سے زیادہ کراہتِ تنزیہی کا قول کیا جا سکتا ہے، بلکہ خود ماہِ رمضان میں جماعت کے ساتھ وتر پڑھنے کی افضلیت وغیر افضلیت فقہاءِ احناف کے مابین مختلف فیہ ہے، اگرچہ مفتیٰ بہٖ قول یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ وتر پڑھنا افضل ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق ہم اپنی رائے ذکر کرنے سے پہلے اس بارے میں فقہاءِ احناف کی آراء اور اُن کے مابین اِس اختلاف کی بنیاد اور وجہ پیش کرتے ہیں۔ الغرض فقہاءِ احناف کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ماہِ رمضان میں وتر کی جماعت، عشاء کے فرضوں کے تابع ہے یا تراویح کے تابع ہے، یا یہ اِن دونوں سے جدا اور علیحدہ مستقل جماعت ہے اور ماہِ رمضان کے تابع ہے۔

قولِ اول: بعض فقہائے کرام کے نزدیک وتر کی جماعت تمام نمازیوں کے حق میں جماعتِ عشاء کے تابع ہے، لہٰذا جس نے کسی بھی وجہ سے عشاء کے فرض جماعت کے بغیر تنہا پڑھے ہوں، وہ وتر کی نماز بھی تنہا پڑھے گا اور اُس کے لئے وتر کی جماعت میں شامل ہونا خلافِ اولیٰ (اور بطورِ عادت کراہتِ تنزیہی) ہے اور اگر اُس نے عشاء کی فرض نماز جماعت کے ساتھ پڑھی ہو تو وہ باجماعت وتر پڑھ سکتا ہے، چاہے تو اُس امام کے ساتھ وتر کی جماعت میں شامل ہو جائے جس کی اقتدا میں عشاء کے فرض ادا کئے ہیں اور کسی دوسرے امام کی اقتدا میں بھی وتر پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ قُہستانی کے حوالے سے علامہ شامی لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: ”لٰكِنَّهٗ إِذَا لَمْ يُصَلِّ الْفَرْضَ مَعَهٗ لَا يَتْبَعُهٗ فِي الْوِتْرِ“۔

ترجمہ: ”لیکن اگر اُس نے امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو وہ وتر میں اُس کا اتباع نہیں کرے گا“۔

علامہ قُہستانی کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”لٰكِنْ يَنْبَغِيْ أَنْ يَكُوْنَ قَوْلُ الْقُهُسْتَانِيِّ ”مَعَهٗ“ اِحْتِرَازًا عَنْ صَلَاتِهَا مُنْفَرِدًا، أَمَّا لَوْ صَلَّاهَا جَمَاعَةً مَعَ غَيْرِهٖ ثُمَّ صَلَّى الْوِتْرَ مَعَهٗ لَا كَرَاهَةَ“۔

ترجمہ: ”لیکن علامہ قہستانی کا یہ کہنا کہ ”عشاء کے فرض امام کے ساتھ نہ پڑھے ہوں“، یہ

اس کے تنہا عشاء کے فرض پڑھنے سے احتراز ہے، (یعنی اگر کسی نے تنہا عشاء کے فرض پڑھے ہوں تو وتر کی نماز بھی تنہا پڑھے گا) البتہ اگر اُس نے عشاء کے فرض کسی دوسرے امام کی اقتدا میں باجماعت پڑھے ہوں، پھر اس نے اُس (دوسرے) امام کے ساتھ وتر کی نماز پڑھی تو یہ مکروہ نہیں ہے، (رَدُّالْمُحْتَار، ج2، ص:48)"۔ یعنی کسی کراہیت کے بغیر وتر کی جماعت میں شامل ہونے کے لیے بہر حال جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھنا ضروری ہے، خواہ اُسی امام کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھی ہو جس کے ساتھ جماعت وتر میں شامل ہو رہا ہے یا کسی اور امام کی اقتدا میں پڑھی ہو۔

ہمارے بعض متاخرین اکابر فقہائے کرام نے اِسی رائے پر عمل کرتے ہوئے ماہِ رمضان میں تنہا عشاء کے فرض پڑھنے والے شخص کو وتر کی جماعت میں شامل ہونے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ امام اہلسنت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز فرماتے ہیں:

"مَنْ صَلَّی الْفَرْضَ بِجَمَاعَۃٍ یَّجُوْزُ لَہُ الدُّخُوْلُ فِیْ جَمَاعَۃٍ سَوَاءٌ صَلَّی الْفَرْضَ خَلْفَ ھٰذَا الْاِمَامِ اَوْ خَلْفَ غَیْرِہٖ وَسَوَاءٌ صَلَّی التَّرَاوِیْحَ وَحْدَہٗ اَوْ خَلْفَ ھٰذَا الْاِمَامِ اَوْ خَلْفَ غَیْرِہٖ بَلْ وَمَنْ لَّمْ یُصَلِّھَا رَأْسًا۔۔۔اِلٰی قَوْلِہٖ۔۔۔فَاِنَّ مَنْ صَلَّی الْفَرِیْضَۃَ مُنْفَرِدًا لَیْسَ لَہٗ اَنْ یَّدْخُلَ فِیْ جَمَاعَۃِ الْوِتْرِ لَا مَعَ ھٰذَا الْاِمَامِ وَلَا مَعَ غَیْرِہٖ"۔

ترجمہ: "جس نے عشاء کے فرض جماعت کے ساتھ پڑھے ہوں تو اُس کے لیے جماعتِ (وتر) میں داخل ہونا جائز ہے، خواہ اُس نے فرض اِس امام کے پیچھے پڑھے ہوں یا کسی دوسرے امام کے پیچھے اور خواہ اس نے تراویح تنہا پڑھی ہوں یا اُس امام کی اقتداء میں (جس کے ساتھ جماعتِ وتر میں شامل ہونا چاہتا ہے) یا کسی اور امام کی اقتدا میں تراویح پڑھی ہوں، بلکہ اگر سِرے سے تراویح پڑھی ہی نہ ہوں تب بھی (مذکورہ بالا صورت میں) وہ جماعت کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے اور جس نے عشاء کے فرض تنہا پڑھے ہوں اُس کے لیے وتر کی جماعت میں شامل نہیں ہونا چاہیے، نہ تو اِس امام کے ساتھ (جس کی اقتدا میں تراویح پڑھی ہے) اور نہ کسی دوسرے امام کے ساتھ، (جِدُّ الْمُمْتَار: ج3 ص:493)"۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''اگر عشاء جماعت سے پڑھی اور تراویح تنہا، تو وتر کی جماعت میں شریک ہوسکتا ہے اور اگر عشاء تنہا پڑھ لی اگرچہ تراویح با جماعت پڑھی تو وتر تنہا پڑھے''۔

(بہار شریعت، جلد: 1، ص: 693)

قولِ دوم: اس کے برعکس بعض فقہائے کرام نے کہا ہے کہ جماعتِ وتر، جماعتِ تراویح کے تابع ہے، لہٰذا اگر کسی نے جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھی ہو تو اس قول کی روشنی میں وہ وتر کی جماعت میں شامل نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ وتر تنہا پڑھے۔

علامہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ شرح صغیر میں لکھتے ہیں:

''اِذَا لَمْ یُصَلِّ الْفَرْضَ مَعَ الْاِمَامِ، قِیْلَ: لَایَتْبَعُهٗ فِی التَّرَاوِیْحِ وَلَا فِی الْوِتْرِ وَکَذَا اِذَا لَمْ یُصَلِّ مَعَهُ التَّرَاوِیْحَ لَا یَتْبَعُهٗ فِی الْوِتْرِ''۔

ترجمہ: ''اگر امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں، تو کہا گیا ہے کہ وہ نہ تو تراویح میں امام کی اقتدا کرے اور نہ ہی وتر میں، اسی طرح اگر امام کی اقتدا میں صرف تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے، (صغیری، صلاۃ التراویح، فروع مَنْ فَاتَتْهُ تَرْوِیْحَةٌ: ص: 210)''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فِی التَّتَارْخَانِیَّةِ عَنِ التَّتِمَّةِ أَنَّهٗ سُئِلَ عَلِیُّ بْنُ أَحْمَدَ عَمَّنْ صَلَّی الْفَرْضَ وَالتَّرَاوِیْحَ وَحْدَهٗ أَوِ التَّرَاوِیْحَ فَقَطْ، هَلْ یُصَلِّی الْوِتْرَ مَعَ الْإِمَامِ، فَقَالَ: لَا''۔

ترجمہ: ''تاتارخانیہ میں ''التَّتِمَّة'' کے حوالے سے منقول ہے کہ علی بن احمد سے اُس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے فرض اور تراویح تنہا پڑھی ہوں یا صرف تراویح تنہا پڑھی ہوں، تو کیا وہ امام کے ساتھ وتر پڑھے گا؟ انہوں نے فرمایا: نہیں''۔

(رَدُّالْمُحْتَار: ج: 2، ص: 48)

**قولِ سوم:** علامہ عبدالرحمٰن آفندی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْ تَرَكُوا الْجَمَاعَةَ فِي الْفَرْضِ لَمْ يُصَلُّوا التَّرَاوِيحَ بِجَمَاعَةٍ وَلَوْ لَمْ يُصَلِّهَا مَعَ الْإِمَامِ صَلَّى الْوِتْرَ بِهِ لِأَنَّهُ تَابِعٌ لِرَمَضَانَ وَعِنْدَ الْبَعْضِ لَا، لِأَنَّهُ تَابِعٌ لِلتَّرَاوِيحِ''۔

ترجمہ: ''اور اگر لوگوں نے فرض میں جماعت کو ترک کر دیا ہو تو وہ تراویح جماعت کے ساتھ نہیں پڑھیں گے اور اگر کسی نمازی نے تراویح امام کے ساتھ نہ پڑھی ہوں، تو وہ وتر اُس کے ساتھ پڑھ لے، کیونکہ وتر رمضان کے تابع ہیں اور بعض کے نزدیک نہ پڑھے کیونکہ وتر کی جماعت تراویح کے تابع ہے، (مَجْمَعُ الْاَنْهُر: ج:1، ص136)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''صحیح یہ ہے کہ نفسِ وتر اگرچہ عشاء کے تابع ہیں، لیکن وتر کی جماعت کا مسنون ہونا تراویح کی جماعت کے سنت ہونے کے تابع ہے، کیونکہ اگر وتر جماعتِ عشاء کے تابع ہوتے تو سارا سال وتر جماعت کے ساتھ مسنون ہوتے، کیونکہ عشاء کی نماز میں جماعت سارا سال مسنون ہے اور چونکہ وتر کی جماعت صرف رمضان میں مسنون ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی جماعت کا سنت ہونا تراویح کی جماعت کے سُنت ہونے کے تابع ہے۔

مزید لکھتے ہیں: علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''الَّذِي يَظْهَرُ أَنَّ جَمَاعَةَ الْوِتْرِ تَبَعٌ لِجَمَاعَةِ التَّرَاوِيحِ وَإِنْ كَانَ الْوِتْرُ نَفْسُهُ أَصْلًا فِي ذَاتِهِ لِأَنَّ سُنَّةَ الْجَمَاعَةِ فِي الْوِتْرِ إِنَّمَا عُرِفَتْ بِالْأَثَرِ تَابِعَةً لِلتَّرَاوِيحِ''۔

ترجمہ: ''ظاہر بات یہ ہے کہ (جماعت کے حق میں) وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے، اگرچہ وتر بذاتہٖ اصل ہے، لیکن (ماہِ رمضان میں) وتر کی جماعت کا سنت ہونا آثارِ (صحابہ) کی روشنی میں تراویح کے تابع ہے''۔

(رَدُّالْمُحْتَار عَلَى الدُّرِّ الْمُخْتَار، ج:2، ص:436، بیروت)

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ کا وتر کی جماعت کے سُنّت ہونے کو تراویح کی جماعت کے سُنت ہونے کے تابع قرار دینے پر علامہ ابن عابدین شامی کی اس عبارت سے

استدلال محلِّ نظر ہے، اس لیے کہ علامہ ابن عابدین شامی نے وتر کی جماعت کی تابعیت کو فقط جماعتِ عشاء میں محصور نہیں کیا، بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ جماعتِ وتر بیک وقت جماعتِ عشاء و جماعتِ تراویح اور ماہِ رمضان کے تابع ہے۔ البتہ وتر کی جماعت کا فرضِ عشاء کی جماعت کے تابع ہونا ہر ایک کے حق میں ہے اور اس کا تراویح کے تابع ہونا فقط جماعت کے حق میں ہے، منفرد کے حق میں نہیں ہے، چنانچہ اُنہوں نے اپنی مذکورہ بالا عبارت میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابن عابدین نے منفرد کے حق میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ اُس کے لئے نمازِ وتر نمازِ تراویح کے تابع نہیں ہے، سو ہماری نظر میں اِس عبارت کا مُستفاد یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر سب لوگوں نے تراویح کی نماز باجماعت نہیں پڑھی، تو وہ وتر بھی باجماعت نہیں پڑھیں گے، لیکن اگر اکثر نے نمازِ تراویح باجماعت پڑھ لی ہے یا کسی مسجد میں باجماعت تراویح ہو چکی ہے اور کسی ایک شخص یا چند اشخاص نے تراویح باجماعت نہیں پڑھیں، تو وہ وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتے ہیں، چنانچہ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"لِاَنَّ جَمَاعَتَهَا تَبَعٌ لِّجَمَاعَةِ الْفَرْضِ، فَإِنَّهَا لَمْ تَقُمْ إِلَّا بِجَمَاعَةِ الْفَرْضِ، فَلَوْ أُقِيمَتْ بِجَمَاعَةٍ وَحْدَهَا كَانَتْ مُخَالِفَةً لِلْوَارِدِ فِيهَا فَلَمْ تَكُنْ مَشْرُوعَةً؛ أَمَّا لَوْ صُلِّيَتْ بِجَمَاعَةِ الْفَرْضِ وَكَانَ رَجُلٌ قَدْ صَلَّى الْفَرْضَ وَحْدَهُ، فَلَهُ أَنْ يُصَلِّيَهَا مَعَ ذٰلِكَ الْإِمَامِ لِاَنَّ جَمَاعَتَهُمْ مَشْرُوعَةٌ فَلَهُ الدُّخُولُ فِيهَا مَعَهُمْ لِعَدَمِ الْمَحْذُورِ"۔

ترجمہ: "کیونکہ تراویح کی جماعت فرض کی جماعت کے تابع ہے، اس لیے کہ تراویح کی جماعت فرض کی جماعت کے ساتھ ہی قائم ہوئی ہے، پس اگر ایک جماعت نے اکیلے اکیلے نمازِ تراویح پڑھ لی، تو (چونکہ) یہ اس بارے میں وارِد ہونے والے آثار کی مخالفت ہوگی، لہٰذا اسے جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔ البتہ اگر تراویح کی نماز فرضِ عشاء کی جماعت کے ساتھ پڑھ لی گئی اور کوئی ایسا شخص ہے جس نے فرض تنہا پڑھے ہیں تو اُس کے لیے امام کے ساتھ تراویح پڑھنا جائز ہے، اس لیے کہ تراویح کی جماعت بحیثیتِ مجموعی مشروع ہے،

لہٰذا اس کے لیے اُن کے ساتھ جماعت میں داخل ہونا جائز ہے، کیونکہ اس سے کوئی مانع نہیں پایا جاتا، (رَدُّالْمُحْتَار: ج:2،ص:48)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَوْ لَمْ يُصَلِّهَا أَيِ التَّرَاوِيحَ بِالْإِمَامِ أَوْ صَلَّاهَا مَعَ غَيْرِهِ لَهُ أَنْ يُّصَلِّيَ الْوِتْرَ مَعَهُ، بَقِيَ لَوْ تَرَكَهَا الْكُلُّ، هَلْ يُصَلُّوْنَ الْوِتْرَ بِجَمَاعَةٍ، فَلْيُرَاجَعْ''۔

ترجمہ: ''اور اگر اُس نے تراویح امام کے ساتھ نہیں پڑھیں یا کسی اور امام کے ساتھ پڑھی ہیں تو وہ وتر امام کے ساتھ باجماعت پڑھ سکتا ہے (کیونکہ اس کے حق میں وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع نہیں اور مطلقاً تراویح کی جماعت ادا ہو چکی ہے)، باقی یہ صورت رہ جاتی ہے کہ اگر (کسی مقام پر) تمام لوگوں نے تراویح کی جماعت کو ترک کردیا ہو (کیونکہ یہ سنّتِ مُتوارثہ کا ترک ہے) تو کیا وہ جماعت کے ساتھ وتر پڑھیں گے؟ تو اس کی بابت (مآخذِ فقہ سے) رجوع کیا جائے (اس کی تشریح علامہ شامی کے حوالے سے گزر چکی ہے کہ اس صورت میں وہ سب وتر باجماعت نہیں پڑھیں گے)''۔

(رَدُّالْمُحْتَار، جلد2،ص:436، بیروت)

**قولِ چہارم:** بعض فقہائے کرام کے نزدیک ماہِ رمضان میں وتر کی جماعت نہ تو جماعتِ تراویح کے تابع ہے اور نہ ہی عشاء کی جماعت کے تابع، بلکہ یہ مستقل نماز ہے اور اس کی جماعت ماہِ رمضان کے تابع ہے، اس تعلیل کی روشنی میں عشاء کے فرض تنہا پڑھنے والے کے لیے وتر کی جماعت میں شامل ہونے کا جواز ثابت ہوتا ہے، یہ علامہ طحطاوی اور علامہ حلبی کا مذہب ہے۔

چنانچہ امام اہلسنّت امام احمد رضا قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''اَمَّا مَا ذَكَرُوْا اَنَّ جَمَاعَةَ الْوِتْرِ هَلْ هِيَ تَبَعٌ لِّجَمَاعَةِ التَّرَاوِيْحِ اَمْ لَا، جَنَحَ الْفَاضِلَانِ الْحَلَبِيُّ وَالطَّحْطَاوِيُّ فِيْ حَوَاشِي الدُّرِّ اِلَى الثَّانِيْ وَاسْتَظْهَرَ الشَّامِيُّ اَوَّلًا''۔

ترجمہ: ''رہی یہ بات جو فقہاء نے ذکر کی ہے کہ وتر کی جماعت آیا تراویح کی جماعت کے

تابع ہے یا نہیں! تو فاضلانِ گرامی علامہ حلبی اور علامہ طحطاوی نے درمختار کے حاشیہ میں دوسری شق (یعنی جماعتِ وتر جماعتِ تراویح کے تابع نہیں ہے) کی طرف اور علامہ شامی نے پہلی شق (یعنی جماعتِ وتر جماعتِ تراویح کے تابع ہے) کو ترجیح دی ہے"۔

(جِدُّ المُمْتَار: ج3ص:496)

چنانچہ علامہ طحطاوی نے درمختار پر تحریر کردہ اپنے حاشیہ میں اس صورت (یعنی اگر تمام لوگ باجماعت تراویح کو ترک کردیں تو آیا وہ وتر جماعت کے ساتھ پڑھیں گے یا نہیں) کے بارے میں علامہ علاء الدین حصکفی کا یہ قول نقل کیا: "فَلْيُرَاجَعْ"، یعنی اس کی بابت مآخذ فقہ کی طرف رجوع کرلیا جائے، علامہ شامی نے تو منع لکھا ہے، لیکن علامہ طحطاوی اس پر تفریع فرماتے ہیں:

"قَضِيَّةَ التَّعْلِيْلِ فِی الْمَسْئَلَةِ السَّابِقَةِ بِقَوْلِهِمْ: 'لِاَنَّهَا تَبَعٌ'، اَنْ يُّصَلِّيَ الْوِتْرَ بِجَمَاعَةٍ فِیْ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ، لِاَنَّهَا لَيْسَ بِتَبَعٍ لِلتَّرَاوِيْحِ وَلَا لِلْعِشَاءِ عِنْدَ الْاِمَامِ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی"۔

ترجمہ: "سابقہ مسئلہ میں (علامہ حصکفی کا) اپنے اس قول 'لِاَنَّهَا تَبَعٌ' سے بیان کردہ علت کا تقاضا یہ ہے کہ اس صورت میں وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جائے، کیونکہ نمازِ وتر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہ تو تراویح کے تابع ہے اور نہ ہی فرض عشاء کے تابع، (حاشیۃ الطحطاوی: ج1، ص:297)"، یعنی علامہ حصکفی نے فرض کی جماعت ترک کرنے والے کے لیے تراویح کی جماعت میں شامل ہونے کے جواز کی علت چونکہ یہ بیان کی ہے کہ تراویح کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہے، لہٰذا اس تعلیل سے یہ معلوم ہوا کہ اگر تمام لوگ تراویح کو ترک کردیں تو وہ باجماعت وتر پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ نمازِ وتر مستقل نماز ہے یہ نہ تو عشاء کے تابع ہے اور نہ ہی تراویح کے تابع۔

علامہ طحطاوی کے اس کلام کی روشنی میں تنہا فرض پڑھنے والے کے لیے کراہت کے بغیر وتر کی جماعت میں شامل ہونے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ جب اصل یعنی

جماعتِ فرض کو چھوڑنے والا تابع یعنی جماعتِ تراویح میں شامل ہوسکتا ہے، تو اُس کے لیے وتر کی جماعت میں شامل ہونا بطریقِ اَولیٰ جائز ہوگا، کیونکہ وہ تو مستقل اور علیحدہ نماز ہے، نہ وہ فرض کے تابع ہے اور نہ ہی تراویح کے۔

علامہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ شرح صغیر میں لکھتے ہیں:

''اِذَا لَمْ یُصَلِّ الْفَرْضَ مَعَ الْاِمَامِ، قِیْلَ: لَایَتْبَعُهٗ فِی التَّرَاوِیْحِ وَلَا فِی الْوِتْرِ وَکَذَا اِذَا لَمْ یُصَلِّ مَعَهُ التَّرَاوِیْحَ لَایَتْبَعُهٗ فِی الْوِتْرِ، وَالصَّحِیْحُ اَنَّهٗ یَجُوْزُ أَنْ یَّتْبَعَهٗ فِیْ ذٰلِكَ کُلِّهٖ حَتّٰی لَوْ دَخَلَ بَعْدَ مَا صَلَّی الْاِمَامُ الْفَرْضَ وَشَرَعَ فِی التَّرَاوِیْحِ فَاِنَّهٗ یُصَلِّی الْفَرْضَ اَوَّلًا وَحْدَهٗ ثُمَّ یُتَابِعُهٗ فِی التَّرَاوِیْحِ، وَفِی الْقُنْیَةِ لَوْ تَرَکُوا الْجَمَاعَةَ فِی الْفَرْضِ لَیْسَ لَهُمْ اَنْ یُّصَلُّوا التَّرَاوِیْحَ جَمَاعَةً''۔

ترجمہ: ''اگر کسی نے امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں، تو کہا گیا ہے کہ پھر امام کی اقتدا میں نہ تراویح پڑھے نہ وتر، اسی طرح اگر امام کی اقتداء میں صرف تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے اور صحیح یہ ہے کہ ان سب میں امام کی اقتدا کرے گا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس وقت داخل ہوا جب امام فرض پڑھا کر تراویح شروع کرچکا تھا تو وہ پہلے تنہا فرض پڑھے گا اور پھر تراویح میں اس کا اتباع کرے گا۔ اور ''القنیة'' میں ہے: اگر تمام لوگوں نے فرضِ عشاء کی جماعت کو ترک کردیا تو اُن کے لیے جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنا جائز نہیں ہے، (صَغِیْرِی، صلاۃ التراویح، فروع مَنْ فَاتَتْهُ تَرْوِیْحَةٌ: ص:210)''۔ یعنی یہ عدمِ جواز تنہا جماعتِ فرض کے تارک کے لیے نہیں ہے۔

نیز علامہ عبدالرحمٰن آفندی نے صراحت کی ہے کہ ماہِ رمضان میں وتر کی جماعت کا تراویح کی جماعت کے تابع ہونا فقہائے کرام کے نزدیک مُختلف فیہ ہے، کیونکہ بعض فقہائے کرام کے نزدیک وتر کی جماعت محض ماہِ رمضان کے تابع ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْ تَرَکُوا الْجَمَاعَةَ فِی الْفَرْضِ لَمْ یُصَلُّوا التَّرَاوِیْحَ بِجَمَاعَةٍ وَلَوْ لَمْ یُصَلِّهَا مَعَ الْإِمَامِ صَلَّی الْوِتْرَ بِهٖ لِاَنَّهٗ تَابِعٌ لِرَمَضَانَ وَعِنْدَ الْبَعْضِ لَا، لِاَنَّهٗ تَابِعٌ لِلتَّرَاوِیْحِ''۔

ترجمہ: "اور اگر (کسی مقام پر) سب نے فرض کی جماعت کو ترک کر دیا، تو وہ تراویح بھی جماعت کے ساتھ نہیں پڑھیں گے اور اگر کسی نے تراویح امام کے ساتھ نہ پڑھی ہوں تو وہ وتر اُس کے ساتھ پڑھے گا کیونکہ وتر رمضان کے تابع ہے اور بعض کے نزدیک نہیں پڑھے گا، کیونکہ وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے، (مَجۡمَعُ الۡاَنۡھُر: ج: 1، ص: 136)"۔ اس سے بھی وہی بات ثابت ہوتی ہے کہ تنہا فرض پڑھنے والے کے لیے جماعت وتر میں شامل ہونا بلا کراہت جائز ہے۔

نیز فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے کہ اگر عشاء کے فرض، نمازِ تراویح اور وتر پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ امام نے عشاء کے فرض طہارت کے بغیر ادا کیے تھے جبکہ تراویح اور وتر کی نماز طہارت کے ساتھ ادا کی تھی، تو عشاء کے فرضوں کے ساتھ ساتھ تراویح کا بھی اعادہ لازم ہوگا، لیکن وتر کا اعادہ لازم نہیں ہوگا۔ اس سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ وتر کی جماعت نہ تو عشاء کے فرضوں کے تابع ہے اور نہ تراویح کے تابع، کیونکہ اگر یہ ان میں سے کسی ایک کے تابع ہوتی تو جس طرح اصل یعنی عشاء یا تراویح کا اعادہ لازم ہوا ہے، وتر کا اعادہ بھی لازم ہوتا، لیکن وتر کا اعادہ لازم نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی جماعت مستقل بالذات ہے، فرض یا تراویح کی جماعت کے تابع نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ زیلعی حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَھُوَ مَا بَعۡدَ الۡعِشَاءِ اِلٰی طُلُوۡعِ الۡفَجۡرِ، قَبۡلَ الۡوِتۡرِ وَبَعۡدَہٗ، کَمَا ذُکِرَ فِی الۡمُخۡتَصَرِ حَتّٰی لَوۡ تَبَیَّنَ اَنَّ الۡعِشَاءَ صَلَّوۡھَا بِلَا طَھَارَۃٍ دُوۡنَ التَّرَاوِیۡحِ وَالۡوِتۡرِ، اَعَادُوا التَّرَاوِیۡحَ مَعَ الۡعِشَاءِ دُوۡنَ الۡوِتۡرِ عِنۡدَ اَبِیۡ حَنِیۡفَۃَ، لِاَنَّھَا تَبَعٌ لِلۡعِشَاءِ"۔

ترجمہ: "تراویح کا وقت عشاء کے بعد سے لیکر طلوعِ فجر تک ہے، وتر سے پہلے بھی (تراویح پڑھ سکتے ہیں) اور اُس کے بعد بھی، جیسا کہ مختصر میں مذکور ہے حتیٰ کہ اگر یہ بات ظاہر ہوئی کہ لوگوں نے عشاء کی نماز طہارت کے بغیر پڑھی تھی، لیکن تراویح اور وتر طہارت کے ساتھ پڑھے تھے، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ عشاء کے ساتھ تراویح کا اعادہ کریں گے،

وتر کا اعادہ نہیں کریں گے، اس لیے کہ تراویح عشاء کے تابع ہے (اور وتر مستقل نماز ہے)''۔(تبیین الحقائق: ج1 ص:178)

علامہ عبدالرحمٰن آفندی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَقْتُ التَّرَاوِيحِ بَعْدَ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى آخِرِ اللَّيْلِ لِأَنَّهَا تَبَعٌ لِلْعِشَاءِ دُونَ الْوِتْرِ حَتَّى لَوْ ظَهَرَ أَنَّ الْعِشَاءَ صُلِّيَتْ بِلَا طَهَارَةٍ وَالتَّرَاوِيحَ بِطَهَارَةٍ أُعِيدَتِ التَّرَاوِيحُ مَعَ الْعِشَاءِ، لَا الْوِتْرُ عِنْدَ الْإِمَامِ''۔

ترجمہ: ''تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے لیکر رات کے آخر تک ہے، کیونکہ وہ عشاء کے تابع ہے نہ کہ وتر کے، حتیٰ کہ اگر یہ بات معلوم ہوئی کہ عشاء کی نماز طہارت کے بغیر اور تراویح طہارت کے ساتھ پڑھی گئی ہے، تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عشاء کے ساتھ تراویح کا اعادہ کیا جائے، نہ کہ وتر کا، (مَجْمَعُ الْأَنْهُر: ج:1 ص136)''۔ کیونکہ تراویح کی جماعت فرضِ عشاء کی جماعت کے تابع ہے، جبکہ وتر اس کے تابع نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَالصَّحِيحُ أَنَّ وَقْتَهَا مَا بَعْدَ الْعِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ قَبْلَ الْوِتْرِ وَبَعْدَهُ حَتَّى لَوْ تَبَيَّنَ أَنَّ الْعِشَاءَ صَلَّاهَا بِلَا طَهَارَةٍ دُونَ التَّرَاوِيحِ وَالْوِتْرِ أَعَادَ التَّرَاوِيحَ مَعَ الْعِشَاءِ دُونَ الْوِتْرِ، لِأَنَّهَا تَبَعٌ لِلْعِشَاءِ، هٰذَا عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى فَإِنَّ الْوِتْرَ غَيْرُ تَابِعٍ لِلْعِشَاءِ فِي الْوَقْتِ عِنْدَهُ، وَالتَّقْدِيمُ إِنَّمَا وَجَبَ لِأَجْلِ التَّرْتِيبِ وَذٰلِكَ يَسْقُطُ بِعُذْرِ النِّسْيَانِ فَيَصِحُّ إِذَا أَدَّى قَبْلَ الْعِشَاءِ بِالنِّسْيَانِ بِخِلَافِ التَّرَاوِيحِ فَإِنَّ وَقْتَهَا بَعْدَ أَدَاءِ الْعِشَاءِ فَلَا يُعْتَدُّ بِمَا أُدِّيَ قَبْلَ الْعِشَاءِ''۔

ترجمہ: ''صحیح یہ ہے کہ تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے لیکر طلوعِ فجر تک ہے، وتر سے پہلے بھی اور بعد بھی، حتیٰ کہ اگر یہ بات ظاہر ہوئی کہ عشاء کی نماز طہارت کے بغیر پڑھی تھی لیکن تروایح اور وتر طہارت کے ساتھ پڑھے تھے، تو عشاء کے ساتھ تراویح کا اعادہ کریں گے نہ کہ وتر کا، اس لیے کہ تراویح عشاء کے تابع ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے'

کیونکہ اُن کے نزدیک وقت کے اندر وتر کی نماز عشاء کی نماز کے تابع نہیں ہیں اور عشاء کی نماز کو وتر پر ترتیب کی وجہ سے مقدم کرنا واجب ہے اور وہ نسیان کے عذر کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے، پس اگر کسی نے بھولے سے وتر کی نماز عشاء کے فرضوں سے پہلے پڑھ لی تو اُس کی نماز صحیح ہے، برخلاف تراویح کے، کہ اُن کا وقت عشاء کے فرض ادا کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے، لہٰذا عشاء سے پہلے ادا کی گئی تراویح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1،ص:115)

فقیہ ملت علامہ ابوالخیر محمد نوراللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا: ''ایک مولانا رمضان المبارک میں فرض اکیلے پڑھنے والے کے لیے وتر کی جماعت میں شمولیت ناجائز بتاتے ہیں، میں نے صغیری کی عبارت پیش کی، ساتھ ہی عالمگیری اور کبیری کا حوالہ دیا، مگر وہ اپنی تائید میں علامہ شامی کی عبارت پیش کرتے ہیں، آپ سے رہنمائی چاہیے''۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں: ''بلاشک وریب شامل ہوسکتا ہے کہ ایسی جماعتِ وتر بالاتفاق جائز ومشروع ہے اور جماعتِ جائز ومشروع کے ساتھ نماز ادا کرنا بہ حکمِ قرآنِ کریم جائز ہے، اس جماعت کے نمازی راکعین ہیں اور اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے: ''وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ'' اور حدیثِ صحیح میں ہے: ''اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ'' اور یہ بھی ہے: ''فَمَا اَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَاَتِمُّوْا، (صحیح البخاری:378و635)''۔

وہ لکھتے ہیں: ''مذہبِ حنفیہ متون وشروح وفتاویٰ وحواشی بالاتفاق ماہِ رمضان میں علی الاطلاق وتر باجماعت کے جواز واستحباب سے گونج رہے ہیں، حالانکہ اگر صرف متون میں ہی ہوتا اور شروح وفتاویٰ میں اس کے خلاف ہوتا، تب بھی جائز رہتا کہ محققین نے تصریح فرمائی کہ مسئلۂ متون، مسئلۂ شروح وفتاویٰ سے مقدّم ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک فقہی ضابطہ لکھا: ''أَنَّ مَافِي الْمُتُوْنِ مُقَدَّمٌ عَلٰى مَا فِي الشُّرُوْحِ وَمَافِي الشُّرُوْحِ مُقَدَّمٌ عَلٰى مَافِي الْفَتَاوٰى''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:1،ص:72، دارالفکر، بیروت)

اُس کے بعد وہ مزید بحث کرتے ہیں اور جن کتبِ فقہ کے ہم نے حوالہ جات دیے ہیں، اُن کا بھی ذکر کر کے لکھتے ہیں: ''بفضلہٖ وکرمہٖ اسی مختصر فتوے سے مہرِ نیم روز کی مانند واضح ہو گیا کہ صورتِ مذکورہ میں وہ شخص جماعتِ وتر میں شامل ہو سکتا ہے اور یہ شمول جائز وروا ہے، (فتاویٰ نوریہ، ج:1،ص:563)''۔ علامہ محمد نور اللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے اسی مقام پر اس موضوع پر مختلف سائلین کے جواب میں مزید فتاویٰ بھی موجود ہیں۔

فقہائے کرام کی مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ جب نفسِ وتر نفسِ عشاء کے تابع نہیں ہیں، تو وتر کی جماعت بھی عشاء کی جماعت کے تابع نہیں ہوگی۔ پس اگرچہ امام اہلسنّت امام احمد رضا قادری اور حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہم نے علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو راجح قرار دیتے ہوئے عشاء کی جماعت میں شریک نہ ہونے والے شخص کے لیے وتر کی جماعت میں عدمِ شرکت کو راجح اور اولیٰ قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسے شخص کے لیے عشاء کی نماز تنہا پڑھ کر تراویح کی جماعت میں شامل ہونے کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ تراویح کی جماعت بالاتفاق فرض کی جماعت کے تابع ہے، اس کے برعکس وتر کی جماعت کا فرضِ عشاء کی جماعت کے تابع ہونا فقہائے احناف کے نزدیک مُتفق علیہ مسئلہ نہیں ہے، توہم فرض باجماعت نہ پڑھنے والے کے لیے وتر کی جماعت میں شامل ہونے کے جواز کا قول کریں گے تاکہ رمضان المبارک میں جماعت کی برکت اور اجرِ زائد سے محروم نہ رہیں۔ فقیہِ ملت علامہ مفتی محمد نور اللہ نعیمی، استاذ العلماء حضرت علامہ عطا محمد بندیالوی اور علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہم اور علامہ مفتی محمد رفیق حسنی مُدَّ ظِلّھم نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ تاہم اعلیٰ حضرت اور حضرت صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہم ہمارے مُسلمہ اکابر میں سے ہیں، لہٰذا جو حضرات ان کے موقف کو اختیار کرنا چاہیں، وہ ایسا کر سکتے ہیں، اس مسئلے کو راجح اور مرجوح کے درجے میں لیا جائے۔

## تصدیقاتِ مفتیانِ کرام:

نوٹ: راقم نے معاصرین میں سے اہلسنت وجماعت کے انتہائی ثقہ مفتی علامہ مفتی محمد

ابراہیم قادری مُدَّ ظِلّھم کی خدمت میں یہ فتویٰ بھیجا تاکہ اگر ہم سے کوئی فروگزاشت ہوگئی ہوتو اُس کی نشاندہی ہوجائے۔میں حضرت قبلہ مفتی صاحب دامت برکاتہم کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے گہری نظر سے اس کا مطالعہ فرمایا،بعض جگہ عربی عبارات کے ترجمے کو بہتر بنایا اور بعض جگہ کچھ لفظی تبدیلیاں تجویز فرمائیں،میں نے بہ طیب خاطر اُن کی رائے کو قبول کر کے اس فتوے میں جذب کرلیا ہے،آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ فقیر اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو بہت وقیع سمجھتا ہے،لیکن چونکہ جواز دوسری جانب بھی ہے اور اسی پر اس فقیر کا عمل ہے،اس لیے اس مسئلے کو نزاع کا باعث نہیں بننا چاہیے،کیونکہ یہ اختلاف بھی اَولویت اور غیر اولویت کے اعتبار سے ہے،یعنی اختلاف محض اس بنا پر ہے کہ رمضان المبارک میں عشاء کے فرض تنہا پڑھنے والے کے لیے آیا وتر کی جماعت میں شامل ہونا اولیٰ ہے یا خلافِ اَولیٰ،بھلا خلافِ اولیٰ کام بھی ناجائز ہو سکتا ہے''۔

(2) حضرت علامہ مفتی محمد رفیق حسنی مُدَّ ظلّھم:

ماشاءاللہ!مفتی اعظم حضرت مولانا منیب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے وتروں کی جماعت کے جواز پر مفصل فتویٰ تحریر فرمایا ہے،الحمدللہ!میں اپنی کتاب ''رفیق الصائمین'' میں غالباً 1987ء استاذ العرب والعجم استاذیم مولانا عطا محمد بندیالوی کی تحقیق کے حوالے سے جواز کا فتویٰ لکھ چکا ہوں،مگر اس میں اجمال تھا اور حضرت مفتی صاحب نے تفصیل ذکر فرمادی،واللہ تعالیٰ اعلم،(23 جولائی 2018ء)۔

(3) حضرت علامہ مفتی محمد جان نعیمی مُدَّ ظلّھم:

فقیر نے حضرت العلام مفتی منیب الرحمٰن مدظلہ العالی (مفتی اعظم پاکستان) کا تحریر کردہ فتویٰ وتروں کی جماعت کے جواز پر اول سے آخر تک پڑھا،فقیر کا اتفاق ہے اور اسی قول کو مخادیم سندھ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے،وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وعلمہ اتم واحکم،(30 جولائی،2018ء)

(4) حضرت علامہ مفتی محمد اکمل مدنی مُدَّ ظلّہم:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

راقم، زیر بحث مسئلے میں قبلہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب دامت فیوضہم سے نہ صرف مکمل اتفاق رکھتا ہے، بلکہ اس مذہب کے اختیار کرنے کو دین وعبادات کے سلسلے میں بے رغبتی سے بھرپور موجودہ ماحول کے پیشِ نظر، دوسرے مؤقف کے مقابلے میں انسب واولیٰ گمان کرتا ہے۔ نیز عرصۂ دراز سے خود بھی اس پر عامل اور اسی کی ترغیب دیتا ہے اور اس اختیارِ قول کی چند وجوہات ہیں:

(۱) من جانبِ شرع نافذ کردہ، عباداتِ اجتماعیہ کی حکمتوں پر غور کیا جائے تو بُعدِ تکبر، رغبتِ نفوس، تنقید وگرفتِ خلق کے خوف کے باعث، عبادات پر حصولِ استقامت اور فضائے اتحاد واتفاق قائم کرنا، جیسے امور سرفہرست نظر آئیں گے۔ چونکہ مذکورہ مسئلے میں، اختیارِ قولِ مرجوح کی صورت میں ان حکمتوں کا حصول واضح طور پر نظر آرہا ہے، لہٰذا اسی کا اختیار کیا جانا، انسب معلوم ہوتا ہے۔

(۲) جماعت کی موافقت، شریعت اور اس کی اتباع میں اکابرین اسلام رضی اللہ عنہم کو ہمیشہ مطلوب ومحبوب، جب کہ اس کی مخالفت، معیوب ومعتوب رہی ہے۔ قرآنِ عظیم میں وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ، حدیث میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا، منافقین کے جماعت سے پیچھے رہ جانے پر اظہارِ غضب، فقہائے احناف رضی اللہ عنہم کا صلواتِ مکتوبہ کی جماعت کے سلسلے میں 6 اقوال میں سے، واجبِ عین کا اختیار کرنا اور مسجد میں موجود مسلمان کے، آغازِ وقتِ نماز کے بعد، مسجد سے بلا عذر چلے جانے کو ناپسند فرمانا، اس کی نظائرِ صریحہ ہیں۔ چنانچہ وتر کے سلسلے میں اسی مزاج کی موافقت، انسب معلوم ہوتی ہے۔

(۳) یہ دور عوام کی دین سے بے رغبتی کا دور ہے، چنانچہ بے حد ضروری ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو، انہیں مذہب اور مذہبی شخصیات کے قریب لایا جائے اور متنفر ہونے سے بچایا جائے، چاہے وہ کسی مکروہِ تنزیہی فعل کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ عندالتحقیق فعلِ مکروہ

تنزیہی، گناہ نہیں، چاہے اس کی عادت ہی کیوں نہ قائم ہوجائے۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جان لو جو کچھ پہلے گزر چکا ہے اوراس پر ہم نے جزم اور بھروسا کیا، وہ یہ ہے کہ مکروہِ تنزیہی پر صغیرہ، کبیرہ کوئی گناہ نہیں اوراس سے بندہ کسی قسم کی سزا کا مستحق نہیں ہوتا، نہ زیادہ کا اور نہ ہی کم کا، یہی واضح حق ہے، جس سے علیحدگی اختیار نہیں کی جاسکتی اور معتمد علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔ ردالمحتار کے باب الحظر میں اما المکروہ کراھۃ تنزیہ کے تحت ہے کہ بالاتفاق حلّت کے زیادہ قریب ہے، یعنی اس کے مرتکب کو بالکل عذاب نہیں ہوگا، لیکن تارک کو کچھ نہ کچھ ثواب ملے گا۔

(جلد:4،ص:505، رضا فاؤنڈیشن)

**اور مکروہِ تنزیہی فعل کے باعث لوگوں کے دین کی جانب مائل ہونے اوراس سے روکنے کے بارے میں فرمایا:**

''اور عوام کو اللہ عزوجل کے ایسے ذکر سے منع کرنا جو شرعاً گناہ نہ ہو، محض بدخواہی عام مسلمین ہے اوراس کا مرتکب نہ ہوگا، مگر متقشف کہ مقاصدِ شرع سے جاہل وناواقف ہو یا متصلف کہ مسلمانوں میں اختلاف ڈال کر اپنی رفعت وشہرت چاہتا ہو، بلکہ ائمہ ناصحین تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ منع کرنا اُس منکر سے ضرور ہے جو بالاجماع حرام ہو، بلکہ تصریحیں فرمائیں کہ عوام اگر کسی طرح یادِ خدا میں مشغول ہوں، ہرگز منع نہ کیے جائیں، اگرچہ وہ طریقہ اپنے مذہب میں حرام ہو، مثلاً سورج نکلتے وقت نماز حرام ہے اور عوام پڑھتے ہوں تو نہ روکے جائیں کہ کسی طرح وہ خدا کا نام تو لیں، اسے سجدہ تو کریں، اگرچہ کسی دوسرے مذہب پر اس کی صحت ہوسکے، (جلد:9،صفحہ:141، رضا فاؤنڈیشن)''۔

مذکورہ مسئلے میں وتر کی جماعت کا ترک، شائد نمازِ وتر کی ادائیگی میں بے رغبتی کا سبب تو نہ بنے، لیکن اس سلسلے میں تنفر ضرور مشاہدہ کیا گیا ہے اور ازالۂ فساد، جلبِ مصالح سے بہتر ہے کے تحت، اس کے ازالے یا سدِ باب کے سلسلے میں، مکروہِ تنزیہی فعل کے ارتکاب کی اجازت دینا، غالباً عین مزاجِ شرع کے موافق ہوگا۔

(۴) بدگمانی، نااتفاقی، قلبی وزبانی غیبت وغیرہا امور سے بچنا اور مسجد جیسی مقدس ومحترم جگہ کو، ان گناہوں سے یکسر پاک وصاف رکھنا، بھی از حد ضروری ہے۔ اگر غور کیا جائے تو جماعتِ وتر میں شرکت سے روکنا، مذکورہ امور میں ابتلاء کا سبب بن سکتا ہے، بلکہ بنتے دیکھا بھی گیا ہے، خصوصاً ان مقامات پر جہاں، ایک امام نے عوام کو قولِ ثانی پر عمل کی اجازت دی تھی، لیکن جب امام تبدیل ہوا اور اس نے قولِ اول کے نفاذ میں مبالغے سے کام لینے کی کوشش کی۔ یونہی یورپی ممالک کی نئی نسل، اس طرح کے اختلافات سے سخت متنفر دیکھی گئی ہے۔

(۵) ہر نیا دور، دین سے دوری کے لحاظ سے پہلے سے بڑھ کر ہوتا ہے اور یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ اہلِ زمانہ کی بدلتی ہوئی کیفیات وعادات پر گہری نظر رکھتے ہوئے، بوقتِ ضرورت، سابقہ مسائل میں ضروری تبدیلی پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ایک زمانے کا مفتیٰ بہ قول، کسی دوسرے زمانے میں، ضرورتِ صحیحہ کی بنا پر، غیر مفتی بہ ہوجاتا ہے۔ ظاہر الروایہ کے برخلاف، دیگر شرائط کے ساتھ، فقط بشہوت چھونے سے حکمِ حرمتِ ابدیہ کا اجراء اور عاقلہ بالغہ کی جانب سے، بلا اجازتِ ولی، غیر کفو میں کیے گئے نکاح کو موقوف کے بجائے، غیر نافذ ماننا، اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر قولِ امامِ اعظم رضی اللہ عنہ ترک کر کے، کسی دوسرے امام کے قول پر فتویٰ دینا بھی روا رکھا گیا ہے۔ وللہذا اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ بھی اکابرین رضی اللہ عنہم کی اسی سنت پر عمل پیرا رہے۔ فتاویٰ رضویہ میں اس کی بکثرت امثلہ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ موقع کی مناسبت سے صرف ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ سابقہ ادوار میں جنازے کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کو مکروہ لکھا گیا۔ لیکن دورِ اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ میں، جب اس کے بارے میں مسلمانوں کے عملِ مخالف کو ذکر کر کے وضاحت طلب کی گئی، تو آپ نے فرمایا:

"ہاں کتبِ حنفیہ میں جنازے کے ساتھ ذکرِ جہر کو مکروہ لکھا ہے، جس طرح خود نفسِ ذکرِ جہر کو بکثرت کتبِ حنفیہ میں مکروہ بتایا، حالانکہ وہ اطلاعات قرآن عظیم واحادیثِ حضور سید

المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اور عند التحقیق کراہت کا عروض نظر بعوارض خارجہ غیر لازم ہے۔ جیسا کہ علامہ خیر الدین رملی استاد صاحبِ درِ مختار وغیرہ محققین نے تحقیق فرمایا اور ہم نے اپنے فتویٰ میں اسے منقح کیا، یہاں بھی اس کا منشاء عوارض ہی ہیں۔ قلب ہمراہیاں کا مشوش ہونا، یادِ موت سے دوسری طرف توجہ کرنا۔ انصاف کیجیے تو یہ حکم اس زمانِ خیر کے لیے تھا، جبکہ ہمراہیانِ جنازہ تصورِ موت میں ایسے غرق ہوتے تھے کہ گویا میت ان میں ہر ایک کا خاص اپنا کوئی جگر پارہ ہے، بلکہ گویا خود ہی میت ہیں، ہمیں کو جنازہ پر لیے جاتے ہیں اور اب قبر میں رکھیں گے، ولہٰذا علماء نے سکوتِ محض کو ناپسند کیا تھا کہ کلام اگرچہ ذکر ہی ہو، اگرچہ آہستہ ہو، اس تصور سے کہ (بغایت نافع اور مفید اور برسوں کے زنگ دل سے دھو دینے والا ہے) روکے گا یا کم از کم دل بٹ تو جائے گا، تو اس وقت محض خاموشی ہی مناسب تر ہے، ورنہ حاش للہ ذکرِ خدا عزوجل ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ کسی وقت منع ہے۔ اب کہ زمانہ منقلب ہوا، لوگ جنازہ کے ساتھ اور دفن کے وقت اور قبروں پر بیٹھ کر لغویات وفضولیات اور دنیوی تذکروں بلکہ خندہ ولہو میں مشغول ہوتے ہیں، تو انہیں ذکرِ خدا اور رسول عزوجل وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مشغول کرنا، عین صواب وکارِ ثواب ہے، مع ہذا جنازہ کے ساتھ ذکرِ جہر کی کراہت میں اختلاف ہے کہ تحریمی ہے یا تنزیہی ہے اور ترجیح بھی مختلف آئی۔ قنیہ میں کراہت تنزیہ کو ترجیح دی اور اسی پر فتاویٰ تتمہ میں جزم فرمایا اور یہی تجرید ومجتبیٰ وحاوی وبحر الرائق وغیرہا کے لفظ ینبغی کا مفاد ہے اور ترک اولیٰ اصلاً گناہ نہیں، كَمَا نَصُّوْا عَلَيْهِ وَحَقَّقْنَاهُ فِي جُمَل مجلية (جیسا کہ علماء نے اس کی صراحت فرمائی اور ہم نے رسالے جُمَل مجلِّیۃ "اَنَّ الْمَکْرُوْہَ تَنْزِیْھًا لَیْسَ بِمَعْصِیَۃٍ" میں اس کی تحقیق کی ہے)۔

(ج:9،ص:140.141، رضا فاؤنڈیشن)

چونکہ ہمارے زمانے میں علمی اختلافات سے ناواقف اور صحبتِ علماء سے محروم عوام الناس کے لیے جماعتِ وتر میں شرکت، تنہا نماز پڑھنے سے افضل، فوائدِ کثیرہ کی حامل اور کئی نقصانات سے حفظ کا سبب بھی ہے، لہٰذا مکروہِ تنزیہی ہونے کو نظر انداز کرتے ہوئے،

اس کی اجازت دینا ہی بہتر وافضل گمان ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب

(5) حضرت علامہ مولانا مفتی محمد اسماعیل نورانی زِیْدَ مَجْدُہٗ:

اَلْجَوَابُ حَقٌّ وَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ، (28 جولائی 2018ء)۔

## مقتدی کو سہو ہوا تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں ہے

**سوال:**

مقتدی امام کے ساتھ تکبیرِ اولیٰ سے شامل تھا، مقتدی نے غلطی سے دوسری رکعت میں اَلتَّحیات کے بعد درودِ ابراہیمی پڑھ لیا، جس کی وجہ سے اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگیا، اب وہ سجدۂ سہو کیسے کرے گا، کیونکہ وہ امام کے ساتھ پہلی رکعت سے شامل ہے اور کیا اس کی نماز سجدۂ سہو کے بغیر مکمل ہوجائے گی؟، (محمد ناظم، ظفر وال)۔

**جواب:**

اگر امام کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہوئے مقتدی سے نماز میں سہو واقع ہوجائے، تو اُس پر سجدۂ سہو نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

''إِنَّ الْإِمَامَ یَکْفِیْ مَنْ وَّرَائَہٗ، فَإِنْ سَھَا الْإِمَامُ فَعَلَیْہِ سَجْدَتَا السَّھْوِ وَعَلٰی مَنْ وَّرَائَہٗ أَنْ یَّسْجُدُوْا مَعَہٗ وَإِنْ سَھَا أَحَدٌ مِّمَّنْ خَلْفَہٗ فَلَیْسَ عَلَیْہِ أَنْ یَّسْجُدَ، وَالْإِمَامُ یَکْفِیْہِ''۔

ترجمہ: ''بے شک امام اپنے مقتدیوں کو کفایت کرتا ہے، پس اگر امام سے سہو واقع ہو تو اس پر سہو کے دو سجدے لازم ہیں اور اس میں مقتدی اُس کی پیروی کریں گے، جماعت میں شامل کسی مقتدی سے انفرادی طور پر سہو ہو تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، امام (کی نماز کی صحت) اس کے لیے کافی ہے، (السنن الکبریٰ للبیہقی: 3884)''۔

مَراقی الفلاح میں ہے:

''قَالَ ﷺ: اَلْإِمَامُ لَکُمْ ضَامِنٌ یَّرْفَعُ عَنْکُمْ سَھْوَکُمْ وَقِرَائَتَکُمْ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام (نماز کی صحت کے لیے) تمہارا ضامن ہے، وہ

تمہارے سہو اور قراءت کی ذمہ داری کو پورا کرلیتا ہے"۔

(حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد 2، ص: 64)

علامہ علاء الدین کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فَأَمَّا الْمُقْتَدِیْ إِذَا سَهَا فِي صَلَاتِهٖ فَلَا سَهْوَ عَلَيْهِ، لِأَنَّهٗ لَا يُمْكِنُهُ السُّجُوْدُ، لِأَنَّهٗ إِنْ سَجَدَ قَبْلَ السَّلَامِ كَانَ مُخَالِفًا لِلْإِمَامِ، وَإِنْ أَخَّرَهٗ إِلٰی مَا بَعْدَ سَلَامِ الْإِمَامِ يَخْرُجُ مِنَ الصَّلَاةِ بِسَلَامِ الْإِمَامِ"۔

ترجمہ: "پس اگر مقتدی نماز میں بھول جائے تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، کیونکہ اس کے لیے سجدہ کرنا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ مقتدی نے اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کیا تو امام کی مخالفت ہوگی اور اگر امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ کیا تو وہ امام کے سلام پھیرتے ہی نماز سے نکل جاتا ہے، (بدائع الصنائع، جلد 1، ص: 260)"۔

## مقتدیوں کا بھول کر سلام پھیرنا

**سوال:**

جس نمازی کی ایک یا چند رکعات جماعت سے رہ گئی ہوں اور وہ امام کے ساتھ سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے، (ہارون الرشید، کراچی)

**جواب:**

مسبوق مقتدی کے سلام پھیرنے کی چند صورتیں ہیں: (۱) اس نے یہ گمان کرتے ہوئے دانستہ سلام پھیرا کہ اُسے امام کے ساتھ سلام پھیرنا ہے، تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ (۲) اُس نے بھول کر امام سے پہلے یا امام کے ساتھ سلام پھیرا، تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، کیونکہ وہ ابھی امام کی اقتدا سے خارج نہیں ہوا اور اقتدا میں رہتے ہوئے مقتدی سے ایسی خطا ہوجائے، جو سجدۂ سہو کا موجب ہے، تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، بشرطیکہ اس نے نماز کو فاسد کرنے والا کوئی عمل نہ کیا ہو۔

(۳) اس نے بھول کر امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا، تو اس پر سجدۂ سہو لازم

ہوگا، کیونکہ امام کے سلام پھیرتے ہی وہ امام کی اقتدا سے باہر آ گیا اور اب وہ منفرد کے حکم میں ہے، فقہی دلائل درج ذیل ہیں:

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَوْ سَلَّمَ سَاهِيًا إِنْ بَعْدَ إِمَامِهِ لَزِمَهُ السَّهْوُ وَإِلَّا، لَا''۔

ترجمہ: ''اور اگر (مسبوق نے) بھول کر سلام پھیر دیا تو اگر اس نے امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا ہے، تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے اور اگر اس نے بھول کر امام کے ساتھ سلام پھیرا ہے، تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْ سَلَّمَ سَاهِيًا'': قَيَّدَ بِهِ لِأَنَّهُ لَوْ سَلَّمَ مَعَ الْإِمَامِ عَلٰى ظَنِّ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَعَهُ، فَهُوَ سَلَامُ عَمْدٍ، فَتَفْسُدُ، كَمَا فِي ''الْبَحْرِ'' عَنِ ''الظَّهِيْرِيَّةِ''۔ قَوْلُهُ: ''لَزِمَهُ السَّهْوُ'': لِأَنَّهُ مُنْفَرِدٌ فِي هٰذِهِ الْحَالَةِ۔ قَوْلُهُ: ''وَإِلَّا، لَا'': أَيْ وَإِنْ سَلَّمَ مَعَهُ أَوْ قَبْلَهُ لَا يَلْزَمُهُ، لِأَنَّهُ مُقْتَدٍ فِي هَاتَيْنِ الْحَالَتَيْنِ، وَفِي ''شَرْحِ الْمُنْيَةِ'' عَنِ ''الْمُحِيْطِ'' إِنْ سَلَّمَ فِي الْأُوْلٰى مُقَارِنًا لِسَلَامِهِ فَلَا سَهْوَ عَلَيْهِ، لِأَنَّهُ مُقْتَدٍ بِهِ، وَبَعْدَهُ يَلْزَمُ لِأَنَّهُ مُنْفَرِدٌ''۔

ترجمہ: ''اور اگر مسبوق نے بھول کر سلام پھیرا، یہاں بھولنے کی قید لگائی ہے، کیونکہ اگر اس نے یہ گمان کر کے سلام پھیرا کہ اُسے امام کے ساتھ ہی سلام پھیرنا چاہیے، تو یہ قصداً سلام پھیرنا ہے، تو اس سے اُس مسبوق مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ''ظہیریہ'' کے حوالے سے ہے۔ علامہ حصکفی کا یہ کہنا کہ مسبوق مقتدی اگر امام کے سلام پھیرنے کے بعد بھول کر سلام پھیرتا ہے، تو اُس پر سجدۂ سہو اس لیے لازم آئے گا کہ اب وہ منفرد کے حکم میں ہے۔ علامہ حصکفی کا یہ کہنا کہ اگر مقتدی نے بھول کر امام کے ساتھ یا اس سے پہلے سلام پھیرا ہے، تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، کیونکہ ان دونوں حالتوں میں وہ بدستور مقتدی ہے (اور مقتدی کی خطا سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا)۔ ''شرح المنیہ'' میں ''محیط'' کے حوالے سے ہے: ''اگر مسبوق مقتدی نے بھول کر امام کے ساتھ سلام پھیرا تو

اُس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہے، کیونکہ وہ حالتِ اقتدا میں ہے، اور اگر اس نے امام کے بعد سلام پھیرا تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہوگا، کیونکہ اب وہ منفرد ہے (یعنی امام کے سلام پھیرتے ہی اقتدا سے باہر آچکا ہے)، (جلد 3، ص: 651، دمشق)''۔

## نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھنا

**سوال:**

کیا عید کے دن نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھ سکتے ہیں، (محمد حذیفہ جمشید، کوٹ ادو)۔

**جواب:**

نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھنا مطلقاً مکروہ ہے، خواہ گھر میں پڑھے یا عید گاہ میں، حتیٰ کہ عورت بھی گھر میں نفل پڑھنا چاہے تو نمازِ عید کے بعد پڑھے، نماز عید کے بعد صرف عید گاہ میں نفل پڑھنا منع ہے، گھر آکر پڑھ سکتے ہیں، حدیث پاک میں ہے: ''نبی ﷺ نے عید الفطر کی نماز دو رکعت پڑھائی، نہ اُس سے پہلے نماز پڑھی اور نہ اُس کے بعد (عید گاہ میں) نماز پڑھی، (صحیح البخاری: 964)''۔ البتہ اگر کسی نے بدقسمتی سے عید کے دن فجر کی نماز اپنے وقت پر ادا نہ کی ہو اور سورج نکل آیا ہو، تو وہ نمازِ عید سے پہلے فجر کی نماز قضا پڑھ سکتا ہے، کیونکہ فرض کی قضا فرض ہے۔

## اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنا منع نہیں ہے

**سوال:**

ایک شخص اذان سے پہلے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کو گناہ کبیرہ قرار دے رہا ہے، رہنمائی فرمائیں، (سردار ریاض احمد عباسی، آزاد کشمیر)۔

**جواب:**

حدیث پاک میں ہے: ''عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ، ثُمَّ صَلُّوا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا، ثُمَّ سَلُوا اللهَ لِيَ الْوَسِيلَةَ، فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي

الْجَنَّةِ، لَا تَنْبَغِي إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللهِ وَأَرْجُوْ أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ، فَمَنْ سَأَلَ لِي الْوَسِيلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو جیسے کلمات وہ کہتا ہے، ویسے ہی کہو (یعنی کلماتِ اذان کو دہراؤ)، پھر تم مجھ پر درود پڑھو، کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے جنت میں مقام وسیلہ (نمایاں مقام) کی دعا کرو، کیونکہ یہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے صرف ایک (خاص) بندے کو عطا فرمائے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک بندہ میں ہی ہوں، تو جو (مومن) میرے لیے مقام وسیلہ کی دعا مانگے گا، اس کی شفاعت مجھ پر لازم ہے"۔ (صحیح مسلم: 384)

اس حدیث مبارک کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "جب مؤذن اذان دے رہا ہو تو دو کلمات کے درمیان جو وہ سکتہ کرتا ہے، اس میں ان کلمات کو دہراؤ اور اذان کے اختتام پر مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ جو مجھ پر درود بھیجے، اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے مقامِ وسیلہ (جنت میں ایک نمایاں مقام جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے خاص ہے) کی دعا کرے، وہ شفاعت کا حق دار بن گیا، (صحیح مسلم: 384)"۔

پس اتباعِ سنّت کا تقاضا یہ ہے کہ اذان کے بعد درود شریف پڑھے، لیکن اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کی ممانعت نہیں ہے، درود شریف کسی وقت بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کو گناہ کبیرہ یا بدعت قرار دے، یہ اپنی طرف سے شریعت وضع کرنے کے مترادف ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہیے۔

## زوال وغروب کے وقت اذکار وتسبیحات پڑھنا بہتر ہے

**سوال:** زوال اور غروبِ آفتاب کے وقت قرآن پاک کی تلاوت اور دیگر اذکار وتسبیحات

پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟، (ایم۔عدنان، کراچی)۔

**جواب:**

زوالِ آفتاب کے وقت اور غروبِ آفتاب سے قبل کے بیس منٹ، ان دونوں اوقات میں کسی بھی قسم کی نماز پڑھنا مکروہ وممنوع ہے، سوائے اس کے کہ جنازہ عین اُسی وقت آئے، تو پڑھا جا سکتا ہے، لیکن پہلے سے موجود جنازے کو تاخیر کر کے ان اوقات میں پڑھنا مکروہ ہے اور قراءت نماز کا رکن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ ان مکروہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت نہ کی جائے، البتہ اَذکار اور تسبیحات ودرود شریف پڑھ سکتے ہیں۔

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَفِی ''اَلْبُغْیَةِ'' اَلصَّلَاةُ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ فِی الْاَوْقَاتِ الَّتِی تُکْرَہُ فِیھَا الصَّلَاةُ وَالدُّعَآءُ وَالتَّسْبِیْحُ أَفْضَلُ مِنْ قِرَائَةِ الْقُرْآنِ۔ وَلَعَلَّهُ لِاَنَّ الْقِرَائَةَ رُکْنُ الصَّلَاةِ وَھِیَ مَکْرُوھَةٌ فَالْاَوْلٰی تَرْکُ مَا کَانَ رُکْنًا لَھَا''۔

ترجمہ: اور ''بُغْیَہ'' میں ہے: اُن اوقات میں جن میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود پڑھنا، دعا کرنا اور تسبیح پڑھنا قرآن کی تلاوت کرنے سے افضل ہے، اِس کا سبب یہ ہے کہ قراءت نماز کا رکن ہے اور نماز مکروہ اوقات میں مکروہ تحریمی ہے، پس بہتر یہ ہے کہ نماز کے رکن کو بھی (ان اوقات میں) ترک کیا جائے، (البحرالرائق، ج:1، ص:437)''۔ پس ان اوقات میں اگرچہ قراءت کر سکتے ہیں لیکن یہ خلافِ اَولیٰ ہے اور اگر اس وقت قراءت کی اور دورانِ قراءت آیتِ سجدہ آ گئی تو سجدہ کی تلاوت بھی کر سکتے ہیں۔

## نماز باجماعت کی صف بندی میں بچوں کی رعایت

**سوال:**

آپ کے اس مفید اور علمی صفحے کے ذریعے میں آپ کی توجہ دو اہم مسائل کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ پہلا یہ کہ آج کل بزرگوں کو نئی نسل سے یوں تو بہت شکایات ہیں، لیکن بڑی شکایت یہ ہے کہ نئی نسل اپنے دین سے بیگانہ ہے اور مساجد ویران ہیں، لیکن کیا کبھی

ہم نے اس کے اسباب پر غور کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی ہے وہ یہ کہ بڑوں کا رویہ اس معاملے میں مناسب نہیں ہے۔ خاص طور پر جمعے کے دن بچے سب سے پہلے تیار ہو کر مسجد میں آجاتے ہیں، بڑے لوگ عام طور پر آخری وقت میں آتے ہیں۔ جماعت کھڑی ہونے کے وقت امام صاحب یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ تمام بچے پچھلی صف میں چلے جائیں تو عام طور پر ہمارے جیسے چھوٹے علاقے کی مسجد کی آخری صف دراصل مسجد کے باہر ہوتی ہے، اس اعلان پر لوگ فوری طور پر عمل کرتے ہیں اور گرمی ہو یا سردی بچوں کو اگلی صفوں سے نکال کر پیچھے کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بڑی خوشی سے نماز کے لیے آنے والے بچوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ عام نمازوں میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بچے جو کہ بڑے نمازیوں کی صف چھوڑ کر ان سے پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں بعد میں آنے والے بڑے ان کو نیت بندھی حالت میں کھسکاتے ہوئے پیچھے پہنچا دیتے ہیں، جس سے اُن کے دل و دماغ پر مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے بارے میں کوئی زیادہ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ خاص طور پر جمعے کے دن بڑے نمازی وقت سے پہلے پہنچنے کی کوشش کریں اور جب جماعت کھڑی ہو تو چھوٹے بچوں کو صفوں کے دائیں بائیں کھڑا کیا جائے نہ کہ سب سے پیچھے یا مسجد سے باہر۔ ازراہِ کرم بتائیں کہ ہمارا دین تو آسانیاں پہنچانے والا اور انتہا پسندی سے روکنے والا مذہب ہے، وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے، (ایس این اقبال، سرجانی ٹاؤن، کراچی)۔

**جواب:**

سب سے پہلے چند احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(۱) ''قَالَ أَبُوْمَالِكٍ الْأَشْعَرِيُّ أَلَا أُحَدِّثُكُمْ بِصَلَاةِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَفَّ الرِّجَالَ وَصَفَّ خَلْفَهُمُ الْغِلْمَانَ، ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ فَذَكَرَ صَلَاتَهُ، ثُمَّ قَالَ: هٰكَذَا صَلَاةٌ، قَالَ عَبْدُ الْأَعْلٰى: لَا أَحْسَبُهُ إِلَّا قَالَ صَلَاةُ أُمَّتِيْ''۔

ترجمہ: ''ابو مالک اشعری بیان کرتے ہیں: میں تمہیں نبی ﷺ کی نماز کے بارے میں نہ

بتاؤں؟، انہوں نے کہا: (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے) نماز کی اقامت کا حکم دیا، پہلے مردوں کی صفیں بنائیں، پھر ان کے پیچھے باشعور لڑکوں کی صفیں بنائیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نماز پڑھائی، پھر ابو مالک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی کیفیت بیان کی اور کہا: نماز اس طرح ہوتی ہے، عبدالاعلیٰ کہتے ہیں: میں گمان کرتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میری اُمّت کی نماز اس طرح ہے، (سنن ابوداؤد: 677)"۔

(۲) "عَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِي الصَّلَاةِ، وَيَقُوْلُ: اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا، فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ، لِيَلِنِيْ مِنْكُمْ أُولُوْا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ قَالَ أَبُوْ مَسْعُوْدٍ: فَأَنْتُمُ الْيَوْمَ أَشَدُّ اخْتِلَافًا"۔

ترجمہ: "عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں صف بندی کے وقت ہمارے کندھے چھوتے اور فرماتے: برابر ہو جاؤ اور (صفوں میں) فرق نہ کرو کہ اس کے سبب تمہارے دل جدا ہو جائیں گے، تم میں سے میرے قریب بالغ اور عقلمند لوگ کھڑے ہوں، پھر وہ جو درجے میں ان کے قریب ہیں، پھر وہ جو درجے میں ان کے قریب ہیں، ابومسعود نے کہا: (صف بندی میں لاپرواہی کے سبب) آج تم میں بہت اختلافات در آئے ہیں، (صحیح مسلم: 432)"۔

کتبِ فقہ میں نماز کی صفوں کی ترتیب اس طرح درج ہے:

"وَيَصُفُّ الرِّجَالُ، ثُمَّ الصِّبْيَانُ، ثُمَّ النِّسَاءُ، لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: لِيَلِيَنِيْ مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى"۔

ترجمہ: "اور پہلے مردوں کی صفیں ہوں، پھر (باشعور) بچوں کی اور پھر عورتوں کی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: (جماعت میں) تم میں سے میرے قریب بالغ اور عقلمند ہونے چاہئیں، (ہدایہ، جلد 1، صفحہ: 239)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"(الرِّجَالُ) ظَاهِرُهُ يَعُمُّ الْعَبْدَ (ثُمَّ الصِّبْيَانُ) ظَاهِرُهُ تَعَدُّدُهُمْ، فَلَوْ وَاحِدًا دَخَلَ

الصَّفَّ"۔

ترجمہ:"(نماز کی صفوں کی ترتیب میں پہلے) مرد ہوں گے، پھر بچے، بظاہر یہ اس صورت میں ہے کہ ان کی تعداد زیادہ ہو اور اگر ایک ہی بچہ ہو تو (مردوں کی) صف میں شامل ہو جائے گا"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ذَکَرَہٗ فِی "الْبَحْرِ" بَحْثًا، قَالَ: وَکَذَا لَوْکَانَ الْمُقْتَدِیْ رَجُلًا وَصَبِیًّا یَصُفُّھُمَا خَلْفَہٗ لِحَدِیْثِ أَنَسٍ، فَصَفَفْتُ أَنَاوَالْیَتِیْمُ وَرَائَہٗ وَالْعَجُوْزُ مِنْ وَرَائِنَا وَھٰذَا بِخِلَافِ الْمَرْأَۃِ الْوَاحِدَۃِ فَإِنَّھَا تَتَأَخَّرُ مُطْلَقًا کَالْمُتَعَدِّدَاتِ لِلْحَدِیْثِ الْمَذْکُوْرِ"۔

ترجمہ:"البحرالرائق" میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: اور اسی طرح اگر مقتدی صرف ایک مرد اور ایک بچہ ہوں تو وہ دونوں امام کے پیچھے اکٹھے صف بنا کے کھڑے ہوں گے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: میں نے اور یتیم نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور بڑھیا ہمارے پیچھے تھیں، اور ایک بچے کا مسئلہ ایک عورت کے مسئلے سے مختلف ہے، کیونکہ عورتیں ایک ہوں یا زیادہ حدیث مذکور کی بناء پر ہر صورت میں پیچھے الگ صف میں کھڑی ہوں گی"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:2، صفحہ:270-269، داراحیاء التراث العربی بیروت)

حدیث پاک کی روشنی میں پہلی صف میں امام کے پیچھے وسطِ صف میں ایسے عاقل وبالغ اور متشرع افراد ہونے چاہییں جو کسی ہنگامی صورت میں امام کی نیابت کر سکیں۔ باقی ترجیحی ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں ہوں اور پھر بچوں کی، لیکن مذکورہ بالا فقہی عبارت سے ظاہر ہے کہ بوقتِ ضرورت جب کہ اگلی صفیں نامکمل ہوں تو بچے بڑوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر اگلی صفیں نامکمل تھیں اور بچے درمیان میں آ کر شامل ہو گئے تو بعد میں انہیں نکال کر پیچھے بھیجنا مروت کے خلاف ہے۔

آج کل عام طور پر مشاہدے میں آیا ہے کہ بچوں کو بالکل الگ تھلگ کر کے آخری

صف میں کھڑا کر دیا جائے تو وہ دورانِ نماز شرارتیں کرتے ہیں اور اس طرح سارے نمازیوں کی یکسوئی اور حضورِ قلبی میں خلل واقع ہوتا ہے، اگر انہیں بڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے تو زیادہ باادب ہوکر پڑھتے ہیں اور بڑوں سے سیکھتے بھی ہیں اور جب بچے نیت باندھ کر آگے کی صف میں کھڑے ہوجائیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے کرنا آدابِ نماز کے منافی ہے اور اگر اس کا سینہ قبلے سے پھر گیا تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ لیکن یہاں ایسے بچے مراد ہیں جو باشعور ہوں، نماز اور مسجد کے آداب کو سمجھتے ہوں۔

الشیخ عبدالقادر الرافعی مُتوفّٰی 1323ھ لکھتے ہیں:

قَالَ ''الرَّحمَتِی'': رُبمَا یَتعَیَّنُ فِی زَمَانِنَا اِدْخَالُ الصِّبیَانِ فِیْ صُفُوْفِ الرِّجَالِ، لِاَنَّ الْمَعْهُوْدَ مِنهُمْ اِذَا اجْتَمَعَ صَبِیَّانِ فَاَکْثَرُ تُبْطِلُ صَلَاةُ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ، وَرُبَّمَا تَعَدّٰی ضَرَرُهُمْ اِلٰی اِفْسَادِ صَلَاةِ الرِّجَالِ، اِنْتَهٰی۔

ترجمہ: ''علامہ رحمتی نے کہا: ہمارے زمانے میں بچوں کو اکثر مردوں کے درمیان کھڑا کیا جاتا ہے، کیونکہ مشاہدے میں آیا ہے کہ جب (نماز میں) بچے ایک ساتھ جمع ہوجائیں تو (چھیڑ چھاڑ کر کے) ایک دوسرے کی نماز فاسد کر دیتے ہیں اور بعض صورتوں میں ان کا ضرر مردوں کی نماز فاسد کرنے تک پہنچ جاتا ہے''۔

(تقریرات الرافعی علی الردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، ص:100)

بعض لوگ ایسے کم عمر اور ناسمجھ شرارتی بچوں کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آتے ہیں، جو مسجد میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہیں، نمازیوں کے آگے سے بے دھڑک گزرتے ہیں، شور مچاتے ہیں، کبھی جماعت کے دوران رونے یا ہنسنے لگتے ہیں، کبھی پیشاب بھی کر لیتے ہیں اور آج کل مساجد میں بالعموم قالینیں بچھی ہوتی ہیں، جن کو پاک کرنا کافی دشوار ہوتا ہے، تو ایسے بچوں کو مسجد میں لانا ہی شرعاً منع ہے، حدیث شریف میں ہے:

''جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبیَانَکُمْ وَمَجَانِیْنَکُمْ وَشِرَاءَکُمْ وَبَیْعَکُمْ وَخُصُومَاتِکُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِکُمْ وَإِقَامَةَ حُدُوْدِکُمْ وَسَلَّ سُیُوْفِکُمْ، وَاتَّخِذُوْا عَلٰی أَبْوَابِهَا الْمَطَاهِرَ وَجَمِّرُوْهَا فِی

الْجُمَعِ''۔

ترجمہ: ''اپنی مسجدوں کو (ناسمجھ) بچوں، پاگلوں، لین دین کے معاملات، آپس کے جھگڑوں، شعوروشغب، حدودِ شرعی کے قیام اور (ایک دوسرے پر) تلواریں سونتنے سے بچا کر رکھو اور جمعہ کے دن مسجد کے دروازوں پر صفائی کے لیے برتن رکھ دیا کرو اور کسی خوشبودار چیز کی دھونی دو، (سُنن ابن ماجہ:750)''۔

تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''وَیَحْرُمُ اِدْخَالُ صِبْیَانٍ وَمَجَانِیْنَ حَیْثُ غَلَبَ تَنْجِیْسُھُمْ وَاِلَّا فَیُکْرَہُ''۔

ترجمہ: ''اور بچوں اور فاترالعقل لوگوں کا مسجد میں داخل کرنا حرام ہے، کیونکہ اکثر وہ ناپاک ہوتے ہیں، اور اگر ناپاک نہ ہوں تو مکروہِ تنزیہی ہے، (جلد:2ص:371)''۔

یہاں حرام سے مراد مکروہِ تحریمی ہے۔ ہمیں بچوں کے معاملے میں افراط وتفریط سے بچنا چاہیے، ناسمجھ اور آدابِ مسجد کا شعور نہ رکھنے والے کم عمر بچوں کو مسجد میں لے کر نہیں آنا چاہیے اور باشعور و باادب بچوں کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کرنی چاہیے، اگر وہ صفوں کے درمیان پہلے سے موجود ہیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے نہیں کرنا چاہیے، یہ مروت اور بزرگانہ شفقت کے خلاف ہے، وہ بڑوں کے درمیان کھڑے ہوں گے تو باادب رہیں گے اور بڑوں سے سیکھیں گے۔

## معذور بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے

**سوال:**

بسا اوقات میں شدید تھک جاتا ہوں، ہمت جواب دے جاتی ہے اور بڑی مشکل سے مسجد تک جاتا ہوں تو کیا ایسی صورت میں میرے لیے بیٹھ کر نماز ادا کرنا درست ہے۔

(حسنین احمد، لاہور)

**جواب:**

اگر آپ مسجد تک جانے سے اتنے تھک جاتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ کھڑے ہو کر

نماز نہیں پڑھ سکتے، مگر گھر پر کھڑے ہو کر پڑھ سکتے ہیں، تو گھر پر نماز پڑھ لیا کریں۔ لیکن ایسا شخص جو قیام پر قادر ہی نہیں، اُس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھے، اگر زمین پر سر رکھ کر سجدہ نہیں کر سکتا تو حکم یہ ہے کہ وہ اشارے سے سجدہ کرے اور رکوع کی بہ نسبت سجدے کے لیے سر کو تھوڑا زیادہ نیچے جھکائے۔ ایسا معذور شخص اگر کرسی پر بیٹھ کر بھی نماز ادا کرے تو جائز ہے اور اس صورت میں رکوع اور سجود اشارے سے کرے۔ زمین پر رکھی ہوئی کسی شے پر سر رکھ کر سجدہ کرنے میں کوئی کراہت نہیں، لیکن اُس شے کی بلندی موضع قدم (یعنی زمین سے) ایک یا دو اینٹوں کی مقدار (یعنی نو انچ) بلندی سے زائد نہ ہو، علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَلَوِارْتَفَعَ مَوْضِعَ السُّجُوْدِ عَنْ مَوْضِعِ الْقَدَمَيْنِ قَدْرَلَبِنَةٍ أَوْلَبِنَتَيْنِ مَنْصُوْبَتَيْنِ جَازَ، لَاإِنْ زَادَ''۔

ترجمہ: ''پس اگر سجدہ کی جگہ کو زمین سے ایک یا دو اینٹوں کی بلندی کی مقدار اٹھایا ہے تو (نماز) جائز ہے اور اگر اِس مقدار سے زائد ہے تو جائز نہیں ہے، (فتح القدیر، ج:1، ص: 311، مطبوعہ: مرکز اہلسنّت برکات رضا، ہند)''۔ کرسی اگرچہ زمین پر ہی رکھی ہوتی ہے، لیکن اس کی اونچائی بیان کی گئی مقدار سے زیادہ ہوتی ہے۔

علامہ بدرالدین عینی متوفی 855ھ ''البنایہ فی شرح الھدایہ'' میں لکھتے ہیں:

''قَالَ: فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعِ الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَأَوْمَأَ إِيْمَاءً يَعْنِيْ قَاعِدًالِأَنَّهٗ وَسِعَ مِثْلَهٗ، وَجَعَلَ سُجُوْدَهٗ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوْعِهِ لِأَنَّهٗ قَائِمٌ مَّقَامَهُمَا، فَأَخَذَحُكْمَهُمَا، وَلَايَرْفَعُ إِلٰى وَجْهِهٖ شَيْئٌ يَسْجُدُعَلَيْهِ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَإِنْ قَدَرْتَ أَنْ تَسْجُدَ عَلَى الْأَرْضِ فَاسْجُدْ وَإِلَّافَأَوْمِ بِرَأْسِكَ وَإِنْ فَعَلَ ذٰلِكَ وَهُوَيَخْفِضُ رَأْسَهٗ أَجْزَأَهٗ لِوُجُوْدِالْإِيْمَاءِ''۔

ترجمہ: ''(ماتن نے) کہا: اگر نمازی رکوع وسجود کی طاقت نہیں رکھتا، تو (رکوع وسجود) کے لیے بیٹھ کر اشارہ کرے، کیونکہ وہ اسی کی طاقت رکھتا ہے اور سجدوں کے لیے رکوع کی نسبت سر کو زیادہ جھکائے کیونکہ اشارہ ہی رکوع وسجود کے قائم مقام ہے، تو اس کا حکم وہی ہوگا اور

سجدہ کرنے کے لیے اپنے چہرے کی طرف کوئی چیز نہ اٹھائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہی ارشاد ہے: ''اور اگر تم زمین پر سجدہ کرنے کی طاقت رکھتے ہو، تو سجدہ کرو، ورنہ سر سے اشارہ کرو'' اور اگر وہ سر کو جھکا کر اس طرح سجدہ کرتا ہے تو یہ (ادائے فرض کے لیے) کافی ہے، کیونکہ اشارہ پایا گیا''۔ (جلد 3، ص: 193 تا 196، مکتبۂ حقانیہ، ملتان)

اگر کوئی شخص صف میں کھڑے ہو کر اشارے سے رکوع و سجود نہ کر سکتا ہو اور بیٹھ بھی نہ سکتا ہو تو گھر پر جیسا اس سے ہو سکے نماز پڑھ لے، وہ جماعت سے معذور ہے۔ باجماعت نمازوں میں صفوں کے درمیان کرسی رکھنے سے ''تسویۃ الصّف'' یعنی صف کی برابری کی سنّت ادا ہو ہی نہیں سکتی۔ ہماری نظر میں جب تک بندہ بیٹھ کر، خواہ التحیات کی وضع میں ہو یا پاؤں دائیں جانب نکال کر یا آلتی پالتی مار کر بیٹھ سکتا ہو، حتی الامکان بیٹھ کر نماز پڑھے۔

## دورانِ جماعت جب مقتدی جماعت میں شامل ہو

### سوال:

امام کے رکوع کے بعد پہلے یا دوسرے سجدے میں کوئی مقتدی شامل ہوا، نماز کے آخر میں اپنی بقیہ رکعت بھی پڑھ لی، آٹھ سجدوں کے بجائے نو سجدے ادا کر لیے تو کیا نماز مکمل ہو جائے گی، (محمد ناظم، نارووال)۔

### جواب:

حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي قَتَادَةَ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ نُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ إِذْ سَمِعَ جَلَبَةَ رِجَالٍ، فَلَمَّا صَلَّى قَالَ: مَا شَأْنُكُمْ، قَالُوْا: اِسْتَعْجَلْنَا إِلَى الصَّلَاةِ، قَالَ: فَلَا تَفْعَلُوْا إِذَا أَتَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جس وقت ہم نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، اچانک آپ کو لوگوں کی آہٹیں اور آوازیں سنائی دیں، آپ ﷺ نے نماز پڑھنے کے بعد فرمایا: تمہیں کیا ہوا تھا؟، انہوں نے عرض کی: ہم جماعت میں شامل

ہونے کے لیے جلدی کر رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایسا نہ کرو، جب تم نماز پڑھنے کے لیے آؤ تو تم اطمینان اور سکون کے ساتھ آؤ، تم کو (امام کے ساتھ) جتنی نماز مل جائے، اس کو پڑھ لو اور جتنی نماز تم سے فوت ہو جائے، اسے (آخر میں) پوری کر لو"۔
(صحیح بخاری:635)

اس حدیث کے مطابق مقتدی کو چاہیے کہ سکون واطمینان کے ساتھ جماعت میں شامل ہونے کے لیے آئے اور امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز پوری کر لے۔ جتنی نماز ملنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر امام پہلے یا دوسرے سجدے میں ہے، تو سجدہ میں شامل ہو جائے، یہ اضافی یا زائد سجدہ نماز کی تکمیل میں مانع نہیں ہوگا اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد بقیہ نماز پوری کرنے پر نماز کامل شمار ہوگی۔ مسبوق مقتدی مکمل رکعات کے علاوہ امام کی اقتدا میں جو اضافی سجدہ یا قعدہ کرے گا، اس پر اسے اجر کی اُمید رکھنی چاہیے۔ بعض لوگ امام کو سجدے یا قعدے میں دیکھ کر کھڑے رہتے ہیں اور امام جب نئی رکعت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، تو شامل ہو جاتے ہیں، ایسا نہ کریں، بلکہ امام جس مرحلے میں بھی ہو نیت کر کے جماعت میں شامل ہو جائیں، آپ کے ہر سجدے، تسبیح اور قعدے پر آپ کو اجر ملے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام ترمذی نے اپنی سُنَن میں باب باندھا ہے: "بَابُ مَا ذُكِرَ فِي الرَّجُلِ يُدْرِكُ الْإِمَامَ وَهُوَ سَاجِدٌ كَيْفَ يَصْنَعُ"، ترجمہ: "کوئی شخص امام کو سجدے کی حالت میں پائے تو کیا کرے"، اس کے تحت انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے:

"قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ وَالْإِمَامُ عَلَى حَالٍ فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الْإِمَامُ"۔

ترجمہ: "نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے آئے اور امام کسی حال میں ہو (یعنی حالتِ رکوع یا قیام یا سجدہ یا تشہد میں ہو) تو وہی کرے جو امام کر رہا ہے، (ترمذی:591)"۔ امام ابوعیسیٰ نے کہا ہے: "یہ حدیث غریب ہے اور صرف اسی طریق

سے مروی ہے، لیکن اہلِ علم کا اس پر عمل ہے، انہوں نے کہا: کوئی شخص آئے اور امام کو سجدے میں پائے تو امام کے ساتھ سجدے میں شامل ہوجائے اور اگر امام کے ساتھ رکوع فوت ہوگیا ہے تو یہ رکعت ادا نہ ہوئی (یعنی مسبوق اس کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرے) اور عبداللہ بن مبارک نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ امام کے ساتھ سجدے میں شامل ہوجائے اور انہوں نے بعض ائمہ سے نقل کیا ہے: امید کی جاتی ہے کہ اس سجدے سے سر اٹھانے سے پہلے اس کی مغفرت کردی جائے گی"۔

## نابینا کی امامت

**سوال:**

کیا نابینا امام کے پیچھے نماز پنجگانہ اور نمازِ جنازہ ادا کی جاسکتی ہے۔

(عرفان احمد، آزاد کشمیر)

**جواب:**

نابینا شخص اگر احتیاط برتتا ہے یعنی کپڑوں یا بدن پر کوئی چیز لگ جائے تو کسی بینا شخص کو دکھا کر اطمینان کرلیتا ہے کہ کہیں نجاست تو نہیں لگی اور اگر نجاست لگ گئی ہو تو دھو لیتا ہے، ایسے نابینا کی امامت جائز ہے، مگر مکروہِ تنزیہی ہے اور اگر وہ حاضرین میں مسائل نماز کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

"عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ اِسْتَخْلَفَ ابْنَ أُمِّ مَكْتُومٍ يَؤُمُّ النَّاسَ وَهُوَ أَعْمٰى"۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (غزوۂ تبوک کے موقع پر عبداللہ) بن اُمِّ مکتوم کو (مدینہ منورہ میں) اپنا خلیفہ بنایا تاکہ وہ لوگوں کی امامت کریں، حالانکہ وہ نابینا تھے، (سنن ابوداؤد: 595)"۔

اس کی شرح میں علامہ علی القاری الحنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ابن الملک نے کہا: نابینا کی امامت کی کراہت اس صورت میں ہے کہ قوم میں اس کے

مقابلے میں تندرست شخص اس سے بڑا عالم یا اس کے برابر درجے کا عالم موجود ہو، علامہ ابن حجر نے کہا: اس میں نابینا کی امامت کا جواز ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ بینا کی امامت اَولیٰ ہے یا نابینا کی (جبکہ دونوں دستیاب ہوں)، (مرقاۃ المفاتیح، جلد:3، ص:84 مکتبۂ امدادیہ، ملتان)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"(وَيُكْرَهُ) تَنْزِيهًا (إِمَامَةُ أَعْمٰى) وَنَحْوِهِ الْاَعْشٰى "نَهْرٌ" (إِلَّا أَنْ يَّكُوْنَ) أَيْ غَيْرُ الْفَاسِقِ (أَعْلَمَ الْقَوْمِ) فَهُوَ أَوْلٰى"۔

ترجمہ: "نابینا اور ایسا شخص جسے رات کو نظر نہ آتا ہو، اس کی امامت مکروہ تنزیہی ہے (بحوالہ النہر الفائق) اور اگر یہ زیادہ صاحب علم ہو تو اس کی امامت بہتر ہے، (جلد:2، ص: 254,255، بیروت)"۔ چونکہ علامہ حصکفی نے نابینا کا ذکر فاسق اور اَعرابی کے سیاق میں کیا ہے، اس لیے اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَحَاصِلُهُ: أَنَّ قَوْلَهُ إِلَّا أَنْ يَّكُوْنَ أَعْلَمَ الْقَوْمِ خَاصٌّ بِالْاَعْمٰى، أَمَّا غَيْرُهُ فَلَا تَنْتَفِي الْكَرَاهَةُ بِعِلْمِهِ"۔

ترجمہ: "اس بحث کا حاصل یہ ہے" علامہ حصکفی کا یہ قول کہ "اگر وہ پوری قوم سے زیادہ عالم ہو" (تو وہ نابینا امامت کا زیادہ حق دار ہے) نابینا کے ساتھ خاص ہے، جہاں تک غیرِ نابینا (مثلاً فاسق کی امامت) کا تعلق ہے، تو علم کی بنا پر اس کی کراہت منتفی نہیں ہوگی ۔۔۔۔ اور آگے چل کر لکھتے ہیں: کہ اگر نابینا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عالم ہے تو استحقاقِ امامت کا معاملہ بالکل برعکس ہوگا (یعنی نابینا عالم ہی زیادہ حق دار ہوگا)"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار ج:2، ص:255، بیروت)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا: "اندھے کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی یا تحریمی ہے یا نہیں اور یہ امامت کے واسطے سزاوار ہے یا نہیں"، آپ جواب میں لکھتے ہیں: "اندھا اگر تمام موجودین میں سب سے زیادہ مسائل کا جاننے والا نہ ہو اور

اس کے سوا دوسرا صحیح القراءت، صحیح العقیدہ، غیر فاسقِ مُعلِن حاضر جماعت ہے، تو اندھے کی امامت مکروہِ تنزیہی ہے اور اگر وہی سب سے زیادہ علمِ نماز رکھتا ہے، تو اسی کی امامت افضل ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 6، ص: 520 رضا فاؤنڈیشن، لاہور)"۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"نابینا کی امامت مکروہ تنزیہی ہے، جبکہ دوسرے لوگ مسائل طہارت ونماز میں اس سے زائد یا اس کے برابر ہوں اور اگر سب سے زائد یہی علم رکھتا ہو، تو اس کی امامت میں اصلاً کراہت نہیں، بلکہ اس صورت میں اسی کو امام بنانا بہتر ہے، بحر الرائق میں ہے:

"وَقَيَّدَ كَرَاهَةَ إِمَامَةِ الْأَعْمٰى فِي "الْمُحِيط" وَغَيْرِهِ بِأَنْ لَا يَكُونَ أَفْضَلَ الْقَوْمِ، فَإِنْ كَانَ أَفْضَلَهُمْ فَهُوَ أَوْلٰى"۔

ترجمہ: "اندھے کی امامت کے مکروہ ہونے کو "المحیط" وغیرہ کتب میں اس بات کے ساتھ مقید کیا ہے کہ وہ قوم (حاضرینِ جماعت) میں سب سے بڑھ کر افضل نہ ہو، ورنہ تو پھر اُسی کو امام بنانا اولیٰ ہے، (البحر الرائق، ج: ۱، ص: ۳۶۹)"۔

مکروہ تنزیہی ناجائز نہیں ہوتا مگر اس سے بچنا بہتر، اور کرنا برا ہے، مگر گناہ نہیں۔
(فتاویٰ امجدیہ جلد اول ص: 107 مطبوعہ مکتبۂ رضویہ، آرام باغ، کراچی)

## نمازِ تہجد کا افضل وقت

**سوال:**

تہجد کا مقبول وقت کیا ہے؟، (مجیب خان، احمد پور شرقیہ)۔

**جواب:**

عشاء کے بعد سو کر اٹھیں اور نوافل پڑھیں، وہ تہجد ہیں۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جو شخص تہائی رات سونا چاہے اور ایک تہائی عبادت کرنا، اُس کے لیے افضل یہ ہے کہ پہلی اور پچھلی تہائی میں سوئے اور درمیان کی تہائی میں عبادت کرے اور اگر نصف شب میں سونا

چاہتا ہے اور نصف جاگنا تو پچھلی نصف میں عبادت افضل ہے، حدیث پاک میں ہے:

"یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ، فَيَقُولُ: مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبُ لَهُ وَمَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهُ وَمَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ"۔

ترجمہ: "رات کے پچھلے پہر جب ایک تہائی رات باقی رہ جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر خاص تجلی فرماتا ہے اور ندا فرماتا ہے: "ہے کوئی دعا کرنے والا کہ اُس کی دعا قبول کروں، ہے کوئی مانگنے والا کہ اُسے دوں، ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ اس کی بخشش کردوں"۔
(صحیح مسلم:758)، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:678)

## نمازِ عشاء کی بابت ایک سوال

**سوال:**

اگر کوئی شخص عشاء کی نماز (فرض) پڑھے بغیر سو گیا اور وہ نماز فجر سے دو گھنٹے قبل اٹھ کر عشاء کی نماز ادا کرتا ہے اور تہجد پڑھتا ہے تو اس کی دونوں نمازیں ہو جائیں گی؟

(مجیب خان، احمد پور شرقیہ)

**جواب:**

نمازِ عشاء کی ادائیگی میں تہائی رات تک تاخیر کرنا مستحب ہے اور آدھی رات تک تاخیر مباح، اتنی تاخیر کہ رات ڈھل گئی، مکروہ ہے کیونکہ یہ جماعت کی تعداد کم ہونے کا سبب ہے۔ مذکورہ وقت میں نمازِ عشاء اور تہجد دونوں ادا ہو جائیں گے، حدیث پاک میں ہے:

(۱) "عَنْ أَبِي بَرْزَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَ الْعِشَاءِ وَالْحَدِيثَ بَعْدَهَا"۔

ترجمہ: "حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ عشاء سے پہلے سونے کو ناپسند کرتے تھے اور عشاء کے بعد (فضول) باتیں کرنے کو، (صحیح بخاری:568)"۔

(۲) "حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ شُغِلَ عَنْهَا لَيْلَةً، فَأَخَّرَهَا حَتّٰى

رَقَدْنَا فِی الْمَسْجِدِ، ثُمَّ اسْتَيْقَظْنَا، ثُمَّ رَقَدْنَا، ثُمَّ اسْتَيْقَظْنَا، ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِیُّ ﷺ، ثُمَّ قَالَ: لَيْسَ أَحَدٌ مِّنْ أَهْلِ الْأَرْضِ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ غَيْرُكُمْ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ لَا يُبَالِیْ أَقَدَّمَهَا أَمْ أَخَّرَهَا إِذَا كَانَ لَا يَخْشٰى أَنْ يَّغْلِبَهُ النَّوْمُ عَنْ وَقْتِهَا وَكَانَ يَرْقُدُ قَبْلَهَا''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی کام میں مشغول تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عشاء کی نماز کو مؤخر کردیا، حتیٰ کہ ہم مسجد میں سو گئے، پھر ہم بیدار ہوئے، پھر ہم سو گئے، پھر ہم بیدار ہوئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمارے پاس نکل کر تشریف لائے، پھر آپ نے فرمایا: تمام روئے زمین پر اس نماز کا تمہارے سوا اور کوئی انتظار نہیں کررہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ عشاء کی نماز مقدّم کریں یا مؤخّر کریں جب کہ انہیں یہ خطرہ نہ ہو کہ نیند کے غلبہ کی وجہ سے عشاء کا وقت نکل جائے گا اور وہ عشاء پڑھنے سے پہلے سو جاتے تھے، (صحیح بخاری:570)''۔

(۳) ''عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِیْ لَأَمَرْتُهُمْ أَنْ يُّؤَخِّرُوا الْعِشَاءَ إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ أَوْ نِصْفِهٖ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اگر میری اُمّت پر دشوار نہ ہوتا تو میں اُنہیں عشاء کی نماز تہائی رات یا نصف رات تک مؤخر کرنے کا حکم دیتا''۔
(سُنن ترمذی:168)

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''(قَوْلُهٗ وَالْعِشَاءُ إِلَى الثُّلُثِ) أَیْ نُدِبَ تَأْخِيْرُهَا إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ لِمَا رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَصَحَّحَهٗ ''لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِیْ لَأَخَّرْتُ الْعِشَاءَ إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ أَوْ نِصْفِهٖ'' وَفِیْ مُخْتَصَرِ الْقُدُوْرِیِّ إِلٰى مَا قَبْلَ الثُّلُثِ لِرِوَايَةِ الْبُخَارِیِّ ''كَانُوْا يُصَلُّوْنَ الْعَتَمَةَ فِيْمَا بَيْنَ أَنْ يَّغِيْبَ الشَّفَقُ إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ'' وَمُقْتَضَاهُ أَنَّهٗ لَا يُسْتَحَبُّ تَأْخِيْرُهَا إِلَى الثُّلُثِ بِخِلَافِ الْأَوَّلِ وَ وُفِّقَ بَيْنَهُمَا فِیْ شَرْحِ الْمَجْمَعِ لِابْنِ الْمَلِكِ بِحَمْلِ الْأَوَّلِ عَلَى الشِّتَاءِ

وَالثَّانِیْ عَلَی الصَّیْفِ لِغَلَبَةِ النَّوْمِ وَأَطْلَقَهُ فَشَمِلَ الصَّیْفَ وَالشِّتَاءَ وَقِیْلَ یُسْتَحَبُّ تَعْجِیْلُ الْعِشَاءِ فِی الصَّیْفِ لِئَلَّا تَتَقَلَّلَ الْجَمَاعَةُ وَأَفَادَ أَنَّ التَّأْخِیْرَ إِلٰی نِصْفِ اللَّیْلِ لَیْسَ بِمُسْتَحَبٍّ وَقَالُوْا إِنَّهُ مُبَاحٌ وَإِلٰی مَا بَعْدَهُ مَکْرُوْهٌ وَقِیْلَ إِلٰی مَا بَعْدَ الثُّلُثِ مَکْرُوْهٌ وَرَوَی الْإِمَامُ أَحْمَدُ وَغَیْرُهُ أَنَّهُ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ کَانَ یَسْتَحِبُّ أَنْ یُؤَخِّرَ الْعِشَاءَ وَکَانَ یَکْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِیْثَ بَعْدَهَا وَقَیَّدَ الطَّحَاوِیُّ کَرَاهَةَ النَّوْمِ قَبْلَهَا بِمَنْ خُشِیَ عَلَیْهِ فَوْتُ وَقْتِهَا أَوْ فَوْتُ الْجَمَاعَةِ فِیْهَا وَإِلَّا فَلَا''۔

ترجمہ: ''امام ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی کا یہ قول: ''عشاء کی نماز میں تہائی رات تک تاخیر مستحب ہے''، کیونکہ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا اور صحیح کہا ہے: ''اگر میں اپنی امت کے لیے دشواری محسوس نہ کرتا تو میں نمازِ عشاء کو نصف شب یا تہائی شب تک مؤخر کرتا'' اور ''مختصر القدوری'' میں صحیح بخاری کی روایت میں تہائی رات سے قبل پڑھنے کا حکم ہے: ''عشاء کی نماز کو وہ شفق (کی سفیدی) غائب ہونے کے بعد تہائی رات کے اول حصہ تک مؤخر کرتے تھے''۔ اس روایت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے قول کے برعکس تہائی رات تک تاخیر کرنا مستحب نہیں ہے، ''ابن الملک'' کی ''شرح المجمع'' میں ان دونوں اقوال کے درمیان موافقت یوں بیان کی گئی ہے کہ پہلے قول کو موسمِ سرما پر محمول کریں گے اور دوسرے قول کو موسمِ گرما پر، کیونکہ اس موسم میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور بعض نے مطلق بات کی ہے، پس یہ موسمِ گرما و سرما دونوں کو شامل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ موسمِ گرما میں عشاء کی نماز جلد پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے، کیونکہ تاخیر سے جماعت کی تعداد کم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نصف رات تک تاخیر مستحب نہیں ہے، بعض فقہاء نے کہا: عشاء کی نماز نصف شب تک مؤخر کرنا مباح ہے اور نصف شب کے بعد تک مؤخر کرنا مکروہ ہے، ایک قول کے مطابق تہائی رات کے بعد تاخیر کرنا مکروہ ہے اور امام احمد و دیگر مُحدّثین نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عشاء میں تاخیر کو پسند فرماتے تھے اور عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ امام طحاوی نے عشاء سے پہلے سونے کو ان لوگوں

کے لیے مکروہ کہا ہے، جن کے لیے (نیند کے سبب) نماز یا جماعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو، ورنہ عشاء سے پہلے سونا مطلقاً مکروہ نہیں ہے، (البحر الرائق، جلد 1، ص: 430)''۔

جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ افضل ہے، حدیث میں ہے:

''صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً''۔

ترجمہ: ''جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے پر ستائیس درجہ فضیلت رکھتا ہے''۔ (صحیح بخاری: 645)

مسجد کے لیے چل کر جانا ثواب کی زیادتی کا سبب ہے۔

(۱) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَطَهَّرَ فِي بَيْتِهٖ، ثُمَّ مَشٰى إِلٰى بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ لِيَقْضِيَ فَرِيْضَةً مِّنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ، كَانَتْ خَطْوَتَاهُ إِحْدَاهُمَا تَحُطُّ خَطِيْئَةً، وَالْأُخْرٰى تَرْفَعُ دَرَجَةً''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے گھر میں وضو کرے پھر اللہ تعالیٰ کے کسی گھر میں کوئی فریضہ ادا کرنے جائے تو اس کا ایک قدم ایک گناہ ساقط کرے گا اور دوسرا ایک درجہ بلند کرے گا، (صحیح مسلم: 666)''۔

(۲) ''سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ: كَانَتْ دِيَارُنَا نَائِيَةً عَنِ الْمَسْجِدِ، فَأَرَدْنَا أَنْ نَّبِيْعَ بُيُوْتَنَا، فَنَقْتَرِبَ مِنَ الْمَسْجِدِ، فَنَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: إِنَّ لَكُمْ بِكُلِّ خَطْوَةٍ دَرَجَةً''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ہمارے گھر مسجد سے دور تھے، ہم نے ارادہ کیا کہ اپنے گھر بیچ کر مسجد کے قریب گھر خرید لیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے منع کیا اور فرمایا: تمہارے ہر قدم کے عوض ایک درجہ ہے، (صحیح مسلم: 664)''۔

(۳) ''مَنْ تَوَضَّأَ لِلصَّلَاةِ فَأَسْبَغَ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ مَشٰى إِلَى الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ فَصَلَّاهَا مَعَ النَّاسِ أَوْ مَعَ الْجَمَاعَةِ أَوْ فِي الْمَسْجِدِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ ذُنُوْبَهٗ''۔

ترجمہ: ''جس نے نماز کے لیے اچھی طرح وضو کیا، پھر فرض نماز کے لیے گیا اور لوگوں کے

ساتھ یا جماعت کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ اُس کے گناہوں کو معاف فرما دے گا، (سُنن نسائی:856)''۔

(۴)''صَلَاۃُ الرَّجُلِ فِی الْجَمَاعَۃِ تُضَعَّفُ عَلٰی صَلَاتِہٖ فِی بَیْتِہٖ، وَفِی سُوْقِہٖ، خَمْسًا وَّعِشْرِیْنَ ضِعْفًا، وَذٰلِکَ أَنَّہٗ إِذَا تَوَضَّأَ، فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَی الْمَسْجِدِ، لَا یُخْرِجُہٗ إِلَّا الصَّلَاۃُ، لَمْ یَخْطُ خَطْوَۃً، إِلَّا رُفِعَتْ لَہٗ بِھَا دَرَجَۃٌ، وَحُطَّ عَنْہُ بِھَا خَطِیْئَۃٌ، فَإِذَا صَلّٰی لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِکَۃُ تُصَلِّی عَلَیْہِ، مَا دَامَ فِی مُصَلَّاہُ، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ، اَللّٰھُمَّ ارْحَمْہُ وَلَا یَزَالُ أَحَدُکُمْ فِی صَلَاۃٍ مَا انْتَظَرَ الصَّلَاۃَ''۔

ترجمہ: ''مرد کی (مسجد میں) جماعت کے ساتھ نماز اس کی گھر میں اور بازار میں نماز پر پچیس درجہ افضل ہے کیونکہ جب وہ عمدہ طریقہ سے وضو کرتا ہے، پھر مسجد کی طرف نکلتا ہے اور صرف نماز ہی اس کے نکلنے کا سبب ہے، تو اس کے ہر قدم پر اس کا ایک درجہ بلند کر دیا جاتا ہے اور اس کے ایک گناہ کو مٹا دیا جاتا ہے اور جب وہ نماز پڑھتا ہے تو جب تک وہ نماز کی جگہ پر رہتا ہے، فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں: اے اللہ! اس پر رحمت نازل فرما، اس پر رحم فرما اور تم میں سے کوئی شخص جب تک نماز کے انتظار میں رہتا ہے، اس کا نماز میں شمار ہوتا رہتا ہے، (صحیح بخاری:647)''۔

## عشا کی نیت میں غلطی سے ظہر یا عصر کہہ دینا

**سوال:**

اگر کوئی شخص عشاء کی جماعت میں غلطی سے ظہر، عصر یا مغرب کی نیت کر کے شامل ہو جائے، سلام پھیرنے سے پہلے یا سلام پھیرتے وقت یاد آیا تو اس نماز کا شرعی حکم کیا ہے؟، (محمد اشرف قادری، قصبہ کالونی کراچی)۔

**جواب:**

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، زبان سے نیت کے کلمات کا ادا کرنا، جو ہمارے ہاں معروف ہیں، نہ حدیث سے ثابت ہیں، نہ شرعاً ضروری ہیں۔ ہمارے متاخرین فقہائے

کرام نے ذہنی استحضار یعنی ذہن کو مُتوجہ رکھنے کے لیے زبانی نیت کو مستحب قرار دیا ہے۔

فرض نماز میں یہ ضروری ہے کہ دل میں اُس خاص نماز کی نیت کرے، مثلاً: آج کی ظہر۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْوَاجِبَاتُ وَالْفَرَائِضُ لَا تَتَادّٰی بِمُطْلَقِ النِّیَّةِ إِجْمَاعًا کَذَا فِی ''الْغِیَاثِیَّةِ'' فَلَا بُدَّ مِنَ التَّعْیِیْنِ فَیَقُوْلُ: نَوَیْتُ ظُهْرَ الْیَوْمِ أَوْعَصْرَ الْیَوْمِ أَوْ فَرْضَ الْوَقْتِ أَوْ ظُهْرَ الْوَقْتِ کَذَا فِی ''شَرْحِ مُقَدِّمَةِ أَبِی اللَّیْثِ'' وَلَا یَکْفِیْهِ نِیَّةُ الْفَرْضِ وَإِذَا نَوٰی فَرْضَ الْوَقْتِ جَازَ إِلَّا فِی الْجُمُعَةِ وَلَوْ نَوَی الظُّهْرَ فِی غَیْرِ الْجُمُعَةِ قِیْلَ یَجُوْزُ هُوَ الصَّحِیْحُ''۔

ترجمہ: ''واجبات اور فرائض مطلق نیت سے ادا نہیں ہوں گے، اس پر اجماع ہے، جیسا کہ ''غیاثیہ'' میں ہے، فرض نماز میں تعیین ضروری ہے، پس یہ کہے: میں آج کے ظہر کی نیت کرتا ہوں یا وقتی فرض کی یا وقتِ ظہر کی نیت کرتا ہوں، جیسا کہ ''مُقدّمہ ابواللّیث'' کی شرح میں ہے اور (وقت کی تعیین کے بغیر مطلق) فرض کی نیت کافی نہیں ہے، مگر جب فرضِ وقت کی نیت کی تو جائز ہے مگر جمعہ میں فرض وقت کی نیت کافی نہیں اور اگر جمعہ کے علاوہ ظہر کی نیت کی تو بعض نے جائز قرار دیا، یہ صحیح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:65)''۔

صحتِ نیت کے لیے چند امور ضروری ہیں:

(۱) نیت دل کے ارادے کو کہتے ہیں، محض جاننا نیت نہیں ہے۔

(۲) نیت میں محض زبان سے ادا کیے ہوئے الفاظ کا اعتبار نہیں ہے، پس اگر دل میں ظہر کی نیت کی اور وقت بھی ظہر کا ہے، لیکن زبان سے لفظ عصر نکلا تو نماز ادا ہوجائے گی۔

(۳) محتاط ترین بات یہ ہے کہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت نیت حاضر ہو، اگر نیت پہلے کرلی اور درمیان میں کوئی اجنبی فعل عارض نہیں ہوا (جیسے کھانا پینا کلام وغیرہ) تو بھی صحتِ ادا کے لیے یہ نیت کافی ہے۔

(۴) نماز شروع کرتے وقت دل میں نیت حاضر نہیں ہے، تو دورانِ نماز کی نیت کا اعتبار نہیں ہے۔

(۵) صحیح یہ ہے کہ سنت اور نفل کے لیے مطلق نماز کی نیت کافی ہے، وقت کی تعیین ضروری نہیں ہے، البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تراویح کے لیے تراویح یا قیام اللیل کی نیت کرے، البتہ فرض اور واجب نماز کے لیے بالترتیب فرض اور واجب کی نیت ضروری ہے۔

(۶) نیت حاضر ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر کوئی پوچھے، کون سی نماز پڑھ رہے ہو تو کسی تردّد یا سوچ بچار کیے بغیر بتادے کہ مثلاً: ظہر کی نماز پڑھ رہا ہوں۔

(بہارِ شریعت، جلد سوم، ص:493، ملخصاً)

## مسبوق کی نماز اور سِرّی نماز میں ثناء پڑھنے کا مسئلہ

**سوال:**

زید ظہر، عصر یا عشاء کی چوتھی رکعت میں شامل ہوا، بقیہ رکعات ادا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟، (محمد اشرف، قصبہ کالونی کراچی)۔

**جواب:**

امام کے ایک رکعت یا چند رکعات پڑھنے کے بعد جو شخص جماعت میں شامل ہوا اور آخر تک رہا، اُسے ''مسبوق'' کہتے ہیں۔ مسبوق امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب اپنی نماز شروع کرے گا تو یہ حقِ قراءت میں اس کی پہلی رکعت قرار دی جائے گی اور اِس میں مسبوق ثناء (اگر پہلے نہ پڑھی ہو)، سورۂ فاتحہ اور سورت پڑھے گا، رکوع وسجود کے بعد حقِ تشہُد میں یہ دوسری یا تیسری یا چوتھی رکعت جو شمار میں آئے، قرار پائے گی۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الرُّبَاعِيَّةِ فَعَلَيْهِ أَنْ يَقْضِيَ رَكْعَةً يَقْرَأُ فِيهَا الْفَاتِحَةَ وَالسُّوْرَةَ وَيَتَشَهَّدُ وَيَقْضِيَ رَكْعَةً أُخْرٰى كَذٰلِكَ وَلَا يَتَشَهَّدُ وَفِي الثَّالِثَةِ بِالْخِيَارِ وَالْقِرَاءَةُ أَفْضَلُ هٰكَذَا فِي ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ: ''اگر مسبوق نے چار رکعات والی نماز میں سے ایک رکعت پائی، (امام کے سلام پھیرنے کے بعد) اس پر لازم ہے کہ پہلی رکعت اس طرح پوری کرے کہ سورۂ فاتحہ اور

سورت اور (قعدہ میں) تشہد پڑھے، دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھے اور اس میں تشہد نہ پڑھے، اور تیسری رکعت میں خیار ہے، قراءت کرنا افضل ہے، ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:95)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَيَقْضِي أَوَّلَ صَلَاتِهِ فِي حَقِّ قِرَائَةٍ، وَآخِرَهَا فِي حَقِّ تَشَهُّدٍ، فَمُدْرِكُ رَكْعَةٍ مِّنْ غَيْرِ فَجْرٍ يَأْتِي بِرَكْعَتَيْنِ بِفَاتِحَةٍ وَّسُورَةٍ وَّتَشَهُّدٍ بَيْنَهُمَا وَبِرَابِعَةِ الرُّبَاعِيِّ بِفَاتِحَةٍ فَقَطْ، وَلَا يَقْعُدُ قَبْلَهَا''۔

ترجمہ: ''مسبوق اپنی فوت شدہ رکعت قراءت کے حق میں اول اور تشہد کے حق میں آخر نماز تصور کر کے ادا کرے، فجر کے علاوہ ایک رکعت پانے والا دو رکعات کو فاتحہ اور سورت اور ان کے درمیان تشہد کے ساتھ ادا کرے اور چار رکعات نماز میں چوتھی رکعت کو صرف فاتحہ کے ساتھ پڑھے اور اس سے پہلے قعدہ نہ کرے، (جلد 3، ص:644، دمشق)''۔

آپ نے مسئلے کی جو صورت دریافت کی ہے، اُس کا جواب یہ ہے: مُقتدی امام کے سلام پھیرنے کے بعد اللہ اکبر کہہ کر اٹھے اور ثنا و فاتحہ کے ساتھ سورت ملا کر رکعت مکمل کرے اور التحیات پر بیٹھ جائے کیونکہ امام کے ساتھ پڑھی جانے والی ایک رکعت کو ملا کر اب اُس کی دو رکعات ہو چکی ہیں۔ اُس کے بعد تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو اور اُس میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملا کر رکعت مکمل کرے اور آخر میں صرف فاتحہ پڑھ کر اپنی چوتھی رکعت پڑھے اور اس طرح نماز مکمل کرے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''إِلَّا إِذَا شَرَعَ الْإِمَامُ فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءٌ كَانَ مَسْبُوقًا أَوْ مُدْرِكًا وَّسَوَاءٌ كَانَ إِمَامُهُ يَجْهَرُ بِالْقِرَاءَةِ أَوْ لَا، فَإِنَّهُ لَا يَأْتِي بِهِ لِمَا فِي النَّهْرِ عَنِ الصُّغْرٰى أَدْرَكَ الْإِمَامَ فِي الْقِيَامِ يُثْنِي مَا لَمْ يَبْدَأْ بِالْقِرَاءَةِ، وَقِيلَ فِي الْمُخَافَتَةِ يُثْنِي''۔

ترجمہ: ''مگر جب امام قراءت شروع کر دے، خواہ وہ جہری قراءت کر رہا ہو یا سرّی،

مقتدی ثناء (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ) نہیں پڑھے گا، خواہ وہ مقتدی مسبوق ہو یا مدرِک، ''اَلنَّھْرُ الْفَائِق'' میں صغریٰ کے حوالے سے ہے: (مقتدی نے) امام کو قیام میں پایا، تو جب تک امام نے قراءت نہ شروع کی ہو، مقتدی ثناء پڑھ لے اور ایک قول یہ ہے کہ سرّی قراءت کے دوران بھی ثناء پڑھ لے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ متعدد ثقہ حوالہ جات کے ساتھ بشمول امام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْ أَدْرَكَ الْإِمَامَ بَعْدَ مَا اشْتَغَلَ بِالْقِرَاءَةِ، قَالَ ابْنُ الْفَضْلِ: لَا يُثْنِي وَقَالَ غَيْرُهُ: يُثْنِي وَيَنْبَغِي التَّفْصِيلُ إِنْ كَانَ الْإِمَامُ يَجْهَرُ لَا يُثْنِي وَإِنْ كَانَ يُسِرُّ يُثْنِي وَهُوَ مُخْتَارُ شَيْخِ الْإِسْلَامِ خَوَاهَرْزَادَهْ، وَعَلَّلَهُ فِي ''الذَّخِيرَةِ'' بِمَا حَاصِلُهُ أَنَّ الْاِسْتِمَاعَ فِي غَيْرِ حَالَةِ الْجَهْرِ لَيْسَ بِفَرْضٍ، بَلْ يُسَنُّ تَعْظِيمًا لِلْقِرَاءَةِ فَكَانَ سُنَّةً غَيْرَ مَقْصُودَةٍ لِذَاتِهَا، وَعَدَمُ قِرَاءَةِ الْمُؤْتَمِّ فِي غَيْرِ حَالَةِ الْجَهْرِ لَا لِوُجُوبِ الْإِنْصَاتِ، بَلْ لِأَنَّ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ۔ وَأَمَّا الثَّنَاءُ فَهُوَ سُنَّةٌ مَقْصُودَةٌ لِذَاتِهَا وَلَيْسَ ثَنَاءُ الْإِمَامِ ثَنَاءً لِلْمُؤْتَمِّ، فَإِذَا تَرَكَهُ يَلْزَمُ تَرْكُ سُنَّةٍ مَقْصُودَةٍ لِذَاتِهَا لِلْإِنْصَاتِ الَّذِي هُوَ سُنَّةٌ تَبَعًا بِخِلَافِ تَرْكِهِ حَالَةَ الْجَهْرِ، فَكَانَ الْمُعْتَمَدُ مَا مَشَى عَلَيْهِ الْمُصَنِّفُ، فَافْهَمْ''۔

ترجمہ: ''اور جب مقتدی امام کے قراءت میں مشغول ہونے کے بعد جماعت میں شامل ہوا، ابن فضل نے کہا: ثناء نہیں پڑھے گا اور دوسرے علماء نے کہا: پڑھے گا اور اس کے لیے تفصیل درکار ہے، اگر امام جہری قراءت کر رہا ہے، تو ثناء (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ) نہ پڑھے اور اگر سرّی قراءت کر رہا ہے تو پڑھ لے، شیخ الاسلام خواہرزادہ کا یہی مختار ہے اور ''ذخیرہ'' میں اس کی علت یہ بیان کی ہے، قراءتِ سرّی ہو رہی ہو تو اِستماع (توجہ سے سننا) فرض نہیں ہے، بلکہ قراءت کی تعظیم کے لیے یہ سنّت ہے، سو یہ ایسی سنت ہے جو مقصود بالذات نہیں ہے اور سرّی قراءت کی صورت میں مقتدی کے قراءت نہ کرنے کا حکم اس وجہ سے نہیں کہ (سرّی قراءت کے دوران) اس کا چپ رہنا واجب ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ امام

کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے (یعنی باجماعت نماز میں امام کی جہری اور سرّی قراءت کا حکم یکساں ہے)، جبکہ ثناء (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ) پڑھنا "مقصود بالذات سنت" ہے اور امام کی ثناء مقتدی کے لیے کافی نہیں ہے، پس جب مقتدی (امام کی سرّی قراءت کے دوران) ثناء کو چھوڑے گا تو (قراءت کے دوران) انصات (خاموش رہنا) کی خاطر جو کہ تبعاً سنت ہے مقصود بالذات سنت ثناء کو چھوڑے گا۔ اس کے برعکس امام کی جہری قراءت کے دوران چونکہ اِنصات واِستماع (خاموش رہنا اور توجہ سے سننا) واجب ہے، لہٰذا مصنف کا قول ہی معتمد ہے، اسے سمجھیے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص:168-167، بیروت)"۔

الغرض جب مسبوق مقتدی امام کے ساتھ اس حال میں شامل ہوا کہ امام سرّی قراءت کر رہا ہے، تو مقتدی ثناء پڑھ لے، کیونکہ امام کی سرّی قراءت کے دوران مقتدی کا انصات (خاموش رہنا) مقصود بالذات سنّت نہیں ہے، بلکہ تعظیم قراءت کے لیے تبعاً سنت ہے، جبکہ مقتدی کا ثناء پڑھنا مقصود بالذات سنّت ہے اور ثناء کو قراءت پر قیاس نہیں کر سکتے، کیونکہ امام کی قراءت مقتدی کے لیے کافی ہے، جبکہ امام کی ثنا مقتدی کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ مقتدی کو اپنی ثناء پڑھنی ہوتی ہے۔

## نماز کے لیے مقررہ وقت میں تاخیر کرنا

**سوال:**

ہماری محلے کی مسجد میں پچھلے تقریباً 25 سال سے گیارہویں شریف کی محفل پاک چاند کی گیارہ کی نمازِ مغرب سے عشا تک بلا ناغہ ہو رہی ہے اور محفل کا کچھ حصہ نماز عشا کے بعد بھی جاری رہتا ہے، مثلاً ذکر شریف اور لنگر شریف وغیرہ، اکثر نماز عشا لیٹ ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں پیش امام صاحب کو کئی دفعہ انتظامیہ کی جانب سے باور کرایا گیا ہے کیونکہ نقیب محفل کے فرائض بھی امام صاحب ہی ادا کر رہے ہوتے ہیں، تقریباً پونے دو گھنٹے کی محفل میں عشا کی نماز دس سے پندرہ منٹ لیٹ ہونا معمول بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ نماز جمعہ بھی پانچ سے دس منٹ لیٹ ہونا معمول بن گیا ہے۔ باقی نمازیں جو وقت پر پڑھانا اُن کی ذمہ

داری ہے، ایک یا دو منٹ لیٹ پڑھاتے ہیں۔ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں فرمائیے کہ اس عمل سے گنہگاری تو نہیں ہو رہی اور اگر یہ گنہگاری والا عمل ہے، تو اس کا ذمہ دار کون ہے انتظامیہ یا امام صاحب اور یہ کہ فرض نماز پر نفلی عبادت کو ترجیح دی جاسکتی ہے؟

(محمد اعظم ظہیر، انتظامیہ مسجد)

**جواب:**

نماز کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا''۔

ترجمہ: ''بے شک نماز مومنوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے، (نساء: 103)''۔ نمازِ فجر کا وقت صبحِ صادق سے طلوعِ آفتاب تک ہے، نمازِ ظہر سورج ڈھلنے سے ہر چیز کا سایہ سایۂ اصلی کے علاوہ دو مثل ہونے تک ہے، عصر کا وقت سایہ دو مثل ہونے سے سورج ڈوبنے تک ہے۔ مغرب کا وقت غروبِ آفتاب سے غروبِ شفق تک ہے اور عشاء کا وقت غروبِ شفق سے طلوعِ فجر تک ہے۔ الغرض شریعت میں نمازوں کے اوقات کا اول و آخر وقت بیان کر کے تعین کر دیا گیا ہے، فقہ میں اس امر کا بھی بیان ہے کہ افضل وقت کون سا ہے۔

ہمارے یہاں گھڑی کے اعتبار سے نمازوں کے اوقات کی تعیین ایک انتظامی امر ہے اور یہ آسانی کے لیے اور شریعت کی مُقررہ حد کے اندر رہتے ہوئے کرتے ہیں، اس لیے اِس تعیین میں کوئی حرج نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ''۔

ترجمہ: ''تمہارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی، (الحج: 78)''۔

(۲) ''يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتا''۔ (البقرہ: 185)

امام صاحب کو چاہیے کہ نمازوں کے مقررہ اوقات کی پابندی کریں تاکہ لوگ مُتنفّر نہ ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

''یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا''۔

ترجمہ: ''دین کو آسان کر کے پیش کرو، مشکل کر کے پیش نہ کرو اور لوگوں کو (اللہ کی رحمت کی) بشارت دو، اُنہیں (دین سے) مُتنفّر نہ کرو، (صحیح بخاری:69)''۔

پانچوں نمازوں کے شرعی اوقات نماز کے لیے ظرفِ زمان ہیں، کوئی بھی فرض نماز پورے وقت کو محیط نہیں ہوتی، البتہ شریعت میں افضل ومستحب اور مکروہ اوقات کے بارے میں رہنمائی کی ہے۔ مساجد میں نمازِ باجماعت کے لیے جو اوقات مقرر کیے جاتے ہیں، یہ تعیینِ شرعی نہیں ہے، بلکہ لوگوں کی آسانی کے لیے ہے۔ تاہم اگر ان مُقررہ اوقات میں نماز کی ادائیگی میں کبھی کبھار تقدیم وتاخیر ہوجائے تو شرعاً مواخذہ نہیں ہے اور نہ گنہگاری کا عمل ہے، البتہ وقت کی پابندی اخلاقی فریضہ ہے۔

ہمارے نزدیک افضل صورت تو یہ ہے کہ اذان ونماز باجماعت مقررہ وقت پر ہو اور وقفۂ نماز کے لیے تقریب موقوف کرلی جائے، نماز سے فراغت کے بعد اسے جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ادارے جامعہ نعیمیہ کا سالانہ جلسۂ تقسیم اَسناد ودستارِ فضیلت اگر مسجد میں ہو رہا ہے، تو ہم نظم اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ اذان ونماز باجماعت اپنے مقررہ وقت پر ہو۔ لیکن اگر تقریب کے منتظمین کا نظم یہ ہو کہ تقریب جاری رہے اور اس کے بعد اذان ونمازِ باجماعت ہو بشرطیکہ وقت میں گنجائش ہے، تو اس کے لیے ایک دن پہلے نمازیوں کو مطلع کردیا جائے۔ جمعۃ المبارک کی نماز میں بھی وقت کی پابندی کرنی چاہیے۔ ہم جب نماز کا فلسفہ اور حکمتیں بیان کرتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ نماز پابندئ وقت سکھاتی ہے اور عمل اس کے برعکس کریں تو یہ قول وفعل میں تضاد ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳ ''۔ (الصّف:3-2)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو، جن پر تم خود عمل نہیں کرتے، اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناراضی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو، جو خود کرتے نہیں ہو''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باجماعت نمازوں میں لوگوں کے احوال کا لحاظ رکھتے تھے، حدیث پاک میں ہے:

(۱) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ مِنْهُمُ الضَّعِيفَ وَالسَّقِيمَ وَالْكَبِيرَ، وَإِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَا شَاءَ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے (یعنی امامت کرے) تو اسے چاہیے کہ (مقدارِ قراءت میں) تخفیف کرے، کیونکہ اُن میں (یعنی جماعت میں شامل لوگوں میں) بعض لوگ کمزور ہوتے ہیں اور بعض بیمار یا بوڑھے ہوتے ہیں (یعنی زیادہ دیر تک نماز میں قیام اُن کے لیے دشوار ہوتا ہے) اور جب تم میں سے کوئی شخص تنہا نماز پڑھے تو وہ (اپنی استطاعت اور ذوق کے مطابق) جتنی چاہے، لمبی نماز پڑھے، (صحیح بخاری:703)''۔

(۲) ''أَخْبَرَنِي أَبُو مَسْعُودٍ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: وَاللهِ يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ أَجْلِ فُلَانٍ مِمَّا يُطِيلُ بِنَا، فَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فِي مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ يَوْمَئِذٍ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَأَيُّكُمْ مَا صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الضَّعِيفَ وَالْكَبِيرَ وَذَا الْحَاجَةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! میں فلاں شخص کی وجہ سے نمازِ فجر سے رہ جاتا ہوں کیونکہ وہ ہمیں طویل نماز پڑھاتے ہیں۔ حضرت ابومسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اُس دن کے مقابلے میں کبھی وعظ ونصیحت کے موقع پر اتنا غضبناک نہیں دیکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم لوگوں کو (دین سے) متنفّر کرنے والے ہو، پس تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے (یعنی امامت کرے)، تو اسے چاہئے کہ (مقدارِ

قراءت میں) تخفیف کرے کیونکہ ان میں (یعنی جماعت میں شامل لوگوں میں سے) بعض لوگ کمزور یا بوڑھے یا کام کاج والے ہوتے ہیں، (یعنی زیادہ دیر تک نماز میں قیام اُن کے لیے دشوار ہوتا ہے)، (صحیح بخاری:702)"۔

(۳) "عَنْ أَبِیْ قَتَادَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: إِنِّیْ لَأَقُوْمُ فِی الصَّلَاةِ أُرِیْدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِیْهَا، فَأَسْمَعُ بُکَاءَ الصَّبِیِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِیْ صَلَاتِیْ کَرَاهِیَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلٰی أُمِّهٖ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میری خواہش ہوتی ہے کہ لمبی نماز پڑھوں کہ دریں اثناء میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں، تو میں اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ اس کی ماں کو طول دشوار ہوگا، میں نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، (صحیح بخاری:707)"۔

الغرض اجتماعی عبادات میں مستحبات و مستحسنات کی سعادت کے حصول کے ساتھ ساتھ لوگوں کے احوال کی رعایت اور دشواریوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، کیونکہ عبادت کے وقت خشوع و خضوع اور استحضارِ قلبی بھی ضروری ہے اور حتی الامکان کوشش کی جائے کہ لوگوں کی طبیعت پر گراں نہ گزرے، جیسا کہ حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بچے کے رونے پر اس کی ماں کے قلبی اضطراب کا بھی پاس رکھتے تھے۔

## صحتِ اقتدا کے لیے امام اور مقتدی کی نماز کا ایک ہونا ضروری ہے

### سوال:

اگر امامت کرانیوالا شخص مسافر ہو اور اسکی مغرب کی نماز قضا ہو چکی ہو، عشاء کا وقت ہو۔ امام کہے کہ میں تین فرض مغرب کے پڑھ کر سلام پھیر دوں گا اور آپ اپنی عشاء کی نماز پوری کر لیجیے گا، اب امام اور مقتدیوں کی نیت میں تضاد آ گیا، ایسی صورت میں کیا مقتدیوں کی نمازِ عشاء ادا ہو جائیگی؟، (رائے فیصل پناہ، دبئ)۔

### جواب:

اقتدا کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ امام اور مقتدی دونوں کی نماز اس طور پر

ایک ہو کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کو متضمن ہو۔

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اِنَّ اِتِّحَادَ الصَّلَاتَیْنِ شَرْطٌ لِصِحَّةِ الِاقْتِدَاءِ وَذٰلِكَ بِاَنْ یُّمْکِنَهُ الدُّخُولَ فِی صَلَاتِهِ بِنِیَّةِ صَلَاةِ الْإِمَامِ فَتَکُوْنَ صَلَاةُ الْإِمَامِ مُتَضَمِّنَةً لِصَلَاةِ الْمُقْتَدِیْ وَھُوَ الْمُرَادُ بِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: ''اَلْإِمَامُ ضَامِنٌ أَیْ تَتَضَمَّنُ صَلَاتُهٗ صَلَاةَ الْمُقْتَدِیْ''۔

ترجمہ: ''صحتِ اقتدا کی ایک شرط یہ ہے کہ امام ومقتدی کی نماز ایک ہو (یعنی دونوں ایک ہی وقت کی ادا یا قضا نماز پڑھ رہے ہوں) اور وہ اس طرح کہ مقتدی کے لیے امام کی نیت کے مطابق نماز میں داخل ہونا ممکن ہو، تاکہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کو متضمن ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کہ ''امام ضامن ہے، یعنی اس کی نماز مقتدی کی نماز کو متضمن ہے'' سے یہی مراد ہے، (البحر الرائق، جلد 1، ص:632-631)''۔

مکمل حدیث یہ ہے:

''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اَلْإِمَامُ ضَامِنٌ، وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ، اَللّٰھُمَّ أَرْشِدِ الْاَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِیْنَ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: امام ضامن ہے اور موذن امین ہے، اے اللہ! اماموں کو ہدایت نصیب فرما اور موذنوں کی مغفرت فرما، (سُنن ترمذی:207)''۔

ایک شرط یہ بھی ہے کہ امام کا مقیم یا مسافر ہونا معلوم ہو، یہ شرط حقیقۃً صحتِ نماز کی شرط نہیں بلکہ صحتِ اقتدا کے لیے شرط ہے، لہٰذا اگر نماز کے بعد حال معلوم ہو جائے، نماز صحیح ہو جائے گی۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''لَا یَصِحُّ اِقْتِدَاءُ مُصَلِّی الظُّھْرِ بِمُصَلِّی الْعَصْرِ وَمُصَلِّیْ ظُھْرِ یَوْمِهٖ بِمُصَلِّیْ ظُھْرِ أَمْسِهٖ وَبِمُصَلِّی الْجُمُعَةِ وَکَذَا عَکْسُهٗ''۔

ترجمہ: ''ظہر کی نماز پڑھنے والے کی عصر کی نماز پڑھنے والے کے پیچھے اقتداء درست نہیں

ہے، اسی طرح آج کی (ادا) ظہر پڑھنے والے کی کل کی قضائے ظہر یا جمعہ پڑھانے والے کے پیچھے اقتداء درست نہیں ہے اور اسی طرح اس کے برعکس صورت کا حکم ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:86)''۔ یعنی وقت اور اداء وقضا کے اعتبار سے امام اور مقتدی کی نیت ایک ہونی چاہیے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام اور مقتدیوں کی نماز میں اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے امام کی نماز مقتدیوں کی نماز کو مُتضمن نہیں ہے، لہٰذا عشاء کی ادا نماز پڑھنے والے مقتدیوں کی نماز وقت عشاء میں مغرب کی قضا پڑھنے والے امام کے پیچھے درست نہیں ہوگی، مقتدی اپنی ادا نماز تنہا یا باجماعت پڑھیں اور اگر سوال میں بیان کی گئی صورت کے مطابق وہ نماز پڑھ چکے ہیں، وہ نماز ادا نہیں ہوئی، اس کا اعادہ کریں۔

## امام کی اقتدا میں مقتدی کے لیے قراءت کا حکم

**سوال:**

باجماعت نماز میں تیسری اور چوتھی رکعت میں کہ جب امام با آواز بلند تلاوت نہ کر رہے ہوں، خود مقتدی کے لیے تلاوت کا کیا حکم ہے، نیز اگر یہ غلط ہے تو پچھلی ادا کردہ نمازوں کی صحت کا کیا حکم ہے؟، (محمد دانیال احمد، ملتان)۔

**جواب:**

باجماعت نمازوں میں مقتدی امام کے پیچھے خاموش کھڑا رہے گا، خواہ نماز سرّی (یعنی ظہر وعصر کی) ہو یا جہری (فجر، مغرب اور عشاء کی)۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں مقتدی کو قراءت اصلاً جائز نہیں ہے، وہ خاموش کھڑا رہے، تکبیرِ تحریمہ کے بعد صرف ثنا (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ) پڑھے، جبکہ امام نے جہراً قراءت شروع نہ کی ہو، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَالْمُؤْتَمُّ لَايَقْرَأُ مُطْلَقًا وَلَا الْفَاتِحَةَ فِي السِّرِّيَّةِ اتِّفَاقًا۔۔۔ بَلْ يَسْتَمِعُ إِذَا جَهَرَ وَيُنْصِتُ إِذَا أَسَرَّ لِقَوْلِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: كُنَّا نَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ فَنَزَلَ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا''۔

ترجمہ: ''مقتدی مُطلقاً (کسی بھی رکعت میں) قراءت نہ کرے، (نہ جہری نماز میں نہ سرّی

نماز میں) اور نہ ہی سرّی نماز میں فاتحہ پڑھے، اِس پر احناف کے ائمۂ ثلاثہ کا اتفاق ہے''۔۔۔آگے چل کر لکھتے ہیں: ''بلکہ جب امام جہراً قراءت کرے، تو مقتدی سُنے اور جب امام سرّاً پڑھے تو مقتدی چپ رہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم امام کے پیچھے قراءت کیا کرتے تھے، پھر یہ آیت نازل ہوئی: ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو''، (اعراف:204)''۔

(ردُّ المحتار علی الدر المختار، جلد 3، ص:475، دمشق)

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ، قَالَ: كَانُوْا يَتَكَلَّمُوْنَ فِي الصَّلَاةِ، فَنَزَلَتْ: ''وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا''، قَالُوْا: هٰذَا فِي الصَّلَاةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: صحابہ نماز میں گفتگو کرلیا کرتے تھے، پھر یہ آیت نازل ہوئی: ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو، (اعراف:204)''، انہوں نے فرمایا: یہ حکم نماز کے بارے میں ہے، (مُصَنَّف ابن ابی شیبہ:8380)''۔

## ہر قعدے میں تشہُّد پورا پڑھنا واجب ہے

**سوال:**

التحیات کے آخر میں کلمہ شہادت پورا پڑھنا افضل ہے، کچھ حذف کرنے کا حکم کیا ہے؟

(محمد دانیال احمد، ملتان)

**جواب:**

دونوں قعدوں میں پورا تشہُّد پڑھنا واجب ہے، ایک لفظ بھی چھوڑا تو واجب ترک ہوگا اور سجدۂ سہو لازم ہوگا، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَيَجِبُ التَّشَهُّدُ فِي الْقَعْدَةِ الْأَخِيْرَةِ وَكَذَا فِي الْقَعْدَةِ الْأُوْلٰى وَهُوَ الصَّحِيْحُ هٰكَذَا فِي ''السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ''، وَهُوَ الْأَصَحُّ كَذَا فِي ''مُحِيْطِ السَّرَخْسِيِّ''۔

ترجمہ: قعدۂ اخیرہ میں تشہُّد واجب ہے اور اسی طرح قعدۂ اُولیٰ میں بھی تشہُّد واجب ہے اور

یہی صحیح ہے، جیسا کہ "السراج الوہاج" میں ہے، یہی صحیح ترین ہے، محیط السرخسی میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 71)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"(وَالتَّشَهُّدَانِ) وَيَسْجُدُ لِلسَّهْوِ بِتَرْكِ بَعْضِهٖ كَكُلِّهٖ وَكَذَا فِي كُلِّ قَعْدَةٍ فِي الْاَصَحِّ"۔

ترجمہ: "دونوں قعدوں میں پورا تشہّد پڑھنا واجب ہے اور تشہّد کے بعض حصے کے ترک کرنے پر بھی سجدۂ سہو کرے گا جیسا کہ پوری اَلتَّحِیَّات (تشہُّد) کے ترک کرنے پر سجدۂ سہو لازم ہے، یہی حکم ہر قعدے کا ہے، یہی صحیح ترین ہے، (جلد 3، ص: 214، دمشق)"۔

## امام کی پیروی میں مقتدی تکبیرات آہستہ کہے

**سوال:**

باجماعت نماز کے دوران کون سے کلمات ہیں جو امام باآواز بلند پڑھے تو مقتدی بھی پڑھے؟، (محمد دانیال احمد، ملتان)۔

**جواب:**

دورانِ جماعت امام تکبیرِ تحریمہ، تکبیراتِ انتقال بلند آواز سے پڑھتا ہے، مقتدی بھی آہستہ پڑھے، رکوع سے اٹھتے وقت جب امام "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" پڑھے تو مقتدی "رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ" آہستہ پڑھے اور اسی طرح نماز سے نکلنے کے لیے مقتدی امام کے سلام کہنے کے وقت سلام بھی آہستہ کہے۔

امام جہری نماز میں جہراً اور سرّی نماز میں سرًّا تلاوت کرتا ہے، لیکن مقتدی دونوں صورتوں میں خاموش رہے گا، حدیث مبارک میں ہے: "مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَتُهٗ لَهٗ قِرَاءَةٌ"، ترجمہ: "جس نے امام کی اقتدا میں نماز پڑھی، تو امام کی قراءت مقتدی کے لیے کافی ہے، (مُصَنَّف ابن ابی شیبہ: 3779)"۔

## نماز کے بعد وظائف پر شوہر کا اعتراض

**سوال:**

میرے شوہر میری عبادت کی زیادتی پر اعتراض کرتے ہیں، خاص طور پر صبح کی نماز اور وظائف جو بیس منٹ پر مشتمل ہیں اور عشاء کی نماز اور وظائف جو تیس منٹ پر مشتمل ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ صرف فرض نماز، سنت اور مختصر وظائف ہونے چاہئیں۔ان کا موقف صحیح ہے یا میں حق بجانب ہوں، اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے، خاوند کی بات کو مانا جائے یا روزمرہ کی عبادت کو کم کیا جائے۔ برائے مہربانی تفصیلی جواب حوالہ جات کے ساتھ سے راہنمائی فرمائیں، (مدیحہ خان)۔

**جواب:**

اسلام میں فرائض وواجبات اور سُنَن مؤکدہ پر تو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے، البتہ ازدواجی تعلق استوار رکھنے اور حقوق وفرائض میں توازن پیدا کرنے کے لیے نفلی عبادات میں اعتدال بہتر ہے۔ذیل میں ہم دو اَحادیث مبارکہ پیش کررہے ہیں:

(ا) نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (مُواخاتِ انصار ومہاجرین کے موقع پر) حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا، حضرت سلمان، حضرت ابوالدرداء کی ملاقات کے لیے گئے۔ اُنہوں نے (اُن کی بیوی) حضرت اُمِ الدرداء کو خستہ حالت میں دیکھا تو ان سے پوچھا: یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟۔اُنہوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء کو دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پھر حضرت ابوالدرداء آئے تو انہوں نے حضرت سلمان کو کھانا پیش کیا، حضرت سلمان نے کہا: آپ بھی کھائیں، تو حضرت ابوالدرداء نے کہا: میں روزے سے ہوں، حضرت سلمان نے کہا: میں اُس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک کہ آپ نہیں کھائیں گے، پھر حضرت ابوالدرداء نے (مہمان کی دلداری کے لیے نفلی روزہ توڑ کر) کھانا کھایا۔ پھر جب رات ہوگئی تو حضرت ابوالدرداء (قیام اللیل کے نوافل پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے، حضرت سلمان نے اُن سے کہا: آپ سوجائیں، سو

کریم میں قطعی) نوید دی گئی ہے، تو ان میں سے ایک نے کہا: ”میں تو ہمیشہ پوری رات نوافل پڑھتے ہوئے گزاروں گا“، دوسرے نے کہا: ”میں ہمیشہ (نفلی) روزے رکھا کروں گا اور روزہ کبھی نہیں چھوڑوں گا“، تیسرے نے کہا: ”میں ہمیشہ عورتوں سے اجتناب کروں گا اور کبھی نکاح نہیں کروں گا (تاکہ نہ بیوی بچے ہوں اور نہ خانگی ذمے داریوں کا جھنجھٹ)“۔ دریں اثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اُن کی باتوں کو سن کر) فرمایا: تو تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا تھا؟، سنو! اللہ کی قسم! بے شک میں تم سب سے زیادہ متقی ہوں اور میرے دل میں اللہ کی خشیت سب سے زیادہ ہے، لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور کبھی چھوڑ بھی دیتا ہوں اور رات کو (نوافل) پڑھتا ہوں اور (کچھ دیر کے لیے) سو بھی جاتا ہوں اور میں نے عورتوں سے نکاح بھی کیے ہوئے ہیں، سو جس نے میری سنت سے اِعراض کر کے (تقوے کا من پسند طریقہ اختیار کیا) تو وہ میرے (پسندیدہ) طریقے پر نہیں ہے، (بخاری:5063)“۔

سطورِ بالا میں ہم نے عام ضابطہ بیان کیا ہے، لیکن آپ نے نمازِ فجر کے بعد بیس منٹ اور نمازِ عشاء کے بعد تیس منٹ کے وظائف کا جو معمول بتایا ہے، یہ بہت زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر ان اوقات میں آپ کے شوہر کے کسی کام کا حرج نہ ہو رہا ہو یا صبح بچوں کے اسکول کی تیاری یا رات کو چھوٹے بچوں کے سلانے میں حرج نہ ہو رہا ہو، تو شوہر کو دل بڑا رکھنا چاہیے، کیونکہ گھر میں عبادت، تلاوت اور اَذکار برکت کا سبب ہوتے ہیں اور اگر وظائف کسی کام میں حرج کا سبب ہوں تو آپ اپنی سہولت کے مطابق وقت تبدیل کر لیں۔ نفلی عبادت کے معاملے میں خاوند سے مطابقت پیدا کرنا بہتر ہے، خاوند کی رضامندی کے لیے نفلی عبادات میں تخفیف کی جا سکتی ہے، یہاں تک کہ خاوند کے کہنے پر نفلی روزہ بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔

## ادا بہ نیتِ قضا یا قضا بہ نیتِ ادا پڑھنا

**سوال:**

ایک شخص نمازِ ظہر اخیر وقت میں پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا، اُس نے گمان کیا کہ نماز قضا

ہو چکی ہے، لہٰذا آج کی نمازِ ظہر قضا کی نیت کر لی، بعد میں معلوم ہوا کہ جس وقت اس نے نماز پڑھی، ظہر کا وقت باقی تھا، کیا اس کی نماز ادا ہو گئی؟۔ (سید عمیر الحسن برنی، کراچی)۔

**جواب:**

فقہی مسئلہ یہی ہے کہ وقتی نماز پڑھ رہا ہے تو قضا یا ادا کی نیت کی ضرورت نہیں، مطلق نیت کافی ہے اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ آج کی (ظہر یا عصر) کی نیت کر لے۔ اگر قضا نماز بہ نیتِ ادا پڑھی یا ادا بہ نیتِ قضا پڑھی، تو نماز ہو جائے گی، مثلاً وقتِ ظہر ابھی باقی ہے اور اس نے گمان کیا کہ وقت ختم ہو گیا اور اس دن کی نمازِ ظہر قضا کی نیت سے پڑھی یا وقت نکل جانے کے بعد اس نے اس گمان کے ساتھ کہ وقت باقی ہے، ادا کی نیت سے پڑھی، نماز ہو گئی یہی مختار قول ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''فَالْاَوْلٰی نِیَّۃُ ظُھْرِ الْیَوْمِ لِجَوَازِہٖ مُطْلَقًا لِصِحَّۃِ الْقَضَاءِ بِنِیَّۃِ الْاَدَاءِ کَعَکْسِہٖ ھُوَ الْمُخْتَارُ''۔

ترجمہ: ''بہتر یہ ہے کہ آج کی نیت کرے کیونکہ اس کا مطلقاً جواز ہے کیونکہ ادا کی نیت سے قضا نماز صحیح ہے جیسا کہ قضا کی نیت سے ادا نماز صحیح ہے، یہی مختار قول ہے''۔

''قَوْلُہٗ لِصِحَّۃِ الْقَضَاءِ بِنِیَّۃِ الْاَدَاءِ'' کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

''ھٰذَا التَّعْلِیْلُ إِنَّمَا یَظْھَرُ إِذَا نَوَی الْاَدَاءَ، أَمَّا إِذَا تَجَرَّدَتْ نِیَّتُہٗ فَلَا، وَالْمُنَاسِبُ مَا فِی الْاَشْبَاہِ عَنِ الْفَتْحِ لَوْ نَوَی الْاَدَاءَ عَلٰی ظَنِّ بَقَاءِ الْوَقْتِ فَتَبَیَّنَ خُرُوْجُہٗ أَجْزَأَہٗ وَکَذَا عَکْسُہٗ، ثُمَّ مَثَّلَ لَہٗ نَاقِلًا عَنْ ''کَشْفِ الْاَسْرَارِ'' بِقَوْلِہٖ: کَنِیَّۃِ مَنْ نَوٰی أَدَاءَ ظُھْرِ الْیَوْمِ بَعْدَ خُرُوْجِ الْوَقْتِ عَلٰی ظَنِّ أَنَّ الْوَقْتَ بَاقٍ، وَکَنِیَّۃِ الْاَسِیْرِ الَّذِیْ اشْتَبَہَ عَلَیْہِ رَمَضَانُ فَتَحَرّٰی شَھْرًا وَصَامَہٗ بِنِیَّۃِ الْاَدَاءِ فَوَقَعَ صَوْمُہٗ بَعْدَ رَمَضَانَ وَعَکْسُہٗ کَنِیَّۃِ مَنْ نَوٰی قَضَاءَ الظُّھْرِ عَلٰی ظَنِّ أَنَّ الْوَقْتَ قَدْ خَرَجَ وَلَمْ یَخْرُجْ بَعْدُ، وَکَنِیَّۃِ الْاَسِیْرِ الَّذِیْ صَامَ رَمَضَانَ بِنِیَّۃِ الْقَضَاءِ عَلٰی ظَنِّ أَنَّہٗ قَدْ مَضٰی وَالصِّحَّۃُ فِیْہِ بِاعْتِبَارِ أَنَّہٗ أَتٰی بِأَصْلِ النِّیَّۃِ، وَلٰکِنْ أَخْطَأَ فِی الظَّنِّ وَالْخَطَأُ فِیْ مِثْلِہٖ مَعْفُوٌّ عَنْہُ أَقُوْلُ وَمَعْنٰی کَوْنِہٖ أَتٰی بِأَصْلِ

النِّيَّةِ أَنَّهُ قَدْ عَيَّنَ فِي قَلْبِهِ ظُهْرَ الْيَوْمِ الَّذِي يُرِيْدُ صَلَاتَهُ فَلَا يَضُرُّ وَصْفُهُ لَهُ بِكَوْنِهِ أَدَاءً أَوْ قَضَاءً، بِخِلَافِ مَا إِذَا نَوَى صَلَاةَ الظُّهْرِ قَضَاءً وَهُوَ فِي وَقْتِ الظُّهْرِ وَلَمْ يَنْوِ صَلَاةَ هٰذَا الْيَوْمِ لَا يَصِحُّ عَنِ الْوَقْتِيَّةِ لِأَنَّهُ بِنِيَّةِ الْقَضَاءِ صَرَفَهُ عَنْ هٰذَا الْيَوْمِ وَلَمْ تُوجَدْ مِنْهُ نِيَّةُ الْوَقْتِيَّةِ حَتّٰى يَلْغُوَ وَصْفُهُ بِالْقَضَاءِ فَلَمْ يُوجَدِ التَّعْيِيْنُ، وَكَذَا لَوْ نَوَاهُ أَدَاءً وَكَانَتْ عَلَيْهِ ظُهْرٌ فَائِتَةٌ لَا يَصِحُّ عَنْهَا وَإِنْ كَانَ قَدْ صَلَّى الْوَقْتِيَّةَ لِمَا قُلْنَا''۔

ترجمہ: ''یہ تعلیل اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب ادا کی نیت کرے، جب نیت خالی ہو تو صحیح نہیں ہوگی، مناسب وہ ہے، جو ''الاشباہ'' میں ''فتح القدیر'' کے حوالے سے ہے: اگر اس گمان پر ادا کی نیت کی کہ وقت ابھی باقی ہے، پھر معلوم ہوا کہ وقت نکل چکا تھا، تو نماز جائز ہوگی اور اسی طرح اس کا عکس ہے (یعنی اس گمان پر نماز قضاء کی نیت کر کے پڑھی کہ وقت نکل چکا ہے اور پھر معلوم ہوا کہ ابھی وقت باقی تھا)۔ پھر ''کشف الاسرار'' سے نقل کرتے ہوئے اس قول سے مثال دی: اس شخص کی نیت جس نے وقت نکلنے کے بعد یہ گمان کرتے ہوئے کہ ابھی وقت باقی ہے، آج کی ظہر کی ادا کی نیت کی، اور اسی طرح ایسا قیدی، جس پر رمضان مشتبہ ہو گیا ہو، اس نے ایک مہینے کے لیے تحرّی کی اور ادا کی نیت سے روزے رکھے پھر اس کے روزے رمضان کے بعد واقع ہوئے اور اس کے برعکس اس شخص کی نیت جس نے ظہر کی نماز کی قضا کی نیت یہ گمان کرتے ہوئے کی کہ وقت نکل چکا ہے، حالانکہ ابھی ظہر کا وقت باقی تھا اور اس قیدی کی نیت جس نے قضا کی نیت سے یہ گمان کرتے ہوئے روزے رکھے کہ رمضان گزر چکا ہے (لیکن پھر معلوم ہوا کہ یہ رمضان تھا)۔ اس میں صحت اس اعتبار سے ہے کہ وہ نیت کی اصل کو لایا، لیکن گمان میں غلطی کی اور اس کی مثل میں خطا معاف ہے۔ میں کہتا ہوں: ''وہ اصل نیت کو لایا، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اس نے دل میں آج کی ظہر کی تعیین کی، جس کی نماز کا اس نے ارادہ کیا۔ پس اس کے لیے اس کا وصف ادا یا قضا ہونے کے ساتھ مضر نہیں، بخلاف اس صورت کے جب اس نے ظہر کی نماز کی قضا کی نیت کی، جبکہ وہ ظہر کے وقت میں تھا اور اس نے اس آج کی نماز کی نیت نہیں کی تھی، تو وقتی نماز کی

طرف سے یہ نماز صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ قضا کی نیت سے اس نے اسے اس دن سے پھیر دیا ہے اور اس سے وقتی نماز کی نیت نہیں پائی گئی حتیٰ کہ قضا کے ساتھ اس کا وصف لغو ہو، پس تعیین نہیں پائی گئی اور اسی طرح اگر اس نے ظہر کی ادا کی نیت کی اور اس پر فوت شدہ ظہر تھی تو یہ نماز اس کی طرف سے صحیح نہ ہوگی اگرچہ وہ وقتی نماز پڑھ چکا تھا، اس وجہ سے جو ہم نے بیان کی ہے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:7974، دمشق)''۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے:

(الف) مطلقاً نماز کی نیت کافی ہے، قضا یا ادا کی تعیین ضروری نہیں ہے یا زیادہ بہتر یہ ہے کہ آج کی (ظہر یا عصر) کی نیت کرلے۔

(ب) مثلاً کسی نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ وقت نکل چکا ہے، ظہر کی نماز بہ نیت قضا پڑھی، جبکہ ابھی وقت باقی تھا، تو نماز ادا ہو جائے گی۔

(ج) کسی نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ ابھی وقت باقی ہے، نمازِ ظہر بہ نیت ادا پڑھی، پھر معلوم ہوا کہ وقت نکل چکا تھا، تب بھی نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی، اِن دونوں صورتوں کا مستفاد یہ ہے کہ ادا بہ نیتِ قضا اور قضا بہ نیتِ ادا پڑھ لی تو نماز درست ہے، جبکہ خطا نیت میں نہ ہو، وقت کے حوالے سے گمان میں ہو۔

(د) نماز ظہر کا وقت ہے اور اس نے قضائے ظہر پڑھی (اور اس کے ذمے ظہر کی قضا باقی تھی)، تو اس سے وقتی ادا نماز سے بری الذمہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے قضا کی نیت کر کے نماز کو وقتی فرض سے پھیر دیا اور اس سے وقتی نماز کی نیت نہیں پائی گئی کہ اسے قضا سے پھیر کر وقتی نماز کی طرف لے آئے۔

(ہ) ظہر کی نماز ادا کی نیت سے پڑھی، جبکہ اس کے ذمے قضائے ظہر بھی باقی تھی تو اس طرح قضاء سے بری الذمہ نہیں ہوگا، خواہ وقتی ظہر پڑھ چکا ہو۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قضا یا ادا کی نیت کی کچھ حاجت نہیں، اگر قضا بہ نیت ادا پڑھی یا ادا بہ نیت قضا، تو نماز ہوگئی،

یعنی مثلاً وقت ظہر باقی ہے اور اس نے گمان کیا کہ جاتا رہا اور اس دن کی نماز ظہر بہ نیت قضا پڑھی یا وقت جاتا رہا اور اس نے گمان کیا کہ باقی ہے اور بہ نیت ادا پڑھی، ہوگئی اور اگر یوں نہ کیا، بلکہ وقت باقی ہے اور اس نے ظہر کی قضا پڑھی، مگر اس دن کے ظہر کی نیت نہ کی تو نہ ہوئی، یوہیں اس کے ذمہ کسی دن کی نماز ظہر تھی اور بہ نیت ادا پڑھی نہ ہوئی''۔

(بہارِ شریعت، ج:1،ص:495)

علامہ زین الدین بن ابراہیم المعروف ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ: ''وَلِلْفَرْضِ شَرْطُ تَعْيِيْنِهٖ كَالْعَصْرِ مَثَلًا لِاِخْتِلَافِ الْفُرُوْضِ فَلَا بُدَّ مِنَ التَّعْيِيْنِ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: ''وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى''، أَطْلَقَهٗ فَشَمِلَ''۔

ترجمہ: ''علامہ شیخ عبداللہ بن احمد نسفی کا یہ قول: ''فرض کے لیے تعیین ضروری ہے، مثلاً یوں کہے: عصر کی نماز''، کیونکہ فرضوں میں اختلاف ہوتا ہے، پس تعیین ضروری ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے: ہر شخص کے لیے وہی ہے، جس کی اس نے نیت کی، (حدیث مبارک میں) اسے مطلق رکھا ہے، پس یہ اس کو بھی شامل ہے، (البحر الرائق، ج:1،ص:485)''۔

## فرض کے بعد والی سنتیں پہلے ادا کرنے، سنتوں اور فرض کے درمیان نوافل پڑھنے کا حکم

**سوال:**

ظہر کی سنتیں ادا کرنے کے بعد بھی جماعت میں ابھی وقت کافی ہے۔ تو کیا جماعت کے ساتھ فرض ادا کرنے کے بعد جو دو نفل ادا کرتے ہیں، کیا فرضوں سے پہلے میں اس خالی وقت میں ادا کر سکتا ہوں؟ اور اس طرح فرضوں کے بعد والی دو سنتیں بھی پڑھ سکتا ہوں یا نہیں۔ جامع سوال یہ ہوا کہ تمام نمازوں کے فرض، سنت اور نفل میں جو ترتیب ہے کیا بوقت ضرورت یا کافی وقت میسر ہونے کی وجہ سے یہ ترتیب بدلی جا سکتی ہے یا نہیں؟، اس ضمن میں نفلوں کے بارے میں وضاحت اور رہنمائی فرمائیں، (سید محمد علی گیلانی، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان، 19 ٹیپو سلطان روڈ ملتان کینٹ)۔

**جواب:**

سنت اور فرض کے درمیان نوافل اور قضا نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں، البتہ فرض کے بعد والی سنتیں فرض سے پہلے ادا نہیں کی جاسکتیں۔ ظہر کے فرض سے پہلے اور بعد کی سنتیں اپنے اپنے مقام پر پڑھی جائیں، تاہم اگر فرض کی جماعت میں شمولیت کے سبب پہلی چار سنتیں رہ جائیں، تو فرض کے بعد بہتر یہ ہے کہ پہلے بعد والی دو سنتیں اپنے مقام پر پڑھ لیں اور پھر فرض سے پہلے رہ جانے والی چار سنتیں ادا کریں، کیونکہ پہلے کی چار سنتیں اپنی جگہ سے ہٹ چکی ہیں، تو بعد کی دو سنتوں کو اپنے مقام پر پڑھا جائے اور اُس کے بعد پہلے والی چار سنتیں پڑھی جائیں، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا فَاتَتْهُ الْأَرْبَعُ قَبْلَ الظُّهْرِ، صَلَّاهَا بَعْدَ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ بیان رضی اللہ عنہا کرتی ہیں: جب کبھی رسول اللہ ﷺ کی ظہر کے فرض سے پہلے والی چار سنتیں رہ جاتیں، تو آپ ﷺ اُن کو فرض کے بعد والی سنتوں کے بعد پڑھتے تھے، (سُنن ابن ماجہ:1158)''۔

''اَلْمَوْسُوْعَةُ الْفِقْهِيَةُ الْكُوَيْتِيَه'' میں ہے:

''اَلسُّنَنُ الرَّوَاتِبُ مُقْتَرِنَةٌ بِالْفَرَائِضِ، فَمِنْهَا مَا يُصَلّٰى قَبْلَ الْفَرِيْضَةِ، مِثْلُ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَسُنَّةِ الظُّهْرِ الْقَبْلِيَّةِ، وَمِنْهَا مَا يُصَلّٰى بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ مِثْلُ سُنَّةِ الظُّهْرِ الْبَعْدِيَّةِ وَسُنَّةِ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَالْوِتْرِ وَقِيَامِ رَمَضَانَ''۔

ترجمہ: ''سُنَنِ مُؤکّدہ فرائض کے ساتھ ہی ہوتی ہیں، بعض کو فرض سے پہلے ادا کیا جاتا ہے، جیسے فجر اور ظہر کی پہلے والی سنتیں، اور بعض کو فرض کے بعد ادا کیا جاتا ہے، جیسے: ظہر کی بعد والی سنتیں، اور مغرب وعشاء کی سنتیں، وتر اور قیام رمضان (یعنی نمازِ تراویح)''۔

مزید لکھتے ہیں:

''وَمَا كَانَ مِنْ هٰذِهِ السُّنَنِ قَبْلَ الْفَرِيْضَةِ فَوَقْتُهَا يَبْدَأُ مِنْ دُخُوْلِ وَقْتِ الْفَرِيْضَةِ

وَيَنْتَهِي بِإِقَامَةِ الصَّلَاةِ إِذَا كَانَتْ تُؤَدّٰى فِي جَمَاعَةٍ، لِأَنَّهُ إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةُ"۔

ترجمہ: "پس جو فرض سے پہلے کی سنتیں ہیں، تو وقتی (فرض) داخل ہوتے ہی ان کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور نماز باجماعت ہونے کی صورت میں اقامت کہنے تک رہتا ہے، اس لیے جب نماز کی اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"أَمَّا السُّنَنُ الْبَعْدِيَّةُ: مِثْلُ سُنَّةِ الظُّهْرِ الْبَعْدِيَّةِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ، فَوَقْتُ كُلٍّ مِنْهَا مِنْ بَعْدِ الْاِنْتِهَاءِ مِنَ الْفَرِيضَةِ إِلَى خُرُوجِ وَقْتِ الْمَكْتُوبَةِ وَدُخُولِ وَقْتِ الْأُخْرٰى، فَإِذَا خَرَجَ الْوَقْتُ وَلَمْ يُؤَدِّ السُّنَنَ الْبَعْدِيَّةَ فَإِنَّهَا تُعْتَبَرُ فَائِتَةً"۔

ترجمہ: "رہی بعد والی سنتیں: جیسے ظہر، مغرب، اور عشاء کے بعد کی، ان کا وقت فرض ادا کرنے کے بعد سے لیکر اُس نماز کا وقت ختم ہونے اور دوسری نماز کا وقت شروع ہونے تک جاری رہتا ہے، پس اگر نماز کا وقت نکل گیا تو بعد والی سنتیں ادا نہیں کی جائیں گی، انہیں فوت شدہ مانا جاتا ہے (یعنی ان کا وقت نکل چکا ہے)، (جلد 25، ص:280)"۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے ظہر یا عشاء کے بعد والی سنتیں پہلے ادا کیں، تو گویا کہ اس نے سنتیں وقت سے پہلے ادا کر لیں اور یہ اس کی سُنَنِ مؤکَّدہ شمار نہیں ہونگی بلکہ یہ نفل ہوں گے، جن پر نفل کا اجر ملے گا۔ نفل نماز کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، اس لیے نفل کے لیے مطلق نماز کی نیت کافی ہے، اس میں وقت کے تعین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نوافل کے مکروہ اوقات کے بارے میں ہم "تفہیم المسائل" جلد دہم میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔

## نمازِ وتر میں دعاءِ قنوت پڑھے بغیر رکوع میں چلا گیا

**سوال:**

وتر کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا، رکوع میں یاد آیا، قیام کی طرف لوٹا اور دعائے قنوت پڑھ کر رکوع کا اعادہ کیے بغیر سجدۂ سہو کر کے سلام پھیر دیا، کیا نماز

درست ہوگئی؟۔ (محمد رمیز، متعلّم: جامعہ انوار القرآن، گلشن اقبال، کراچی)۔

**جواب:**

ضابطہ یہ ہے کہ اگر نمازِ وتر میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا تو رکوع کی قیام کی طرف نہ لوٹے بلکہ آخر میں سجدۂ سہو کر کے سلام پھیر دے، نماز درست ہوجائے گی کہ دعائے قنوت واجب ہے اور واجب کے ترک پر سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے۔ لیکن اگر قیام کی طرف لوٹ آیا اور قنوت پڑھا، رکوع نہیں کیا تو نماز فاسد نہیں ہوگی، البتہ گنہگار ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْنَسِیَ الْقُنُوْتَ فَتَذَکَّرَ فِی الرُّکُوْعِ فَالصَّحِیْحُ أَنَّهٗ لَا یَقْنُتُ فِی الرُّکُوْعِ وَلَا یَعُوْدُ إِلَی الْقِیَامِ ھٰکَذَا فِی ''التَّتَارْخَانِیَّة'' فَإِنْ عَادَ إِلَی الْقِیَامِ وَقَنَتَ وَلَمْ یُعِدِ الرُّکُوْعَ لَمْ تَفْسُدْ صَلَاتُهٗ کَذَا فِی ''الْبَحْرِ الرَّائِق''۔

ترجمہ: ''اگر دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں یاد آیا، پس درست (عمل) یہ ہے کہ نہ رکوع میں قنوت پڑھے اور نہ ہی قیام کی طرف لوٹے، ''تاتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے، پس اگر قیام کی طرف واپس آیا، دعائے قنوت پڑھی اور رکوع کا اعادہ نہیں کیا، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، ''البحر الرائق'' میں اسی طرح ہے''۔

مزید لکھتے ہیں:

''اَلْإِمَامُ إِذَا تَذَکَّرَ فِی الرُّکُوْعِ فِی الْوِتْرِ أَنَّهٗ لَمْ یَقْنُتْ لَا یَنْبَغِیْ أَنْ یَّعُوْدَ إِلَی الْقِیَامِ وَمَعَ ھٰذَا إِنْ عَادَ وَقَنَتَ لَا یَنْبَغِیْ أَن یُّعِیْدَ الرُّکُوْعَ وَمَعَ ھٰذَا إِنْ أَعَادَ الرُّکُوْعَ وَالْقَوْمُ مَا تَابَعُوْهُ فِی الرُّکُوْعِ الْأَوَّلِ وَإِنَّمَا تَابَعُوْهُ فِی الرُّکُوْعِ الثَّانِیْ أَوْعَلَی الْقَلْبِ لَا تَفْسُدُ صَلَاتُهُمْ کَذَا فِی ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ: ''امام کو نمازِ وتر کے رکوع میں یاد آیا کہ دعائے قنوت نہیں پڑھی، تو اسے قیام کی طرف واپس نہیں آنا چاہیے، اس کے باوجود اگر لوٹ آیا اور دعائے قنوت پڑھی تو اسے رکوع کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے اور اس کے باوجود اگر رکوع کا اعادہ کرلیا اور مقتدیوں نے پہلے رکوع

میں امام کا ساتھ نہیں دیا تھا اور دوسرا رکوع امام کے ساتھ کیا یا پہلا رکوع امام کے ساتھ کیا اور دوسرا رکوع امام کے ساتھ نہ کیا، دونوں صورتوں میں اُن کی نماز فاسد نہیں ہوگی، "خلاصہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 111)"۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اگر دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا تو نہ قیام کی طرف لوٹے نہ رکوع میں پڑھے اور اگر قیام کی طرف لوٹ آیا اور قنوت پڑھا اور رکوع نہ کیا، تو نماز فاسد نہ ہوگی، مگر گنہگار ہوگا اور اگر صرف الحمد پڑھ کر رکوع میں چلا گیا تھا تو لوٹے اور سورت وقنوت پڑھے پھر رکوع کرے اور آخر میں سجدہ سہو کرے۔ یوہیں اگر الحمد بھول گیا اور سورت پڑھ لی تھی تو لوٹے اور فاتحہ وسورت وقنوت پڑھ کر پھر رکوع کرے۔ امام کو رکوع میں یاد آیا کہ دعائے قنوت نہیں پڑھی تو قیام کی طرف عود نہ کرے، پھر بھی اگر کھڑا ہو گیا اور دُعا پڑھی تو رکوع کا اعادہ نہ چاہیے اور اگر اعادہ کرلیا اور مقتدیوں نے پہلے رکوع میں امام کا ساتھ نہ دیا اور دوسرا امام کے ساتھ کیا یا پہلا رکوع امام کے ساتھ کیا دوسرا نہ کیا، دونوں حال میں ان کی نماز بھی فاسد نہ ہوگی، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 656)"۔

## عید کی نماز میں درمیان میں شامل ہونے والا تکبیرات کس طرح کہے

**سوال:**

نمازِ عید شروع ہوگئی، پہلی رکعت میں امام تکبیرات کہہ چکا، اس کے بعد کوئی مقتدی جماعت میں شامل ہوا یا دوسری رکعت میں آکر شامل ہوا تو وہ عید کی زائد تکبیرات کس طرح کہے؟ (منور احمد، ملیر کراچی)۔

**جواب:**

جو نمازی نمازِ عید کی پہلی رکعت میں امام کے تکبیراتِ عید کہنے کے بعد شامل ہوا تو وہ نیت باندھ کر نماز میں شامل ہو اور تکبیرِ تحریمہ کے بعد تین زائد تکبیریں کہہ کر خاموش ہو جائے اور اگر اس نے امام کو پہلی رکعت کے رکوع میں پایا تو تکبیرِ تحریمہ کہہ کر رکوع میں امام

کے ساتھ شامل ہوجائے اور ہاتھ اٹھائے بغیر تین تکبیریں کہہ دے، پھر اگر امام بدستور رکوع میں ہے تو رکوع کی تسبیحات پڑھ لے، ورنہ اگر امام رکوع سے کھڑا ہوگیا ہے تو تسبیحات رکوع چھوڑ دے اور امام کی اتّباع کرے۔ اگر مسبوق مقتدی نے امام کو دوسری رکعت میں پایا تو اس کی پیروی میں وہ رکعت مکمل کرے اور پھر امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی بقیہ نماز کے لیے کھڑا ہو اور فاتحہ وسورت پڑھنے کے بعد تین زائد تکبیرات کہے اور پھر رکوع میں چلا جائے اور اگر مسبوق مقتدی دوسری رکعت کے رکوع کے بعد جماعت میں شامل ہوا تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو اور ثناء پڑھنے کے بعد تین زائد تکبیرات اپنے مقام پر کہے اور پھر دوسری رکعت میں قراءت کے بعد اور رکوع سے پہلے تین زائد تکبیریں کہے اور حسبِ ترتیب نماز مکمل کرلے۔

## نمازِ عید میں سجدۂ سہو ترک کیا جاسکتا ہے

**سوال:**

نمازِ عید میں امام دوسری رکعت میں تین زائد تکبیریں کہے بغیر رکوع میں چلا گیا تو اب کیا کرے؟، (منور احمد، ملیر، کراچی)۔

**جواب:**

یاد آنے پر رکوع ہی کی حالت میں ہاتھ اٹھائے بغیر تین زائد تکبیریں پڑھ لے اور پھر رکوع کی تسبیحات پڑھ کر رکوع سے کھڑا ہو، مقتدی بھی اس کی اتباع کریں۔ لیکن اگر امام جلد بازی میں گھبرا کر رکوع سے کھڑا ہوگیا اور حالتِ قیام میں تین تکبیریں کہیں اور پھر رکوع کرکے نماز مکمل کی تو نماز ہوجائے گی۔ فقہی اصول کے مطابق اس صورت میں اسے سجدۂ سہو کرنا چاہیے، لیکن جمعہ وعیدین میں جماعت کافی بڑی ہو، تو فساد وانتشار سے بچنے کے لیے سجدۂ سہو ترک کیا جاسکتا ہے۔ جماعت کثیر کے سبب معاف ہے۔

اسی طرح اگر امام نے دوسری رکعت کی تین زائد تکبیریں نہ رکوع سے پہلے کہیں، نہ رکوع میں کہیں، نہ رکوع سے اٹھ کر کہیں تو اگرچہ فقہی اصول کے ضابطے کے مطابق ترکِ واجب

سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے، لیکن اگر سجدۂ سہو نہ کیا تو جماعت کثیر کے سبب نماز ہو جائے گی، نماز کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے مواقع پر فقہی مسائل سے ناواقف لوگ شور مچانا شروع کردیتے ہیں اور امام گھبرا جاتے ہیں، اس لیے یہ مسئلہ لکھا گیا ہے۔ ائمۂ کرام کو بھی نماز کے مسائل کا وقتاً فوقتاً مطالعہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ اعتماد کے ساتھ لوگوں کو بتا سکیں۔

## اگر کسی کی نمازِ عید رہ جائے تو کیا کرے

**سوال:**

بعض اوقات بشری کوتاہی، تساہل اور سستی کی بنا پر کسی کی عید کی نماز رہ جاتی ہے، تو وہ کیا کرے، (محمد رمیز، سرجانی ٹاؤن)۔

**جواب:**

عید کی نماز صرف با جماعت ادا کی جاتی ہے، اگر کسی کی نماز رہ گئی ہے، تو انفرادی طور پر اس کی قضا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے اپنی اس تقصیر پر توبہ کرے۔ البتہ اگر زیادہ تعداد میں کچھ لوگوں کی نماز رہ گئی ہے اور ان میں نماز کی امامت کا اہل ہے تو وہ کسی کھلے میدان میں زوالِ آفتاب یعنی نصف النہار شرعی سے پہلے با جماعت پڑھ سکتے ہیں۔

## خطبے اور نماز کے درمیان چندہ

**سوال:**

ہمارے محلے کی مسجد کے اخراجات اہلِ محلہ کے تعاون سے پورے کیے جاتے ہیں، جمعۃ المبارک کے اجتماع میں بھی چندہ ہوتا ہے۔ چند ہفتوں سے انتظامیہ نے خطبے اور نماز کے درمیان چندہ جمع کرنا شروع کردیا ہے، جس میں تقریباً پانچ / دس منٹ لگتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ خطبہ کے بعد نمازِ جمعہ کو روک رکھنا شرعاً کیسا ہے اور جماعت میں تاخیر کا حکم کیا ہوگا؟، (قاری محمد حیات، شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

**جواب:**

خطبہ اور نماز کے درمیان اگر فاصلہ طویل ہو جائے تو یہ مکروہ ہے اور پہلا خطبہ کافی

نہیں، دوبارہ پڑھا جائے گا، دُرِّ مختار میں ہے:

''فَإِذَا أَتَمَّ أُقِيمَتْ وَيُكْرَهُ الْفَصْلُ بِأَمْرِ الدُّنْيَا ذَكَرَهُ الْعَيْنِيُّ''۔

ترجمہ: ''جب امام خطبہ مکمل کرلے تو اقامت کہی جائے اور دنیاوی امور کے لیے (خطبہ اور نماز کے درمیان) فاصلہ کرنا مکروہ ہے، ''عینی'' نے اسے ذکر کیا ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قَوْلُهُ: ''فَإِذَا أَتَمَّ أَيِ الْإِمَامُ الْخُطْبَةَ'' قَوْلُهُ أُقِيمَتْ بِحَيْثُ يَتَّصِلُ أَوَّلُ الْإِقَامَةِ بِآخِرِ الْخُطْبَةِ وَتَنْتَهِي الْإِقَامَةُ بِقِيَامِ الْخَطِيبِ مَقَامَ الصَّلَاةِ''۔

ترجمہ: ''جب امام خطبہ مکمل کرلے، تو اقامت کا آغاز خطبہ کے آخر کے ساتھ متصل ہو اور خطیب جب نماز کی جگہ کھڑا ہو، اس کے کھڑا ہونے کے ساتھ اقامت ختم ہو''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''قَوْلُهُ بِأَمْرِ الدُّنْيَا أَمَّا بِنَهْيٍ عَنْ مُّنْكَرٍ أَوْ أَمْرٍ بِمَعْرُوْفٍ فَلَا وَكَذَا بِوُضُوْءٍ أَوْ غُسْلٍ لَوْ ظَهَرَ أَنَّهُ مُحْدِثٌ أَوْ جُنُبٌ كَمَا مَرَّ بِخِلَافِ أَكْلٍ أَوْ شُرْبٍ حَتّٰى لَوْ طَالَ الْفَصْلُ اسْتَأْنَفَ الْخُطْبَةَ كَمَا مَرَّ فَافْهَمْ''۔

ترجمہ: ''جہاں تک ''نہی عن المنکر'' یا ''امر بالمعروف'' کے ساتھ فاصلہ ہو تو یہ مکروہ نہیں ہے، اسی طرح وضو یا غسل کے ساتھ فاصلہ ہے، اگر یہ ظاہر ہو کہ وہ محدث یا جنبی ہے، جس طرح گزر چکا ہے۔ کھانے یا پینے کا معاملہ مختلف ہے، یہاں تک کہ اگر فاصلہ طویل ہو جائے تو نئے سرے سے خطبہ دے، جس طرح گزر چکا ہے، پس اس مسئلے کو سمجھنا چاہیے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 5، ص: 84، دمشق)''۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَلَوْ فَصَلَ بِأَجْنَبِيٍّ فَإِنْ طَالَ بِأَنْ رَجَعَ لِبَيْتِهِ فَتَغَدّٰى أَوْ جَامَعَ وَاغْتَسَلَ اسْتَقْبَلَ خُلَاصَة: أَيْ لُزُوْمًا لِبُطْلَانِ الْخُطْبَةِ سِرَاجٌ''۔

ترجمہ: ''اگر وہ خطبہ اور نماز کے درمیان اجنبی عمل کا فاصلہ کرے، اگر وہ فاصلہ طویل ہو، اس طرح کہ وہ اپنے گھر کی طرف لوٹے اور کھانا کھائے یا جماع کرے اور غسل کرے، تو وہ

نئے سرے سے خطبہ دے، (بحوالہ: خلاصۃ الفتاویٰ) یعنی لازمی طور پر وہ نئے سرے سے خطبہ دے کیونکہ خطبہ باطل ہوجاتا ہے، بحوالہ: ''سراج''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، ج:5،ص:48، دمشق)

مندرجہ بالا فقہی حوالوں سے معلوم ہوا کہ کسی ضرورت کے تحت خطبے اور اقامت میں معمولی فصل کی گنجائش ہے اور چندہ جمع کرنے میں پانچ دس منٹ نہیں لگتے، اگر ہر صف میں ایک آدمی مقرر کردیا جائے تو ایک دو منٹ میں یہ کام ہوسکتا ہے، مسجد کے مصارفِ جاریہ کے لیے یہ شِعار ہمارے ہاں رائج ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا ہو کہ ایک ہی آدمی پوری مسجد اور تمام نمازیوں کے درمیان چکر لگائے اور مسجد بڑی ہو تو اس میں پھر زیادہ وقفہ ہوسکتا ہے، اس سے اجتناب کیا جائے اور ہر صف کے لیے ایک آدمی مقرر کردیا جائے، میں نے یورپ اور امریکا کی مساجد میں اسی طرح دیکھا ہے، اس کی گنجائش ہے، ایک دو منٹ تو بعض اوقات صف بندی میں بھی لگ جاتے ہیں۔

## معذور کے لیے نماز کا طریقہ

**سوال:**

گھٹنے کی وجہ سے ایک آدمی بیٹھ نہیں سکتا اور سجدہ نہیں کرسکتا وہ کرسی پر بیٹھ کر رکوع کی طرح جھک کر سجدہ کرتا ہے اور التحیات کرسی پر بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے مگر وہ قیام بھی کرسکتا ہے اور رکوع بھی کھڑے ہوکر کرسکتا ہے۔لیکن کیا وہ پوری نماز بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے یا جتنی نماز وہ کھڑے ہوکر پڑھ سکتا ہے اس کیلئے وہ کھڑا ہوجائے اور باقی نماز کرسی پر بیٹھ کر پڑھے اور کیا تھکاوٹ یا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کسی وقت وہ پوری نماز بیٹھ کر پڑھنا چاہے تو ایسا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟، (سید محمد علی گیلانی، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان، 19 ٹیپو سلطان روڈ ملتان کینٹ)۔

**جواب:**

ایسا شخص جو قیام پر قادر ہے، سجدہ نہیں کرسکتا، اُس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ زمین پر بیٹھ

کر نماز پڑھے، اگر زمین پر سر رکھ کر سجدہ نہیں کر سکتا تو حکم یہ ہے کہ وہ اشارے سے سجدہ کرے اور رکوع کی بہ نسبت سجدے کے لئے سر کو تھوڑا زیادہ نیچے جھکائے۔

ایسا معذور شخص اگر کرسی پر بیٹھ کر بھی نماز ادا کرے تو جائز ہے اور اس صورت میں رکوع اور سجود اشارے سے کرے۔ البتہ باجماعت نمازوں میں صفوں کے درمیان کرسی رکھنے سے ''تَسْوِیَةُ الصَّف'' یعنی صف کی برابری کی سنّت ادا ہو ہی نہیں سکتی۔ ہماری نظر میں جب تک بندہ بیٹھ کر (خواہ التحیات کی وضع میں یا پاؤں دائیں جانب نکال کر یا آلتی پالتی مار کر بیٹھ کر) نماز پڑھ سکتا ہو تو کرسی پر نہ پڑھے، مسجدوں میں کرسیوں پر نماز پڑھنے والے صفوں کے اطراف میں کھڑے ہوں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''فَلَوْ قَدَرَ عَلَيْهِ دُوْنَ السُّجُوْدِ نُدِبَ إِيمَاؤُهُ قَاعِدًا''۔

ترجمہ: ''جو شخص قیام پر قادر ہو اور سجدہ پر قادر نہ ہو، تو بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا مستحب ہے''، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''أَيْ عَلَى الْقِيَامِ وَحْدَهُ أَوْ مَعَ الرُّكُوْعِ كَمَا فِي ''الْمُنْيَةِ''۔ قَوْلُهُ: ''نُدِبَ إِيمَاؤُهُ قَاعِدًا'': أَيْ لِقُرْبِهِ مِنَ السُّجُوْدِ، وَجَازَ إِيمَاؤُهُ قَائِمًا كَمَا فِي الْبَحْرِ وَأَوْجَبَ الثَّانِيْ زُفَرُ وَالْأَئِمَّةُ الثَّلَاثَةُ لِأَنَّ الْقِيَامَ رُكْنٌ فَلَا يُتْرَكُ مَعَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِ وَلَنَا أَنَّ الْقِيَامَ وَسِيْلَةٌ إِلَى السُّجُوْدِ لِلْخُرُوْرِ، وَالسُّجُوْدُ أَصْلٌ لِأَنَّهُ شُرِعَ عِبَادَةً بِلَا قِيَامٍ كَسَجْدَةِ التِّلَاوَةِ وَالْقِيَامُ لَمْ يُشْرَعْ عِبَادَةً وَحْدَهُ، حَتّٰى لَوْ سَجَدَ لِغَيْرِ اللهِ تَعَالٰى يُكَفَّرُ بِخِلَافِ الْقِيَامِ وَإِذَا عَجَزَ عَنِ الْأَصْلِ سَقَطَتِ الْوَسِيْلَةُ كَالْوُضُوْءِ مَعَ الصَّلَاةِ وَالسَّعْيِ مَعَ الْجُمُعَةِ، وَمَا أَوْرَدَهُ ابْنُ الْهُمَامِ أَجَابَ عَنْهُ فِي ''شَرْحِ الْمُنْيَةِ''، ثُمَّ قَالَ: وَلَوْ قِيْلَ إِنَّ الْإِيمَاءَ أَفْضَلُ لِلْخُرُوْجِ مِنَ الْخِلَافِ لَكَانَ مُوَجَّهًا وَلٰكِنْ لَمْ أَرَ مَنْ ذَكَرَهُ''۔

ترجمہ: ''یعنی صرف قیام پر قادر ہو یا رکوع کے ساتھ قیام پر قادر ہو، جیسا کہ ''مُنْيَةُ الْمُصَلِّيْ'' میں ہے۔ کیونکہ یہ سجدہ کی قریب ہے اور کھڑے ہو کر اشارہ سے نماز پڑھنا بھی

جائز ہے جیسا کہ "البحر الرائق" میں ہے۔ امام زفر اور ائمۂ ثلاثہ نے دوسرے قول کو واجب کیا ہے، کیونکہ قیام رکن ہے، پس اس پر قدرت ہوتے ہوئے اُسے ترک نہیں کیا جائے گا اور ہماری دلیل یہ ہے کہ قیام سجدے کے لیے جھکنے کا ذریعہ ہے اور سجدہ اصل ہے، کیونکہ یہ قیام کے بغیر بطورِ عبادت مشروع ہے، جیسے سجدۂ تلاوت اور قیام علیحدہ بطورِ عبادت مشروع نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی غیر اللہ کو سجدہ کرے گا تو کافر ہو جائے گا بخلاف قیام کے (کہ غیر اللہ کے لیے قیام سے کفر لازم نہیں آتا) اور جب اصل سے عاجز ہوا تو ذریعہ بھی ساقط ہو گیا جیسے نماز کے ساتھ وضو اور جمعہ کے ساتھ سعی ہے۔ "ابنِ ہُمام" نے جو اعتراض کیا ہے، "شرح المُنیۃ" میں اس کا جواب دیا ہے، پھر فرمایا: اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اختلاف سے نکلنے کے لیے اشارہ کرنا افضل ہے تو بھی ایک وجہ بنتی ہے، لیکن میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا جس نے یہ ذکر کیا ہو"۔ نیز علامہ علاء الدین حصکفی نے لکھا: "فَلَوْ قَدَرَ عَلَيْهِ دُوْنَ السُّجُوْدِ نُدِبَ إِيْمَاؤُهُ قَاعِدًا، وَكَذَا مَنْ يَّسِيْلُ جُرْحُهُ لَوْ سَجَدَ"۔

ترجمہ: "اور اسی طرح جس زخمی شخص کے سجدہ کرنے سے اس کے زخم سے خون یا پیپ رِستا ہو، اس کا بھی بیٹھ کر اشارے سے سجدہ کرنا مستحب ہے"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أَيْ يَنْدُبُ إِيْمَاؤُهُ قَاعِدًا مَعَ جَوَازِ إِيْمَائِهِ قَائِمًا لِعَجْزِهِ عَنِ السُّجُوْدِ حُكْمًا لِأَنَّهُ لَوْ سَجَدَ لَزِمَ فَوَاتُ الطَّهَارَةِ بِلَا خَلَفٍ، وَلَوْ أَوْمَا كَانَ الْإِيْمَاءُ خَلَفًا عَنِ السُّجُوْدِ"۔

ترجمہ: "یعنی اس کے باوجود کہ حکماً سجدے سے عاجز ہونے کی بنا پر اُس کا کھڑے ہو کر اشارے سے سجدہ کرنا جائز ہے، مگر اس کا بیٹھ کر اشارے سے سجدہ کرنا مستحب ہے، کیونکہ اگر وہ سجدہ کرے گا تو کسی قائم مقام کے بغیر طہارت کا فوت ہونا لازم آئے گا اور اگر وہ اشارے سے سجدہ کرے گا تو یہ سجدے کے قائم مقام ہو جائے گا۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:153، دمشق)

نوٹ: اگر غیر اللہ کو معبود مان کر سجدہ کیا جائے تو کفر ہے، ورنہ تعظیماً کیا جائے تو حرام ہے، اسی

طرح کسی مذہب میں غیر اللہ کی عبادت حالتِ قیام میں کی جاتی ہے، تو اس صورت میں عبادت کی نیت سے قیام بھی کفر ہوگا، ورنہ تعظیماً قیام جائز ہے۔

پس آپ اگر کسی بھی طرح سے بیٹھ سکتے ہیں، خواہ اَلتحیّات کی ہیئت میں یا دونوں پاؤں ایک طرف نکال کر یا آلتی پالتی مار کر یا قبلے کی جانب ٹانگیں پھیلا کر، تو زمین پر بیٹھ کر نماز پڑھیں، اشارے سے رکوع اور سجود کریں اور اگر یہ قدرت نہیں ہے تو دونوں صورتیں اختیار کر سکتے ہیں، کھڑے ہو کر قراءت کریں، پھر رکوع کریں اور کرسی پر بیٹھ کر یا کھڑے کھڑے اشارے سے سجدہ کریں اور سجدہ کے لیے رکوع سے زیادہ جھکنا ہوگا۔

## غیر مسلم ممالک میں نمازِ جمعہ کی دوسری جماعت کا مسئلہ

**سوال:**

آپ نے تفہیم المسائل جلد 7، ص:92 پر لکھا ہے کہ ایک مسجد میں جمعہ کی ایک سے زائد جماعتیں نہیں ہو سکتیں، جبکہ غیر مسلم ممالک میں بعض جگہ اس کا رواج ہے، ان کے بارے میں کیا حکم ہے، (علامہ نصیر اللہ نقشبندی، اولڈہم، یو۔ کے)۔

**جواب:**

ہم نے ایک مسجد میں دو جمعوں کے عدمِ جواز کا فتویٰ فقہی اصولوں اور بلادِ اسلامیہ میں جاری و ساری سُنتِ مُتوارثہ کے مطابق فقہی حوالہ جات کے ساتھ لکھا تھا۔ لیکن اب یورپ، امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور دیگر غیر مسلم ممالک میں بالعموم نہ جمعۃ المبارک اور عیدین پر سرکاری چھٹی ہوتی ہے اور نہ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے ملازمت کے اوقاتِ کار میں وقفے کا التزام ہے۔ نیز لندن جیسے شہروں میں بعض علاقوں کی مسجدیں چھوٹی ہیں اور نمازی بیک وقت اُن میں سما نہیں سکتے، اس لیے بعض مساجد میں با قاعدہ انتظامات کے تحت دو دو جمعوں اور عیدین کی دو یا تین جماعتوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ امریکا میں پاکستانیوں کی مساجد میں بعض جگہ ایک جمعے میں خطاب اردو میں ہوتا ہے اور دوسرے میں انگریزی میں، کیونکہ نئی نسل اردو خطاب کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں ایسے ممالک میں

ضرورت کی بنا پر ایک ہی مسجد میں جمعوں اور عیدین کی ایک سے زیادہ جماعتوں کی اجازت دی جانی چاہیے اور عملاً رائج بھی ہے۔ نیز یہ بات مُسلّم ہے کہ جمعوں اور عیدین کی ایک سے زیادہ جماعتوں میں نمازوں کی امامت ایک ہی شخص نہیں کرتا بلکہ الگ الگ امام کرتے ہیں، البتہ ایک شخص متعدد خطابات کر سکتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن، ایر پورٹ، بس اڈہ، موٹروے کے سروس سینٹر کی مسجد اور مارکیٹ کی مسجدوں کے سوا، کیونکہ ان مقامات پر لوگوں کا گروہوں کی شکل میں آنا جانا لگا رہتا ہے، محلوں کی مساجد میں عام نمازوں میں بھی ہمارے فقہائے کرام نے ایک سے زائد جماعتوں کی ممانعت اس لیے کی ہے کہ اسے انتشار اور تفریق کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے، جبکہ غیر مسلم ممالک میں بعض جگہ جمعہ اور عیدین میں واقعی اس کی ضرورت ہوتی ہے اور فقہی اصول ہے: ''اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَات'' ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہے''۔ (المجلّۃ الاحکام العدلیہ، مادہ: 21)

## قراءت کی غلطی کی شکایت

**سوال:**

امام صاحب عمر کے تقاضے کے سبب تلاوتِ قرآن میں تلفظ کی ادائیگی اور قواعدِ تجوید میں غلطیاں کرتے ہیں، یہ شکایت مسجد میں نماز ادا کرنے والے طالب علم علماء اور دیگر نمازی صاحبان کی ہے، اس صورت میں مسجد کمیٹی کا کیا کردار ہونا چاہیے؟

(جنرل سیکریٹری جامع مسجد خضریٰ، نیو کراچی)

**جواب:**

قراءت نماز کے فرائض میں سے ایک فرض ہے، قرآن کو قواعدِ تجوید کے مطابق درست پڑھنا اور حروف کو ان کے مخارج سے صحیح ادا کرنا ضروری ہے، تاہم اس کا فیصلہ عام مقتدی نہیں کر سکتے۔ آپ نے لکھا ہے: ''طالب علم علماء نے شکایت کی''، اس کا بہترین حل یہ ہے کہ کسی مستند ادارے میں قواعدِ تجوید و قراءت سے واقف قاری صاحب کو امام صاحب

کی قراءت سنوائی جائے اور اُن کے فیصلے کو تسلیم کیا جائے، کیونکہ ''لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ'' ہر فن کے ماہر موجود ہوتے ہیں۔

## طالبات کا مدرسہ بنانا

**سوال:**

بلاک 17 فیڈرل بی ایریا میں ST-3 گورنمنٹ نقشے میں مسجد ہے۔ 40 سال سے چہار دیواری کے اندر جامع مسجد غوثیہ ایک بڑے ہال اور صحن پر مشتمل ہے، اطراف میں ایک بڑا رقبہ خارجِ مسجد ہے، جس میں پیچھے کی طرف وضو خانہ اور شمالی جانب بچوں کا مدرسہ ہے، جبکہ بائیں جانب پچھلے حصے میں استنجاء خانہ اور اسٹاف کی رہائش ہے۔ مسجد کے سامنے جنوبی حصہ پورا خالی ہے، جو کہ خارجِ مسجد ہے، ہم اس خالی حصے میں بچیوں کے لیے مدرسہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیا اس جگہ بچیوں کا مدرسہ قائم کیا جا سکتا ہے؟

(عارف علی، جنرل سیکریٹری، مسجد غوثیہ، بلاک 17، ایف۔ بی ایریا، کراچی)

**جواب:**

اگر مذکورہ جگہ اصلِ مسجد سے ہٹ کر یا فنائے مسجد میں ہے اور اس کا داخلی و خارجی راستہ مسجد سے باہر کیا جا سکتا ہے، تو وہاں طالبات کے لیے مدرسہ بنانے میں حرج نہیں ہے۔ تعلیم و تعلّم دراصل مسجد اور مقاصدِ مسجد سے تعلق رکھتے ہیں، البتہ مسجد کے آداب ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بچوں یا بچیوں کا شور نمازیوں کی نماز میں خلل انداز نہ ہو یا نماز کے اوقات میں درس و تدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

''جَنِّبُوْا مَسَاجِدَکُمْ صِبْیَانَکُمْ وَمَجَانِیْنَکُمْ وَشِرَائَکُمْ وَبَیْعَکُمْ وَخُصُوْمَاتِکُمْ وَرَفْعَ أَصْوَاتِکُمْ وَاِقَامَةَ حُدُوْدِکُمْ وَسَلَّ سُیُوْفِکُمْ''۔

ترجمہ: ''اپنی مساجد کو بچوں، پاگلوں، خرید و فروخت کے معاملات، باہمی جھگڑوں، شور و شغب، (مجرموں پر) حدودِ الٰہی قائم کرنے اور ایک دوسرے پر تلواریں سونتنے (یعنی آپس کے لڑائی جھگڑوں) سے بچاؤ، (سُنن ابن ماجہ: 750)''۔ دارالفکر کے مطبوعہ نسخے میں

''شہاء'' کی بجائے ''شہار'' (شریر کی جمع) کا لفظ ہے، ممکن ہے یہ کمپوزنگ کی غلطی ہو۔

فنائے مسجد کے بارے میں امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''اَقُوْلُ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ: اِعْلَمْ وَفَّقَنَا اللّٰہُ تَعَالٰی وَاِیَّاکَ اَنَّ لِلْمَسْجِدِ اِطْلَاقَیْنِ اَحَدُھُمَا مَوْضِعُ الصَّلٰوۃِ مِنَ الْاَرْضِ الْمَوْقُوْفَۃِ لَھَا وَھُوَ الْاَصْلُ وَبِھٰذَا الْمَعْنٰی لَایَدْخُلُ فِیْہِ الْبِنَاءُ فَاِنَّ الْبِنَاءَ مِنَ الْاَوْصَافِ کَالْاَطْرَافِ فَالْبَابُ وَالْجِدَارُ خَارِجٌ عَنِ الْمَسْجِدِ، وَکَذَا الدَّکَّۃُ وَالْمَنَارُ وَالْحِیَاضُ وَالْاٰبَارُ وَاِنْ کَانَتْ فِیْ حُدُوْدِہٖ بَلْ فِیْ جَوْفِہٖ اِذَا بُنِیَتْ قَبْلَ تَمَامِ الْمَسْجِدِیَّۃِ، اَمَّا بَعْدَہٗ فَلَا یَجُوْزُ تَغْیِیْرُ شَیْءٍ مِّنَ الْاَوْقَافِ عَنْ ھَیْئَتِہٖ اِلَّا بِشَرْطِ الْوَاقِفِ لِحَاجَۃِ الْوَقْفِ وَمَصْلَحَتِہٖ''۔

ترجمہ: ''میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کہتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے: مسجد کی دو اطلاقات ہیں (۱) زمین کا وہ حصہ جو نماز کے لیے وقف کیا گیا ہے، وہی اصلِ مسجد ہے، اِس اطلاق میں مسجد کی بنیادیں مسجد میں داخل نہیں کہ بنیادیں اوصاف کے حکم میں ہیں جیسے کہ اطراف (وحدود)، پس مسجد کا دروازہ اور دیواریں مسجد سے خارج ہیں، اسی طرح اذان کے چبوترے، منار، حوض اور کنویں (وغیرہ)، خواہ وہ حدودِ مسجد یا مسجد کے وسط ہی میں ہوں، بشرطیکہ مسجد کے مکمل ہونے سے پہلے بنائے گئے (تو مسجد سے خارج ہیں)۔ البتہ مسجد مکمل ہوجانے کے بعد اگر ان چیزوں کو مسجد میں بنایا تو یہ جائز نہیں کیونکہ یہ وقف کو بدلنا ہوگا۔ ہاں! اگر واقف نے وقف کی ضرورت اور اس کے فائدے کے لیے شروع میں اس کی اجازت دے رکھی ہو، تو جائز ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 28، ص:136)''۔

## شہر کی مسجد میں نمازِ جمعہ کا اجرا

**سوال:**

120 گز پلاٹ پر ایک مسجد گراؤنڈ+فرسٹ فلور بنی ہوئی ہے، گراؤنڈ فلور پر پانچ دکانیں، وضو خانہ اور امام ومؤذن کی رہائش گاہ ہے اور فرسٹ فلور پر مسجد ہے۔ مسجد میں پانچ نمازیں باجماعت ہوتی ہیں، جمعہ نہیں ہوتا، کیا اس مسجد میں نمازِ جمعہ قائم کی جاسکتی

ہے؟ (حافظ محمد شہباز، کراچی)

**جواب:**

شہر میں متعدد مقامات پر نمازِ جمعہ ادا کی جاسکتی ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَتُؤَدّٰی فِیْ مِصْرٍ وَّاحِدٍ بِمَوَاضِعَ کَثِیْرَۃٍ مُّطْلَقًا عَلَی الْمَذْھَبِ وَعَلَیْہِ الْفَتْوٰی شَرْحُ الْمَجْمَعِ لِلْعَیْنِیِّ وَإِمَامَۃُ فَتْحِ الْقَدِیْرِ دَفْعًا لِلْحَرَجِ''۔

ترجمہ: ''اور جمعہ ایک شہر میں متعدد جگہ مطلقاً پڑھا جاسکتا ہے، یہی (مختار) مذہب ہے اور علامہ عینی کی تصنیف ''شَرْحُ الْمَجْمَع'' اور امام ابن ہمام کی ''فتح القدیر'' کے ''بَابُ الْاِمَامَۃ'' میں اسی کو مُفتیٰ بہٖ قرار دیا گیا ہے، یہ حرج کو دور کرنے کے لیے ہے''۔ اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَوْلُہٗ: مُطْلَقًا أَیْ سَوَاءٌ کَانَ الْمِصْرُ کَبِیْرًا أَوْ لَا۔۔۔ وَسَوَاءٌ کَانَ التَّعَدُّدُ فِیْ مَسْجِدَیْنِ أَوْ أَکْثَرَ ھٰکَذَا یُفَادُ مِنَ الْفَتْحِ''۔

ترجمہ: ''یعنی خواہ شہر بڑا ہو یا چھوٹا،۔۔۔ ایک سے زیادہ جمعے کے اجتماعات دو مسجدوں میں ہوں یا زیادہ میں، ''فتح القدیر'' سے اسی طرح مُستفاد ہے''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''قَوْلُہٗ عَلَی الْمَذْھَبِ فَقَدْ ذَکَرَ الْإِمَامُ السَّرَخْسِیُّ أَنَّ الصَّحِیْحَ مِنْ مَذْھَبِ أَبِیْ حَنِیْفَۃَ جَوَازُ إِقَامَتِھَا فِیْ مِصْرٍ وَاحِدٍ فِیْ مَسْجِدَیْنِ اَوْ أَکْثَرَ بِہٖ نَأْخُذُ لِإِطْلَاقِ لَا جُمُعَۃَ إِلَّا فِیْ مِصْرٍ، شَرَطَ الْمِصْرَ فَقَطْ، وَبِمَا ذَکَرْنَا انْدَفَعَ مَا فِی الْبَدَائِعِ مِنْ أَنَّ ظَاھِرَ الرِّوَایَۃِ جَوَازُھَا فِیْ مَوْضِعَیْنِ لَا فِیْ أَکْثَرَ وَعَلَیْہِ الْاِعْتِمَادُ اھ فَإِنَّ الْمَذْھَبَ الْجَوَازُ مُطْلَقًا بَحْرٌ۔۔۔ قَوْلُہٗ وَعَلَی الْمَرْجُوْحِ ھُوَ مَا مَرَّ عَنِ الْبَدَائِعِ مِنْ عَدَمِ الْجَوَازِ فِیْ أَکْثَرَ مِنْ مَوْضِعَیْنِ''۔

ترجمہ: ''امام سرخسی نے ذکر کیا ہے: امام ابوحنیفہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ ایک شہر میں دو یا زیادہ مساجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنا جائز ہے، ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں اور جو ہم نے ذکر کیا، اس کی رو سے بدائع الصنائع کا یہ قول: ''لَا جُمُعَۃَ إِلَّا فِیْ مِصْرٍ'' (جمعہ صرف شہر میں جائز ہے) مطلق ہے، کیونکہ ظاہر الروایہ کے مطابق ایک شہر میں صرف دو مقامات پر جمعہ جائز

ہے، دو سے زائد مقامات پر نہیں، رد ہو گیا اور اسی پر اعتماد ہے، پس مذہب مطلق جواز ہے (بحوالہ: البحر الرائق)۔۔۔ بدائع الصنائع کا جو قول گزرا ہے کہ "ایک شہر میں دو جگہوں سے زیادہ جگہوں پر نمازِ جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے، یہ مرجوح قول ہے۔

(حاشیہ ابن عابدین، جلد 5، ص: 29-28، دمشق)

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"شہر میں متعدد جگہ جمعہ ہو سکتا ہے، خواہ شہر چھوٹا ہو یا بڑا اور جمعہ دو مسجدوں میں ہو یا زیادہ، (درمختار)۔ مگر بلا ضرورت بہت سی جگہ جمعہ قائم نہ کیا جائے کہ جمعہ شعائرِ اسلام سے ہے اور جامع جماعات ہے اور بہت سی مسجدوں میں ہونے سے وہ شوکت اسلامی باقی نہیں رہتی، جو اجتماع میں ہوتی، نیز دفع حرج کے لیے تعدد جائز رکھا ہے تو خواہ مخواہ جماعت پراگندہ کرنا اور محلہ محلہ جمعہ قائم کرنا نہ چاہیے۔ نیز ایک بہت ضروری امر جس کی طرف عوام کو بالکل توجہ نہیں، یہ ہے کہ جمعہ کو اور نمازوں کی طرح سمجھ رکھا ہے کہ جس نے چاہا نیا جمعہ قائم کر لیا اور جس نے چاہا پڑھا دیا، یہ ناجائز ہے، اس لیے کہ جمعہ قائم کرنا بادشاہِ اسلام یا اس کے نائب کا کام ہے اور جہاں سلطنتِ اسلامی نہ ہو، وہاں جو سب سے بڑا فقیہ سُنّی صحیح العقیدہ ہو، اَحکام شرعیہ جاری کرنے میں سلطان اسلام کے قائم مقام ہے، لہٰذا وہی جمعہ قائم کرے، بغیر اس کی اجازت کے نہیں ہو سکتا اور یہ بھی نہ ہو تو عام لوگ جس کو امام بنائیں، عالم کے ہوتے ہوئے عوام بطورِ خود کسی کو امام نہیں بنا سکتے، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ دو چار شخص کسی کو امام مقرر کر لیں، ایسا جمعہ کہیں سے ثابت نہیں، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 764)"۔

امام اہلسنّت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا:

"ایک قصبہ میں جامع مسجد ہے کہ ہمیشہ اُس میں جمعہ ہوتا ہے اب ایک مسجد بنا ہوئی اُس کو جامع مسجد بنانا اور قدیم کی جامع مسجد کو ترک کر دینا یا دونوں جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟"۔ آپ نے جواب میں لکھا: "قصبہ وشہر جہاں جمعہ جائز ہے، وہاں نماز جمعہ متعدد جگہ ہونا بھی جائز ہے اگرچہ افضل حتّی الوسع ایک جگہ ہوتا ہے اور اگلی مسجد جامع کو ترک کر

دینے کے اگر یہ معنی کہ اُس میں نماز ہی چھوڑ دی جائے، تو قطعاً ناجائز کہ مسجد کا ویران کرنا ہے اور اگر یہ مراد کہ نماز تو وہاں ہوا کرے مگر جمعہ وہاں کے بدلے اب اس مسجد جدید میں ہو، اس میں اگر وہاں کے اہل اسلام کوئی مصلحتِ شرعیہ قابل قبول رکھتے ہوں تو کیا مضائقہ، ورنہ مسجد جامع وہی مسجد قدیم ہے اور اس میں نماز جمعہ کا ثواب زائد۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 8، ص:312)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فی نفسہٖ شہر میں مُتعدد مقامات پر جمعے کے اجتماعات جائز ہیں، البتہ امام اہلسنّت امام احمد رضا قادری اور صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہما کی تصریحات کے مطابق اگر مذکورہ مسجد میں جمعہ کی نماز قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے یا قرب وجوار کی مساجد میں پہلے سے قائم جمعے کا اجتماع متاثر ہوتا ہے تو آپ اپنی مسجد میں جمعہ قائم نہ کریں۔

## کمیونٹی ہال میں نمازِ تراویح کا اہتمام کرنا

**سوال:**

ہماری کالونی میں ساڑھے تین سو فلیٹ ہیں، ایک کمیونٹی ہال ہے، جس میں شادی کی تقریبات بھی ہوتی ہیں اور کالونی میں رہنے والے ہندو مذہب کے لوگ بھی شادی اور دوسری مذہبی رسومات اس ہال میں کرتے ہیں۔ کالونی میں مسجد بھی ہے، رمضان المبارک میں کچھ لوگ تیرہ روزہ تراویح کی جماعت اس ہال میں کرتے ہیں۔ کیا ہال میں تراویح پڑھنا جائز ہے؟، (رؤف خان، گارڈن کراچی)۔

**جواب:**

عموماً سہ روزہ، پانچ روزہ، دس روزہ یا اسی طرح مختصر دنوں کے لیے نمازِ تراویح کا اہتمام پارک، میدان، ہال وغیرہ میں کیا جاتا ہے، اگر قرآن صحیح پڑھا جائے، الفاظ کی ادائیگی صحیح ہو اور سننے والے کی سمجھ میں آئے، تو شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن شاہراہِ عام پر نہ پڑھی جائے، البتہ مسجد کا ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَإِنْ صَلّٰى بِجَمَاعَةٍ فِي الْبَيْتِ اخْتَلَفَ فِيهِ الْمَشَايِخُ وَالصَّحِيحُ أَنَّ لِلْجَمَاعَةِ فِي الْبَيْتِ فَضِيلَةٌ وَلِلْجَمَاعَةِ فِي الْمَسْجِدِ فَضِيلَةٌ أُخْرٰى فَإِذَا صَلّٰى فِي الْبَيْتِ بِجَمَاعَةٍ فَقَدْ حَازَ فَضِيلَةَ أَدَائِهَا بِالْجَمَاعَةِ وَتَرَكَ الْفَضِيلَةَ الْأُخْرٰى، هٰكَذَا قَالَهُ الْقَاضِي الْإِمَامُ أَبُو عَلِي النَّسَفِي، وَالصَّحِيحُ اَنَّ أَدَائَهَا بِالْجَمَاعَةِ فِي الْمَسْجِدِ أَفْضَلُ''۔

ترجمہ: ''اگر اپنے گھر میں جماعت کے ساتھ تراویح پڑھے، تو اس میں مشایخ کا اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ گھر میں جماعت کی فضیلت ہے اور مسجد میں (جماعت سے) پڑھنا دوسری فضیلت ہے، پس اگر گھر میں جماعت سے تراویح پڑھے گا تو جماعت سے ادا کرنے کی فضیلت مل جائے گی اور دوسری (یعنی مسجد کی) فضیلت چھوٹ جائے گی، امام ابوعلی نسفی کا بھی یہی قول ہے اور صحیح یہ ہے کہ تراویح کا مسجد میں باجماعت ادا کرنا افضل ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:116)

مذکورہ کمیونٹی ہال میں نمازِ تراویح پڑھنے میں شرعاً قباحت نہیں ہے، لیکن جب قریب مسجد موجود ہے اور وہاں تراویح کا اجتماع ہوتا ہے، تو مسجد کی فضیلت کھونا اور مسجد میں نمازیوں کی تعداد کم ہو جانا دونوں ثواب سے محرومی کا باعث ہیں۔ تراویح پورے ماہِ رمضان کی سنّت ہے، ختمِ قرآن خواہ کسی دن ہو جائے، بقیہ دنوں کی تراویح بھی باقاعدگی سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔ تاہم اگر ہال کی صفائی کر کے وہاں نماز باجماعت پڑھی جائے، تو نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، غیر مسلموں کے وہاں تقریبات منعقد کرنے سے نماز کے جواز پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ پوری زمین اگر خشک ہے اور اس پر کوئی ظاہری اور محسوس و مُبصر (نظر آنے والی) نجاست نہیں ہے، تو وہ زمین پاک ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام پر اپنے چھ فضائل بیان فرمائے، ان فضائل کا بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا، وَاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ''، ترجمہ: ''میرے لیے پوری زمین مسجد اور آلۂ طہارت بنادی گئی ہے، سو میری

اُمّت میں جس شخص کے لیے نماز کا وقت آجائے، وہ (جہاں کہیں بھی ہو) نماز پڑھ لے، (صحیح بخاری:436)''۔زمین پر مسلم کافر الغرض انسان حیوانات سب چلتے ہیں، تو محض ان کے چلنے سے زمین ناپاک نہیں ہوتی، بلکہ خشک زمین پاک کے حکم میں ہے تاوقتیکہ اس پر کوئی نظر آنے والی نجاست نہ ہو۔فرض کریں زمین پر کسی نے کسی جگہ پیشاب کیا اور دھوپ پڑنے سے وہ بخارات بن کر اُڑ گیا یا زمین میں جذب ہو گیا اور زمین خشک ہو گئی، تو زمین پاک ہے۔

## عورتوں کی نماز کا طریقہ

**سوال:**

نماز میں عورت کے لیے سجدے کا طریقہ کیا ہے؟، (سید سعد، نارتھ کراچی)۔

**جواب:**

خواتین کے لیے نماز میں مردوں کی بنسبت زیادہ ستر کا اہتمام کرنا اور سمٹ کر نماز ادا کرنا مستحب ہے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''اِذَا جَلَسَتِ الْمَرْاَۃُ فِی الصَّلَاۃِ وَضَعَتْ فَخِذَھَا عَلٰی فَخِذِھَا الْاُخْرٰی، وَاِذَا سَجَدَتْ اَلْصَقَتْ بَطْنَھَا فِی فَخِذَیْھَا کَاَسْتَرِ مَا یَکُوْنُ لَھَا، وَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَنْظُرُ اِلَیْھَا وَیَقُوْلُ: یَا مَلَائِکَتِی اُشْھِدُکُمْ اَنِّی قَدْ غَفَرْتُ لَھَا''۔

ترجمہ: ''جب عورت نماز میں بیٹھے تو ایک ران کو دوسری ران کے اوپر رکھے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو اپنی دونوں رانوں سے ملائے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ ستر ہو، اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھتا ہے اور فرماتا ہے: اے میرے فرشتو! تم گواہ رہو، میں نے اسے بخش دیا ہے، (سنن بیہقی:3199)''۔

(۲) حضرت یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں:

''اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مَرَّ عَلَی امْرَاَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ: اِذَا سَجَدْتُّمَا فَضُمَّا بَعْضَ

اللَّحْمِ إِلَى الْأَرْضِ فَإِنَّ الْمَرْأَةَ لَيْسَتْ فِي ذٰلِكَ كَالرَّجُلِ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ کا گزر دو عورتوں پر ہوا جو نماز پڑھ رہی تھیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اپنا جسم زمین کے ساتھ ملا دو، کیونکہ عورت کے سجدے کی ہیئت مرد کی طرح نہیں ہے، (المراسیل للامام ابی داؤد:87)''۔

(۳) حارث الاعور بیان کرتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''إِذَا سَجَدَتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَضُمَّ فَخِذَيْهَا''۔ ترجمہ: ''جب عورت سجدہ کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنی دونوں رانوں کو آپس میں ملالے، (سنن بیہقی:3197)''۔

(۴) حضرت ابراہیم نخعی بیان کرتے ہیں: ''كَانَتِ الْمَرْأَةُ تُؤْمَرُ إِذَا سَجَدَتْ أَنْ تَلْزَقَ بَطْنَهَا بِفَخِذَيْهَا كَيْلَا تَرْتَفِعَ عَجِزَتُهَا وَلَا تُجَافِيَ كَمَا يُجَافِي الرَّجُلُ''۔

ترجمہ: ''عورت کو اس بات کا حکم دیا جاتا تھا کہ جب وہ سجدہ کرے تو اپنا پیٹ اپنی رانوں کے ساتھ ملائے، تاکہ اُس کی سرین بلند نہ ہو اور وہ اپنے پیٹ اور رانوں کے درمیان مردوں کی طرح خلا نہ چھوڑے، (سنن بیہقی، ج:2،ص:314)''۔

## مسافر امام کی اقتدا میں مقیم کی نماز

**سوال:**

اگر امام مسافر ہو اور مقتدی مقیم، امام دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر لے، تو مقیم حضرات اپنی نماز باقی کیسے ادا کریں گے؟، (عبدالرحمٰن، لاہور)۔

**جواب:**

ایسی صورت میں مقیم مقتدی اپنی بقیہ نماز ثناء اور قراءت کے بغیر خاموش کھڑے رہ کر ادا کرے گا، البتہ رکوع اور سجود کی تسبیحات اور تکبیراتِ انتقال کہے گا۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''وَإِنْ صَلَّى الْمُسَافِرُ بِالْمُقِيمِينَ رَكْعَتَيْنِ سَلَّمَ وَأَتَمَّ الْمُقِيمُونَ صَلَاتَهُمْ، كَذَا فِي ''الْهِدَايَة'' وَصَارُوْا مُنْفَرِدِيْنَ كَالْمَسْبُوْقِ إِلَّا أَنَّهُمْ لَا يَقْرَؤُنَ فِي الْأَصَحِّ، هٰكَذَا فِي

''التَّبْيِيْن''، وَيُسْتَحَبُّ لِلْإِمَامِ أَنْ يَقُوْلَ:أَتِمُّوْا صَلَاتَكُمْ فَإِنَّا قَوْمٌ سَفَرٌ، كَذَا فِي ''الْهِدَايَةِ''۔

ترجمہ:''اگر مسافر نے مقیم حضرات کو نماز پڑھائی، امام دو رکعت پر سلام پھیر دے گا اور مقیم حضرات اپنی نماز پوری کریں گے، جیسا کہ ''ہدایہ'' میں ہے اور یہ مقیم نمازی مسبوق کے مثل ہوں گے مگر صحیح ترین قول کے مطابق قراءت نہیں کریں گے، ''تبیین'' میں اسی طرح ہے اور امام کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ کہے: اپنی نماز پوری کرو میں مسافر ہوں، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:142)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَصَحَّ اقْتِدَاءُ الْمُقِيْمِ بِالْمُسَافِرِ فِي الْوَقْتِ وَبَعْدَهُ فَإِذَا قَامَ الْمُقِيْمُ إِلَى الْإِتْمَامِ لَا يَقْرَأُ''۔

ترجمہ:''مقیم کا مسافر کی اقتدا کرنا وقت میں اور وقت کے بعد صحیح ہے، جب مقیم نماز مکمل کرنے کے لیے کھڑا ہوگا، وہ قراءت نہیں کرے گا۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:640، دمشق)

مقیم کو چاہیے کہ مسافر کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کرے اور جب امام سلام پھیر دے تو مقیم مقتدی کھڑا ہو جائے اور اپنی باقی دو رکعتیں پڑھ لے، ان دو رکعتوں میں قراءت بالکل نہ کرے بلکہ اتنی دیر خاموش کھڑا رہے جتنی دیر سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حکماً وہ امام ہی کی اقتداء میں ہوتا ہے اور امام کی اقتداء میں مقتدی پر قراءت نہیں ہے۔

## مسافر مقیم کے پیچھے نماز پوری پڑھے گا

**سوال:**

اگر مسافر نے مقیم امام کی اقتداء کی اور وہ چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہو تو اپنی بقیہ نماز کی تکمیل کیسے کرے گا؟۔

**جواب:**

مسافر جب مقیم امام کے پیچھے باجماعت نماز ادا کرے گا تو پوری نماز پڑھے گا، خواہ تکبیرِ اُولیٰ سے شامل ہوا ہو یا درمیان میں اقتداء کی ہو، حدیث پاک میں ہے: ''إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ''، ترجمہ: ''امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اُس کی اقتداء کی جائے۔

(صحیح بخاری:688)

مسافر کے لیے مقیم امام کی اقتدا میں نماز قصر کرنا جائز نہیں، کیونکہ نبی ﷺ کے فرمان کے عموم کا یہی تقاضا ہے: ''مَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا''، ترجمہ: ''پس نماز کا جو حصہ پالو اسے پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے مکمل کرلو، (صحیح البخاری:636)''۔ چنانچہ مسافر جب مقیم امام کے ساتھ آخری دو رکعتیں پائے تو اس کے لیے واجب ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد دو رکعتیں اور پڑھے اور اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دو رکعتوں پر اکتفا کر کے امام کے ساتھ سلام پھیر دے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَأَمَّا اقْتِدَاءُ الْمُسَافِرِ بِالْمُقِيْمِ فَيَصِحُّ فِي الْوَقْتِ وَيُتِمُّ''۔

ترجمہ: ''جہاں تک مسافر کی مقیم کی اقتداء کا معاملہ ہے تو یہ وقت میں صحیح ہے اور وہ اپنی نماز مکمل کرے گا، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:643 دمشق)''۔

مزید لکھتے ہیں:

''وَلَا مُسَافِرٍ بِمُقِيْمٍ بَعْدَ الْوَقْتِ فِيْمَا يَتَغَيَّرُ بِالسَّفَرِ كَالظُّهْرِ، سَوَاءٌ أَحْرَمَ الْمُقِيْمُ بَعْدَ الْوَقْتِ أَوْ فِيْهِ، فَخَرَجَ فَاقْتَدَى الْمُسَافِرُ بَلْ إِنْ أَحْرَمَ فِي الْوَقْتِ فَخَرَجَ صَحَّ وَأَتَمَّ تَبَعًا لِإِمَامِهِ''۔

ترجمہ: ''اور وقت گزرنے کے بعد مقیم کے پیچھے مسافر کی اقتدا درست نہیں، ان نمازوں میں جن میں سفر کی وجہ سے تغیر ہوتا ہے، جیسے ظہر کی نماز خواہ مقیم نے وقت کے بعد یا وقت کے اندر تکبیر کہی پھر وقت نکل گیا تو مسافر نے اقتداء کی بلکہ اگر وقت میں تکبیر کہی پھر وقت

نکل گیا تو صحیح ہے اور مسافر امام کی اتباع کے سبب اپنی نماز کو مکمل کرے۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:599 دمشق)

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أَیْ وَلَا یَصِحُّ اقْتِدَاءُ مُسَافِرٍ بِمُقِیْمٍ إلَخ، وَبَیَانُ ذٰلِكَ أَنَّ صَلَاةَ الْمُسَافِرِ قَابِلَةٌ لِلْإِتْمَامِ مَا دَامَ الْوَقْتُ بَاقِیًا، بِأَنْ یَّنْوِیَ الْإِقَامَةَ أَوْ بِأَنْ یَّقْتَدِیَ بِمُقِیْمٍ فَیَصِیْرُ تَبَعًا لِإِمَامِهٖ وَیُتِمُّ لِبَقَاءِ السَّبَبِ وَهُوَ الْوَقْتُ۔ أَمَّا إِذَا خَرَجَ الْوَقْتُ فَقَدْ تَقَرَّرَتْ فِیْ ذِمَّتِهٖ رَكْعَتَیْنِ فَلَا یُمْكِنُ إِتْمَامُهَا بِإِقَامَةٍ أَوْ غَیْرِهَا، حَتّٰی إِنَّهٗ یَقْضِیْهَا فِیْ بَلَدِهٖ رَكْعَتَیْنِ، فَإِذَا اقْتَدٰی بَعْدَ الْوَقْتِ بِمُقِیْمٍ أَحْرَمَ بَعْدَ الْوَقْتِ أَوْ فِیْهِ لَا یَصِحُّ"۔

ترجمہ: "یعنی مسافر کا مقیم کی وقت کے بعد اقتدا کرنا صحیح نہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ مسافر کی نماز مکمل کرنے کے قابل ہے جب تک وقت باقی ہے اس طرح کہ مسافر اقامت کی نیت کرے یا وہ مقیم کی اقتداء کرلے۔ پس وہ اپنے امام کے تابع ہوگا اور وہ سبب کے بقا کی وجہ سے نماز کو مکمل کرے گا اور سبب وقت ہے۔ جب وقت نکل جائے گا تو مسافر کے ذمہ دو رکعتیں ہی مقرر ہوگئیں۔ پس اقامت یا اس کے علاوہ کسی طرح نماز کو مکمل کرنا ممکن نہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے شہر میں اس نماز کی قضا دو رکعتیں ہی کرے گا اور جب وقت کے بعد مقیم کی اقتداء کرے گا تو اس نے وقت کے بعد یا وقت کے اندر تکبیر کہی ہو تو صحیح نہیں ہے"۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 3، ص:599 دمشق)

## فوج کا جنگل میں پڑاؤ شرعی اقامت نہیں ہے

**سوال:**

ہم نے اپنی چھاؤنی سے سو کلومیٹر دور ایک جنگل میں بیس دن قیام کیا، کیا اس دوران نماز پوری پڑھیں گے؟، (عبداللہ ضیائی، کورنگی)۔

**جواب:**

اقامت کی نیت صحیح ہونے کے لیے چھ شرائط ہیں:

(۱)چلنا ترک کرے اگر چلنے کی حالت میں اقامت کی نیت کی تو مقیم نہیں۔

(۲)وہ جگہ اقامت کی صلاحیت رکھتی ہو، جنگل یا دریا غیر آباد ٹاپو میں اقامت کی نیت کی مقیم نہ ہوا۔

(۳)پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت ہو اس سے کم ٹھہرنے کی نیت سے مقیم نہ ہوگا۔

(۴)یہ نیت ایک ہی جگہ ٹھہرنے کی ہو اگر دو جگہوں میں پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ ہو، مثلاً ایک میں دس دن دوسرے میں پانچ دن کا تو مقیم نہیں ہوگا۔

(۵)اپنا ارادہ مستقل رکھتا ہو یعنی کسی کا تابع نہ ہو۔

(۶)اس کی حالت اس کے ارادہ کے منافی نہ ہو۔

وہ جگہ اقامت کی صلاحیت رکھتی ہو، درمختار میں ہے:

''أَوْ يَنْوِیْ وَلَوْ فِی الصَّلَاةِ إِذَا لَمْ يَخْرُجْ وَقْتُهَا وَلَمْ يَكُ لَاحِقًا إِقَامَةَ نِصْفِ شَهْرٍ حَقِيقَةً أَوْ حُكْمًا لِمَا فِی الْبَزَّازِيَّةِ وَغَيْرِهَا: لَوْ دَخَلَ الْحَاجُّ الشَّامَ وَعَلِمَ أَنَّهُ لَا يَخْرُجُ إِلَّا مَعَ الْقَافِلَةِ فِی نِصْفِ شَوَّالٍ أَتَمَّ لِأَنَّهُ كَنَاوِی الْإِقَامَةِ بِمَوْضِعٍ وَّاحِدٍ صَالِحٍ لَهَا مِنْ مِّصْرٍ أَوْ قَرْيَةٍ أَوْ صَحْرَاءِ دَارِنَا وَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْأَخْبِيَةِ فَيَقْصُرُ إِنْ نَوَى الْإِقَامَةَ''۔

ترجمہ: ''یا وہ حقیقتاً یا حکماً نصف ماہ اقامت کی نیت کرلے، اگرچہ وہ نماز میں ہو، بشرطیکہ جب نماز کا وقت نہ نکلا ہو اور وہ لاحق نہ ہو، کیونکہ ''بزازیہ'' میں ہے: اگر حاجی شام میں داخل ہوا اور اسے علم ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ نصف شوال کو روانہ ہوگا تو وہ اپنی نماز کو مکمل کرے گا کیونکہ وہ اقامت کی نیت کرنے والے کی طرح ہے، ایسی جگہ میں جو اقامت کے قابل ہے، وہ شہر ہو یا دیہات ہو یا ہمارے دارالاسلام کا صحرا ہو جبکہ وہ خانہ بدوش ہو''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:629-626، دمشق)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ الْحُلْوَانِیُّ: عَسْكَرُ الْمُسْلِمِيْنَ إِذَا قَصَدُوْا مَوْضِعًا وَّمَعَهُمْ أَخْبِيَتُهُمْ وَخِيَامُهُمْ وَفَسَاطِيْطُهُمْ فَنَزَلُوْا مَفَازَةً فِی الطَّرِيْقِ وَنَصَبُوا الْأَخْبِيَةَ وَالْفَسَاطِيْطَ وَعَزَمُوْا

فِيهَا عَلٰى إِقَامَةِ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْمًا لَّمْ يَصِيرُوْا مُقِيمِيْنَ لِأَنَّهَا حَمُوْلَةٌ وَلَيْسَتْ بِمَسَاكِنَ كَذَا فِي "الْمُحِيْط"۔

ترجمہ: "شمس الائمہ حلوانی نے فرمایا: مسلمانوں کا لشکر اگر کسی جگہ جائے اور ان کے خیمے کا سامان ان کے ساتھ ہو، انھوں نے راہ جنگل میں پڑاؤ ڈالا اور وہاں خیمے وغیرہ نصب کیے اور پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا تو وہ مقیم نہیں ہوں گے کیونکہ وہ سامان اٹھانے والے ہیں، وہاں ان کے گھر نہیں ہیں، "محیط" میں اسی طرح ہے"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:139)

سپاہی/ ملازم کی اپنی نیت معتبر نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے افسر یا مالک کا تابع ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنے افسر اور مالک کے ساتھ ہو ورنہ خود اس کی نیت معتبر ہے۔

تنویر الابصار ورد المحتار میں ہے:

"وَالْمُعْتَبَرُ نِيَّةُ الْمَتْبُوْعِ لِأَنَّهُ الْأَصْلُ لَا التَّابِعِ كَامْرَأَةٍ وَفَّاهَا مَهْرَهَا الْمُعَجَّلَ وَعَبْدٍ غَيْرِ مُكَاتَبٍ وَجُنْدِيٍّ إِذَا كَانَ يَرْتَزِقُ مِنَ الْأَمِيْرِ أَوْ بَيْتِ الْمَالِ وَأَجِيْرٍ وَأَسِيْرٍ وَغَرِيْمٍ وَتِلْمِيْذٍ مَعَ زَوْجٍ وَمَوْلًى وَأَمِيْرٍ وَمُسْتَأْجِرٍ"۔

ترجمہ: "متبوع کی نیت معتبر ہے، کیونکہ وہ اصل ہے، تابع کی نیت کا اعتبار نہیں، جس طرح ایسی عورت جس کے شوہر نے مہرِ معجّل دے دیا، وہ شوہر کے تابع ہے اور ایسا غلام جو مکاتب نہ ہوا، اپنے آقا کے تابع ہے اور سپاہی جب وہ امیر یا بیت المال سے وظیفہ لیتا ہو، اپنے کمانڈر کے تابع ہے اور مزدور مستاجر کے تابع، قیدی قید کرنے والے کے تابع، (اسی طرح) مقروض اور شاگرد (کا معاملہ ہے کہ وہ بالترتیب قرض خواہ اور استاد کے تابع ہیں"۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:657-652، دمشق)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فَهٰؤُلَاءِ لَا يَصِيرُوْنَ مُقِيمِيْنَ بِنِيَّةِ أَنْفُسِهِمْ فِي ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ، كَذَا فِي "الْمُحِيْط"۔

ترجمہ: "پس ظاہر روایت کے مطابق یہ تمام (سپاہی، مزدور، مقروض، شاگرد، بیوی وغیرہ)

اپنی نیت سے مقیم نہیں ہوں گے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:141)

## فجر کی جماعت کے بعد نماز کی ادائیگی

**سوال:**

اگر فجر کی نماز ہو چکی ہو تو جماعت کے بعد نماز کی ادائیگی اور رکعات ادا کرنے کا طریقہ بتادیں، اسی طرح قضا نماز کی ادائیگی کا طریقہ بتادیں، (آصف خلیل)۔

**جواب:**

نمازِ فجر کی جماعت ہوجانے کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے فجر کی نماز ادا کرلی جائے تو یہ ادا ہی کہلائے گی اور دو سنّت اور دو فرض پوری نماز پڑھی جائے گی۔ سورج طلوع ہوتے ہی مکروہ وقت کا آغاز ہوجاتا ہے، جو تقریباً بیس منٹ رہتا ہے، لہٰذا طلوعِ آفتاب کے بیس منٹ گزرنے کے بعد فجر کی نماز قضا پڑھی جائے گی اور وہی چار رکعات پوری پڑھی جائیں گی، حدیث پاک میں ہے:

''وَإِنَّ أَوَّلَ وَقْتِ الفَجْرِ حِيْنَ يَطْلُعُ الفَجْرُ، وَإِنَّ اٰخِرَ وَقْتِهَا حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ''۔

ترجمہ: ''نمازِ فجر کا اول وقت جب فجر یعنی صبحِ صادق طلوع ہوجائے اور اس کا آخری وقت (یعنی اختتام) جب سورج طلوع ہوجائے، (سُنن ترمذی: 151)''۔

علامہ ابوالحسین احمد بن محمد بن احمد بغدادی قدوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''أَوَّلُ وَقْتِ الْفَجْرِ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ الثَّانِي وَهُوَ الْبَيَاضُ الْمُعْتَرِضُ فِي الْأُفُقِ وَاٰخِرُ وَقْتِهَا مَالَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ''۔

ترجمہ: ''فجر کا اول وقت فجرِ ثانی (یعنی صبحِ صادق) طلوع ہونا ہے اور وہ سفیدی جو اُفق پر پھیل جاتی ہے اور فجر کا آخر وقت آفتاب طلوع ہونا ہے، (مختصر القدوری، ص:57)''۔

قضا نمازیں مکروہ اوقات (طلوعِ آفتاب کے بعد احتیاطاً بیس منٹ تک، نصف النہار شرعی (زوال) اور غروبِ آفتاب سے قبل کے بیس منٹ) کے علاوہ جب بھی فرصت ملے،

ادا کرتے رہنا چاہیے اور ہر وقت کی نماز کے ساتھ یعنی وقتی نماز سے پہلے یا بعد میں اس وقت کی نماز کی کم از کم ایک قضا پڑھ لیں اور نیت اس طرح کریں مثلاً فجر یا ظہر یا عصر یا مغرب یا عشاء اور وتر کی پہلی یا آخری نماز جو میرے ذمے باقی ہے، اُسے بطور قضا ادا کرتا ہوں۔ نیت زبانی کرنا ضروری نہیں ہے، دل میں ارادہ کافی ہے۔

## شیشے کا دروازہ نمازی کا سُترہ بن سکتا ہے

**سوال:**

4 جنوری کو روزنامہ جنگ کے اسلامی صفحے پر ایک مسئلہ (مسجد میں محرابی دیوار پر شیشے لگانا) کے بارے میں آپ نے نہایت مفصّل اور مدلّل جواب دیا تھا، اسی سلسلے میں میرا سوال ہے کہ آج کل مسجد کے ہال اور برآمدوں میں ٹرانسپیرنٹ شیشے کے دروازے لگائے جاتے ہیں جن کے آر پار لوگ واضح نظر آتے ہیں، کیا ایسے شیشوں والے دروازے کو نمازی کے لیے ''سُترہ'' بنایا جاسکتا ہے، (اظفر صدّیقی، لاہور)۔

**جواب:**

شیشہ خود ایک ٹھوس چیز ہے، جو سُترہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے آر پار نظر آنا گزرنے والے کے لیے ممانعت کا سبب نہیں بن سکتا۔ حدیث پاک میں سُترہ کی کم از کم مقدار ایک ہاتھ لمبا اور ایک انگلی کے برابر موٹا ہونے کی تعلیم فرمائی گئی ہے اور زیادہ سے زیادہ لمبائی تین ہاتھ ہے، تو اگر آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور ایک ذراع لمبی اور ایک انگلی موٹی لکڑی یا اس کی بھی ڈبل آپ کے سامنے سُترے کے طور پر رکھی ہوئی ہو تو کیا آپ کو سامنے سب کچھ نظر نہیں آرہا ہوتا، سو یہ ایک علامتی آڑ ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِیْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ عَنْ سُتْرَةِ الْمُصَلِّیْ، فَقَالَ: كَمُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سُترہ (Cover) کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: پالان کی پچھلی لکڑی

کے برابر ہو، (صحیح مسلم:500)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار ہے:

"سُتْرَۃً بِقَدْرِ ذِرَاعٍ طُولاً وَغِلَظِ أِصبَعٍ لِتَبْدُوَ لِلنَّاظِرِ بِقُرْبِہٖ دُونَ ثَلَاثَۃِ أَذْرُعٍ"۔

ترجمہ: "سُترہ کی لمبائی کی مقدار ایک ہاتھ اور موٹائی ایک انگلی کے برابر ہونی چاہیے تاکہ قریب سے دیکھنے والے پر ظاہر ہو کہ سترہ اور نمازی کے درمیان فاصلہ زیادہ سے زیادہ تین ہاتھ ہو"۔

سُترے کا بچھا کر رکھنا یا نصب کرنا لازم نہیں ہے، مُعلّق شے بھی بطور سُترہ استعمال ہوسکتی ہے، علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَصُوْرَتُہٗ: أَنْ تَکُوْنَ السِّتَارَۃُ مِنْ ثَوْبٍ أَوْنَحْوِہٖ مُعَلَّقَۃٌ فِیْ سُقُفٍ مَثَلاً ثُمَّ یُصَلِّیْ قَرِیْباً مِّنْہُ، فَإِذَا سَجَدَ تَقَعُ عَلٰی ظَھْرِہٖ وَیَکُوْنُ سُجُوْدُہٗ خَارِجاً عَنْھَا وَإِذَاقَامَ أَوْقَعَدَ سَبَلَتْ عَلَی الْاَرْضِ وَسُتْرَتُہٗ"۔

ترجمہ: "اس کی صورت یہ ہے: کپڑے کا پردہ یا اُس کے جیسی کوئی شے چھت سے مُعلّق (لٹکی ہوئی) ہے، پھر اس کے قریب کوئی نماز پڑھ رہا ہو، پس جب سجدہ کرے تو پردہ اُس کی پشت پر ہوگا اور سجدہ اُس (پردے) کے خارج میں اور جب نمازی قیام یا قعدہ کرے گا تو پردہ زمین پر لٹک رہا ہوگا اور سترہ ہوگا

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص:126-125-123، دمشق)

## تیمُّم کا حکم

**سوال:**

سفر کے دوران ٹرین یا بس وغیرہ میں اگر پانی دستیاب نہ ہو، تیمم کس طرح کیا جاسکتا ہے، نیز یہ کہ اگر پانی اور پاک مٹی دونوں دستیاب نہ ہوں یا پاک مٹی تو دستیاب ہو لیکن استعمال پر قدرت نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے، (یحییٰ، کراچی)۔

**جواب:**

ٹرین، بس وغیرہ کی دیواریں عموماً لکڑی، لوہے یا پلاسٹک وغیرہ کی ہوتی ہیں، اُن سے تیمم کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر سفر کے دوران اُن پر کچھ گرد وغبار وغیرہ جم جاتا ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گرد وغبار سے بھی تیمم کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَيَجُوْزُ التَّيَمُّمُ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللهُ بِكُلِّ مَا كَانَ مِنْ جِنْسِ الْاَرْضِ كَالتُّرَابِ وَالرَّمْلِ وَالْحَجَرِ وَالْجِصِّ۔۔۔۔۔۔۔ وَكَذَا يَجُوْزُ بِالْغُبَارِ مَعَ الْقُدْرَةِ عَلَى الصَّعِيْدِ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ رَحِمَهُمَا اللهُ، لِاَنَّهٗ تُرَابٌ رَقِيْقٌ''۔

ترجمہ: ''امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ کے نزدیک ہر وہ چیز جو زمین کی جنس سے ہو، اُس سے تیمم جائز ہے، جیسے مٹی، ریت، پتھر اور چونا''۔۔۔۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غبار سے تیمُّم کرنا بھی جائز ہے، اگرچہ مٹی سے تیمُّم کرنے پر قادر ہو، کیونکہ غبار باریک مٹی ہی ہوتا ہے، (ہدایہ، جلد 1، ص:88)''۔

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جو چیز آگ سے جل کر راکھ ہو جاتی ہو جیسے: لکڑی، گھاس وغیرہ یا پگھل جاتی ہو یا نرم ہو جاتی ہو جیسے: چاندی، سونا، تانبا، پیتل، لوہا وغیرہ دھاتیں، وہ زمین کی جنس سے نہیں، ایسی چیزوں سے تیمُّم جائز نہیں۔ ہاں یہ دھاتیں اگر کان سے نکال کر پگھلائی نہ گئیں کہ ان پر مٹی کے اجزا ہنوز باقی ہیں، تو ان سے تیمُّم جائز ہے اور اگر پگھلا کر صاف کر لی گئیں اور ان پر اتنا غُبار ہے کہ ہاتھ مارنے سے اس کا اثر ہاتھ میں ظاہر ہوتا ہے، تو اس غُبار سے تیمُّم جائز ہے، ورنہ نہیں، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:358)''۔

آج کل ریل گاڑیوں میں پانی کا انتظام ہوتا ہے اور وضو کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر پانی دستیاب نہیں ہے اور خدشہ ہے کہ اگلے اسٹیشن پہنچنے تک نماز کا وقت نکل جائے گا، تو تیمُّم کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں، جیسا کہ فقہی عبارات کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ گرد پر ہاتھ

مار کر بھی تیمُّم ہوسکتا ہے اور احتیاطاً مناسب سائز کا پتھر یا ڈھیلا بھی ساتھ رکھ سکتے ہیں، اس پر ہاتھ پھیرنے سے بھی تیمّم ہوسکتا ہے۔

ریل میں مشکل یہ ہے کہ اسے اسٹیشن کے علاوہ ہر جگہ حسبِ منشا رکوایا نہیں جاسکتا، البتہ اگر بس میں سفر کرتے ہوئے نماز کے وقت کے اندر اگلا اسٹاپ آنے کی اُمید ہے، تو اس کا انتظار کریں، ورنہ اسے مناسب جگہ نماز کے لیے رکوایا بھی جاسکتا ہے۔ موٹر وے پر سروس سینٹر کے لیے جگہیں متعین ہیں، وہاں دیگر ضروریات کے علاوہ استنجا خانے اور وضو خانے سمیت مسجد بھی ہوتی ہے ،آج کل عام شاہراہوں پر بعض پٹرول پمپوں کے ساتھ مسافروں کے لیے چھوٹی مسجدیں بھی بنی ہوتی ہیں اور بعض مقامات پر تو بہت عمدہ اور صاف ستھری ہوتی ہیں اور مسافر مل کر باجماعت نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اور بعض مقامات پر مین شاہراہ کے قریب مستقل مساجد ہوتی ہیں۔

سطورِ ذیل میں ہم نماز کے وقت کے اندر طہورین یعنی پانی اور پانی کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں تیمم کے لیے پاک مٹی یا جنسِ ارض سے کوئی چیز یا غُبار وغیرہ پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں نماز کے احکام پر تفصیلی گفتگو کر رہے ہیں:

امام مسلم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

(1) ''عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهَا اسْتَعَارَتْ مِنْ أَسْمَاءَ قِلَادَةً فَهَلَكَتْ، فَأَرْسَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِهٖ فِي طَلَبِهَا، فَأَدْرَكَتْهُمُ الصَّلَاةُ، فَصَلَّوْا بِغَيْرِ وُضُوْءٍ، فَلَمَّا أَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ شَكَوْا ذٰلِكَ إِلَيْهِ، فَنَزَلَتْ آيَةُ التَّيَمُّمِ، فَقَالَ أُسَيْدُ بْنُ حُضَيْرٍ: جَزَاكِ اللّٰهُ خَيْرًا، فَوَاللّٰهِ مَا نَزَلَ بِكِ أَمْرٌ قَطُّ، إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ لَكِ مِنْهُ مَخْرَجًا وَجَعَلَ لِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْهِ بَرَكَةً''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: انہوں نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے ایک ہار عاریۃً لیا اور وہ (سفر میں) گم ہوگیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ میں سے بعض کو ہار ڈھونڈنے کے لیے بھیجا، اسی اثنا میں نماز کا وقت آگیا اور انہوں نے بغیر وضو کے نماز پڑھ

لی، جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ سے اس بات کی شکایت کی، اسی وقت آیت تیمم نازل ہوئی اور اُسید بن حُضیر نے حضرت عائشہ سے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ پر کوئی پریشانی نہیں آئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی کو آپ سے زائل کردیا اور مسلمانوں کے لیے اس میں برکت رکھ دی۔ (صحیح مسلم: 367)

امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں:

(2) ''بَعَثَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أُسَيْدَ بْنَ حُضَيْرٍ وَأُنَاسًا مَعَهُ فِي طَلَبِ قِلَادَةٍ أَضَلَّتْهَا عَائِشَةُ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّوْا بِغَيْرِ وُضُوءٍ، فَأَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ، فَأُنْزِلَتْ آيَةُ التَّيَمُّمِ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے اُسید بن حُضیر اور اُن کے ساتھ کچھ افراد کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گم کردہ ہار کی تلاش کے لیے بھیجا، اس دوران نماز کا وقت آگیا تو انہوں نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی، پھر وہ نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آیتِ تیمم نازل ہوئی، (ابوداؤد: 317)''۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

''وَإِنْ عَدِمَ بِكُلِّ حَالٍ صَلّٰى عَلٰى حَسَبِ حَالِهِ وَهٰذَا قَوْلُ الشَّافِعِيِّ، وَقَالَ أَبُو حَنِيْفَةَ وَالثَّوْرِيُّ وَالْأَوْزَاعِيُّ: لَا يُصَلِّيْ حَتّٰى يَقْدِرَ، ثُمَّ يَقْضِيَ، لِأَنَّهَا عِبَادَةٌ لَا تُسْقِطُ الْقَضَاءَ، فَلَمْ تَكُنْ وَاجِبَةً، كَصِيَامِ الْحَائِضِ، وَقَالَ مَالِكٌ: لَا يُصَلِّيْ وَلَا يَقْضِيْ، لِأَنَّهُ عَجَزَ عَنِ الطَّهَارَةِ، فَلَمْ تَجِبْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ، كَالْحَائِضِ، وَقَالَ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ: هٰذِهِ رِوَايَةٌ مُنْكَرَةٌ عَنْ مَالِكٍ وَذَكَرَ عَنْ أَصْحَابِهِ قَوْلَيْنِ: أَحَدُهُمَا كَقَوْلِ أَبِي حَنِيْفَةَ، وَالثَّانِيْ يُصَلِّيْ عَلٰى حَسَبِ حَالِهِ، وَيُعِيْدُ، وَلَنَا مَا رَوٰى مُسْلِمٌ فِي ''صَحِيْحِهِ'' أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ أُنَاسًا لِطَلَبِ قِلَادَةٍ أَضَلَّتْهَا عَائِشَةُ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَصَلَّوْا بِغَيْرِ وُضُوءٍ، فَأَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ، فَنَزَلَتْ آيَةُ التَّيَمُّمِ وَلَمْ يُنْكِرِ النَّبِيُّ ﷺ ذٰلِكَ وَلَا أَمَرَهُمْ

بِإِعَادَةٍ۔

فَدَلَّ عَلَى أَنَّهَا غَيْرُ وَاجِبَةٍ، وَلِأَنَّ الطَّهَارَةَ شَرْطٌ، فَلَمْ تُؤَخَّرِ الصَّلَاةُ عِنْدَ عَدَمِهَا، كَالسُّتْرَةِ وَاسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ وَإِذَا ثَبَتَ هٰذَا، فَإِذَا صَلَّى عَلَى حَسَبِ حَالِهِ، ثُمَّ وَجَدَ الْمَاءَ أَوِ التُّرَابَ، لَمْ يَلْزَمْهُ إِعَادَةُ الصَّلَاةِ فِي إِحْدَى الرِّوَايَتَيْنِ، وَالْأُخْرَى عَلَيْهِ الْإِعَادَةُ وَهُوَ مَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ، لِأَنَّهُ فَقَدَ شَرْطَ الصَّلَاةِ، أَشْبَهَ مَا لَوْ صَلَّى بِالنَّجَاسَةِ۔

وَالصَّحِيحُ الْأَوَّلُ، لِمَا ذَكَرْنَا مِنَ الْخَبَرِ، وَلِأَنَّهُ أَتَى بِمَا أُمِرَ، فَخَرَجَ عَنْ عُهْدَتِهِ، لِأَنَّهُ شَرْطٌ مِنْ شَرَائِطِ الصَّلَاةِ، فَيَسْقُطُ عِنْدَ الْعَجْزِ عَنْهُ، كَسَائِرِ شُرُوطِهَا وَأَرْكَانِهَا، وَلِأَنَّهُ أَدّٰى فَرْضَهُ عَلَى حَسَبِهِ، فَلَمْ يَلْزَمْهُ الْإِعَادَةُ، كَالْعَاجِزِ عَنِ السُّتْرَةِ إِذَا صَلَّى عُرْيَانًا، وَالْعَاجِزِ عَنِ الِاسْتِقْبَالِ إِذَا صَلَّى إِلَى غَيْرِهَا، وَالْعَاجِزِ عَنِ الْقِيَامِ إِذَا صَلَّى جَالِسًا، وَقِيَاسُ أَبِي حَنِيفَةَ عَلَى الْحَائِضِ فِي تَأْخِيرِ الصِّيَامِ لَا يَصِحُّ، لِأَنَّ الصَّوْمَ يَدْخُلُهُ التَّأْخِيرُ، بِخِلَافِ الصَّلَاةِ، بِدَلِيلِ أَنَّ الْمُسَافِرَ يُؤَخِّرُ الصَّوْمَ دُوْنَ الصَّلَاةِ، وَلِأَنَّ عَدَمَ الْمَاءِ لَوْ قَامَ مَقَامَ الْحَيْضِ لَأَسْقَطَ الصَّلَاةَ بِالْكُلِّيَّةِ، وَلِأَنَّ قِيَاسَ الصَّلَاةِ عَلَى الصَّلَاةِ أَوْلٰى مِنْ قِيَاسِهَا عَلَى الصِّيَامِ، وَأَمَّا قِيَاسُ مَالِكٍ فَلَا يَصِحُّ، لِأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ وَقِيَاسُ الطَّهَارَةِ عَلَى سَائِرِ شَرَائِطِ الصَّلَاةِ أَوْلٰى مِنْ قِيَاسِهَا عَلَى الْحَائِضِ، فَإِنَّ الْحَيْضَ أَمْرٌ مُعْتَادٌ يَتَكَرَّرُ عَادَةً، وَالْعَجْزُ هَاهُنَا عُذْرٌ نَادِرٌ غَيْرُ مُعْتَادٍ، فَلَا يَصِحُّ قِيَاسُهُ عَلَى الْحَيْضِ، وَلِأَنَّ هٰذَا عُذْرٌ نَادِرٌ فَلَمْ يُسْقِطِ الْفَرْضَ، كَنِسْيَانِ الصَّلَاةِ وَفَقْدِ سَائِرِ الشُّرُوطِ"۔

ترجمہ: ''اور اگر وضو اور تیمم پر کسی صورت میں قدرت نہ ہو، تو جس حال میں ہو نماز پڑھے اور یہ امام شافعی کا قول ہے اور امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری اور امام اوزاعی نے کہا: جب تک قدرت حاصل نہ ہو نماز نہ پڑھے، پھر قضا کرلے، کیونکہ یہ عبادت ہے اور (عدمِ قدرت) قضا کو ساقط نہیں کرتی، پس اُسی حالت میں ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، جیسے حائض کے لیے رمضان کے روزے (حالتِ حیض میں رکھنا واجب نہیں ہیں)۔ امام مالک نے کہا: نہ اس

حالت میں نماز پڑھے اور نہ قضا کرے، کیونکہ وہ طہارت سے عاجز ہے تو اس پر نماز واجب نہیں ہے، جیسے حائض پر واجب نہیں ہے۔ اور ابن عبدالبر نے کہا: امام مالک سے یہ روایت مُنکر ہے اور اصحابِ مالک سے دو روایتیں ہیں: (۱) امامِ ابوحنیفہ کے قول کے مطابق (کہ اس حالت میں نہ پڑھے جب تک کہ طہارت پر قدرت حاصل نہ ہو جائے، پھر قضا کرے)، (۲) اُسی حالت میں نماز پڑھ لے اور اعادہ کرے۔ امام ابن قدامہ نے کہا: ہماری دلیل امام مسلم کی روایت ہے (نفسِ مسئلہ کے بارے میں صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد کے الفاظ متقارب ہیں)، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ اُن کے اس عمل کو رد کیا اور نہ نماز کا اعادہ کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ حدیثِ (تقریری) دلالت کرتی ہے کہ (ایسی حالت میں پڑھی گئی نماز کا) اعادہ واجب نہیں ہے، کیونکہ طہارت شرط ہے اور عدمِ طہارت کی صورت میں نماز مؤخر نہیں کی جائے گی، جیسے سُترہ کے بغیر یا قبلہ رُخ ہوئے بغیر نماز پڑھ لی تو اس صورت میں نماز کا اعادہ نہیں ہوگا اور جب یہ بات ثابت ہوگئی اور جب اُسی حالت پر نماز پڑھ لی، پھر پانی یا مٹی دستیاب ہو گئے تو دو میں سے ایک روایت کے مطابق نماز کا اعادہ لازم نہیں ہے اور دوسری روایت کے مطابق اعادہ لازم ہے اور یہ امام شافعی کا مذہب ہے، کیونکہ اس نے نماز کی شرط کو نہ پایا، یہ صورت اُس کے مشابہ ہے کہ نجاست کے ساتھ نماز پڑھ لی ہو۔

صحیح پہلی روایت ہے، جیسا کہ ہم نے حدیث بیان کی اور اس لیے بھی کہ اس نے امرِ شرعی پر عمل کیا اور اس سے بری الذمہ ہوگیا، کیونکہ طہارت نماز کی شرائط میں سے ایک شرط ہے تو عجز کی صورت میں ساقط ہو جائے گی، جیسے باقی شرائط اور ارکان ساقط ہو جاتے ہیں اور اس لیے کہ اس نے فرض کو حسبِ حال ادا کیا تو اس پر اعادہ لازم نہیں ہے، جیسے برہنہ نماز پڑھنے والا سترِ عورت سے عاجز ہوتا ہے اور استقبالِ قبلہ (کے تعین) سے عاجز شخص جب غیرِ قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ لے اور قیام سے عاجز شخص جب بیٹھ کر نماز پڑھ لے اور امام ابوحنیفہ کا حائض کے روزوں کو مؤخر کرنے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ روزے

میں (عذر کی بنا پر) تاخیر ہو سکتی ہے بخلاف نماز کے (کہ اس میں تاخیر نہیں ہو سکتی) اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ مسافر روزے کو مؤخر کرلے گا (مگر) نماز کو نہیں کر سکتا اور اس لیے کہ اگر پانی پر عدمِ قدرت حیض کے قائم مقام ہو تو یہ نماز کو بالکلیہ ساقط کر دے گی (کیونکہ حائض سے نماز ساقط ہو جاتی ہے) اور اس لیے بھی کہ نماز کو نماز پر قیاس کرنا روزے پر قیاس کرنے کی نسبت اولیٰ ہے اور امام مالک کا قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو اور طہارت کا نماز کی باقی شرائط پر قیاس کرنا حائض کے روزے پر قیاس کرنے سے اولیٰ ہے، کیونکہ حیض خواتین کے لیے ایک عادتِ جاریہ (Routine Matter) ہے اور اپنے مقررہ وقت پر اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے اور عجز وہاں عذر بنتا ہے جہاں امرِ غیر معتاد ہو، لہٰذا حائض کے روزے پر اس کا قیاس کرنا درست نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ یہ عذرِ نادر ہے، لہٰذا فرض کو ساقط نہیں کرے گا، جیسے نماز کی ادائی کو بھول جانا اور باقی شرائط کا فقدان''۔

(المغنی، ج:۱،ص:۱۸۴)

نماز کی ادائیگی کو بھول جانے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے:

(1) ''مَنْ نَسِیَ الصَّلَاۃَ فَلْیُصَلِّھَا إِذَا ذَکَرَھَا''، ترجمہ: ''جب کوئی (وقت پر) نماز پڑھنا بھول جائے تو جوں ہی یاد آئے پڑھ لے، (صحیح مسلم:680)''۔

(2) ''عَنْ أَبِي قَتَادَۃَ، قَالَ: ذَکَرُوا لِلنَّبِيِّ ﷺ نَوْمَھُمْ عَنِ الصَّلَاۃِ، فَقَالَ: إِنَّہُ لَیْسَ فِي النَّوْمِ تَفْرِیطٌ، إِنَّمَا التَّفْرِیطُ فِي الْیَقَظَۃِ، فَإِذَا نَسِيَ أَحَدُکُمْ صَلَاۃً أَوْ نَامَ عَنْھَا، فَلْیُصَلِّھَا إِذَا ذَکَرَھَا''۔

ترجمہ: ''ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کی: (بعض اوقات) سوتے ہوئے نماز رہ جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تفریط (کوتاہی) سونے میں نہیں ہے، کوتاہی جاگتے ہوئے (نماز کو ترک کرنے میں) ہے، پس جب تم میں سے کوئی نماز کو بھول جائے یا سوتا رہ جائے، تو جوں ہی یاد آئے نماز پڑھ لے، (سنن ترمذی:177)''۔

علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بِأَنْ حُبِسَ فِي مَكَانٍ نَجِسٍ وَلَا يُمْكِنُهُ إِخْرَاجُ تُرَابٍ مُطَهِّرٍ، وَكَذَا الْعَاجِزُ عَنْهُمَا لِمَرَضٍ''۔

ترجمہ: ''کسی کو ناپاک جگہ میں بند کیا جائے کہ اس کے لیے پاک مٹی نکالنا ممکن نہ ہو، اسی طرح اگر مرض کی وجہ سے وہ پانی اور مٹی کے استعمال پر قادر نہ ہو (تو یہ دونوں فاقد الطہورین کی صورتیں ہیں)، (الدُّرُّ المختار، ج:1، ص:252)''۔ ''فَقْدُ الطَّهُوْرَيْنِ'' کے معنی ہیں: ''پاک کرنے والی دو چیزوں یعنی پانی اور پاک مٹی کا دستیاب نہ ہونا''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی ''فَقْدُ الطَّهُوْرَيْنِ'' کی صورتیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''كَأَنْ حُبِسَ فِي مَكَانٍ لَيْسَ فِيهِ وَاحِدٌ مِنْهُمَا أَوْ فِي مَوْضِعٍ نَجِسٍ لَا يُمْكِنُهُ إِخْرَاجُ تُرَابٍ مُطَهِّرٍ أَوْ كَانَ وَجَدَ مَاءً هُوَ مُحْتَاجٌ إِلَيْهِ لِنَحْوِ عَطَشٍ أَوْ وَجَدَ تُرَابًا نَدِيًّا وَلَمْ يَقْدِرْ عَلَى تَجْفِيفِهِ بِنَحْوِ نَارٍ وَمِثْلُهُ الْمَصْلُوبُ وَرَاكِبُ سَفِينَةٍ لَا يَصِلُ إِلَى الْمَاءِ''۔

ترجمہ: ''(۱) کسی کو ایسی جگہ میں قید کیا جائے کہ وہاں پانی اور مٹی دونوں میسر نہ ہوں، (۲) کسی کو کسی نجس مکان میں قید کیا جائے کہ وہ پاک مٹی کے اخراج پر قادر نہ ہو، (۳) پانی ہے، لیکن پیاس بجھانے کے لیے کفایت کرتا ہے، گیلی مٹی ہو اور اسے خشک کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، جیسے: آگ پر گرم کر کے خشک کرنا وغیرہ، (۴) کسی کو سولی پر لٹکایا جائے کہ جس کی وجہ سے وہ طہارت پر قادر نہ ہو، (۵) کوئی شخص کشتی میں سوار ہو اور سمندر کا پانی اس کی دسترس میں نہ ہو، (اَلْفِقْهُ الْإِسْلَامِيُّ وَأَدِلَّتُهُ، ج:1، ص:606)''۔

ایسے شخص پر وجوب وعدمِ وجوب صلوٰۃ کے بارے میں اختلاف ہے، فقہائے کرام کے اس مسئلے میں مختلف مذاہب ہیں:

(۱) ''امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: ایسے شخص پر طہارت کے بغیر نماز ادا کرنا واجب ہے، بعد میں اعادہ واجب نہیں ہے، (۲) امام مالک فرماتے ہیں: ایسے شخص پر نماز معاف ہے، اُس سے ادا اور قضا دونوں ساقط ہیں، (۳) امام شافعی فرماتے ہیں: ایسے شخص پر ادا اور قضا

دونوں واجب ہیں، (۴) امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ایسے شخص پر وقت کے اندر تشبُّہ بالمصلّین واجب ہے، لیکن تشبُّہ کی صورت میں نہ نماز کی نیت کرے گا، نہ قراءت کرے گا اور طہارت پر قادر ہونے کے بعد نماز کا اعادہ کرے گا، ''تَشَبُّہُ بِالصَّلٰوۃِ'' سے مراد یہ ہے کہ نمازی جیسی حرکات کرے، جیسے قیام، قراءت کے لیے ہونٹوں کو ہلانا، رکوع وسجود اور تشہد وغیرہ، (۵) امام ابو حنیفہ کا مفتیٰ بہ مذہب وہی ہے جو کہ صاحبین کا ہے''۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:1،ص:609-606)

ہمارے علماء نے صاحبین کے مذہب کو ترجیح دی ہے، کیونکہ شریعت میں اس کی نظیریں موجود ہیں، جیسے: (۱) تَشَبُّہُ بِالصَّائِمِیْن، یعنی رمضان کے مہینے میں اگر حیض ونفاس والی عورت دن کے کسی حصے میں پاک ہوجائے یا مسافر مقیم ہوجائے یا نابالغ، بالغ ہوجائے یا کوئی کافر مسلمان ہوجائے، تو دن کے باقی حصے میں وہ روزے کے مُنافی افعال (جیسے کھانا پینا وغیرہ) سے اجتناب کرے گا، (۲) تَشَبُّہُ بِالْحُجَّاج: اسی طرح اگر کسی کا حج رکنِ اعظم ادا نہ کرنے کے سبب فوت ہوجائے تو وہ دوسرے حجاج کی طرح حج کے افعال ادا کرتا رہے گا، لیکن بعد میں اس حج کی قضا کرے گا۔

ہمارے شیخ الحدیث علامہ احمد علی سعیدی اپنی زیرِ تصنیف ''شرح سنن ابی داؤد'' میں لکھتے ہیں:

''اس مسئلے میں امام احمد بن حنبل کے مذہب کو ترجیح دینا اولیٰ ہے، کیونکہ نماز کے مسائل کو نماز کے مسائل پر ہی قیاس کرنا چاہیے، طہارت کی طرح استقبال قبلہ بھی نماز کی شرائط میں سے ہے، لیکن ہمارے فقہائے کرام فرماتے ہیں: ''جو شخص کسی عذر کی بنا پر استقبال قبلہ سے عاجز ہو، وہ جس سمت پر نماز پڑھنے پر قادر ہو، اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا اور بعد میں اس پر اعادہ نہیں ہے، (درمختار مع ردالمحتار، ج:1،ص:290)''۔

اسی طرح سترِ عورت بھی نماز کی شرائط میں سے ہے، لیکن اگر کسی نمازی کے پاس سترِ عورت کے لیے کپڑے نہ ہوں تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ بغیر کپڑوں کے بیٹھ کر

اشارے سے نماز پڑھے گا، اگر اس کے کپڑے کسی نے غصب نہیں کیے تھے تو بالاتفاق وہ نماز کا اعادہ نہیں کرے گا، (البحر الرائق، ج:1،ص:275)''، نماز کے انہی مسائل پر قیاس کرتے ہوئے فاقد الطہورین کی نماز بھی بغیر طہارت کے جائز ہونی چاہیے اور اس پر اعادہ واجب نہیں ہے''۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے یہ موقف اختیار کیا کہ نماز کو نماز پر قیاس کرنا چاہیے، نہ کہ روزوں پر کہ حائض کی ایامِ حیض کی نمازیں معاف ہیں، جبکہ حائض پر ایامِ حیض کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا واجب ہے۔ لیکن مذکورہ بالا سطور میں یہ درج کیا جاچکا ہے کہ ''فَاقِدُ الطَّهُورَین'' کی صورت میں صاحبین اور امام ابوحنیفہ کا مختار مذہب یہی ہے کہ نماز کی قضا واجب ہوگی، ہمارے نزدیک یہی قابلِ ترجیح ہے۔

ہمارے استاذِ حدیث علامہ محمد عبداللہ ضیائی نے بھی اس مسئلے پر تفصیلی بحث لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

شیخ ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ ہجری لکھتے ہیں:

''وہ شخص جو وضو اور تیمم کرنے پر قادر نہ ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو وہ اُسی حال میں نماز پڑھے گا، اس کی نماز جائز ہوگی، وہ نماز کا اعادہ نہیں کرے گا، خواہ وہ وقت کے اندر پانی پر قادر ہو جائے یا وقت کے بعد، اس کی دلیل یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(1) ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ''، ترجمہ: ''تم جتنی استطاعت رکھتے ہو، اتنا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، (التغابن:16)''۔

(2) ''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا''، ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، (البقرہ:286)''۔

(3) ''وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ''، ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے وہ چیزیں تمہارے لیے تفصیل سے بیان کردی ہیں جو اُس نے تم پر حرام کی ہیں، اِلَّا یہ کہ تم اس کی طرف مجبور ہو جاؤ، (الانعام:119)''۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِاَمْرٍ فَافْعَلُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ''، ترجمہ: ''جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اُسے حسبِ استطاعت کرو''۔

مذکورہ بالا نصوص کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ہماری استطاعت اور طاقت کے بقدر احکامِ شرعیہ کا مکلف بنایا ہے، لہٰذا ہم پر اپنی استطاعت اور قوت کے بقدر شریعت کے احکام کی پابندی لازم اور ضروری ہے اور جو حکم ہماری استطاعت اور قدرت سے باہر ہے، ہم اس کے مکلف نہیں ہیں اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بغیر طہارت کے نماز پڑھنے کو حرام کر دیا ہے، اِلَّا یہ کہ ہم طہارت کی استطاعت اور قدرت نہ رکھیں اور وہ شخص جو پانی سے وضو کرنے یا مٹی سے تیمم کرنے پر قادر نہیں ہے، وہ نماز کے لیے طہارت کو ترک کرنے پر مجبور ہے، لہٰذا ایسے شخص پر سے طہارت کے بغیر نماز پڑھنے کی حرمت ساقط ہے اور چونکہ وہ نماز پڑھنے پر قادر ہے، لہٰذا اس پر نماز کی ادائیگی واجب ہوگی اور وہ اس حال میں نماز پڑھے گا تو وہ اُسی طرح نماز پڑھنے والا کہلائے جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نماز پڑھنے والا کہلایا تو پھر نہ تو اس پر کوئی گناہ ہے اور نہ نماز کا اعادہ واجب ہے۔

وہ علماء جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ایسا شخص نماز نہیں پڑھے گا تو انہوں نے اس بات سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے وضو شخص کی نماز قبول نہیں کی جاتی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں فرماتا۔

شیخ ابن حزم لکھتے ہیں:

''اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے اُن چیزوں کو ساقط نہ کیا ہوتا جن پر ہم قادر نہیں ہیں اور اُن چیزوں کو باقی نہ رکھا ہوتا جن پر ہم قادر ہیں، تو یہ قول تمام اقوال کے مقابلے میں صحیح ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم سے اُن چیزوں کو ساقط کر دیا ہے جو ہماری استطاعت میں نہیں ہیں اور اُن چیزوں کا ہمیں مکلف بنایا ہے جن کی ہم استطاعت رکھتے ہیں، اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فرمایا کہ بغیر طہارت کے نماز قبول نہیں کی جاتی، یہ حکم اس

شخص کے لیے ہوگا جو وضو یا تیمم کر کے طہارت حاصل کرنے پر قادر ہو، نہ کہ اُس شخص کے لیے جو ان دونوں چیزوں پر قادر نہ ہو۔

نیز اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح وصریح حدیث بھی مروی ہے، وہ بیان فرماتی ہیں:

''عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: بَعَثَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم أُسَيْدَ بْنَ حُضَيْرٍ وَنَاسًا يَطْلُبُوْنَ قِلَادَةً كَانَتْ لِعَائِشَةَ نَسِيَتْهَا فِي مَنْزِلٍ نَزَلَتْهُ، فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ وَلَيْسُوْا عَلٰى وُضُوْءٍ، وَلَمْ يَجِدُوْا مَاءً فَصَلَّوْا بِغَيْرِ وُضُوْءٍ، فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ آيَةَ التَّيَمُّمِ، قَالَ أُسَيْدُ بْنُ حُضَيْرٍ: جَزَاكِ اللهُ خَيْرًا، فَوَاللهِ مَا نَزَلَ بِكِ أَمْرٌ تَكْرَهِيْنَهُ إِلَّا جَعَلَ اللهُ لَكِ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْهِ خَيْرًا''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت اُسید بن حضیر اور دیگر کچھ لوگوں کو اس ہار کی تلاش میں بھیجا جسے وہ ایک پڑاؤ کی جگہ میں بھول گئی تھیں، پس نماز کا وقت ہو گیا اور وہ لوگ وضو کی حالت میں بھی نہیں تھے اور وہ پانی کو بھی نہ پا سکے، پس انہوں نے بے وضو نماز پڑھ لی، پھر انہوں نے اس بات کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کیا تو اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت کو نازل فرما دیا۔ حضرت اسید بن حضیر نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے، جب بھی تمہارے اوپر کوئی ایسی بات آئی ہے جسے تم ناپسند کرتی ہو، تو اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے اور مسلمانوں کے لیے بھلائی رکھ دیتا ہے، (سنن نسائی: ۳۲۳، صحیح البخاری: ۳۳۶، صحیح مسلم: ۳۶۷، سنن ابوداؤد: ۳۱۷، سنن ابن ماجہ: ۵۶۸)''۔

(اَلْمُحَلّٰی بِالْآثَار، رقم المسئلہ: 246، ج: 1، ص: 362)

اس حدیث میں بیان ہے کہ بعض صحابہ کرام نے پانی پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے بغیر وضو کے نماز پڑھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن صحابہ کرام کا یہ نظریہ تھا کہ جو شخص طہارت پر قادر نہ ہو تو وہ بغیر طہارت کے نماز پڑھ سکتا ہے اور یہ اُس وقت کی بات تھی جب تیمم کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، گویا کہ اس وقت تیمم کا مشروع نہ ہونا اسی طرح تھا جس طرح تیمم کے

شروع ہونے کے بعد پاک مٹی کا مفقود ہونا اور پھر جب انہوں نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ذکر فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، لہٰذا اگر یہ ممنوع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور صحابہ کرام پر انکار فرماتے، نیز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں نماز دہرانے کا حکم بھی نہیں دیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فاقد الطہورین پر نماز کا اعادہ بھی لازم نہیں ہے۔

علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی ٹھٹوی سندھی متوفی ۱۱۳۸ ہجری لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اُسے حسبِ استطاعت کرو"، اس حدیث کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص فاقد الطہورین ہو، وہ نماز پڑھنے پر تو قادر ہوتا ہے، البتہ طہارت کے حصول پر قادر نہیں ہوتا، لہٰذا جس چیز کی وہ استطاعت رکھتا ہے اس کی بجا آوری اس پر لازم ہوگی اور جس چیز کی وہ استطاعت نہیں رکھتا، وہ اس سے ساقط ہوگی اور طہارت کی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے نماز ساقط نہیں ہوگی، کیونکہ وہ نماز کی استطاعت رکھتا ہے، اِلَّا یہ کہ اس پر کوئی دلیل موجود ہو اور یہی بات قیاس اور اصول کے موافق ہے، کیونکہ شرط کی تکلیف کے ساقط ہونے کو مشروط کی تکلیف کا ساقط ہونا لازم نہیں ہے، مثلاً وہ شخص جو اتنی مقدار کپڑوں پر بھی قادر نہ ہو جو اُس کے ستر کو چھپادے یا اس کے پاس کپڑے موجود ہوں لیکن وہ ناپاک ہوں یا جگہ ناپاک ہو، تو ان امور کی وجہ سے اس پر سے نہ تو نماز کی ادائیگی ساقط ہوتی ہے اور نہ مؤخر، بلکہ ایسے شخص پر اسی حال میں نماز فرض ہوتی ہے اور اس پر اعادہ بھی لازم نہیں ہوتا، لہٰذا یہی حکم طہارت کا بھی ہوگا۔

اور شرط تو اپنی جگہ رہی، ایک رکن کی ادائیگی کا متعذر ہونا باقی ارکان کی ادائیگی کے لزوم کو ساقط نہیں کرتا، لہٰذا شرط کس طرح ساقط کرسکتی ہے، مثلاً: جس شخص کے اعضاء وضو میں سے کوئی عضو کٹا ہوا ہو تو اس پر باقی اعضا کو دھونا فرض ہے اور اس سے وضو ساقط نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو شخص نماز میں قراءت کرنے سے عاجز آجائے یا قیام سے عاجز آجائے تو اس سے قراءت اور قیام تو ساقط ہوجاتے ہیں، البتہ باقی ارکان کی ادائیگی ساقط نہیں ہوتی۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض صورتوں میں طہارت کی شرط بھی ساقط ہوجاتی ہے، مثلاً:

جس شخص کو پیشاب کے قطرے آنے یا ہوا کے خارج ہونے کا عذر ہو تو ایسے شخص پر اسی حال میں نماز پڑھنا فرض ہے اور اس پر نماز کا اعادہ لازم نہیں ہے، لہٰذا اسی طرح جو شخص فاقد الطہورین ہو، وہ بھی اسی حال میں بغیر طہارت کے نماز پڑھے گا اور اس پر نماز کی قضا لازم نہیں ہوگی، (حاشیہ سنن نسائی، ج:1، ص:172)"۔

راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ شیخ ابن حزم اور علامہ سندھی نے اس مسئلہ کے متعلق جو تحقیق فرمائی ہے، یہ نقلی و عقلی دونوں قسم کے دلائل سے مزین ہے اور باقی اقوال کے مقابلے میں دلائل کے اعتبار سے مضبوط اور قوی ہے، (شرح جامع ترمذی، ج:1، ص:58-56)"۔

## مسافر پر جمعہ فرض نہیں ہے

**سوال:**

مسافر کے لیے نماز جمعہ کا کیا حکم ہے؟ اور اگر وہ نماز جمعہ ادا کرنا چاہے تو وہ کتنی رکعت ادا کرے گا، اگر اس کو جماعت ملے تو کتنی رکعت ادا کرے اور اگر جماعت نہ مل سکے تو پھر کیسے نماز ادا کرے گا۔ (ایچ۔اے، لاہور)

**جواب:**

مسافر پر جمعہ کی نماز فرض نہیں، علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر لکھتے ہیں:

"وَلَا تَجِبُ الْجُمُعَةُ عَلٰی مُسَافِرٍ"۔

ترجمہ: "مسافر پر نمازِ جمعہ واجب نہیں ہے، (ہدایہ، جلد 1، ص:377)"۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اَلْقَرَوِیُّ إِذَا دَخَلَ الْمِصْرَ یَوْمَهَا وَ نَوٰی اَنْ یَّمْکُثَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ لَزِمَتْهُ الْجُمُعَةُ، لِاَنَّهٗ صَارَ کَوَاحِدٍ مِّنْ أَهْلِ الْمِصْرِ فِی حَقِّ هٰذَا الْیَوْمِ وَإِنْ نَوٰی أَنْ یَّخْرُجَ فِیْ یَوْمِهٖ ذٰلِكَ قَبْلَ دُخُوْلِ الْوَقْتِ أَوْ بَعْدَ الدُّخُوْلِ لَا جُمُعَةَ عَلَیْهِ وَلَوْ صَلّٰی مَعَ ذٰلِكَ کَانَ مَاجُوْرًا، کَذَا فِیْ "فَتَاوٰی قَاضِیْ خَان" وَ "التَّجْنِیْس" وَ "الْمُحِیْط"۔

ترجمہ: "گاؤں کا رہنے والا شہر میں آیا اور جمعہ کے دن یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے، تو اس پر

جمعہ فرض ہے، اس لیے کہ وہ اُس دن کے اعتبار سے وہ اہل شہر میں سے ہو گیا اور اگر اسی دن جمع کا وقت داخل ہونے سے پہلے واپسی کا ارادہ ہو، (یعنی زوال سے پہلے یا زوال کے بعد) تو اس پر جمعہ فرض نہیں ہے، لیکن اگر پڑھے گا تو ثواب پائے گا، "فتاویٰ قاضی خان، تجنیس اور محیط" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:145)"۔

مسافر کے لیے شہر میں ہوتے ہوئے جمعہ کی نماز ادا کرنا افضل ہے، جماعت کے ساتھ شامل ہو کر پوری نماز ادا کرے اور اگر فوری سفر درپیش نہ ہو تو پہلے اور بعد کی سنتیں بھی پڑھ لے، تاہم اگر وہ جمعہ کی نماز کے لیے حاضر نہ ہو اور اپنی قیام گاہ میں ظہر کی نماز قصر (دو رکعات) ادا کر لے تو شرعاً اسے اس کی اجازت ہے۔ قصر کا حکم صرف ظہر، عصر اور عشاء کی فرض نمازوں میں ہے، ان کے علاوہ بقیہ نمازوں میں قصر نہیں ہے، مسافر پر جمعہ واجب نہ ہونے کے باوجود اگر اس نے ادا کر لیا تو نمازِ ظہر اس سے ساقط ہو جائے گی۔

## قصر نماز کا مسئلہ

**سوال:**

عبداللہ اپنی بیوی کے ساتھ برطانیہ منتقل ہو گیا، بچے وہیں پیدا ہوئے۔ اس دوران عبداللہ پاکستان اپنے والدین سے ملنے آتا رہا، اب عبداللہ والدین کے انتقال کے بعد پاکستان منتقل ہو گیا ہے۔ عبداللہ کے بیٹے جن کی پیدائش برطانیہ میں ہوئی، جب پاکستان اپنے والد کے پاس آئیں گے تو نماز پوری پڑھیں گے یا قصر؟ (محمد کمال الدین، گجرات)۔

**جواب:**

ایسا بالغ شخص جس کے والدین کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور وہ شہر اُس شخص کی جائے پیدائش نہیں اور نہ ہی اس کے بیوی بچے وہاں ہوں، تو وہ اس کے لیے وطن اصلی نہیں ہوگا، لہٰذا وہاں اگر پندرہ دن سے کم قیام کا ارادہ ہو تو نماز قصر کرے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فَلَوْ كَانَ لَهُ أَبَوَانِ بِبَلَدٍ غَيْرِ مَوْلِدِهِ وَهُوَ بَالِغٌ وَلَمْ يَتَأَهَّلْ بِهِ فَلَيْسَ ذٰلِكَ وَطَنًا لَهُ إِلَّا

إِذَا عَزَمَ عَلَى الْقَرَارِ فِيْهِ وَتَرَكَ الْوَطَنَ الَّذِىْ كَانَ لَهٗ قَبْلَهٗ ''شَرْحُ الْمُنْيَةِ''۔

ترجمہ: ''اگر اس کے والدین ایسے شہر میں ہوں، جہاں اس کی پیدائش نہیں ہوئی اور وہ بالغ ہے اور اس کی وہاں شادی نہیں ہوئی تو وہ اس کا وطنِ اصلی نہیں ہوگا، مگر جب وہ اس میں سکونت اختیار کرلے اور اس وطن کو ترک کرنے کا عزم کرے جہاں وہ پہلے رہائش پذیر تھا، بحوالہ: ''شرح المنیہ''، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4،ص:648، دمشق)''۔

صورتِ مسئولہ میں عبداللہ کے بیٹے پاکستان میں پندرہ دن سے کم ٹھہرتے ہیں تو نماز قصر کریں گے اور امام کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنے کی صورت میں نماز مکمل پڑھیں گے۔

# مساجد کے مسائل

# امام مسجد کا مشاہرہ اور دیگر مصارف

**سوال:**

امریکہ اور یو۔کے میں ہر ملازم کو ٹیکس دینا پڑتا ہے، یہاں مساجد میں امامت و خطابت کے لیے بیرون ملک سے علماء بلائے جاتے ہیں، ان کے لیگل ویزا لگنے میں وقت اور اخراجات کافی لگتے ہیں۔ معلوم یہ کرنا ہے:

1۔ اگر مسجد فنڈ سے امام کے ویزا اور لیگل کارروائی کا خرچہ دیا جائے جبکہ یہ بات پہلے سے طے ہوئی ہو تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟۔

2۔ مسجد انتظامیہ اور امام صاحب کے درمیان یہ طے پایا کہ تنخواہ کے ساتھ جو سال بھر کا ٹیکس بنتا ہے، وہ بھی مسجد انتظامیہ ادا کرے گی، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟۔

3۔ مُتولیٔ مسجد نے کہا: ہم بھی مسجد کی بہت ڈیوٹی کرتے ہیں، تو کیا ہم اپنے بل مسجد کے فنڈ سے لے لیں؟، ان کا امام پر ایسا قیاس کرنا کیسا ہے۔

(علامہ مدثر حسین قادری، نیو یارک، امریکہ)

**جواب:**

مساجد کے عطیات کا ایک بڑا حصہ صدقاتِ نافلہ سے ہوتا ہے یا مسجد پر وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی سے۔ مساجد کے عطیات میں یہ امر معروف ہے کہ یہ مسجد کے مصارفِ جاریہ کے لیے ہیں۔ اُن مصارفِ جاریہ میں مسجد کی تعمیر و مرمت، توسیع، مسجد کے یوٹیلیٹی بلز (بجلی، گیس اور پانی وغیرہ کے)، ضرورت کے وقت رنگ و روغن، دریاں، قالین، ٹیوب لائٹس، پنکھے، پانی و سیوریج کا نظام، عملے کی تنخواہ اور دیگر مصارف شامل ہوتے ہیں۔ اگر مسجد انتظامیہ نے بیرونِ ملک سے آنے والے مسجد کے امام کے لیے شرائطِ ملازمت طے کر رکھی ہیں، جن میں اُن کی ویزا فیس اور ویزے کے حصول کے لیے قانونی کارروائی کے اخراجات وغیرہ شامل ہیں اور مسجد فنڈ میں گنجائش بھی موجود ہے اور عطیات دینے

والوں پر بھی یہ مقاصد واضح ہیں، تو جائز ہے۔

اگر مسجد انتظامیہ نے امام کے ساتھ اجارہ کرتے وقت امام کو ادا کردہ مشاہرے پر سرکاری ٹیکس کی ادائیگی اپنے ذمے لی ہے، تو مسجد فنڈ سے اس کا ادا کرنا جائز ہے، اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ ٹیکس کے مساوی رقم امام کی تنخواہ میں شامل کرلی جائے اور امام خود اپنا ٹیکس ادا کرے اور دوسری یہ کہ مسجد انتظامیہ براہِ راست خود ٹیکس ادا کرے، جیسا کہ بعض کمپنیوں میں مجموعی تنخواہ (Gross Salary) اور ادا کردہ تنخواہ (Taken Home Salary) میں فرق ہوتا ہے، بہت سے ادارے اپنے ملازمین کے مشاہروں سے ٹیکس وضع کر کے اسے حکومت کے خزانے میں جمع کراتے ہیں۔ انتظامیہ اپنے صوابدیدی اختیارات سے اضافہ کرسکتی ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''تَجُوْزُ الزِّیَادَةُ مِنَ الْقَاضِیْ عَلٰی مَعْلُوْمِ الْإِمَامِ إِذَا کَانَ لَا یَکْفِیْهِ وَکَانَ عَالِمًا تَقِیًّا''۔

ترجمہ: ''وقف سے امام کی جو تنخواہ مقرر ہے، اگر وہ ناکافی ہے اور امام متقی عالم ہے، تو قاضی اس میں اضافہ کرسکتا ہے، (جلد 13، ص: 659، دمشق)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اوقاف سے جو ماہوار وظائف مقرر ہوتے ہیں، یہ من وجہ اُجرت ہے اور من وجہ صلہ، اُجرت تو یوں ہے کہ امام و موذن کی اگر اثنائے سال میں وفات ہوجائے تو جتنے دن کام کیا ہے، اُس کی تنخواہ ملے گی اور محض صلہ ہوتا تو نہ ملتی اور اگر پیشگی تنخواہ ان کو دی جاچکی ہے، بعد میں انتقال ہوگیا یا معزول کردیے گئے تو جو کچھ پہلے دے چکے ہیں، وہ واپس نہیں ہوگا اور محض اُجرت ہوتی تو واپس ہوتی، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص: 545)''۔

مُتولی نے اگر اپنی ذاتی آمدنی سے وقف قائم کیا ہے اور اس کی آمدنی کے ذرائع بھی اسی نے قائم کیے ہیں اور وقف کرتے وقت یہ شرط لگائی تھی کہ وہ اپنے مصارف (جو بھی اس نے طے کیے ہوں) وقف کی آمدنی سے وصول کرے گا تو وہ ایسا کرسکتا ہے، البتہ اگر عوام کے چندے اور عطیات سے مسجد کے مصارف چلتے ہیں تو اُن سے اِس کی عمومی اجازت لینا

ضروری ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔ وقف کرنے والے کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ وہ مصارفِ وقف کا تعیّن کرے اور اس سلسلے میں اسلامی فقہ کا مسلّمہ اصول ہے: ''شَرْطُ الْوَاقِفِ کَنَصِّ الشَّارِعِ''، ''یعنی واقف کی مقررہ شرائط شارع کی نَص کی طرح شرعاً موثر ہوتی ہیں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 13، ص: 651، دمشق)''۔

## مسجد کے سامان کا حکم

**سوال:**

مسجد کے پنکھے، چٹائیاں، ٹوپیاں وغیرہ کسی دوسری جگہ لے جاکر استعمال کرنا کیسا ہے، اگرچہ پھر لاکر واپس رکھ دی جائیں؟۔ جو چیز مسجد میں دے دی جائے، تو یہ وقف ہے، وقف کا کیا حکم ہے؟، (سجاد علی، کراچی)۔

**جواب:**

''وَقْف لِلّٰہ'' کے شرعی معنیٰ ہیں: کسی چیز کو اپنی مِلک سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی مِلک کردینا، مساجد اور اوقاف کی ہر شے انسانوں کی ملکیت سے نکل کر خالص اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوجاتی ہے اور جب وقف ہوتا ہے تو وقف کرنے والا اپنی ملکیت سے نکال کر رضائے الٰہی کے لیے مصارفِ متعینہ میں صرف کرنے کے لیے اللہ کے سپرد کردیتا ہے، تو پھر وقف کی کسی چیز کو کوئی شخص اپنے ذاتی استعمال میں نہیں لاسکتا اور متولی یا کمیٹی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ وقف کی کسی چیز کو اپنے ذاتی کام میں استعمال کریں یا کسی کو استعمال کرنے کی اجازت دیں، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مُتَوَلِّی الْمَسْجِدِ لَیْسَ لَہٗ اَنْ یَّحْمِلَ سِرَاجَ الْمَسْجِدِ اِلٰی بَیْتِہٖ''۔

ترجمہ: ''مسجد کے متولی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مسجد کا چراغ اپنے گھر لے جائے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 462)''۔ لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ مُتولی کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر مسجد کی اشیاء پنکھے، چٹائیاں وغیرہ اپنے گھر لے کر جائے اور اپنے ذاتی استعمال میں لائے، مسجد کی انتظامیہ کو مسجد کے سامان کی نگرانی کرنی چاہیے۔

# مسجد میں محرابی دیوار پر شیشے لگانا

## سوال:

ہماری مسجد میں سامنے کی جانب جو کھڑکیاں ہیں، اُن کے شیشے میں انتہائی واضح عکس نظر آتا ہے، جیسے آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں۔ اکثر نمازیوں کا کہنا ہے کہ عکس کی وجہ سے ہماری نماز نہیں ہوتی، شرعی حکم بیان فرمائیں۔

(ڈاکٹر طارق چغتائی، صدر: جامع مسجد غفران، کراچی)

## جواب:

نمازی کے سامنے شیشے کے دروازے یا کھڑکیاں ہوں تو نماز تو ہو جائے گی، البتہ اگر شیشے کی وجہ سے نمازی کی نماز میں خلل ہوتا ہو اور نمازی کی توجہ اس جانب جاتی ہو، تو نماز مکروہِ تنزیہی ہوگی یعنی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں، ان شیشوں میں جو عکس نظر آتا ہے، اس کا حکم تصویر کا نہیں ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے قبلہ کی جانب دیوار اور محراب میں نقش ونگار کو مکروہ فرمایا، سبب یہ ہے کہ نمازی کا دھیان بٹے گا، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَکَرِہَ بَعْضُ مَشَایِخِنَا النَّقْشَ عَلَی الْمِحْرَابِ وَحَائِطِ الْقِبْلَۃِ لِاَنَّ ذٰلِکَ یَشْغَلُ قَلْبَ الْمُصَلِّیْ''۔

ترجمہ: ''ہمارے بعض مشایخ نے محراب اور قبلہ کی جانب دیوار پر نقش کو مکروہ جانا ہے کیونکہ یہ نمازی کے دل کو غافل کرتا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد5، ص:319)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَابَأْسَ بِنَقْشِہٖ خَلَا مِحْرَابِہٖ فَإِنَّہٗ یُکْرَہُ لِاَنَّہٗ یُلْھِی الْمُصَلِّیْ وَیُکْرَہُ التَّکَلُّفُ بِدَقَائِقِ النُّقُوْشِ وَنَحْوِھَا خُصُوْصًا فِیْ جِدَارِ الْقِبْلَۃِ قَالَہُ الْحَلَبِیُّ وَفِیْ حَظْرِ الْمُجْتَبٰی وَقِیْلَ: یُکْرَہُ فِی الْمِحْرَابِ دُوْنَ السَّقْفِ وَالْمُؤَخَّرِ انْتَھٰی وَظَاھِرُہٗ اَنَّ الْمُرَادَ بِالْمِحْرَابِ جِدَارُ الْقِبْلَۃِ فَلْیُحْفَظْ''۔

ترجمہ: ''اور محراب کے علاوہ مسجد میں نقش ونگار بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے، محراب میں نقش ونگار بنانا مکروہ ہے کیونکہ یہ نمازی کو غافل کردیتے ہیں اور باریک بینی پر مشتمل نقش ونگار کا اہتمام کرنا مکروہ ہے، خصوصاً قبلہ کی دیوار میں ایسا کرنا مکروہ ہے، یہ ''حلبی'' کا قول ہے۔ ''المجتبیٰ'' کے باب الحظر میں ہے: ایک قول یہ کیا گیا ہے: محراب میں ایسا کرنا مکروہ ہے، چھت اور پچھلی دیوار پر ایسا کرنا مکروہ نہیں، اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ محراب سے مراد قبلہ کی دیوار ہے، پس اسے یاد رکھا جانا چاہیے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4، ص: 203-202، دمشق)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا: ''جس مکان میں آئینے قد آدم چار طرف لگے ہوں، اُس مکان میں نماز ہوجائے گی یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''آئینہ سامنے ہو تو نماز میں کراہت نہیں کہ سببِ کراہت تصویر ہے اور وہ یہاں موجود نہیں اور اگر اسے تصویر کا حکم دیں تو آئینہ کا رکھنا بھی مثل تصویر ناجائز ہوجائے، حالانکہ بالا جماع جائز ہے اور حقیقت امر یہ ہے کہ وہاں تصویر ہوتی ہی نہیں بلکہ خطوط شعاعی آئینہ کی صقالت (شفافیت) کی وجہ سے لوٹ کر چہرہ پر آتے ہیں، گویا یہ شخص خود اپنے کو دیکھتا ہے نہ یہ کہ آئینہ میں اس کی صورت چھپتی ہو، (فتاویٰ امجدیہ، ج: 1، ص: 184)''۔

مفتی وقار الدین رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا: ''اگر محراب کے اندر شیشے جڑے ہوں اور محراب کی دیوار پر نمازیوں کی تصویر دکھائی دیتی ہوں، تو کیا ایسی صورت میں نماز ہوجاتی ہے یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''محراب یا قبلہ کی جانب دیوار میں شیشے اتنی اونچائی پر لگائے جاسکتے ہیں کہ خاشعین (عاجزی کے ساتھ نماز پڑھنے والے) کی نظر رکوع سے اٹھتے اور سجدے میں جاتے وقت، ان پر نہ پڑے اور اگر نیچے لگادیے ہیں تو یہ لگانا ناجائز ہے اور اس وجہ سے نماز میں کراہتِ تنزیہی ہوتی ہے کہ ان پر نظر پڑنے کی وجہ سے خشوع میں فرق آئے گا۔ لیکن آئینہ میں آنے والے عکس کا حکم تصویر کا نہیں ہے، (وقار الفتاویٰ، ج: 2، ص: 73)''۔

مزید ایک سوال ہوا: ''مسجد کے برآمدے میں دروازوں پر شیشے لگے ہوئے ہیں، اس میں

مقتدی اور بعض اوقات امام کی بھی پوری تصویر نظر آتی ہے، اس صورت میں نماز پڑھنا کیسا ہے اور اگر نماز پڑھی جائے تو کیا اسے لوٹانا ضروری ہے یا نہیں؟''، آپ نے جواب میں لکھا: ''نمازیوں کے آگے اتنی اونچائی تک کہ خاشعین کی طرح نماز پڑھنے میں جہاں تک نظر آجاتا ہے، شیشے لگانا یا کوئی ایسی چیز لگانا جس سے نمازی کا دھیان اور التفات ادھر جاتا ہو، مکروہ ہے۔ لہٰذا اتنی اونچائی تک کے شیشے ہٹالینا چاہئیں، ان شیشوں میں اپنی شکل جو نظر آتی ہے، اس کے احکام تصویر کے نہیں، لہٰذا نماز مکروہ تحریمی نہ ہوگی مگر مکروہ تنزیہی ہے، (وقار الفتاویٰ، ج:2، ص:258)''۔ لیکن اگر کوئی خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے اور اس کی نظر حالتِ قیام میں مقامِ سجدہ، حالتِ رکوع میں اپنے قدموں اور حالتِ قعدہ میں اپنی گود پر مرکوز ہو تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا، ہماری کُتبِ فقہ میں آدابِ نماز یہی بتائے گئے ہیں۔

## سرد علاقوں کی مساجد میں نمازیوں کے سامنے گیس ہیٹر کا جواز

**سوال:**

ہمارے علاقے میں سردی شدید ہوتی ہے، برف باری بھی ہوتی ہے، پہلے لوگ مسجد کو گرم رکھنے کے لیے انگیٹھی میں لکڑیاں جلاتے تھے، اب گیس آگئی ہے تو گیس کے ہیٹر جلاتے ہیں، جو قبلے کی جانب والی دیوار میں نمازیوں کے سامنے لٹکا کر یا زمین پر رکھے جاتے ہیں اور نمازی اس جانب سجدہ کرتے ہیں، کیا آتش پرستوں سے مشابہت کی بنا پر اس کی ممانعت ہوگی یا ایسا کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (محمد علی، ایبٹ آباد)

**جواب:**

مجوسی عبادت کے وقت آگ کو تنور یا آتشدان (کانون) میں سامنے رکھتے ہیں، جسے ہماری کُتب فقہ وفتاویٰ میں ''کانون'' سے تعبیر کیا گیا ہے، گیس/بجلی کے ہیٹر سامنے رکھ کر یا دیوار پر لٹکا کر نماز پڑھنے میں مجوسیوں کے ساتھ مشابہت نہیں ہے۔ اگر نمازی کے سامنے آگ جل رہی ہو تب بھی نماز ہو جائے گی، فقط کراہت ہے، لیکن جہاں سردی ناقابل

برداشت ہو، بالخصوص ضعیف اور معمر نمازیوں کے لیے وہاں بر بنائے ضرورت کراہت مرتفع ہوجائے گی۔لیکن مخصوص طریقے سے انتظام کیا گیا ہوتو مکروہ نہیں ہے، مثلاً: ہیٹر وغیرہ۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمَنْ تَوَجَّهَ فِي صَلَاتِهٖ إِلَى تَنُّوْرٍ فِيْهِ نَارٌ تَتَوَقَّدُ أَوْ كَانُوْنٍ فِيْهِ نَارٌ يُكْرَهُ وَلَوْ تَوَجَّهَ إِلَى قِنْدِيْلٍ أَوْ إِلَى سِرَاجٍ لَمْ يُكْرَهْ كَذَا فِي ''مُحِيْطِ السَّرَخْسِيِّ''، وَهُوَ الْأَصَحُّ كَذَا فِي ''خِزَانَةِ الْفَتَاوٰى''۔

ترجمہ:''اور جس شخص نے نماز کے دوران تندور کی طرف رُخ کیا، جس میں آگ بھڑک رہی تھی یا آتشدان کی طرف رخ کیا جس میں آگ تھی، تو یہ مکروہ ہے اور اگر قندیل یا چراغ کی طرف رُخ کیا، تو کراہت نہیں ہے، جیسا کہ ''محیط السرخسی'' میں ہے، یہی قول زیادہ صحیح ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:108)

ہمارے فقہائے کرام نے اس کی بابت یہ ضابطہ بیان کیا ہے کہ آگ کے سامنے نماز پڑھنا صرف اس صورت میں مکروہ ہے، جب آگ اس انداز سے نمازی کے سامنے رکھی ہو جس انداز سے مجوسی لوگ اس کی عبادت کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اگر آگ نمازی کے سامنے مجوسیوں کے عبادت کے انداز سے رکھی ہوئی نہ ہوتو نماز مکروہ نہیں ہوگی۔پس اگر آگ نمازی کے سامنے تنور یا آتشدان میں اس طرح رکھی ہو، جیسے مجوسی رکھتے ہیں تو نماز مکروہ ہوگی ورنہ نہیں۔لہٰذا مساجد یا گھروں میں سردی کی وجہ سے ہیٹر سامنے لگا کر نماز پڑھنا مکروہ نہیں ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ ہیٹر کو سامنے رکھنے کے بجائے دائیں بائیں رکھ لیا جائے، یا سامنے کی دیوار میں ذرا اونچی جگہ پر نصب کرلیا جائے تاکہ اس میں کسی قسم کی کراہت کا شائبہ نہ رہے، اس صورت میں ہیٹر کا رُخ حسبِ ضرورت نیچے کی طرف رکھا جاسکتا ہے۔

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ أَوْ شَمْعٍ أَوْ سِرَاجٍ لِأَنَّهُمَا لَا يُعْبَدَانِ وَالْكَرَاهَةُ بِاعْتِبَارِهَا وَإِنَّمَا يَعْبُدُهَا الْمَجُوْسُ

إِذَا كَانَتْ فِي الْكَانُونِ وَفِيهَا الْجَمْرُ أَوْ فِي التَّنُّورِ فَلَا يُكْرَهُ التَّوَجُّهُ إِلَيْهَا عَلَى غَيْرِ هٰذَا الْوَجْهِ وَذُكِرَ فِي غَايَةِ الْبَيَانِ اخْتِلَافُ الْمَشَايِخِ فِي التَّوَجُّهِ إِلَى الشَّمْعِ أَوِ السِّرَاجِ وَالْمُخْتَارُ أَنَّهُ لَا يُكْرَهُ وَيَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ عَدَمُ الْكَرَاهَةِ مُتَّفَقًا عَلَيْهِ فِيمَا إِذَا كَانَ الشَّمْعُ عَلَى جَانِبَيْهِ كَمَا هُوَ الْمُعْتَادُ فِي مِصْرَ الْمَحْرُوسَةِ فِي لَيَالِي رَمَضَانَ لِلتَّرَاوِيحِ"۔

ترجمہ: "علامہ ابوالبرکات احمد بن محمود نسفی کا یہ قول: "اگر نمازی کے سامنے شمع یا چراغ رکھا ہو تو نماز جائز ہے"، کیونکہ یہ عبادت کی نیت سے نہیں رکھے ہوتے اور کراہت کا حکم اس پر محمول ہے کہ عبادت کی نیت سے رکھے ہوں اور آگ کی عبادت مجوس (آتش پرست) کانون (آتش دان) میں رکھ کر کرتے ہیں اور اس میں چنگاری ہوتی ہے یا تنور میں رکھا جاتا ہے، لہٰذا اس سے ہٹ کر کسی طریقے سے رکھا جائے تو اس میں بالاتفاق کراہت نہیں ہے، جبکہ شمع اطراف میں ہو جیسا کہ رمضان کی راتوں میں مصر میں رکھنے کی عادت ہے، (البحر الرائق، جلد 2، ص:56)"۔ علامہ عثمان بن علی زیلعی نے تبیین الحقائق، جلد 1، ص: 167 میں من وعن یہی مسئلہ لکھا ہے۔

تاہم اگر اس میں کراہت ہونے کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی سردی کے موسم میں ضرورت کی بنا پر اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ فقہائے کرام نے نماز میں چہرہ چھپانے کو مجوسیوں سے مشابہت کی وجہ سے مکروہ بتایا ہے اور بوقتِ ضرورت اس کی اباحت کی گنجائش رکھی ہے۔

علامہ علاء الدین کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَيُكْرَهُ أَنْ يُغَطِّيَ فَاهُ فِي الصَّلَاةِ، لِأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ ذٰلِكَ، وَلِأَنَّ فِي التَّغْطِيَةِ مَنْعًا مِنَ الْقِرَاءَةِ وَالْأَذْكَارِ الْمَشْرُوعَةِ، وَلِأَنَّهُ لَوْ غَطَّى بِيَدِهٖ فَقَدْ تَرَكَ سُنَّةَ الْيَدِ، وَقَدْ قَالَ ﷺ: كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ فِي الصَّلَاةِ وَلَوْ غَطَّاهُ بِثَوْبٍ فَقَدْ تَشَبَّهَ بِالْمَجُوسِ، لِأَنَّهُمْ يَتَلَثَّمُونَ فِي عِبَادَتِهِمُ النَّارَ وَالنَّبِيُّ ﷺ نَهَى عَنِ التَّلَثُّمِ فِي الصَّلَاةِ إِلَّا إِذَا كَانَتِ التَّغْطِيَةُ لِدَفْعِ التَّثَاؤُبِ فَلَا بَأْسَ بِهٖ لِمَا مَرَّ"۔

ترجمہ: ''اور نماز میں منہ کا ڈھانپنا مکروہ ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس لیے کہ منہ ڈھانپنے میں قراءت اور اَذکارِ مشروعہ پڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور اس لیے کہ اگر اپنے ہاتھ سے منہ ڈھانپے گا تو ہاتھ باندھنے کی سنّت ترک ہوگی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اپنے ہاتھوں کو نماز میں روکو اور اگر کپڑے سے ڈھانپے گا تو یہ مجوس سے مشابہ ہے، کیونکہ وہ آگ کی عبادت کرتے وقت منہ کو لپیٹتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز میں منہ لپیٹنے سے منع فرمایا ہے، سوائے اس کے کہ جمائی روکنے کے لیے منہ کو ڈھانپا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ گزرا، (بدائع الصنائع، جلد 1، ص:320)''۔

سوئی گیس کے ہیٹر استعمال کرنے میں یہ احتیاط بھی برتی جائے کہ ہیٹر آن کرنے سے پہلے ہی اگر آگ گیس کی نوزل کے قریب رکھی جائے، تو گیس کی بو نہیں پھیلے گی۔

## خُدّام مسجد کے لیے چندہ

**سوال:**

ہماری مسجد کے امام وخطیب بارہ سال سے امامت فرما رہے ہیں، موجودہ مسجد کمیٹی چار سال پہلے منتخب ہوئی۔ امام صاحب عیدین کی نمازوں میں مسجد کی صفوں میں بطور عیدی یا مسجد کے خادمین کو عمرہ کرانے کے لیے رقم جمع کرتے ہیں، جبکہ خادمین صاحبِ حیثیت ہیں، اُن کا یہ رقم جمع کرنا کیسا ہے اور جمع شدہ رقم کا مصرف کیا ہے؟، نیز مسجد کمیٹی کے اراکین بھی خادمین میں شامل ہیں یا نہیں؟، (جنرل سیکریٹری جامع مسجد خضریٰ، نیو کراچی)۔

**جواب:**

ہمارے ہاں بعض اداروں میں رمضان المبارک اور عید کے موقع پر ملازمین کو بونس یعنی ایک اضافی تنخواہ دینے کا رواج ہے اور بعض مساجد کے منتظمین بھی اپنے عملے کو رمضان وعید کے موقع پر بونس دیتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے، شاید اسی کے پیشِ نظر بعض مساجد میں خادمین یا عملے کے لیے الگ سے چندہ کرنے کا رواج رہا ہے، اس لیے اسے اُس سوال پر محمول نہیں کیا جاسکتا، جس کی احادیثِ مبارکہ میں ممانعت آئی ہے، کیونکہ اس کا مصداق وہ

لوگ ہیں، جو اپنے آپ کو فقیر و مسکین اور مفلس ظاہر کر کے سوال کرتے ہیں، بعض اپنی ہیئت کذائی (وضع قطع) ایسی بناتے ہیں کہ لوگوں کو ان پر ترس آئے اور وہ انہیں کچھ نہ کچھ دیدیں، ان میں سے بعض حقیقی مستحقین بھی ہو سکتے ہیں اور بعض پیشہ ور مانگنے والے ہوتے ہیں۔ تاہم نہ مسجد کے عملے کے لیے جمع کیے جانے والے چندے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، نہ عملے کے لوگ مفلسانہ وضع اختیار کر کے سوال کرتے ہیں، بلکہ وہ اسے ایک طرح سے ملازمت سے حاصل مالی سہولت کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں مساجد میں عملے کی تنخواہیں بالعموم عوام کے چندے سے ہی پوری کی جاتی ہیں اور یہی عرف ہے، پس بہتر یہ ہے کہ مسجد کے عمومی فنڈ سے ہی مسجد کے عملے کو بونس دیا جائے، الگ سے مسجد کے عملے کے لیے جھولی پھیلانا باوقار طریقہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں خیراتی اسپتالوں میں ڈاکٹر صاحبان سمیت تمام عملے (یعنی میڈیکل و پیرا میڈیکل اسٹاف) کو تنخواہیں عوام کے عطیات کی رقم ہی سے دی جاتی ہیں، یہ تاثر درست نہیں کہ ایک شعبے میں ہم ایک شِعار کو درست اور دوسرے شعبے میں نادرست سمجھیں۔

مسجد کی انتظامی کمیٹی، خواہ انجمن ہو یا ٹرسٹ ہو، مسجد کی مُتولی ہوتی ہے اور چندہ دینے والوں کی امین ہوتی ہے، اس لیے اُس کے ارکان کو مسجد کا چندہ اپنے اوپر استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی نے خود مسجد کے لیے زمین وقف کی ہو اور اس میں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ بھی قائم کیا ہو اور وقف کرتے وقت قرار دیا ہو کہ وہ خود مُتولی ہوگا، مسجد کی انتظامی خدمت بجالائے گا اور مسجد کی آمدنی سے معروف طریقے سے اپنی ضروریات کے لیے بھی لے گا، تو یہ جائز ہے، لیکن ایسی صورتیں ہمارے ہاں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ عمرے کے نام پر جھولی پھیلا کر چندہ جمع کرنا درست نہیں ہے، وقار اور عزتِ نفس کے بھی خلاف ہے۔ عمرہ صاحبِ استطاعت کے لیے سنت ہے، اگر کوئی شخص مسجد کے امام یا مؤذن یا خادم کو عمرے پر بھیجنا چاہتا ہے، تو وہ کسی تشہیر کے بغیر ایسا کرے، تشہیر میں ریا کا شائبہ ہوتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تنزُّل کا عالم یہ ہے کہ سیاست دان اور حکمران بیت اللہ شریف

اور روضۂ رسول پر حاضری کی تشہیر ضروری سمجھتے ہیں، اس کی فلمیں بنا کر میڈیا پر دکھائی جاتی ہیں اور بعض مذہبی رہنما بھی ایسا ہی کرتے ہیں، کاش کہ ایسا نہ ہوتا۔

## مسجد میں مانگنے کا رواج

**سوال:**

عموماً نمازِ جمعہ کے اجتماعات میں فرض نماز کا سلام پھیرتے ہی بعض لوگ مختلف صفوں میں بیک وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور روتے گڑگڑاتے ہوئے انتہائی دلسوز آواز میں سوال کرتے ہیں، سلام پھیرتے ہی اچانک یہ آوازیں کسی اُفتاد سے کم محسوس نہیں ہوتیں، اس سے نماز و دعا میں لوگوں کی ذہنی حضوری اور یکسوئی میں خلل واقع ہوتا ہے۔کیا یہ طرزِ عمل جائز ہے اور ایسے گداگروں کو دینا کیسا ہے؟۔

(محمد جہانگیر عالم، سائٹ سپر ہائی وے، انڈسٹریل ایریا، کراچی)

**جواب:**

شریعتِ مطہرہ میں بلاضرورت سوال کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، حدیث پاک میں ہے:

(ا) حضرت قَبیصہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''یَا قَبِیصَةُ! إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَحِلُّ إِلَّا لِأَحَدِ ثَلَاثَةٍ: رَجُلٌ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشٍ أَوْ قَالَ سِدَادًا مِنْ عَيْشٍ وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ حَتّٰى يَقُومَ ثَلَاثَةٌ مِنْ ذَوِي الْحِجَا مِنْ قَوْمِهِ لَقَدْ أَصَابَتْ فُلَانًا فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتّٰى يُصِيبَ قِوَامًا مِنْ عَيْشٍ أَوْ قَالَ سِدَادًا مِنْ عَيْشٍ فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ الْمَسْأَلَةِ يَا قَبِيصَةُ سُحْتًا يَأْكُلُهَا صَاحِبُهَا سُحْتًا''۔

ترجمہ: ''اے قبیصہ! سوال کرنا صرف تین اشخاص کے لیے جائز ہے: ایک وہ شخص جو بارِ قرض تلے دبا ہوا ہو، اس کے لیے اتنی مقدار کا سوال کرنا جائز ہے، جس سے اس کا قرض

ادا ہوجائے، اس کے بعد وہ سوال سے رک جائے، دوسرا وہ شخص جس کا تمام مال کسی آفت کی وجہ سے ضائع ہوگیا ہو، اس کے لیے اس قدر سوال کرنا جائز ہے کہ وہ گزارے کے قابل ہوجائے اور تیسرا وہ شخص جو فاقہ سے ہو اور اس کی قوم میں سے تین عقل مند آدمی یہ گواہی دیں کہ یہ فاقہ سے ہے تو اس کے لیے بھی اتنی مقدار کا سوال کرنا جائز ہے کہ اس کا گزارہ ہوجائے اور اے قبیصہ! ان تین شخصوں کے علاوہ کسی کے لیے سوال کرنا حرام ہے اور ایسا سائل حرام کھاتا ہے، (صحیح مسلم: 1044)"۔

(۲) "عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ سَمِعَ أَبَاهُ يَقُوْلُ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتّٰى يَأْتِيَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص سوال کرتا رہے گا حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہوگا، (صحیح مسلم: 1040)"۔

(۳) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "مَنْ تَكَفَّلَ لِي أَنْ لَّا يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئًا أَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ"۔

ترجمہ: "جو مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں، (الدر المنثور، جلد 2، ص: 94)"۔

مسجد کے قیام کا مقصد باجماعت نماز کو فروغ دینا اور لوگوں کو احکامِ شرعیہ بتانا ہے، اس کے علاوہ جن کاموں کی دین میں منفعت ہو، ان کا مسجد میں کرنا جائز ہے۔

علامہ ابوالحسن علی بن خلف ابن بطال مالکی لکھتے ہیں:

"قَالَ الْمُهَلَّبُ: اَلْمَسْجِدُ مَوْضُوْعٌ لِأَمْرِ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ، فَمَا كَانَ مِنَ الْأَعْمَالِ مِمَّا يَجْمَعُ مَنْفَعَةَ الدِّيْنِ وَأَهْلِهِ، فَهُوَ جَائِزٌ فِي الْمَسْجِدِ"۔

ترجمہ: "مہلب نے کہا: مسجد کو مسلمانوں کی نماز باجماعت کے لیے بنایا گیا ہے اور جن کاموں میں دین اور اہلِ دین کا نفع ہو، اُن کا مسجد میں کرنا جائز ہے"۔ (شرح ابن بطال،

ج:2،ص:104)

مسجد میں اپنی ذات کے لیے سوال کرنا حرام ہے اور ایسے سائل کو دینا منع ہے، درمختار میں ہے: ''وَیَحْرُمُ فِیْهِ السُّؤَالُ، وَیُکْرَہُ الْإِعْطَاءُ مُطْلَقًا''۔

ترجمہ: ''مسجد میں سوال کرنا حرام ہے اور اس کو دینا مطلق منع ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 4،ص:209، دمشق)

تنویر الابصار مع الدّر المختار میں ہے:

''وَلَا یَحِلُّ أَنْ یَسْأَلَ مِنَ الْقُوْتِ مَنْ لَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ بِالْفِعْلِ أَوْ بِالْقُوَّةِ کَالصَّحِیْحِ الْمُکْتَسِبِ وَیَأْثَمُ مُعْطِیْهِ إِنْ عَلِمَ بِحَالِهٖ لِإِعَانَتِهٖ عَلَى الْمُحَرَّمِ وَلَوْ سَأَلَ لِلْکِسْوَةِ أَوْ لِاشْتِغَالِهٖ عَنِ الْکَسْبِ بِالْجِهَادِ أَوْ طَلَبِ الْعِلْمِ جَازَ لَوْ مُحْتَاجًا''۔

ترجمہ: ''اس شخص کے لیے سوال کرنا جائز نہیں ہے، جس کے پاس ایک دن کی خوراک ہو یا وہ تندرست ہے اور محنت کر کے کما سکتا ہے اور اگر کوئی اس کے حال سے واقف ہے اور پھر بھی دیتا ہے، تو وہ بھی گنہگار ہوگا، کیونکہ وہ ایک ممنوع کام پر اس کی مدد کر رہا ہے اور اگر اس کو کپڑے کی ضرورت ہو تو اس کا سوال کرنا جائز ہے یا ایک شخص محتاج ہے، لیکن جہاد میں مشغول ہونے یا علمِ دین حاصل کرنے کے سبب کمانے کے لیے فارغ نہیں ہے، تو اس کا سوال کرنا جائز ہے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 6،ص:124، دمشق)''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ فِی النَّهْرِ: وَالْمُخْتَارُ أَنَّ السَّائِلَ إِنْ کَانَ لَا یَمُرُّ بَیْنَ یَدَیِ الْمُصَلِّیْ وَلَا یَتَخَطَّی الرِّقَابَ وَلَا یَسْأَلُ إِلْحَافًا بَلْ لِأَمْرٍ لَا بُدَّ مِنْهُ فَلَا بَأْسَ بِالسُّؤَالِ وَالْإِعْطَاءِ وَمِثْلُهٗ فِی ''الْبَزَّازِیَّةِ'' وَفِیْهَا وَلَا یَجُوْزُ الْإِعْطَاءُ إِذَا لَمْ یَکُوْنُوْا عَلٰی تِلْکَ الصِّفَةِ الْمَذْکُوْرَةِ قَالَ الْإِمَامُ أَبُوْ نَصْرٍ الْعِیَاضِیُّ: أَرْجُوْ أَنْ یَغْفِرَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِمَنْ یُخْرِجُهُمْ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعَنِ الْإِمَامِ خَلَفِ بْنِ أَیُّوْبَ: لَوْ کُنْتُ قَاضِیًا لَمْ أَقْبَلْ شَهَادَةَ مَنْ یَتَصَدَّقُ عَلَیْهِمْ''۔

ترجمہ: ''''النہر الفائق'' میں ہے: مختار مذہب یہ ہے اگر سائل نمازی کے سامنے سے نہیں

گزرتا اور لوگوں کی گردنیں نہیں پھلانگتا اور گڑگڑا کر سوال نہیں کرتا بلکہ اس امر کے لیے سوال کرتا ہے جس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ ہو، تو اس کے سوال کرنے اور اسے دینے میں کوئی حرج نہیں، اس کی مثل ''فتاویٰ بزازیہ'' میں ہے، لیکن جب سائل اس مذکورہ صفت پر نہ ہو تو دینا جائز نہیں، امام ابونصر العیاضی نے فرمایا: میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا جو ایسے لوگوں کو مسجد سے نکالے، امام خلف بن ایوب سے مروی ہے: اگر میں قاضی ہوتا تو جو آدمی اُن پر صدقہ کرتا ہے، میں اس کی شہادت قبول نہ کرتا۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 5، ص: 91، دمشق)

علامہ ابن بزاز کردری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلْمُتَصَدِّقُ عَلٰی مَسَاکِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اِسْرَافًا وَیَسْاَلُوْنَ اِلْحَافًا مَاجُوْرٌ فِیْهِ اِلَّااِذَا عَلِمَ وَاحِدًا بِعَیْنِهٖ اَنَّهٗ بِهٰذِهِ الصِّفَةِ''۔

ترجمہ: ''جو شخص ایسے مساکین پر صدقہ کرتا ہے، جو کھانے میں اسراف کرتے ہیں اور لوگوں سے گڑگڑا کر مانگتے ہیں، اسے تو اجر ملے گا، مگر جو کسی خاص گداگر کی اصل حالت کو جانتے ہوئے دیتا ہے، تو اسے اجر نہیں ملے گا، (فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ، جلد 6، ص: 357)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا:

''جو لوگ صحت مند اور جواں عمر ہیں، مگر آرام طلب ہیں، محنت سے جی چراتے ہیں اور گداگری کو پیشہ بنالیا ہے، بعض نے چند دینی کتابیں پڑھ کر بزرگوں کا روپ دھار لیا ہے، یہ شہر شہر گھومتے ہیں، معلومات حاصل کر کے کسی بااثر شخص کے در پر جا پہنچتے ہیں اور اسے قائل کرتے ہیں کہ لوگوں سے میری مالی مدد کرائیں، بعض لوگ خود بھی متاثر ہو کر دیدیتے ہیں، تو اُن کی مدد پر لوگوں کو آمادہ کرنے والے کو اس حدیث کے مصداق اجر ملے گا: ''نیکی پر رہنمائی کرنے والا اتنا ہی اجر پائے گا، جتنا نیکی کرنے والے کو ملتا ہے'' یا قرآن کریم کے اس فرمان: ''اور گناہ اور حق سے تجاوز کرنے میں کسی کی مدد نہ کرو'' کے مصداق گنہگار ہوگا، جبکہ ایسے بہروپیوں کی وجہ سے سوال کے اصل حق دار محروم رہ جاتے ہیں، (ملخصاً)''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''ضرورتِ شرعی کے بغیر سوال کرنا حرام ہے اور جو لوگ کسبِ حلال کی طاقت کے باوجود (بلاضرورت) گداگری کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں، اس ذریعے سے حاصل کی گئی ان کی کمائی ناپاک وخبیث ہے اور جو اُن کے حال پر مطلع ہونے کے باوجود دیتے ہیں، یہ ناجائز وگناہ ہے اور گناہ پر مدد کرنا ہے اور جب انھیں دینا ناجائز تو دلانے والا بھی ''دَالٌّ عَلَی الْخَیْرِ'' نہیں بلکہ ''دَالٌّ عَلَی الشَّرِّ'' ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل میں نے اپنے مجموعہ فتاویٰ میں بیان کردی ہے، لیکن اگر سوال کے بغیر کوئی کسی کو کچھ دیدے جیسے لوگ علماء ومشائخ کی خدمت کرتے ہیں تو اس کے لے لینے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ نیت نیک ہو تو دینے اور لینے والے دونوں داخلِ ثواب ہیں، خصوصاً جبکہ لینے والا حاجت رکھتا ہو، حدیث پاک میں ہے:

''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: قَدْ کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یُعْطِیْنِی الْعَطَاءَ، فَأَقُوْلُ: أَعْطِهِ أَفْقَرَ إِلَیْهِ مِنِّی، حَتّٰی أَعْطَانِی مَرَّةً مَالًا، فَقُلْتُ أَعْطِهِ أَفْقَرَ إِلَیْهِ مِنِّی، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خُذْهُ، وَمَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَأَنْتَ غَیْرُ مُشْرِفٍ وَلَا سَائِلٍ فَخُذْهُ، وَمَا لَا، فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھے کچھ مال عطا کرتے، تو میں کہہ دیا کرتا تھا کہ جو مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو، اسے دیدیں، حتیٰ کہ ایک بار آپ نے مجھے کچھ مال دیا، میں نے عرض کی: جو شخص مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو، اسے دیدیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ لے لو اور جو مال تمہارے پاس طمع اور سوال کے بغیر آئے، اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ آئے، اس کا خیال نہ کیا کرو، (صحیح مسلم: 1045)''۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: ''مَا الْمُعْطِیْ مِنْ سَعَةٍ بِأَفْضَلَ مِنَ الْآخِذِ إِذَا کَانَ مُحْتَاجًا، رَوَاهُ الطَّبْرَانِیُّ فِی الْکَبِیْرِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا وَشَاهِدُهٗ عِنْدَهٗ فِی الْأَوْسَطِ کَابْنِ حِبَّانَ فِی الضُّعَفَاءِ مِنْ حَدِیْثِ أَنَسٍ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهُ، وَاللهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ''۔

ترجمہ: ''مالدار دینے والا حاجتمند لینے والے سے افضل نہیں ہے، جبکہ وہ حاجت مند ہو، (اسے طبرانی نے المعجم الکبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا اور اوسط میں ان کے ہاں اس کا شاہد بھی ہے جیسا کہ ابن حبان نے الضعفاء میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے) واللہ تعالیٰ اعلم، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص:303)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم میں ایسے مستحقین کو صدقات دینے کو ترجیح دی ہے، جو فقر وفاقہ اور شدید احتیاج کے عالم میں بھی صبر کرتے ہیں، فرمایا: ''یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ''۔

ترجمہ: ''(ان کے حال سے) ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتا ہے، (اے مخاطب!) تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے، (البقرہ:273)''۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تحسین فرمائی، جو لوگوں سے گڑگڑا کر سوال نہیں کرتے، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو اپنی مبارک ذات سے گڑگڑا کر سوال کرنے کا حکم فرمایا ہے: ''اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ''، ترجمہ: ''اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرو، (الاعراف:55)''۔ ہمارا حال یہ ہے کہ جب ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں، تو ہاتھ اٹھا کر بے توجہی سے سرسری طور پر چند کلمات پڑھ کر اٹھ جاتے ہیں، اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ عموماً رمضان کے مہینے میں لوگ مساجد میں آکر نمازیوں کے سامنے اپنے مصائب بیان کر کے گڑگڑا کر سوال کرتے ہیں اور آنسو بھی بہا لیتے ہیں یا کم از کم رونی صورت بنا لیتے ہیں تا کہ لوگوں کے دل پسیج جائیں اور انہیں کچھ دیدیں، جس عطا کرنے والی ذات کے سامنے گڑگڑانا چاہیے، اس کے سامنے نہیں گڑگڑاتے اور مخلوق کے سامنے روتے ہیں اور گڑگڑاتے ہیں، (تبیان القرآن، ج:12، ص:834)''۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو سائل مسجد میں نمازی کے آگے سے گزرے یا نمازیوں کی گردنیں پھلانگے یا گڑگڑا کر سوال کرے یا اس کے متعلق دینے والے کو معلوم ہو کہ یہ فضول خرچی

کرتا ہے یا اس کو معلوم ہے کہ اس کے پاس ایک دن کی خوراک ہے یا یہ شخص صحت مند ہے اور محنت مزدوری کر کے کما سکتا ہے، اس کے سوال پر اس کو دینا جائز نہیں ہے اور اگر یہ موانع اور عوارض نہ پائے جائیں تو اس سائل کو مسجد میں دینا جائز ہے۔

ان عبارات کا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی کے بارے میں اس کے ظاہری حالات کو دیکھ کر رائے قائم کریں اور اس کے مطابق شرعی احکام پر عمل کریں، یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کی کھوج میں لگ جائیں، علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ شاید اسی کھوج کرید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب کوئی سوال کرے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مستحق ہے یا نہیں، مستحق کو دینا چاہیے اور غیر مستحق کو نہیں دینا چاہیے، میں کہتا ہوں کہ جس کو ہم نے غیر مستحق سمجھ کر رد کر دیا وہ کسی اور دروازے پر جا کر گدا کر لے گا، لیکن جب ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کریں گے، اگر اس نے بھی ہمیں عدمِ استحقاق کی بنا پر رد کر دیا تو اس کے بعد ہم کس دروازہ پر جا کر سوال کریں گے، (تبیان القرآن، ج:12،ص:834)"۔

## مسجد کے نام غیر موقوفہ جائیداد کی فروخت کا جواز

### سوال:

قادریہ مسجد گلبہار 2 کی منتظمہ کمیٹی کے خزانچی نے مسجد کے فنڈ سے 1968ء میں ایک مکان 75/4 مبلغ آٹھ ہزار روپے میں مسجد قادریہ کے لیے خریدا، لیکن 1968 سے 2015ء تک مسجد یا مدرسہ کے لیے استعمال کرنے کی بجائے مسجد کی آمدنی کے لیے کرائے پر دے دیا۔ نئی منتظمہ کمیٹی نے 2015 میں ایک بلڈر کو وہ جگہ 70 لاکھ روپے میں فروخت کر دی، تیرہ لاکھ ایڈوانس وصول کر لیے جو مسجد کے اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔ بلڈر نے پانچ منزلہ عمارت تعمیر کر کے فلیٹوں کی صورت میں فروخت کر دیے ہیں۔ 2016ء میں جب اہل محلہ کو معلوم ہوا تو اس کمیٹی کو ختم کر کے نئی کمیٹی بنا دی۔ اب بلڈر موجودہ کمیٹی سے اس مکان کے کاغذات کا مطالبہ کر رہا ہے کہ بقایا 57 لاکھ روپے لے کر کاغذات اس کے حوالے کر دیں۔ کیا ہم یہ رقم بلڈر سے لے لیں یا دوسری جگہ کا مطالبہ کریں۔ اس جگہ پر پانچ منزلہ عمارت تعمیر

ہو چکی ہے اور لوگ اس کے فلیٹ خرید چکے ہیں، (جامع مسجد قادریہ گلبہار 2 کراچی)۔

## جواب:

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَفِي ''الْفَتَاوَى النَّسَفِيَّةِ'' سُئِلَ عَنْ أَهْلِ الْمَحَلَّةِ بَاعُوا وَقْفَ الْمَسْجِدِ لِأَجْلِ عِمَارَةِ الْمَسْجِدِ، قَالَ: لَا يَجُوزُ بِأَمْرِ الْقَاضِي وَغَيْرِهِ، كَذَا فِي ''الذَّخِيرَةِ''، وَفِي فَوَائِدِ نَجْمِ الدِّينِ النَّسَفِيِّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى: أَهْلُ مَسْجِدٍ اشْتَرَوْا عِقَارًا بِغَلَّةِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ بَاعُوا الْعِمَارَةَ اِخْتَلَفَ الْمَشَايِخُ فِي جَوَازِ بَيْعِهِمْ وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ يَجُوزُ، كَذَا فِي ''الْغِيَاثِيَّةِ''۔

ترجمہ: ''فتاویٰ نسفی میں ہے: آپ سے ایک اہل محلہ کی بابت سوال ہوا: انہوں نے وقف مسجد کو تعمیر مسجد کے لیے فروخت کر دیا، آپ نے فرمایا: قاضی یا کسی اور کے حکم سے (بھی ایسا کرنا) جائز نہیں ہے، ''ذخیرہ'' میں بھی اسی طرح ہے۔ فوائد نجم الدین نسفی رحمۃ اللہ علیہ میں ہے: اہل مسجد نے مسجد کی آمدنی سے ایک جائیداد خریدی، پھر اس عمارت کو بیچ دیا، اس بیع کے جواز میں مشائخ کا اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ اُس کا فروخت کرنا جائز ہے، جیسا کہ ''غیاثیہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 464، مکتبۂ رشیدیہ، کوئٹہ)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّهُ الْعَزِيز لکھتے ہیں:

''متولی نے زر وقف سے جو زمین یا جائداد وقف کے لیے خریدی وہ وقف نہیں ہو جاتی، اس کی بیع جائز ہے۔ کتابوں میں جزئیہ کی تصریح ہے، ہاں! بیع کے لئے ایسا ذریعہ اطمینان ضرور ہے، جس میں کسی کے تغلب کا احتمال نہ رہے، قاضی شرع تو یہاں کوئی نہیں، اہل محلہ وعالم دیندار و مسلمانان متدین کی دینداری سے یہ کام ہو، درمختار میں ہے:

''اِشْتَرَى الْمُتَوَلِّي بِمَالِ الْوَقْفِ دَارًا لِلْوَقْفِ لَا تَلْحَقُ بِالْمَنَازِلِ الْمَوْقُوفَةِ وَيَجُوزُ بَيْعُهَا فِي الْأَصَحِّ، وَاللهُ تَعَالَى أَعْلَمُ''۔

ترجمہ: ''متولی نے وقف مال سے کوئی مکان وقف کے طور پر خریدا، تو یہ مکان وقف شدہ جائداد شمار نہ ہوگا، اَصَح قول میں اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم''۔ (فتاویٰ

رضویہ جلد 16،ص:117)

سوال میں بیان کی گئی صورت کے مطابق انتظامیہ نے اپنے عمل سے ثابت کیا ہے کہ انہوں نے وہ جگہ مسجد یا مدرسہ کے نام پر وقف کرنے کی نیت سے نہیں لی تھی بلکہ مسجد یا مدرسہ کی منفعت کے لیے لی تھی، چنانچہ پہلے اسے کرایہ پر دیا، پھر فروخت کردیا۔ مندرجہ بالا فقہی حوالہ جات سے واضح ہے کہ ایسی جائیداد کی فروخت کے بارے میں فقہائے کرام کا صحیح ترین قول جواز کا ہے۔ لہٰذا اب یہ جگہ خریدار سے بقیہ رقم لے کر ان کے نام کی جاسکتی ہے، کیونکہ اب اس بیع کو فسخ کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ تاہم آئندہ اس طرح کا فیصلہ کمیٹی کا کوئی ایک رکن نہ کرے بلکہ پوری انتظامیہ کے اتفاقِ رائے سے اس طرح کے فیصلے ہونے چاہئیں اور جیسا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز نے لکھا ہے:
کسی ثقہ دینی عالم اور اہل محلہ میں سے دین دار اصحابِ رائے کو بھی مشاورت میں شامل کرنا چاہیے۔ آپ نے لکھا ہے: ''اب ہم یہ رقم بلڈر سے لے لیں یا نئی جگہ کا مطالبہ کریں''، یہ آپشن آپ کو پلاٹ فروخت کرتے وقت ذہن میں رکھنا چاہیے تھا، بیع مکمل ہونے کے بعد آپ نئی شرائط عائد نہیں کرسکتے۔ اگر وہ بلڈر اتنا دین دار شخص ہے تو اچھی بات ہے، آپ کو دوسرا پلاٹ خرید کر دیدے۔ بصورتِ دیگر آپ اس رقم یعنی ستر لاکھ روپے سے کوئی اور پلاٹ خرید کر مسجد کی منفعت میں استعمال کرسکتے ہیں۔

## مسجد میں دوڑنا مسجد کے احترام اور وقار کے منافی ہے

**سوال:**

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب جماعت کھڑی ہوجائے تو لوگ جماعت میں شامل ہونے یا رکوع پانے کے لیے دوڑ کر آتے ہیں، کیا یہ طریقہ کار درست ہے''۔

(محمد شعیب، ایف۔ بی ایریا، کراچی)

**جواب:**

یہ طریقہ کار درست نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي قَتَادَةَ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ نُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ إِذْ سَمِعَ جَلَبَةَ رِجَالٍ، فَلَمَّا صَلَّى قَالَ: مَا شَأْنُكُمْ، قَالُوْا: اِسْتَعْجَلْنَا إِلَى الصَّلَاةِ، قَالَ: فَلَا تَفْعَلُوْا إِذَا أَتَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَعَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: دریں اثنا کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ کچھ افراد کا شور سنائی دیا، جب آپ ﷺ نماز پڑھانے سے فارغ ہوگئے تو آپ نے پوچھا: یہ شور کیوں تھا، انہوں نے عرض کی: ہم نماز میں جلدی شامل ہونا چاہتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایسی عجلت نہ کیا کرو، جب تم نماز کے لیے آؤ تو سکون کے ساتھ آؤ، تم (امام کے ساتھ) نماز کا جو حصہ پالو وہ (امام کی اقتدا میں) پڑھ لو اور جو حصہ رہ جائے، وہ (امام کے سلام پھیرنے کے بعد) پورا کرو، (صحیح البخاری:635)''۔ مسجد میں دوڑنا مسجد کے احترام اور وقار کے منافی ہے، بعض اوقات انسان جلدی میں پھسل جاتا ہے یا ٹکر لگ جاتی ہے جو تکلیف کا باعث ہوتی ہے، یہ شِعار بھی درست نہیں ہے کہ کسی نہ کسی طرح امام کو رکوع میں پالے تاکہ اُس رکعت کے پڑھنے سے بچ جائیں، کسی بھی مرحلے میں امام کے ساتھ ملیں، ان شاء اللہ جماعت کا ثواب مل جائے گا، لیکن نماز اور مسجد کا وقار قائم رہنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے باجماعت نماز پڑھنے میں ترتیب سے صف بندی کی بہت تاکید فرمائی ہے، جب کہ جماعت ہونے کے بعد عجلت میں آنے والے اس کی پابندی نہیں کر پاتے اور یہ دیکھے بغیر کہ صف میں دائیں یا بائیں کس طرف کمی ہے، لوگ ایک رخ پر کھڑے ہوتے چلے جاتے ہیں اور صحیح طریقے سے صف بندی نہیں ہو پاتی، جب کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''أَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَسُدُّوا الْخَلَلَ وَلِيْنُوا بِأَيْدِيْ إِخْوَانِكُمْ وَلَا تَذَرُوْا فُرُجَاتٍ لِلشَّيْطَانِ وَمَنْ وَصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ، وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ''۔

ترجمہ: ''(نماز میں) صفیں سیدھی رکھو، کندھوں کو ملا کر کھڑے ہو، (دو نمازیوں کے درمیان) خلا نہ چھوڑو اور صف میں نئے شامل ہونے والے بھائی کے لیے نرمی اختیار کرو اور

شیطان کے (نفوذ) کے لیے خلا نہ چھوڑو اور جو صف کو ملائے گا، اللہ اُسے ملا کر رکھے گا اور جو صف کو توڑے گا، اللہ اُسے (اجتماعیت سے) توڑ دے گا، (سنن ابوداؤد:666)''۔

## مسجد کی تعمیرِ نو

**سوال:**

جامع مسجد بیت المکرم، سیکٹر 11، اورنگی ٹاؤن 480 گز پر بنی ہے، مسجد پرانی اور بوسیدہ ہوگئی ہے اور آبادی بڑھنے کے سبب جگہ کم پڑ رہی ہے، اوپر مزید تعمیر نہیں ہوسکتی کہ معلوم نہیں بنیادیں کتنی مضبوط ہیں۔ انتظامیہ مسجد، علاقہ مکین اور نمازیوں کا ارادہ ہے کہ مسجد مکمل شہید کر کے دوبارہ تعمیر کی جائے۔ کیا مسجد مکمل شہید کر کے دوبارہ تعمیر کی جاسکتی ہے اور پہلے کی تعمیر کرنے والے حضرات کے ثواب کا کیا حکم ہے؟ مسجد کے پرانے سامان کا کیا حکم ہے؟، (انتظامیہ جامع مسجد بیت المکرم، اورنگی ٹاؤن کراچی)۔

**جواب:**

اگر طویل عرصہ گزرنے کی وجہ سے مسجد بوسیدہ ہوجائے یا نمازیوں کے لیے جگہ تنگ ہوجائے اور اُس کو ازسرِ نو تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہو، تو اُسے شہید کر کے تعمیرِ نو جائز ہے، لیکن نیچے سے اوپر تک اُس کی مسجد کی حیثیت ہی بحال رکھی جائے گی۔ اگر اہلِ محلہ اپنے پیسے سے مسجد دوبارہ تعمیر کرانا چاہتے ہیں، تو کرا سکتے ہیں، وقف کی رقم سے صرف نہیں کر سکتے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''فَرْعٌ: أَرَادَ أَهْلُ الْمَحَلَّةِ نَقْضَ الْمَسْجِدِ وَبِنَائَهُ أَحْكَمَ مِنَ الْأَوَّلِ أَنَّ الْبَانِيَ مِنْ أَهْلِ الْمَحَلَّةِ لَهُمْ ذٰلِكَ وَإِلَّا، لَا، ''بَزَّازِيَّةٌ''۔

ترجمہ: ''اہلِ محلہ یہ چاہتے ہوں کہ مسجد کو گرا کر پہلے سے زیادہ عمدہ و مستحکم بنائیں اگر وہ اسی محلے سے ہوں تو ایسا کر سکتے ہیں ورنہ نہیں، ''بزازیہ''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 13، ص:32-431)

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فِي الْكُبْرَى مَسْجِدٌ مَبْنِيٌّ أَرَادَ رَجُلٌ أَنْ يَنْقُضَهُ وَيَبْنِيَهُ ثَانِيًا أَحْكَمَ مِنَ الْبِنَاءِ الْأَوَّلِ لَيْسَ لَهُ ذٰلِكَ، لِأَنَّهُ لَا وِلَايَةَ لَهُ كَذَا فِي ''الْمُضْمَرَاتِ'' وَفِي ''النَّوَازِلِ'' إِلَّا أَنْ يَخَافَ أَنْ يَنْهَدِمَ، كَذَا فِي ''التَّتَارِخَانِيَةِ'' وَتَأْوِيلُهُ إِذَا لَمْ يَكُنِ الْبَانِي مِنْ أَهْلِ تِلْكَ الْمَحَلَّةِ وَأَمَّا أَهْلُ تِلْكَ الْمَحَلَّةِ فَلَهُمْ أَنْ يَهْدِمُوهُ وَيُجَدِّدُوا بِنَائَهُ وَيَفْرِشُوا الْحَصِيرَ، وَيُعَلِّقُوا الْقَنَادِيلَ، لٰكِنْ مِنْ مَالِ أَنْفُسِهِمْ أَمَّا مِنْ مَالِ الْمَسْجِدِ فَلَيْسَ لَهُمْ ذٰلِكَ إِلَّا بِأَمْرِ الْقَاضِي، كَذَا فِي ''الْخُلَاصَةِ''۔

ترجمہ: ''''کبریٰ'' میں ہے: ایک مسجد بنی ہوئی ہے، پھر کسی شخص نے اسے توڑ کر نئی مضبوط مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ کیا، تو وہ ایسا نہیں کرسکتا، اس لیے کہ اسے ولایت حاصل نہیں ہے، یہ ''مُضمرات'' میں ہے۔''نوازل'' میں ہے کہ اگر مسجد منہدم ہوجانے کا خوف ہوتو کرسکتا ہے، جیسا کہ ''تتارخانیہ'' میں ہے، اس مسئلے کی تاویل یہ ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب بنانے والا اس محلے کا نہ ہو۔ محلے والوں کو اختیار ہے کہ وہ مسجد کو گرا کر اُس کی جدید تعمیر کرائیں، اُس میں فرش بچھائیں، قندیل لٹکائیں، لیکن یہ سب اپنے ذاتی مال سے کریں، مسجد کے مال سے ایسا کرنا چاہیں تو انہیں اختیار نہیں مگر جبکہ قاضی / حاکم انہیں اس کی اجازت دیدے، جیسا کہ ''خلاصہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 457)''۔

پرانی مسجد کے تعمیر کرانے والوں کے اجر وثواب میں کمی واقع نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمانے پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ''۔

ترجمہ: ''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس دانے کی طرح ہے، جس نے سات بالیں اگائیں، ہر بالی میں سو دانے ہیں اور جس کے لیے چاہے، اللہ بڑھا دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا بہت علم والا ہے، (البقرہ: 261)''۔

ہمارے قدیم فقہائے کرام کی عبارات اس پر مبنی ہیں کہ قرونِ اُولیٰ و وسطیٰ میں بالعموم افراد مسجد کے لیے اپنی ملکیتی زمین وقف کرتے تھے اور بعض صورتوں میں تعمیر بھی خود کرتے تھے اور اس کو چلانے کے لیے وقف بھی قائم کرتے تھے۔آج کل خاص طور پر بڑے شہروں میں اہلِ محلہ میں سے چند افراد مل کر انجمن یا ٹرسٹ بناتے ہیں اور پھر عام چندے سے یہ کام کرتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ انجمن یا ٹرسٹ کے ذمے داران بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا تغیر وتبدل یا انہدام وتعمیرِ نو یا توسیع وتزئین وتحسین کے حوالے سے انہیں یہ حق حاصل ہے، چندہ دینے والے بھی ان تمام امور کو دیکھ کر چندہ دیتے ہیں، سو یہ ان کی رضامندی کی دلیل ہے۔مسجد کی تعمیرِ نو کی صورت میں بانی یا پہلے عمارت کے تعمیر کنندگان کو اجر ملتا رہے گا، کیونکہ ان کا فعل تعمیرِ نو یا مرمت یا توسیع کے لیے دالّ اور محرک ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے: ''اِنَّ الدَّالَّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِهٖ'' ترجمہ: ''نیکی کی راہ دکھانے والا نیکی کرنے والے کی طرح ہے (یعنی دونوں عنداللہ ماجور ہیں)، (سُنن ترمذی: 2670)''۔کسی بھی مسجد کی بنائے اول یا موجودہ عمارت کے لیے کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ یہ عمارت قیامت تک قائم رہے گی، حادثات وآفات بعید از امکان نہیں ہیں، طویل مدت گزرنے کے بعد عمارتیں بوسیدہ بھی ہوجاتی ہیں اور ان کا اس حال پر قائم رکھنا خطرناک ہوجاتا ہے، پس تعمیرِ نو، مرمت، تغیر وتبدُّل اور توسیع کے سلسلے چلتے رہیں گے۔لہٰذا آپ اپنی مسجد کو منہدم کرکے تعمیرِ نو کرسکتے ہیں، پرانے سامان کے استعمال کی چار صورتیں ہیں:

(۱) اگر نئی تعمیر شدہ مسجد میں استعمال ہوسکتا ہو تو ترجیح اول ہے۔

(۲) اگر فروخت ہوسکتا ہے، تو فروخت کرکے اس کی قیمت نئی تعمیر میں لگائیں۔

(۳) اگر یہ دونوں صورتیں قابلِ عمل نہیں ہیں اور کسی دوسری مسجد میں ضرورت ہو تو وہاں دیدیں۔

(۴) اُسے مباح کردیں، جس کے کام آسکتا ہو کام میں لے لے، ورنہ ٹھکانے لگادیں۔

# جنازے کے مسائل

# سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نمازِ جنازہ

**سوال:**
سید المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وصالِ مبارک ہوا، آپ نے حیاتِ ظاہری کے اعتبار سے پردہ فرمایا، سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسدِ انور پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی یا محض صلوٰۃ وسلام پڑھا جاتا رہا، اس سلسلے میں روایات کیا ہیں اور مختار قول کیا ہے۔
(قاضی محمد اشرف، قصبہ کالونی)

**جواب:** اللہ تعالیٰ کا قانون ہے:

(1) ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾''۔
ترجمہ: ''جو بھی زمین پر ہے، وہ فنا ہونے والا ہے اور آپ کے رب کی ذات باقی ہے جو عظمت اور بزرگی والا ہے، (الرحمٰن: 27-26)''۔

(2) ''كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ''۔
ترجمہ: ''ہر جان موت کا مزا چکھنے والی ہے، پھر تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے''۔
(العنکبوت: 57)

(3) ''وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا''۔
ترجمہ: ''اور جب کسی جان (کی موت) کا مقررہ وقت آجائے تو اللہ اُسے ہرگز مؤخر نہیں فرمائے گا، (المنافقون: 11)''۔

(4) ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا''۔
ترجمہ: ''اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہی ہیں، آپ سے پہلے بھی رسول (آئے اور اپنی حیاتِ ظاہری گزارنے کے بعد) وصال فرما گئے، پس اگر وہ فوت ہو جائیں یا (بفرضِ محال) شہید کر دیے جائیں تو تم ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے اور جو ایڑیوں کے بل پلٹ

جائے تو اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا، (آل عمران:144)"۔

(5) "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ"۔

ترجمہ: "بے شک آپ پر بھی (قانونِ قدرت کے تحت) موت آنی ہے اور بے شک یہ بھی مرنے والے ہیں، (الزمر:30)"۔

عربی قاعدے کے مطابق آیۂ مبارکہ میں دونوں جگہ لفظ "مَيِّتٌ" نکرہ آیا ہے اور ایک ہی جملے میں نکرے کا اعادہ ہو تو ثانی غیرِ اُولیٰ ہوتا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات قانونِ قدرت کے تحت ایک آن، ایک لمحے اور محدود وقت کے لیے تھی، جبکہ باقی سب کی وفات اپنے اپنے حال کے مطابق ہے۔

جب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصالِ مبارک کے بعد صحابۂ کرام مضطرب تھے اور ذہنی طور پر اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور حمد وصلوٰۃ کے بعد فرمایا:

(ا) "اِنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَقْبَلَ عَلٰى فَرَسٍ مِنْ مَسْكَنِهِ بِالسُّنْحِ، حَتّٰى نَزَلَ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ، فَلَمْ يُكَلِّمِ النَّاسَ حَتّٰى دَخَلَ عَلٰى عَائِشَةَ، فَتَيَمَّمَ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَهُوَ مُغَشًّى بِثَوْبِ حِبَرَةٍ، فَكَشَفَ عَنْ وَجْهِهٖ ثُمَّ أَكَبَّ عَلَيْهِ فَقَبَّلَهٗ وَبَكٰى، ثُمَّ قَالَ: بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ، وَاللهِ لَا يَجْمَعُ اللهُ عَلَيْكَ مَوْتَتَيْنِ أَمَّا الْمَوْتَةُ الَّتِيْ كُتِبَتْ عَلَيْكَ، فَقَدْ مُتَّهَا"۔

ترجمہ: "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: حضرت ابوبکر اپنے گھر سے جو "اَلسُّنْح" میں تھا، گھوڑے پر سوار ہو کر آئے حتیٰ کہ گھوڑے سے اتر کر مسجد میں داخل ہوئے، پھر لوگوں سے کلام کیے بغیر حضرت عائشہ کے پاس آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قصد کیا، اس وقت آپ کا چہرۂ انور ایک یمنی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا، پھر انہوں نے آپ کا چہرہ کھولا اور جھک کر آپ کو بوسا دیا اور روئے اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، اللہ کی قسم! اللہ آپ پر دو موتوں کو جمع نہیں کرے گا، سو وہ موت جو (قانونِ قدرت کے تحت) آپ پر لکھ

دی گئی تھی، وہ آپ پر بیت چکی، (بخاری:4452)"۔

(۲) "عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ خَرَجَ وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يُكَلِّمُ النَّاسَ، فَقَالَ: اِجْلِسْ يَا عُمَرُ، فَأَبَى عُمَرُ أَنْ يَجْلِسَ، فَأَقْبَلَ النَّاسُ إِلَيْهِ وَتَرَكُوا عُمَرَ، فَقَالَ أَبُوبَكْرٍ: أَمَّا بَعْدُ! فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا ﷺ، فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللهَ فَإِنَّ اللهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ، قَالَ اللهُ: "وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ"، إِلَى قَوْلِهِ: "الشَّاكِرِينَ"، وَقَالَ: وَاللهِ لَكَأَنَّ النَّاسَ لَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللهَ أَنْزَلَ هٰذِهِ الْآيَةَ حَتّٰى تَلَاهَا أَبُوبَكْرٍ، فَتَلَقَّاهَا مِنْهُ النَّاسُ كُلُّهُمْ، فَمَا أَسْمَعُ بَشَرًا مِنَ النَّاسِ إِلَّا يَتْلُوهَا، فَأَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ، أَنَّ عُمَرَ قَالَ: وَاللهِ مَا هُوَ إِلَّا أَنْ سَمِعْتُ أَبَا بَكْرٍ تَلَاهَا فَعَقِرْتُ، حَتّٰى مَا تُقِلُّنِي رِجْلَايَ، وَحَتّٰى أَهْوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ حِيْنَ سَمِعْتُهُ تَلَاهَا، عَلِمْتُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدْ مَاتَ"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: حضرت ابوبکر نکلے اور حضرت عمر بن خطاب لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، حضرت ابوبکر نے کہا: عمر! بیٹھ جاؤ، حضرت عمر نے بیٹھنے سے انکار کیا، تو لوگ حضرت عمر کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہو گئے، پھر حضرت ابوبکر نے حمد وصلوٰۃ کے بعد کہا: تم میں سے جو شخص سیدنا محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا، تو بے شک سیدنا محمد ﷺ وفات پا چکے ہیں اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ یقیناً ہمیشہ زندہ ہے، اسے (ہرگز) موت نہیں آئے گی، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللهُ الشَّاكِرِينَ"، عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: اللہ کی قسم! ایسا لگا کہ لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، حتیٰ کہ حضرت ابوبکر نے اس آیت کی تلاوت کی، پھر تمام لوگوں نے اس آیت کو حضرت ابوبکر سے حاصل کیا، پس لوگوں میں سے جس بشر نے بھی اس آیت کو سنا، وہ اس کی تلاوت کر رہا تھا، (زہری بیان کرتے ہیں:) مجھے سعید بن المسیب نے خبر

دی: حضرت عمر نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے اس آیت کو صرف حضرت ابوبکر کی تلاوت سے سنا، پس میں بے ہوش ہو گیا، حتیٰ کہ میری ٹانگیں میرا بوجھ نہیں اٹھا رہی تھیں یہاں تک کہ جب میں نے حضرت عمر کو اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ کی وفات ہو گئی ہے تو میں (بے قابو ہو کر) زمین پر گر گیا، (بخاری: 4454)''۔

(۳) فَحَمِدَ اللّٰهَ أَبُو بَكْرٍ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، وَقَالَ: أَلَا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا ﷺ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ، وَقَالَ: ''إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ''۔

ترجمہ: ''پھر حضرت ابوبکر نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور کہا: سنو! جو (سیدنا) محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک (سیدنا) محمد ﷺ وفات پا گئے اور جو اللہ (عزوجل) کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے، اس کو (کبھی) موت نہیں آئے گی اور یہ آیت پڑھی: ''بے شک آپ فوت ہونے والے ہیں اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں، (الزمر: 30)''، (صحیح البخاری: 3668)''۔

پس قانونِ قدرت کے مطابق اپنے وقتِ مقررہ پر انبیائے کرام علیہم السلام پر بھی موت آئی، اسے قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ میں موت، وفات اور فنا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن انبیائے کرام ورُسل عظام علیہم السلام کی وفات ''آنی'' یعنی قانونِ قدرت کے مطابق ایک محدود وقت کے لیے آتی ہے اور پھر اُن کی حیات لوٹ آتی ہے، جیسا کہ اُن کی شان کے لائق ہے، معراج النبی ﷺ کے واقعے میں انبیائے کرام علیہم السلام کے ذی حیات ہونے کے شواہد مذکور ہیں۔ چونکہ قانونِ الٰہی کے مطابق آپ ﷺ نے حیاتِ ظاہری سے پردہ فرمایا، اس لیے اُس پر ظاہری طور پر موت کے احکام نافذ ہوئے، آپ کو غسل دیا گیا، کفن پہنایا گیا، آپ پر صلوٰۃ پڑھی گئی، آپ کے لیے قبرِ انور تیار کی گئی اور اس میں آپ کی تدفین ہوئی اور آج بھی آپ کمالِ صفتِ حیات کے ساتھ اپنی قبرِ انور میں تشریف فرما ہیں۔ قرآنِ کریم قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ آیات میں شہداء کی حیات کی شہادت دیتا ہے اور یہ بھی

بیان فرماتا ہے کہ انہیں عالمِ برزخ میں رزق دیا جاتا ہے، تو انبیائے کرام علیہم السلام اور پھر امام الانبیاء والمرسلین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا درجہ تو تمام شہداء اور تمام انبیائے کرام سے بہت بڑا ہے، اس کی رفعتوں کی انتہا کسی کو نہیں معلوم۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جسدِ مبارک حجرہ شریف میں رکھ دیا گیا، لوگ جماعت کی صورت میں آتے، تکبیرات کہہ کر درود شریف پڑھتے اور دعا کرتے، بدھ کے روز حضرت سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور اُس کے بعد تدفین کردی گئی۔ علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقالات میں ایک مُفصّل تحقیقی مقالہ لکھا اور دلائل کے ساتھ یہ موقف اختیار فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نمازِ جنازہ معروف طریقے سے پڑھی گئی تھی، آپ نے لکھا: ''بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صحابۂ کرام مختلف ٹولیوں اور جماعتوں کی شکل میں آکر آپ پر صرف صلوٰۃ وسلام عرض کرتے، لیکن جو چیز حدیث صحیح سے ثابت ہے اور جو معتمد اور محققین علمائے کرام کا مختار ہے اور جس چیز کی بکثرت کُتبِ سیَر میں صراحت ہے اور جو اَمر اصول حنفیہ اور اصولِ شافعیہ کے مطابق ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کی نمازِ جنازہ معروف طریقہ سے پڑھی گئی، اِلّا یہ کہ اس نماز جنازہ میں کوئی شخص امام نہیں تھا اور نہ ہی اس میں ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا'' والی معروف دعا پڑھی گئی، بلکہ اس دعا کے قائم مقام حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف وتوصیف میں کلمات طیبات عرض کیے گئے''۔

(مقالاتِ سعیدی، ص:120)

شمائلِ ترمذی (بَابُ مَاجَآءَ فِی وَفَاةِ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''یَا صَاحِبَ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! أَیُصَلّٰی عَلٰی رَسُوْلِ اللهِ، قَالَ: نَعَمْ، قَالُوْا: وَکَیْفَ، قَالَ: یَدْخُلُ قَوْمٌ فَیُکَبِّرُوْنَ وَیُصَلُّوْنَ وَیَدْعُوْنَ ثُمَّ یَخْرُجُوْنَ، ثُمَّ یَدْخُلُ قَوْمٌ فَیُکَبِّرُوْنَ وَیُصَلُّوْنَ وَیَدْعُوْنَ، ثُمَّ یَخْرُجُوْنَ، حَتّٰی یَدْخُلَ النَّاسُ''۔

ترجمہ: ''اے رفیقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے،

آپ نے فرمایا: ہاں! صحابہ نے دریافت کیا: کس طرح پڑھیں، آپ نے فرمایا: ایک ایک جماعت حجرہ کے اندر جائے، پس تکبیر کہیں، درود پڑھیں اور دعا کریں پھر باہر آجائیں، پھر دوسری جماعت جائے، تکبیر کہیں، درود پڑھیں اور دعا کریں پھر باہر آجائیں، یہاں تک کہ تمام لوگ اسی طرح داخل ہوں، (ص: 474)''۔

حافظ ابن کثیر دمشقی متوفّٰی 774ھ لکھتے ہیں:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمَّا مَاتَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أُدْخِلَ الرِّجَالُ فَصَلَّوْا عَلَيْهِ بِغَيْرِ إِمَامٍ أَرْسَالًا حَتّٰى فَرَغُوا، ثُمَّ أُدْخِلَ النِّسَآءُ، فَصَلَّيْنَ عَلَيْهِ، ثُمَّ أُدْخِلَ الصِّبْيَانُ، فَصَلَّوْا عَلَيْهِ، ثُمَّ أُدْخِلَ الْعَبِيْدُ، فَصَلَّوْا عَلَيْهِ أَرْسَالًا، لَمْ يَؤُمَّهُمْ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ أَحَدٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوگیا تو پہلے گروہ در گروہ مردوں نے جاکر آپ ﷺ کے جنازے پر بغیر کسی امام کے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھی اور جب وہ فارغ ہوگئے تو عورتوں نے جاکر نماز پڑھی، پھر (باشعور) بچوں نے، پھر غلاموں نے، الغرض کسی امام کے بغیر سب نے الگ الگ نماز پڑھی''۔
(اَلسِّيْرَةُ النَّبَوِيَّه، جلد 4، ص: 527)

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی نماز جنازہ پڑھنے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''قَالَ الْوَاقِدِيُّ: حَدَّثَنِيْ مُوْسَى بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ، قَالَ: وَجَدْتُ كِتَابًا بِخَطِّ أَبِيْ، فِيْهِ أَنَّهُ لَمَّا كُفِّنَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَوُضِعَ عَلٰى سَرِيْرِهٖ، دَخَلَ أَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، وَمَعَهُمَا نَفَرٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ بِقَدْرِ مَا يَسَعُ الْبَيْتُ، فَقَالَا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ، وَسَلَّمَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْأَنْصَارُ كَمَا سَلَّمَ أَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ، ثُمَّ صَفُّوْا صُفُوْفًا لَا يَؤُمُّهُمْ أَحَدٌ، فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ وَهُمَا فِي الصَّفِّ الْأَوَّلِ حِيَالَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَشْهَدُ أَنَّهٗ قَدْ بَلَّغَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ وَنَصَحَ لِأُمَّتِهٖ، وَجَاهَدَ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ حَتّٰی أَعَزَّ اللّٰهُ دِیْنَهٗ وَتَمَّتْ کَلِمَتُهٗ وَأُوْمِنَ بِهٖ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ، فَاجْعَلْنَا إِلٰهَنَا مِمَّنْ یَتَّبِعُ الْقَوْلَ الَّذِیْ أُنْزِلَ مَعَهٗ، وَاجْمَعْ بَیْنَنَا وَبَیْنَهٗ حَتّٰی تُعَرِّفَهٗ بِنَا وَتُعَرِّفَنَا بِهٖ، فَإِنَّهٗ کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفًا رَّحِیْمًا، لَا نَبْتَغِیْ بِالْإِیْمَانِ بِهٖ بَدِیْلًا، وَلَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا أَبَدًا، فَیَقُوْلُ النَّاسُ: آمِیْنَ آمِیْنَ وَیَخْرُجُوْنَ وَیَدْخُلُ آخَرُوْنَ حَتّٰی صَلَّی الرِّجَالُ، ثُمَّ النِّسَاءُ، ثُمَّ الصِّبْیَانُ''۔

ترجمہ: ''واقدی نے کہا: مجھ سے موسیٰ بن محمد بن ابراہیم نے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھے اپنے باپ کی لکھی ہوئی ایک تحریر ملی، اس میں لکھا تھا: جب رسول اللہ ﷺ کو کفن دیا گیا اور آپ کو چار پائی پر رکھا گیا، تو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے اور گھر میں جتنی گنجائش تھی اتنے مہاجرین اور انصار بھی ان کے ساتھ تھے، تو دونوں نے کہا: اے نبی ﷺ آپ پر سلام، اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکات ہوں اور مہاجرین اور انصار نے بھی حضرت ابوبکر اور عمر کی طرح سلام کیا، پھر صفیں بنائی اور ان کا کوئی امام نہیں تھا تو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما دونوں صفِ اول میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے تھے، انہوں نے یہ کلمات پڑھے: اے اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ جو کچھ تو نے اِن کی طرف نازل فرمایا، وہ سب آپ ﷺ نے (امت کو) پہنچایا اور اپنی امت کے ساتھ خیر خواہی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کیا اور ذاتِ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لایا گیا، پس اے ہمارے معبود! ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو ان پر نازل شدہ کلام کی پیروی کرتے ہیں، (آخرت میں) ہمیں ان کے ساتھ جمع فرما کہ ہماری پہچان ایک دوسرے کے ساتھ ہو، پس بے شک وہ مومنین پر بہت شفقت فرمانے والے مہربان ہیں، ہم آپ پر ایمان پر کسی بدل کے طلبگار نہیں اور نہ کبھی اس کے بدلے میں مال لیں گے، تو لوگوں نے کہا: آمین! آمین! (نماز پڑھنے والے) لوگ نکلتے، پھر اس کے بعد دوسرے لوگ داخل ہوتے حتیٰ کہ تمام مردوں، عورتوں اور بچوں نے نماز پڑھی، (البدایۃ والنہایۃ: ج:5، ص:286)''۔

علامہ زرقانی لکھتے ہیں:

''قَالَ عِيَاضٌ: الصَّحِيحُ الَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ: أَنَّ الصَّلَاةَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ صَلَاةً حَقِيقِيَّةً لَا مُجَرَّدَ الدُّعَاءِ فَقَطْ، نَعَمْ، لَا خِلَافَ أَنَّهُ لَمْ يَؤُمَّهُمْ عَلَيْهِ أَحَدٌ، فَقِيلَ: تَعَبُّدِيٌّ، وَقِيلَ: لِيُبَاشِرَ كُلُّ وَاحِدٍ الصَّلَاةَ عَلَيْهِ مِنْهُ إِلَيْهِ، وَقَالَ السُّهَيْلِيُّ: أَخْبَرَ اللهُ: أَنَّهُ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَيْهِ، وَأَمَرَ كُلَّ وَاحِدٍ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَيْهِ، فَوَجَبَ عَلَى كُلِّ وَاحِدٍ أَنْ يُبَاشِرَ الصَّلَاةَ عَلَيْهِ مِنْهُ إِلَيْهِ، وَالصَّلَاةُ عَلَيْهِ بَعْدَ مَوْتِهِ مِنْ هٰذَا الْقَبِيلِ، وَأَيْضًا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَنَا فِي ذٰلِكَ أَئِمَّةٌ، انْتَهَى، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ فِي الْأُمِّ: وَذٰلِكَ لِعِظَمِ أَمْرِهِ ﷺ وَتَنَافُسِهِمْ فِيمَنْ يَتَوَلَّى الصَّلَاةَ عَلَيْهِ، وَقِيلَ لِعَدَمِ اتِّفَاقِهِمْ عَلَى خَلِيفَةٍ، وَقِيلَ لِوَصِيَّتِهِ بِذٰلِكَ''۔

ترجمہ: ''قاضی عیاض نے فرمایا: اور جمہور کا صحیح موقف یہ ہے: نبی ﷺ کی جنازہ کی جو نماز پڑھی گئی، وہ حقیقی نماز تھی صرف دعا نہ تھی، ہاں! اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس نماز کی امامت کسی نے نہیں کی، بعض نے کہا: یہ تعبدی امر تھا (یعنی بطورِ عبادت ادا کی گئی) اور بعض نے کہا: یہ اس لیے تاکہ ہر کسی کو خود آپ کی نماز جنازہ کی سعادت حاصل ہو اور علامہ سہیلی نے کہا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں اور ہر مومن کو حکم دیا کہ وہ آپ ﷺ پر درود بھیجے تو ہر مومن پر یہ واجب ہو گیا کہ ہر ایک اپنی طرف سے خود آپ ﷺ پر درود بھیجے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ پر درود اسی قبیل سے ہے، پس بے شک فرشتے اس شعار میں ہمارے امام ہیں اور امام شافعی نے ''کِتَابُ الْاُمّ'' میں فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت واحترام کی وجہ سے تھا اور آپس میں آپ کی نماز جنازہ کی امامت کی سعادت میں یکساں شریک ہونے کے جذبے کی وجہ سے اور بعض نے کہا: (اُس وقت تک) خلیفہ پر عدم اتفاق کی وجہ سے اور بعض نے کہا: اس لیے کہ آپ ﷺ نے اس کی وصیت فرمائی تھی''۔

(شَرحُ الزُّرْقَانِي عَلَى الْمُوطَّا: ج2ص:94)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

''صَلَّى النَّاسُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَفْرَادًا لَا يَؤُمُّهُمْ اَحَدٌ، وَذٰلِكَ لِعِظَمِ اَمْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَتَنَافُسِهِمْ فِيْ اَنْ لَّا يَتَوَلَّى الْاِمَامَةَ فِي الصَّلَاةِ عَلَيْهِ وَاحِدٌ وَصَلُّوْا عَلَيْهِ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ''۔

ترجمہ: ''لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ کسی امام کے بغیر انفرادی طور پر اس لیے پڑھی، کیونکہ اس سے آپ کی عظمت اور احترام ملحوظ خاطر تھا اور صحابہ کرام کا یہ جذبہ کہ سب اس سعادت میں شریک ہوں، سعادتِ امامت کسی ایک کے لیے خاص نہ ہو، پس سب نے آپ پر بار بار نماز جنازہ پڑھی''۔

(اَلْاُمّ لِلشَّافِعِی: ج:1، ص: 314 دارالمعرفہ، بیروت)

علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ذَكَرَ ابْنُ إِسْحَاقَ وَغَيْرُهٗ: اَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ صَلَّوْا عَلَيْهِ اَفْذَاذًا، لَا يَؤُمُّهُمْ اَحَدٌ، كُلَّمَا جَاءَتْ طَائِفَةٌ صَلَّتْ عَلَيْهِ وَهٰذَا خُصُوْصٌ بِهٖ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَلَا يَكُوْنُ هٰذَا الْفِعْلُ إِلَّا عَنْ تَوْقِيْفٍ وَكَذٰلِكَ رُوِيَ اَنَّهٗ اَوْصٰى بِذٰلِكَ''۔

ترجمہ: ''ابن اسحاق وغیرہ نے بیان کیا ہے: مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ انفرادی طور پر پڑھی اور کسی نے ان کی امامت نہیں کی، جب ایک گروہ آتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز پڑھتا اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت تھی اور یہ کام توقیفی ہی ہوسکتا ہے اور اسی طرح روایت کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وصیت کی تھی، (رَوْضُ الْاَنُف: جز: 7، ص:594، داراحیاء التراث العربی)''۔ توقیفی سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل وسماع پر موقوف ہے، کسی کی عقلی سوچ کا نتیجہ نہیں ہے۔

امام احمد رضا قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنازہ کی نماز کتنی مرتبہ پڑھی گئی اور اول کس شخص نے پڑھائی تھی؟''۔

آپ نے جواب میں لکھا: ''جنازہ اَقدس پر نماز کے بارے میں اقوال مختلف ہیں: ایک

کے نزدیک یہ نمازِ معروف نہ ہوئی، بلکہ لوگ گروہ دَر گروہ حاضر ہوتے اور صلوٰۃ وسلام عرض کرتے، بعض اَحادیث بھی اس کی مؤیّد ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ: ''اَلنَّهْيُ الْحَاجِزُ عَنْ تَكْرَارِ صَلٰوةِ الْجَنَائِزْ'' میں بیان کیا ہے اور بہت علماء یہی نمازِ معروف مانتے ہیں، امام قاضی عیاض نے اسی کی تصحیح فرمائی، جیسا کہ علامہ زُرقانی کی ''شَرْحُ الْمُؤَطَّا'' میں ہے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فتنوں کے سَدِّ باب اور اُمّت کے نظمِ اجتماعی کے انتظام میں مشغول تھے، جب تک ان کے دستِ حق پرست پر بیعت نہیں ہوئی تھی، لوگ فوج در فوج آتے اور جنازۂ انور پر نماز پڑھ کر چلے جاتے۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی، تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شرعی ولی مقرر ہو گئے۔ پھر جب اُنہوں نے جنازۂ مقدس پر نماز پڑھ لی، تو اُن کے بعد کسی نے نہیں پڑھی، کیونکہ ولی کے جنازہ پڑھنے کے بعد کسی کو نمازِ جنازہ کے اعادہ کا اختیار نہیں ہے، ان تمام مطالب کی تفصیلِ قلیل، فقیر کے مذکورہ بالا رسالہ میں درج ہے۔

امام شمس الائمہ سرخسی اپنی ''مبسوط'' میں لکھتے ہیں:

''اِنَّ أَبَابَكْرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ كَانَ مَشْغُوْلًا بِتَسْوِيَةِ الْاُمُوْرِ وَتَسْكِيْنِ الْفِتْنَةِ فَكَانُوْا يُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ قَبْلَ حُضُوْرِهٖ وَكَانَ الْحَقُّ لَهٗ لِاَنَّهٗ هُوَ الْخَلِيْفَةُ فَلَمَّا فَرَغَ صَلّٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ لَمْ يُصَلِّ أَحَدٌ بَعْدَهٗ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ: ''(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (اُمّت کے) معاملات درست کرنے اور فتنہ کو فرو کرنے میں مشغول تھے، سو لوگ ان کی آمد سے پہلے آ کر صلوٰۃ پڑھتے جاتے اور حق اُن کا تھا کیونکہ وہ خلیفہ مقرر ہو چکے تھے، پھر جب وہ اُمّت کے معاملات کو نمٹانے کے بعد فارغ ہوئے تو انہوں نے نماز پڑھی، پھر آپ کے بعد کسی نے نہیں پڑھی''۔ پھر امام اہلسنّت نے مختلف کُتبِ فتاویٰ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل فرمائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''اِذَا غَسَلْتُمُوْنِيْ وَكَفَّنْتُمُوْنِيْ فَضَعُوْنِيْ عَلٰى سَرِيْرِيْ، ثُمَّ اخْرُجُوْا عَنِّيْ فَاِنَّ اَوَّلَ مَنْ يُّصَلِّيْ

عَلَيَّ جِبْرِيْلُ، ثُمَّ مِيكَائِيْلُ، ثُمَّ إِسْرَافِيْلُ، ثُمَّ مَلَكُ الْمَوْتِ مَعَ جُنُوْدِهِ مِنَ الْمَلٰئِكَةِ بِأَجْمَعِهِمْ ثُمَّ ادْخُلُوْا عَلَيَّ فَوْجًا بَعْدَ فَوْجٍ فَصَلُّوْا عَلَيَّ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا''۔

ترجمہ: ''جب تم میرے غسل وکفن سے فارغ ہو جاؤ، تو مجھے میری چارپائی پر رکھ کر باہر نکل جانا، کیونکہ سب سے پہلے جبرئیل مجھ پر صلوٰۃ پڑھیں گے، پھر میکائیل، پھر اسرافیل پھر مَلَکُ الموت اپنے سارے لشکروں کے ساتھ علیہم السلام، پھر گروہ در گروہ میرے پاس حاضر ہو کر مجھ پر درود وسلام عرض کرتے جاؤ، وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی أَعْلَمُ، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 315 بتصرُّف)''۔ صلوٰۃ کا کلمہ نماز کے لیے بھی آتا ہے اور درود کے لیے بھی۔

امام حاکم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''إِذَا غَسَّلْتُمُوْنِي وَحَنَّطْتُمُوْنِي وَكَفَّنْتُمُوْنِي فَضَعُوْنِي عَلٰى شَفِيْرِ قَبْرِيْ، ثُمَّ اخْرُجُوْا عَنِّي سَاعَةً، فَإِنَّ أَوَّلَ مَنْ يُصَلِّي عَلَيَّ خَلِيْلِي وَجَلِيْسِيْ جِبْرِيْلُ وَمِيكَائِيْلُ، ثُمَّ إِسْرَافِيْلُ، ثُمَّ مَلَكُ الْمَوْتِ مَعَ جُنُوْدٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ، ثُمَّ لِيَبْدَأْ بِالصَّلَاةِ عَلَيَّ رِجَالُ أَهْلِ بَيْتِيْ، ثُمَّ نِسَاؤُهُمْ، ثُمَّ ادْخُلُوْا أَفْوَاجًا أَفْوَاجًا وَفُرَادٰى وَلَا تُؤْذُوْنِي بِبَاكِيَةٍ، وَلَا بِرَنَّةٍ وَلَا بِصَيْحَةٍ، وَمَنْ كَانَ غَائِبًا مِنْ أَصْحَابِي فَأَبْلِغُوْهُ مِنِّي السَّلَامَ، فَإِنِّي أُشْهِدُكُمْ عَلٰى أَنِّي قَدْ سَلَّمْتُ عَلٰى مَنْ دَخَلَ فِي الْإِسْلَامِ، وَمَنْ تَابَعَنِي عَلٰى دِيْنِي هٰذَا مُنْذُ الْيَوْمِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ''۔

ترجمہ: ''جب تم مجھے غسل دے دو اور خوشبو لگا دو اور مجھے کفن پہنا دو تو مجھے میری قبر کے کنارے (سریرِ منیر) پر رکھ دینا، پھر کچھ دیر کے لیے تم سب باہر نکل جانا، کیونکہ سب سے پہلے مجھ پر صلوٰۃ میرے خلیل وجلیس جبریل ومیکائیل اور پھر اسرافیل پڑھیں گے، پھر ملک الموت اپنے ملائکہ کے تمام لشکروں کے ساتھ پڑھیں گے، پھر میرے اہلِ بیت کے مرد پڑھیں گے، پھر اُن کی خواتین پڑھیں گی، پھر تم گروہ در گروہ اور تنہا داخل ہو کر پڑھنا اور رونے، بین کرنے اور چلّانے سے مجھے اذیت نہ دینا اور میرے اصحاب میں سے جو موجود نہ ہوں، انہیں میری طرف سے سلام پہنچانا، پس میں تمہیں گواہی دیتا ہوں کہ جو اسلام میں داخل ہوا اور جس نے روزِ قیامت تک دین میں میری پیروی کی، اُس پر میرا سلام

ہو"۔(المستدرک علی الصحیحین:4399)

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز حضرت علی کے نماز جنازہ پڑھنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسی طرح وصالِ اقدس کے بعد حضور پرنور پر جو صلوٰۃ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ادا کی، ایک جماعتِ علماء اسے بھی درود ودعا کے معنی میں لیتی ہے اور حدیث امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے یہی ظاہر: "عَنْ عَلِیٍّ، قَالَ: لَمَّا وُضِعَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عَلَی السَّرِیرِ، قَالَ عَلِیٌّ: أَلَا یَقُوْمُ عَلَیْهِ أَحَدٌ لَعَلَّهٗ یَؤُمُّ، هُوَإِمَامُکُمْ حَیًّا وَمَیِّتًا، فَکَانَ یَدْخُلُ النَّاسُ رَسَلًا رَسَلًا، فَیُصَلُّوْنَ عَلَیْهِ صَفًّا صَفًّا ،لَیْسَ لَهُمْ إِمَامٌ وَیُکَبِّرُوْنَ وَعَلِیٌّ قَائِمٌ بِحِیَالِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یَقُوْلُ: سَلَامٌ عَلَیْكَ أَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَکَاتُهٗ! اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَشْهَدُ أَنْ قَدْ بَلَّغَ مَا أُنْزِلَ إِلَیْهِ وَنَصَحَ لِأُمَّتِهٖ وَجَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللهِ حَتّٰی أَعَزَّ اللهُ دِیْنَهٗ وَتَمَّتْ کَلِمَتُهٗ، اَللّٰهُمَّ فَاجْعَلْنَا مِمَّنْ یَتَّبِعُ مَا أَنْزَلَ اللهُ إِلَیْهِ وَثَبِّتْنَا بَعْدَهٗ وَاجْمَعْ بَیْنَنَا وَبَیْنَهٗ، فَیَقُوْلُ النَّاسُ آمِیْنَ آمِیْنَ! حَتّٰی صَلّٰی عَلَیْهِ الرِّجَالُ ثُمَّ النِّسَاءُ ثُمَّ الصِّبْیَانُ"۔

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جب حضور پرنور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو غسل دے کر سریر منیر پر لٹایا، حضرت مولا علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہ نے فرمایا: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے کوئی امام بن کر نہ کھڑا ہو کہ حیاتِ ظاہری میں بھی وہ تمہارے امام تھے اور وصالِ مبارک کے بعد وہی تمہارے امام ہیں۔ پس لوگ گروہ در گروہ داخل ہوتے اور صف در صف آپ پر صلوٰۃ پڑھتے، ان کا کوئی امام نہ تھا۔ علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے کھڑے عرض کرتے تھے: سلام ہو آپ پر اے نبی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ الٰہی! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو دین نازل ہوا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہنچا دیا اور ہر بات میں اپنی امت کی بھلائی کی اور راہِ خدا میں جہاد فرمایا، یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے اپنے دین کو غالب کیا اور اللہ کا قول پورا ہوا۔ الٰہی! تو ہم کو ان پر اتاری ہوئی کتاب کے پیروکاروں میں شامل فرما اور ان کے بعد بھی اس دین پر ثابت قدم رکھ اور روزِ

قیامت ہمیں ان سے ملا، مولا علی یہ دعا کرتے اور حاضرین آمین کہتے، یہاں تک کہ ان پر مردوں، پھر عورتوں اور پھر لڑکوں نے صلوٰۃ کی، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، (الطبقات الکبریٰ، ج:۲، ص:۲۹۱، دار صادر بیروت)''۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

علامہ زرقانی شرح مؤطا للامام مالک میں امیر المؤمنین حضرت علی کَرَّمَ اللہُ وَجْهَهُ الْکَرِیْم کی حدیث مذکور کے بعد لکھتے ہیں:

''وَظَاهِرُ هٰذَا أَنَّ الْمُرَادَ بِالصَّلَاةِ عَلَيْهِ مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ جَمَاعَةٌ: أَنَّ مِنْ خَصَائِصِهِ أَنَّهُ لَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِ أَصْلًا، وَإِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يَدْخُلُونَ فَيَدْعُونَ وَيَفْتَرِقُونَ، قَالَ الْبَاجِيُّ: وَلِهٰذَا وَجْهٌ وَهُوَ أَنَّهُ أَفْضَلُ مِنْ كُلِّ شَهِيدٍ، وَالشَّهِيدُ يُغْنِيهِ فَضْلُهُ عَنِ الصَّلَاةِ عَلَيْهِ، وَإِنَّمَا فَارَقَ الشَّهِيدَ فِي الْغُسْلِ لِأَنَّهُ حَذَّرَ مَنْ غَسَّلَهُ إِزَالَةَ الدَّمِ عَنْهُ، وَهُوَ مَطْلُوبٌ بَقَاؤُهُ لِطِيبِهِ وَلِأَنَّهُ عُنْوَانٌ بِشَهَادَتِهِ فِي الْآخِرَةِ، وَلَيْسَ عَلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وآله وسلم مَا يُكْرَهُ إِزَالَتُهُ عَنْهُ فَافْتَرَقَا، انْتَهٰى، وَأُجِيبَ بِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنَ الصَّلَاةِ عَلَيْهِ عَوْدُ التَّشْرِيفِ عَلَى الْمُسْلِمِينَ مَعَ أَنَّ الْكَامِلَ يَقْبَلُ زِيَادَةَ التَّكْمِيلِ''۔

ترجمہ: ''اس کا ظاہر یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ سے مراد وہی ہے جو ایک جماعت کا مذہب ہے کہ حضور اقدس کے خصائص سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نمازِ جنازہ بالکل نہ پڑھی گئی۔ پس یہ ہوا کہ لوگ داخل ہوتے اور دعا کر کے جدا ہو جاتے۔ باجی نے فرمایا: اس کی ایک وجہ ہے، وہ یہ کہ سرکار ہر شہید سے افضل ہیں اور شہید کو اس قدر فضیلت حاصل ہے کہ اس کی نمازِ جنازہ کی ضرورت نہیں۔ رہا یہ کہ غسل کے بارے میں سرکار کا معاملہ شہید سے الگ رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شہید کو غسل اس لیے نہیں دیا جاتا کہ اس پر جو خون لگا ہے، وہ زائل ہو جائے گا جب کہ اس کی پاکیزگی کے باعث اس کا باقی رہنا مطلوب ہے اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ اس کی شہادت کا نشان ہوگا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم پر ایسی کوئی چیز نہیں جسے زائل کرنا پسندیدہ ہو، اس لیے یہ حکم الگ الگ''۔ پھر اس کا جواب نقل کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو شرف حاصل ہو،

مزید یہ کہ کامل تکمیل کو قبول کرتا ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مراتب کمال لامتناہی ہیں)، (شرح الزرقانی علی المؤطا، ج:۲،ص:۹۴)،(فتاویٰ رضویہ، ج:۹،ص: ۲۸۴۔۲۸۷، ملخصاً و ملتقطاً، رضا فاؤنڈیشن لاہور)"۔

نوٹ: اصل کتاب میں "یَدْعُوْنَ وَیَفْتَرِقُوْنَ" کی جگہ "یَدْعُوْنَ وَیُصَدِّقُوْنَ" ہے۔

بعض بددین لوگ تعریض کرتے ہیں کہ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جنازہ رکھا ہوا تھا اور یہ لوگ اُمورِ خلافت طے کرنے میں مصروف تھے، ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُس وقت دین کا سب سے ترجیحی مسئلہ خلیفہ کا انتخاب تھا، کیونکہ خلیفہ ہی کو اُمت کے نظمِ اجتماعی کے معاملات کو لے کر آگے چلنا تھا، آج بھی دنیا بھر کی ملتوں اور قوموں کا نظمِ اجتماعی تسلسل کا تقاضا کرتا ہے اور مذہب کے امتیاز کے بغیر یہ شعار آج بھی دنیا کی تمام ملتوں اور قوموں میں رائج ہے کہ اگر وقت کا بادشاہ یا سربراہِ مملکت اپنے عہدِ اقتدار میں فوت ہو جائے، تو اس کی آخری رسوم ادا کرنے سے پہلے اس کے عارضی یا مستقل جانشین کا انتخاب کیا جاتا ہے اور پھر اُسی کی سربراہی میں آخری رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مِن جملہ حیثیات میں سے ایک یہ تھی کہ آپ اُس وقت کی اسلامی ریاست اور نظمِ اجتماعی کے حاکمِ اعلیٰ تھے، لہٰذا نظمِ اجتماعی کے تسلسل کے لیے لازم تھا کہ پہلے آپ کے جانشین کا انتخاب ہوتا اور نظمِ اجتماعی کے امور، جس میں آپ کا جنازہ و تدفین شامل ہے، وہی آپ کا نائب قرار پاتا، پس جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہو گئے تو وہ آپ کے شرعی ولی مقرر ہو گئے، امامِ اہلسنت مجدد دین و ملت امام احمد رضا قادری محدثِ بریلی قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز کا موقف یہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مُحِبّ صادق علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی نے اپنی سیرت کی کتاب "سُبُلُ الْهُدٰی وَالرَّشَاد" میں باب باندھا ہے:

"جِمَاعُ اَبْوَابِ مَرَضِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَوَفَاتِهٖ" اور امام بخاری نے باب باندھا: "بَابُ وَفَاةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ"، احادیثِ مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصالِ مبارک کے لیے "تُوُفِّیَ"

رَسُولِ اللهِ ﷺ" (یعنی آپ ﷺ کی وفات ہوئی) کے کلمات آئے ہیں، (صحیح بخاری:1399)۔ سَیِّدُ الْمُرْسَلِیْن رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن سَیِّدُنَا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ﷺ کے وصالِ مبارک کے بعد دیگر احکامِ شرعی بھی جاری ہوئے مثلاً: غسلِ مبارک، کفن پہنانا، قبرِ انور میں تدفین وغیرہ اور منہاجِ نبوت پر اُمّت کے نظمِ اجتماعی کے اُمور چلانے کے لیے خلافت وامارت کا نظام قائم کیا جانا وغیرہ۔ الغرض اکابرِ اُمّت سے دونوں طرح کی روایات ثابت ہیں، اسے باعثِ نزاع نہیں بنانا چاہیے، ہماری نظر میں چونکہ ظاہری علامات کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے وصال فرمایا اور نمازِ جنازہ اسلام کا شِعار ہے، اس لیے آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھے جانے کا قول راجح ہے، لیکن اس میں بھی دعائے مغفرت شامل نہیں ہے، آپ ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کو جنازہ کے قائم مقام سمجھتے ہیں، اُس کی بابت بھی روایات موجود ہیں، فریقین کو ایک دوسرے پر طعن نہیں کرنا چاہیے، نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ معروف نمازِ جنازہ کا قائل مسلک سے خارج ہو جاتا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

علامہ نووی لکھتے ہیں: "قاضی عیاض نے فرمایا: امام مسلم نے رسول اللہ ﷺ کے کفن اور آپ کی قبر کے بارے میں احادیث ذکر کی ہیں اور آپ کے غسل اور نمازِ جنازہ کے بارے میں احادیث ذکر نہیں کیں۔ آپ کے غسل کے بارے میں سب اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کو غسل دیا گیا اور نمازِ جنازہ پڑھے جانے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: آپ کی نمازِ جنازہ بالکل نہیں پڑھی گئی، لوگ فرداً فرداً جا کر دعا کر کے لوٹ آتے تھے اور اس کی وجہ میں پھر اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا: آپ اپنی فضیلت کی وجہ سے نماز سے مستغنی تھے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ کو غسل بھی نہیں دیا جاتا۔ بعض نے کہا: اس وقت کوئی امام مقرر نہیں تھا اور یہ بھی غلط ہے، کیونکہ نمازیں پڑھی جاتی تھیں اور نماز باجماعت معطل نہیں ہوئی تھی اور حضرت ابوبکر کی بیعت آپ کے دفن سے پہلے مکمل ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکر دفن سے پہلے مسلمانوں کے امام اور خلیفہ مقرر ہو چکے تھے، صحیح نظریہ

جس پر جمہور قائم ہیں، وہ یہ ہے کہ آپ کی نمازِ جنازہ فرداً فرداً پڑھی گئی۔ ایک جماعت جاتی اور سب اکیلے اکیلے نماز جنازہ پڑھتے، پھر وہ جماعت باہر آجاتی اور دوسری جماعت چلی جاتی۔ مردوں کے بعد عورتوں نے نماز جنازہ پڑھی، پھر بچوں نے پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ کے دفن کو پیر سے بدھ تک مؤخر کرنے میں حکمت یہ تھی کہ بیعت مکمل ہوجائے اور مسلمانوں کا ایک امیر منتخب ہوجائے تاکہ کسی نزاع اور اختلاف کے وقت اس کی اطاعت کی جاسکے"۔ (شرح صحیح مسلم، ج:۱، ص: ۳۱۲، نور محمد اصح المطابع کراچی)

رسول اللہ ﷺ کی جنازہ کے متعلق اس سے پہلے ہم علامہ شمس الدین سرخسی کی طویل عبارت بھی نقل کرچکے ہیں، جس طرح قاضی عیاض اور علامہ نووی نے فرمایا: جمہور کا یہ نظریہ ہے کہ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی ہے۔ شمائل ترمذی میں امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ حدیث ذکر کی ہے کہ آپ کی نمازِ جنازہ میں تکبیرات، ثنا اور درود شریف کو پڑھا گیا، (شرح صحیح مسلم، ج:۲، ص: ۸۱۳۔ ۸۱۲، فرید بک اسٹال لاہور)"۔

**خلاصۂ کلام:** سید المرسلین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر نمازِ جنازہ کے حوالے سے سَلف سے خلف تک اکابرِ امت کی دو آرا ہیں: (1) آپ کا جنازہ گروہ در گروہ اور فرداً فرداً معروف طریقے سے پڑھا گیا، لیکن اس کے آخر میں "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا" والی دعا شامل نہیں تھی، بلکہ آپ کے فضائل مبارکہ اور شانِ رفیع کا ذکر تھا۔ (2) سب گروہ در گروہ یا فرداً فرداً آتے اور آپ کی خدمت میں صلوٰۃ وسلام عرض کرتے، آپ کی دعوت وابلاغِ دین کی تصدیق کرتے، آپ پر نازل کردہ کلامِ الٰہی اور وحیِ ربانی پر ایمان لانے کا اقرار کرتے اور آخرت میں آپ کے ساتھ جمع ہونے کی دعا کرتے۔ ان دونوں میں سے کسی بھی رائے کو اختیار کرنے میں کوئی شرعی خرابی لازم نہیں آتی اور امام اہلسنت نے معروف نمازِ جنازہ والی رائے پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، لہٰذا اپنے دلائل سے کوئی کسی رائے کو ترجیح دے، تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے۔

(3) مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں امام کوئی نہیں تھا، کیونکہ صحابہ نے چاہا کہ سب کو یہ سعادت حاصل ہو اور کسی کا اختصاص نہ رہے، (4) جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جانشین اور خلیفۂ اول منتخب ہو چکے اور صحابۂ کرام نے اُن کی بیعتِ عام کرلی، تو وہ آپ کے شرعی ولی قرار پائے، اس لیے اُن کے بعد نمازِ جنازہ یا صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کا سلسلہ موقوف کردیا گیا اور آپ کی تدفین مبارک کردی گئی۔

مندرجہ بالا عبارات میں یہ بحث آئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جنازہ معروف طریقے سے پڑھا گیا یا صحابۂ کرام گروہ در گروہ اور فرداً فرداً آتے اور صلوٰۃ وسلام عرض کرکے اور آپ کے فضائل بیان کرکے چلے جاتے۔ یہاں ''معروف طریقے'' سے یہ مراد نہیں ہے کہ جسدِ انور سامنے رکھا گیا، ایک شخص امام بنا اور باقی صف در صف مقتدی بنے اور مسنون طریقے سے نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ بلکہ اس بحث کا مطلب یہ ہے کہ آیا اسے جنازے کا نام دیا جائے یا محض صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کا، اس میں دو آراء ہیں۔ ورنہ بہارِ شریعت میں متعدد دعائیں مذکور ہیں اور بچوں کے لیے الگ دعا ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ یہ عصرِ حاضر کی طرح معروف اور معتاد جنازہ نہ تھا، ہماری رائے میں امامِ اہلسنت کا یہ قول ''جنازہ معروف طریقہ سے نہ ہوا''، اسی مفہوم کا حامل ہے۔

## میت کی مسہری پر پرچم رکھنا

**سوال:**

ہمارے ملک میں یہ رواج بن گیا ہے کہ جب کسی سیاسی پارٹی کا بڑا شخص مرتا ہے یا شہید ہوجاتا ہے تو سیاسی پارٹی والے میت کی مسہری اور قبر پر اُس پارٹی کا جھنڈا ڈال دیتے ہیں، اسی طرح شہید ہونے والے فوجیوں کی مسہری کو قومی پرچم میں لپیٹا جاتا ہے، یہ عمل کہاں تک درست یا غلط ہے، اگر غلط ہے تو ملک کے جھنڈے کہاں تک درست ہیں؟

(اسلم خان ترین، ڈسٹرکٹ ہرنائی)

**جواب:**

اس رواج کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے اور شریعت میں کسی مقام پر اس کی ممانعت بھی نہیں آئی ہے، اس میں دینی برکت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ میت کو قبر میں رکھتے

وقت پرچم اتار لیتے ہوں۔فوجی شہداء کی تکریم کے طور پر بھی ان کے تابوت کے اوپر قومی پرچم لپیٹا ہوتا ہے، یہ شہید کی تکریم کا ایک دنیاوی شِعار ہے، جیسے قومی ترانہ کھڑے ہو کر سننا،لیکن شہید کی میت کو قبر میں رکھتے وقت قومی پرچم اتار لیا جاتا ہے،اس کی شریعت میں نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی اس کی ممانعت ہے۔جب ہم کسی چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے،تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر کوئی اُخروی اجر و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ یہ جدید دنیا میں شہید کو اکرام کے ساتھ رخصت کرنے کا ایک شعار ہے، جنازے یا قبر پر فوجی سلامی کی بھی یہی حیثیت ہے۔البتہ بطورِ تبرُّک کسی بزرگ سے منسوب کسی شے کو میت سے لاحق کرنا شرعاً جائز ہے۔حدیث پاک میں رسول اللہ ﷺ کا رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے بیٹے کی درخواست پر اُس کے کفن کے لیے اپنی قمیص دینا ثابت ہے:

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ أُبَيٍّ لَمَّا تُوُفِّيَ، جَاءَ ابْنُهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَعْطِنِيْ قَمِيْصَكَ أُكَفِّنْهُ فِيْهِ وَصَلِّ عَلَيْهِ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ فَأَعْطَاهُ النَّبِيُّ ﷺ قَمِيْصَهُ“۔

ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: جب عبداللہ بن اُبَیّ فوت ہوا تو اس کا بیٹا (عبداللہ بن عبداللہ) رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! آپ مجھے اپنی قمیص مبارک عطا فرمایئے تاکہ میں اس میں اپنے والد کو کفن دوں اور اُس کی نمازِ جنازہ پڑھایئے اور اُس کے لیے مغفرت کی دعا فرمایئے، پس رسول اللہ ﷺ نے اُسے اپنی قمیص عنایت فرمائی، (صحیح بخاری:1269)“۔

(ا) ”عَنْ سَهْلٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً جَاءَتِ النَّبِيَّ ﷺ بِبُرْدَةٍ مَنْسُوجَةٍ، فِيهَا حَاشِيَتُهَا، أَتَدْرُونَ مَا الْبُرْدَةُ، قَالُوا: اَلشَّمْلَةُ، قَالَ: نَعَمْ، قَالَتْ: نَسَجْتُهَا بِيَدِي فَجِئْتُ لِأَكْسُوَكَهَا، فَأَخَذَهَا النَّبِيُّ ﷺ مُحْتَاجًا إِلَيْهَا، فَخَرَجَ إِلَيْنَا وَإِنَّهَا إِزَارُهُ، فَحَسَّنَهَا فُلَانٌ، فَقَالَ: اكْسُنِيهَا، مَا أَحْسَنَهَا، قَالَ الْقَوْمُ: مَا أَحْسَنْتَ، لَبِسَهَا النَّبِيُّ ﷺ مُحْتَاجًا إِلَيْهَا، ثُمَّ سَأَلْتَهُ، وَعَلِمْتَ أَنَّهُ لَا يَرُدُّ، قَالَ: إِنِّي وَاللهِ، مَا سَأَلْتُهُ

لِأَلْبَسَهُ، إِنَّمَا سَأَلْتُهُ لِتَكُونَ كَفَنِي، قَالَ سَهْلٌ: فَكَانَتْ كَفَنَهُ"۔

ترجمہ: ''حضرت سہل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں خوبصورت بُنی ہوئی حاشیہ والی چادر لائی، تمہیں معلوم ہے کہ بُردہ کسے کہتے ہیں، انہوں نے جواب دیا: وہ بڑی چادر ہے، کہا: ہاں، اُس عورت نے عرض کی: میں نے خود یہ چادر بُنی ہے، تاکہ آپ کو پہناؤں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ چادر لے لی، اس وقت آپ کو اِس کی ضرورت بھی تھی، آپ ہمارے پاس وہ چادر پہن کر آئے، (اُنہوں نے نام لے کر کہا): فلاں شخص کہنے لگا: یہ کتنی اچھی چادر ہے، یہ آپ مجھے عطا فرما دیجیے۔ اس پر حاضرین نے اُسے کہا: تو نے اچھا نہیں کیا، اس چادر کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہنا تھا اور اس وقت آپ کو اس کی ضرورت تھی، پھر تم نے اس کو مانگ لیا اور تم کو معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سوال کو رَد نہیں فرماتے، اُس شخص نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے اسے پہننے کے لیے نہیں اپنے کفن کے لیے طلب کیا ہے۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ چادر مبارک اس شخص کا کفن بنی، (صحیح بخاری: 1277)''۔

(۲) ''عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ، قَالَتْ: تُوُفِّيَتْ بِنْتُ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لَنَا: اغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا، أَوْ خَمْسًا أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ، فَإِذَا فَرَغْتُنَّ فَآذِنَّنِي، فَلَمَّا فَرَغْنَا آذَنَّاهُ فَنَزَعَ مِنْ حِقْوِهِ إِزَارَهُ، وَقَالَ: أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادی فوت ہوگئیں، پس آپ نے ہم سے فرمایا: ان کو تین مرتبہ غسل دو یا پانچ مرتبہ یا اگر تم چاہو تو اس سے زیادہ مرتبہ دو، پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے مطلع کرنا، پھر جب ہم فارغ ہوگئیں تو ہم نے آپ کو مطلع کیا، آپ نے اپنا تہبند اتار کر ہمیں دیا اور فرمایا: اس کو اُن کے جسم سے ملا دینا''۔
(صحیح بخاری: 1257)

(۳) امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں: ابونعیم نے معرفۃ الصحابہ اور دیلمی نے مسند الفردوس میں بسند حسن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی:

''لَمَّا مَاتَتْ فَاطِمَةُ أُمُّ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، خَلَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَمِيصَهُ وَأَلْبَسَهَا

اِیَّاہُ، وَاضْطَجَعَ فِی قَبْرِهَا، فَلَمَّا سَوّٰی عَلَیْهَا التُّرَابَ، قَالَ بَعْضُهُمْ: یَارَسُوْلَ اللهِ! رَأَیْنَاکَ صَنَعْتَ شَیْئًا لَمْ تَصْنَعْهُ بِاَحَدٍ، فَقَالَ: اِنِّیْ اَلْبَسْتُهَا قَمِیْصِیْ لِتَلْبَسَ مِنْ ثِیَابِ الْجَنَّةِ وَاضْطَجَعْتُ مَعَهَا فِیْ قَبْرِهَا لِاُخَفِّفَ عَنْهَا مِنْ ضَغْطَةِ الْقَبْرِ، اَنَّهَا کَانَتْ اَحْسَنَ خَلْقِ اللهِ صَنِیْعًا اِلَیَّ بَعْدَ اَبِیْ طَالِبٍ"۔

ترجمہ: "جب حضرت علی کَرَّمَ اللهُ وَجْهَه کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنا کُرتا اتار کر انہیں پہنایا اور اُن کی قبر (متبرک کرنے کے لیے اس) میں لیٹے، جب قبر پر مٹی برابر کر دی گئی، تو کسی نے عرض کی: یارسول اللہ! آج ہم نے آپ کو ایسا عمل کرتے دیکھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے (پہلے) کسی کے ساتھ نہیں کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: انہیں میں نے اپنا کُرتا اس لیے پہنایا کہ یہ جنت کے کپڑے پہنے اور ان کی قبر میں اس لیے لیٹا تا کہ قبر کے دبانے میں ان سے تخفیف کروں، یہ ابوطالب کے بعد خلقِ خدا میں سب سے زیادہ میرے ساتھ نیک سلوک کرنے والی تھیں"۔ مزید لکھتے ہیں: امام ابوعمر یوسف بن عبدالبر کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں فرماتے ہیں:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے انتقال کے وقت وصیت میں فرمایا:

"اِنِّیْ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ لِحَاجَةٍ فَاَتْبَعْتُهُ بِاِدَاوَةٍ فَکَسَانِیْ اَحَدَ ثَوْبَیْهِ الَّذِیْ یَلِیْ جَسَدَهٗ فَخَبَأْتُهٗ لِهٰذَا الْیَوْمِ، وَاَخَذَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ مِنْ اَظْفَارِهٖ وَشَعْرِهٖ ذَاتَ یَوْمٍ فَاَخَذْتُهٗ، فَخَبَأْتُهٗ، لِهٰذَا الْیَوْمِ فَاِذَا اَنَا مِتُّ فَاجْعَلْ ذٰلِکَ الْقَمِیْصَ دُوْنَ کَفَنِیْ مِمَّا یَلِیْ جَسَدِیْ وَخُذْ ذٰلِکَ الشَّعْرَ وَالْاَظْفَارَ فَاجْعَلْهُ فِیْ فَمِیْ وَعَلٰی عَیْنِیْ وَمَوَاضِعَ السُّجُوْدِ مِنِّیْ"۔

ترجمہ: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت سے شرف یاب ہوا، ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حاجت کے لیے تشریف فرما ہوئے، میں لوٹا لے کر ہمراہ رکاب سعادت مآب ہوا۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے جوڑے سے کُرتا کہ بدنِ اقدس سے متصل تھا، مجھے انعام فرمایا، وہ کُرتا میں نے آج کے لیے چھپا رکھا تھا اور ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ناخن و مُوئے مبارک

تراشے وہ میں نے لے کر اس دن کے لیے اٹھا رکھے، جب میں مرجاؤں تو قمیص سراپا تقدیس کو میرے کفن کے نیچے بدن کے متصل رکھنا اور موئے مبارک اور پاکیزہ ناخنوں کو میرے منہ اور آنکھوں اور اعضائے سجدہ (پیشانی اور ناک وغیرہ) پر رکھ دینا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد9،ص:115)

## زوال کے وقت نمازِ جنازہ پڑھنا

**سوال:**

ایک جنازہ جس کا وقت 11 بجے مقرر تھا، جگہ کی تبدیلی کہ وجہ سے 11:20 پر پہنچا اور 11:35 پر ادا کیا گیا، اس دن زوال کا وقت 11:22 تا 11:55 تھا، کیا جنازہ ادا ہوگیا؟۔ اس کے علاوہ دو جنازے ایسے تھے، جن کا وقت ہی 11:30 رکھا گیا اور اسی وقت ادا کیے گئے، کیا زوال کے وقت پڑھی گئی نمازِ جنازہ واجب الاعادہ ہے''۔ (محمد شفیق، چکوال)

**جواب:**

حدیث پاک میں نمازِ جنازہ اور تدفین میں جلدی کرنے کا حکم دیا گیا، احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱)''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُوْنَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوٰى ذٰلِكَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: جنازہ کو جلدی لے جاؤ، پس اگر وہ نیک ہے تو تم اس کو بھلائی کی طرف جلدی پہنچا رہے ہو اور اگر وہ اس کے سوا (یعنی بدکار) ہے تو تم شر کو اپنی گردنوں سے اتار رہے ہو، (صحیح بخاری:1315)''۔

(۲)''عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تُؤَخِّرُوا الْجَنَازَةَ إِذَا حَضَرَتْ''۔

ترجمہ:''حضرت علی بن ابوطالب بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جنازہ حاضر ہو تو (نمازِ جنازہ میں) تاخیر نہ کرو، (سُنن ابن ماجہ:1486)''۔

(۳) ''عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ لَهُ: يَا عَلِيُّ! ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا اَلصَّلَاةُ إِذَا أَتَتْ، وَالْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ، وَالْأَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفْئًا''۔

ترجمہ: ''حضرت علی بن ابوطالب بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اُن سے فرمایا: اے علی! تین کاموں میں تاخیر نہ کرو: نماز کی ادائیگی جب نماز کا وقت آجائے، جنازہ جب حاضر ہو، بے شوہر عورت (خواہ کنواری ہو یا بیوہ یا مطلّقہ) کے لیے جب اُس کا کفول جائے، (سُنن ترمذی:1075)''۔

نمازِ جنازہ ہر وقت مشروع ہے یہاں تک کہ اوقاتِ مکروہہ میں بھی، اگر جنازہ اُسی وقت آیا ہو، صاحبِ ہدایہ مُتوفّٰی 593ھ فرماتے ہیں:

''لَا تَجُوْزُ الصَّلَاةُ عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَلَا عِنْدَ قِيَامِهَا فِي الظَّهِيْرَةِ وَلَا عِنْدَ غُرُوْبِهَا لِحَدِيْثِ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: ثَلَاثَةُ أَوْقَاتٍ نَهَانَا رَسُوْلُ اللهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ أَنْ نُّصَلِّيَ فِيْهَا وَأَنْ نَقْبِرَ فِيْهَا مَوْتَانَا عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ حَتّٰى تَرْتَفِعَ وَعِنْدَ زَوَالِهَا حَتّٰى تَزُوْلَ وَحِيْنَ تَضِيْفُ لِلْغُرُوْبِ حَتّٰى تَغْرُبَ وَالْمُرَادُ بِقَوْلِهٖ وَأَنْ نَّقْبِرَ صَلَاةُ الْجَنَازَةِ لِأَنَّ الدَّفْنَ غَيْرُ مَكْرُوْهٍ''۔

ترجمہ: ''طلوعِ شمس، غروبِ شمس اور نصف النہار کے اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ عقبہ بن عامر کی روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان تین (مکروہ) اوقات میں نماز پڑھنے اور دفن کرنے سے منع فرمایا ہے، وہ یہ ہیں: طلوعِ شمس کے وقت یہاں تک کہ سورج بلند ہوجائے اور زوال کے وقت یہاں تک کہ زائل ہوجائے اور جب آفتاب غروب ہونے لگے یہاں تک کہ بالکل غروب ہوجائے، مراد یہ ہے کہ ان اوقات میں نمازِ جنازہ مکروہ ہے، دفن کرنا مکروہ نہیں ہے''۔۔۔نیز لکھتے ہیں:

''وَلَا صَلَاةُ جَنَازَةٍ لِمَا رَوَيْنَا وَلَا سَجْدَةُ تِلَاوَةٍ لِأَنَّهَا فِي مَعْنَى الصَّلَاةِ، وَالْمُرَادُ بِالنَّفْيِ الْمَذْكُوْرِ فِي صَلَاةِ الْجَنَازَةِ وَسَجْدَةِ التِّلَاوَةِ الْكَرَاهَةُ حَتّٰى لَوْ صَلَّاهَا فِيْهِ أَوْ تَلَا فِيْهِ آيَةَ السَّجْدَةِ فَسَجَدَهَا، جَازَ لِأَنَّهَا أُدِّيَتْ نَاقِصَةً كَمَا وَجَبَتْ إِذِ الْوُجُوْبُ بِحُضُوْرِ

الْجَنَازَةِ وَالتِّلَاوَةِ"۔

یعنی قدوری کی عبارت میں نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت کے حوالے سے جو جواز کی نفی کی گئی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان اوقات میں اصلاً نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت کا انعقاد نہیں ہوگا جیسا کہ باقی فرائض منعقد نہیں ہوتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز جنازہ اور سجدہ صحیح تو ہوگا مگر کراہیت کے ساتھ، یعنی عدم جواز سے مکروہ ہونا مراد ہے، کیونکہ ناقص وقت میں یہ واجب ہوئے اور اسی وقت میں ادا کردیے گئے۔

چنانچہ علامہ محمود بابرتی حنفی مُتوفّٰی 786ھ صاحبِ ہدایہ کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(وَالْمُرَادُ بِالنَّفْيِ الْمَذْكُورِ فِي صَلَاةِ الْجَنَازَةِ) يَعْنِيْ أَنَّ الْمُرَادَ بِالنَّفْيِ الْمَذْكُورِ فِي صَلَاةِ الْجَنَازَةِ وَسَجْدَةِ التِّلَاوَةِ بِقَوْلِهٖ: وَلَا صَلَاةُ جَنَازَةٍ وَلَا سَجْدَةُ تِلَاوَةٍ هُوَ الْكَرَاهِيَةُ، يَعْنِي بِهٖ نَفْيَ عَدَمِ الْجَوَازِ، بِخِلَافِ الْفَرَائِضِ فِي هٰذِهِ الْاَوْقَاتِ الثَّلَاثَةِ سِوٰى عَصْرِ يَوْمِهٖ، فَإِنَّ قَوْلَهٗ لَا تَجُوْزُ الصَّلَاةُ عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ إِلٰى آخِرِهٖ مُجْرًى عَلٰى حَقِيْقَةِ عَدَمِ الْجَوَازِ، (العنایہ شرح الہدایہ، ج1ص 235_236)"۔

ترجمہ: مکروہ اوقات میں نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت کی نفی سے مراد کراہت ہے، بخلاف فرائض کے کہ ان اوقات میں ان کا پڑھنا جائز نہیں ہے، سوا اس کے کہ اُس دن کی عصر کی نماز کراہت سے خالی وقت میں نہ پڑھی ہو تو (قضا کرنے کی بجائے) غروبِ آفتاب سے پہلے مکروہِ تحریمی وقت میں پڑھ لی جائے، کیونکہ صاحبِ ہدایہ کی عبارت کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان اوقات میں فرض نماز جائز نہیں ہے، (العنایہ شرح الہدایہ، ج1 ص 235_236)"۔

علامہ ابوبکر بن محمد الحدادی الحنفی مُتوفّٰی 800ھ لکھتے ہیں:

"(قَوْلُهٗ: وَلَا يُصَلِّيْ عَلٰى جَنَازَةٍ وَلَا يَسْجُدُ لِتِلَاوَةٍ) هٰذَا إِذَا وَجَبَتَا فِيْ وَقْتٍ مُبَاحٍ وَأُخِّرَتَا إِلٰى هٰذَا الْوَقْتِ فَإِنَّهٗ لَا يَجُوْزُ قَطْعًا أَمَّا لَوْ وَجَبَتَا فِيْ هٰذَا الْوَقْتِ وَأُدِّيَتَا فِيْهِ جَازَ، لِأَنَّهَا أُدِّيَتْ نَاقِصَةً كَمَا وَجَبَتْ، إِذِ الْوُجُوْبُ بِحُضُوْرِ الْجَنَازَةِ وَالتِّلَاوَةِ فَإِنْ قُلْتَ: مَا

الْأَفْضَلُ الْأَدَاءُ أَوِ التَّأخِيرُ إِلٰى وَقْتٍ مُبَاحٍ، قُلْتُ: أَمَّا فِي صَلَاةِ الْجَنَازَةِ فَالْأَفْضَلُ الْأَدَاءُ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: "عَجِّلُوْا بِمَوْتَاكُمْ" وَقَالَ: ثَلَاثٌ لَا يُؤَخَّرْنَ جَنَازَةٌ أَتَتْ وَدَيْنٌ وَجَدْتَ مَا تَقْضِيْهِ وَبِكْرٌ وُجِدَ لَهَا كُفْوٌ، وَأَمَّا فِي سَجْدَةِ التِّلَاوَةِ فَالْأَفْضَلُ التَّأخِيرُ، لِأَنَّ وُجُوْبَهَا عَلَى التَّرَاخِيْ وَفِي الْهِدَايَةِ اَلْمُرَادُ بِالنَّهْيِ الْمَذْكُوْرِ فِيْ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ وَسَجْدَةِ التِّلَاوَةِ الْكَرَاهَةُ حَتّٰى لَوْ صَلَّاهَا فِيْهِ أَوْ تَلَا سَجْدَةً فِيْهِ وَسَجَدَهَا جَازَ، لِأَنَّهَا أُدِّيَتْ نَاقِصَةً كَمَا وَجَبَتْ"۔

ترجمہ: "(ان اوقات میں) نہ نمازِ جنازہ پڑھے اور نہ سجدۂ تلاوت کرے، یہ مسئلہ اُس صورت میں ہے کہ یہ دونوں (نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت) مباح وقت میں واجب ہوئے ہوں اور انہیں وقتِ مکروہ تک مؤخر کیا گیا ہو، کیونکہ یہ صورت قطعاً جائز نہیں ہے، لیکن اگر اُسی (مکروہ) وقت میں واجب ہوئے ہوں اور اُسی وقت ادا کردیے گئے ہوں، تو جائز ہے، کیونکہ یہ ناقص وقت میں واجب ہوئے اور ناقص وقت میں ادا کردیے گئے، اس لیے کہ ان اوقات میں جنازے کے آجانے یا آیتِ سجدہ پڑھے جانے کے سبب واجب ہوئے، اگر سوال کیا جائے کہ ایسی صورت میں افضل کیا ہے، آیا اُسی مکروہ وقت میں ادا کردیے جائیں یا مباح وقت تک مؤخر کردیے جائیں، میں کہتا ہوں: نمازِ جنازہ کا تو اُسی وقت ادا کرنا افضل ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "اپنے مردوں کو قبر تک پہنچانے میں جلدی کرو" اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو: ایک نمازِ جنازہ، جبکہ جنازہ حاضر ہو، دوسرا قرض کہ اُس کی ادائیگی پر قادر ہوجائے اور کنواری عورت جبکہ اُس کے لیے ہمسر رشتہ مل جائے"، لیکن سجدۂ تلاوت کو مباح وقت تک مؤخر کرنا افضل ہے، کیونکہ اس کی ادائیگی کے وجوب میں تاخیر کی گنجائش ہے اور ہدایہ میں ہے: نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت کی نہی سے مراد یہ ہے کہ اگر ادا کیے گئے تو کراہت کے ساتھ ہوگی حتیٰ کہ اگر اس میں جنازہ پڑھ لیا یا آیتِ سجدہ پڑھ لی اور سجدہ کرلیا تو جائز ہے، کیونکہ یہ ناقص واجب ہوئے تھے اور ناقص ادا ہوگئے، (الجوہرۃ النیرۃ، ج 1 ص 69)"۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَیَنْعَقِدُ نَفْلٌ بِشُرُوْعٍ فِیْهَا بِکَرَاهَةِ التَّحْرِیْمِ لَا یَنْعَقِدُ الْفَرْضُ وَمَاهُوَ مُلْحَقٌ بِهٖ کَوَاجِبٍ لِعَیْنِهٖ کَوِتْرٍ وَسَجْدَةِ تِلَاوَةٍ، وَصَلَاةِ جَنَازَةٍ، تُلِیَتِ الْآیَةُ فِیْ کَامِلٍ وَحَضَرَتِ الْجَنَازَةُ قَبْلَ لِوُجُوْبِهٖ کَامِلًا فَلَا یَتَأَدّٰی نَاقِصًا، فَلَوْ وَجَبَتَا فِیْهَا لَمْ یُکْرَهْ فِعْلُهُمَا أَیْ تَحْرِیْمًا وَفِی التُّحْفَةِ الْاَفْضَلُ أَنْ لَا تُؤَخَّرَ الْجَنَازَةُ''۔

ترجمہ: ''ان (مکروہ) اوقات میں نفل نماز کراہت تحریم کے ساتھ ہوجائے گی، فرض ادا نہیں ہوگا اور جو اس سے ملحق ہے، مثلاً واجب لعینہٖ، جیسے وتر اور سجدۂ تلاوت و نمازِ جنازہ جبکہ آیتِ سجدہ کامل وقت میں پڑھی گئی ہو اور جنازہ وقت مکروہ سے پہلے آ گیا ہو اس لیے کہ ان کا وجوب کامل ہُوا تو ناقص طور پر ادائیگی نہ ہوگی، ہاں اگر ان دونوں کا وجوب ان ہی اوقات میں ہوا ہو تو ان اوقات میں ان کی ادائیگی مکروہِ تحریمی نہیں۔ تحفہ میں ہے: افضل یہ ہے کہ جنازہ میں دیر نہ کی جائے، (جلد 2، ص: 539-536، دمشق)''۔

جنازہ اگر ممنوع اوقات میں لایا گیا ہو تو اسی وقت پڑھ لیں، اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، کراہت اس صورت میں ہے کہ جنازہ پہلے سے تیار موجود ہے اور تاخیر کی یہاں تک کہ مکروہ وقت داخل ہوگیا۔ علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی 1161ھ لکھتے ہیں:

''هٰذَا إِذَا وَجَبَتْ صَلَاةُ الْجَنَازَةِ وَسَجْدَةُ التِّلَاوَةِ فِیْ وَقْتٍ مُبَاحٍ وَأُخِّرَتَا إِلٰی هٰذَا الْوَقْتِ فَإِنَّهٗ لَا یَجُوْزُ قَطْعًا، أَمَّا لَوْ وَجَبَتَا فِیْ هٰذَا الْوَقْتِ وَأُدِّیَتَا فِیْهِ جَازَ، لِأَنَّهَا أُدِّیَتْ نَاقِصَةً کَمَا وَجَبَتْ، کَذَا فِی ''السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ'' وَهٰکَذَا فِی ''الْکَافِیْ'' و ''التَّبْیِیْنُ'' لٰکِنَّ الْاَفْضَلَ فِیْ سَجْدَةِ التِّلَاوَةِ تَأْخِیْرُهَا وَفِیْ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ التَّأْخِیْرُ مَکْرُوْهٌ''۔

ترجمہ: ''یہ اس وقت ہے کہ جب نمازِ جنازہ یا سجدۂ تلاوت مباح وقت میں واجب ہوا اور پھر ان دونوں کو وقتِ مکروہ تک موخر کیا، تو ادائیگی قطعاً جائز نہیں ہے، لیکن اگر نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت مکروہ وقت میں واجب ہوئے، تو اسی وقت میں ادا کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ جیسے ناقص وقت میں واجب ہوئے، اسی طرح ناقص وقت میں ادا کردیے گئے، ''سراج

الوہاج'' اور ''تبیین'' میں اسی طرح ہے، لیکن سجدۂ تلاوت میں تاخیر کرنا افضل ہے اور نمازِ جنازہ میں تاخیر کرنا مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد اول، ص:52)''۔

لیکن اگر جنازہ دانستہ مؤخر کر کے مکروہ وقت میں پڑھ لیا گیا ہے تو ادا ہو گیا، دوبارہ صحیح وقت میں اس کا اعادہ یا قضا نہیں ہے، کیونکہ نماز جنازہ کی تکرار جائز نہیں ہے، البتہ یہ فعل مکروہ تحریمی ہے، البتہ جنازہ مکروہ وقت ہی میں آئے، تو اسے اُسی وقت پڑھ سکتے ہیں، کیونکہ جس طرح اس کا وجوب ناقص وقت میں ہوا، اسی طرح ادا ہو گیا۔ تاہم جنازہ کا وقت اہتمام کے ساتھ مؤخر کر کے مکروہ تحریمی وقت میں مقرر کرنا کراہتِ تحریمہ کا سبب ہے۔

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی مُتوفّٰی 970ھ لکھتے ہیں:

''وَفِی ''التُّحْفَةِ'': اَلْأَفْضَلُ أَنْ یُصَلِّیَ عَلَی الْجَنَازَةِ إِذَاحَضَرَتْ فِی الْأَوْقَاتِ الثَّلَاثَةِ وَلَایُؤَخِّرَهَا بِخِلَافِ الْفَرَائِضِ وَظَاهِرُ التَّسْوِیَةِ بَیْنَ صَلَاةِ الْجَنَازَةِ وَسَجْدَةِ التِّلَاوَةِ أَنَّهُ لَوْحَضَرَتِ الْجَنَازَةُ فِیْ غَیْرِ مَکْرُوْهٍ فَاَخَّرَهَا حَتّٰی صَلّٰی فِی الْوَقْتِ الْمَکْرُوْهِ، فَإِنَّهَا لَا تَصِحُّ وَتَجِبُ إِعَادَتُهَا کَسُجُوْدِ التِّلَاوَةِ وَذَکَرَ الْإِسْبِیْجَابِیُّ لَوْ صَلّٰی صَلَاةَ الْجَنَازَةِ فَإِنَّهُ یَجُوْزُ مَعَ الْکَرَاهَةِ وَلَایُعِیْدُ''۔

ترجمہ: ''''تحفہ'' میں ہے: اگر جنازہ مکروہ وقت میں آیا ہے، تو دیگر فرائض کے برعکس اس جنازے کو اُسی وقت پڑھ لینا افضل ہے اور نمازِ جنازہ اور سجدۂ تلاوت کے حکم میں مساوات کی صورت یہ ہے کہ اگر جنازہ غیر مکروہ وقت میں آیا اور اسے مُؤخّر کر کے مکروہ وقت میں پڑھا تو یہ صحیح نہیں ہے اور اس کا اعادہ واجب ہے، جیسے کہ سجدۂ تلاوت کا حکم ہے اور ''اسبیجابی'' نے کہا: اگر (پہلے سے موجود) جنازہ (مؤخّر کر کے مکروہ وقت میں) پڑھا تو کراہت کے ساتھ جائز ہے، کیونکہ جنازے کی تکرار نہیں ہے''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''وَإِنْ قَرَأَهَا قَبْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ سَجَدَهَا فِی هٰذَا الْوَقْتِ لَایَجُوْزُ وَیُعِیْدُ''۔

ترجمہ: ''اگر آیتِ سجدہ صحیح وقت میں پڑھی تھی، لیکن سجدۂ تلاوت (کو مؤخر کر کے) مکروہ وقت میں ادا کیا تو جائز نہیں ہے اور اس کا اعادہ کرے، (البحر الرائق، ج:1، ص:434)''۔

علامہ بدرالدین کاسانی حنفی متوفّٰی 587ھ لکھتے ہیں:

''یُکْرَہُ الصَّلَاۃُ عَلَی الْجَنَازَۃِ عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَغُرُوْبِھَا، وَنِصْفِ النَّھَارِ لِمَا رَوَیْنَا مِنْ حَدِیْثِ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ أَنَّہٗ قَالَ: ثَلَاثُ سَاعَاتٍ نَھَانَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ أَنْ نُّصَلِّیَ فِیْھَا وَأَنْ نَقْبُرَ فِیْھَا مَوْتَانَا، وَالْمُرَادُ مِنْ قَوْلِہٖ: أَنْ نَقْبُرَ فِیْھَا مَوْتَانَا، اَلصَّلَاۃُ عَلَی الْجَنَازَۃِ دُوْنَ الدَّفْنِ إِذْ لَا بَأْسَ بِالدَّفْنِ فِیْ ھٰذِہِ الْاَوْقَاتِ فَإِنْ صَلَّوْا فِیْ أَحَدِ ھٰذِہِ الْاَوْقَاتِ لَمْ یَکُنْ عَلَیْھِمْ إِعَادَتُھَا، لِاَنَّ صَلَاۃَ الْجَنَازَۃِ لَا یَتَعَیَّنُ لِاَدَائِھَا وَقْتٌ فَفِیْ أَیِّ وَقْتٍ صُلِّیَتْ وَقَعَتْ أَدَاءً لَا قَضَاءً''۔

ترجمہ: ''طلوعِ شمس، غروبِ شمس اور نصف النہار کے اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ عقبہ بن عامر کی روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے ان تین (مکروہ) اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے، دفن کرنا منع نہیں ہے، سو اگر کچھ لوگوں نے ان تین اوقات میں سے کسی ایک (مکروہ) وقت میں نمازِ جنازہ پڑھ لی، تو ان پر نمازِ جنازہ کا اعادہ لازم نہیں ہے، کیونکہ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت متعین نہیں ہے، سو جس وقت پڑھی جائے گی، ادا کہلائے گی، قضا نہیں، (ملخصاً بدائع الصنائع، ج:1، ص:469)''۔

## ایک قبر سے ستر مُردے اٹھائے جانے کی روایت

**سوال:**

لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ قیامت کے روز ایک قبر سے 70 مردے اٹھیں گے، اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟، (قاضی محمد اشرف، اورنگی ٹاؤن)۔

**جواب:**

یہ صرف لوگوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں، اس بات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، لیکن یہ امر ناممکن بھی نہیں ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی اور اس سے پہلے کتنے انسان زمین میں مدفون ہوں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ ایک میت کے آثار معدوم ہو جائیں، تو وہاں کوئی دوسری میت دفن کر دی جائے، سیلابوں، جنگوں اور آفات کے نتیجے میں مشکلات کے

باعث ایک قبر میں زیادہ میتیں دفن کی جاسکتی ہیں، تاہم ایک قبر سے تعین کے ساتھ ستر مردے اٹھائے جانے کی روایت ثابت نہیں ہے۔

## میت کو کاندھا دینا

**سوال:**

کیا غیر محرم عورت کی میت کو کندھا دے سکتا ہے؟، (ساجد علی)۔

**جواب:**

غیر محرم کاندھا دے سکتا ہے، غیر محرم عورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا، چھو نہیں سکتا۔ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے شوہر کے اپنی بیوی کے جنازے کو ہاتھ لگانے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے لکھا: ''جنازے کو محض اجنبی ہاتھ لگاتے، کندھوں پر اٹھاتے، قبر تک لے جاتے ہیں، شوہر نے کیا قصور کیا ہے، یہ مسئلہ جاہلوں میں محض غلط مشہور ہے۔ ہاں! شوہر کو اپنی زنِ مردہ کا بدن چھونا جائز نہیں، چہرہ دیکھنے کی اجازت ہے کَمَا نَصَّ عَلَیْہِ فِی التَّنْوِیْرِ وَالدُّرِّ وَغَیْرِھِمَا (جیسا کہ تنویر الابصار اور درمختار وغیرہما میں اس کی تصریح ہے) اجنبی کو چہرہ دیکھنے کی بھی اجازت نہیں، (فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 138)''۔

## پیدا ہوتے ہی مرنے والے بچے کی نمازِ جنازہ کا حکم

**سوال:**

میرے قریبی گاؤں میں ایک بچہ زندہ حالت میں پیدا ہوا اور فوری فوت ہوگیا، لیکن لوگوں نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

(ڈاکٹر عبدالرزاق، جہلم)

**جواب:**

جو بچہ زندہ پیدا ہوا خواہ چند سانسیں ہی لیں اور فوت ہوگیا، اس کو غسل وکفن دیں گے، اس کا نام بھی رکھا جائے گا اور اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: ''وَمَنْ وُّلِدَ فَمَاتَ یُغَسَّلُ وَیُصَلّٰی عَلَیْہِ''۔ ترجمہ: ''جو زندہ پیدا

ہونے کے بعد فوت ہوا، اسے غسل دیا جائے گا اور اُس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی"۔(جلد5،ص:310،دمشق)

علامہ علاء الدین کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَأَمَّا بَيَانُ مَنْ يُصَلّٰى عَلَيْهِ، فَكُلُّ مُسْلِمٍ مَاتَ بَعْدَ الْوِلَادَةِ يُصَلّٰى عَلَيْهِ صَغِيْرًا كَانَ أَوْ كَبِيْرًا ذَكَرًا كَانَ أَوْ أُنْثٰى، حُرًّا كَانَ أَوْ عَبْدًا"۔

ترجمہ:"اور رہا(میت پر) نمازِ جنازہ پڑھنے کے بارے میں: پس زندہ پیدا ہو کر مرنے والے ہر مسلمان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام،(بدائع الصنائع، جلد1،ص:461)"۔

علامہ زین الدین بن ابراہیم المعروف ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"(قَوْلُهُ وَمَنِ اسْتَهَلَّ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَإِلَّا لَا) اسْتِهْلَالُ الصَّبِيِّ فِي اللُّغَةِ أَنْ يَرْفَعَ صَوْتَهُ بِالْبُكَاءِ عِنْدَ وِلَادَتِهِ۔۔۔ وَفِي الشَّرْعِ أَنْ يَكُوْنَ مِنْهُ مَا يَدُلُّ عَلٰى حَيَاتِهِ مِنْ رَفْعِ صَوْتٍ أَوْ حَرَكَةِ عُضْوٍ۔۔۔فِي "الْمُحِيْطِ" قَالَ أَبُوْحَنِيْفَةَ: إِذَا خَرَجَ بَعْضُ الْوَلَدِ وَتَحَرَّكَ ثُمَّ مَاتَ، فَإِنْ كَانَ خَرَجَ أَكْثَرُهُ صُلِّيَ عَلَيْهِ، وَإِنْ كَانَ أَقَلُّهُ لَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِ وَفِي آخِرِ الْمُبْتَغٰى بِالْمُعْجَمَةِ الْوَلَدُ إِذَا خَرَجَ رَأْسُهُ، وَهُوَ يَصِيْحُ ثُمَّ مَاتَ قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ لَمْ يَرِثْ، وَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِ مَا لَمْ يَخْرُجْ أَكْثَرُ بَدَنِهِ حَيًّا"۔

ترجمہ:"اور یہ قول: جو پیدائش کے وقت رویا، اس کی نماز پڑھی جائے گی جو نہیں رویا، اُس کی نہیں پڑھی جائے گی۔ لُغت میں"استہلال" بچے کا پیدائش کے وقت زور سے رونا مراد ہے۔۔۔ اور شرعاً آواز بلند کرنا یا کسی عضو کا حرکت کرنا اُس کے زندہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔۔مزید لکھتے ہیں:"محیط" میں ہے: امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب بچے کا بعض حصہ باہر نکلا اور حرکت بھی کی، پھر مر گیا، پس اگر اکثر حصہ نکلا تو اس پر نماز پڑھی جائے گی اور اگر کم حصہ نکلا تو نماز نہیں پڑھی جائے گی اور "اَلْمُبْتَغٰی" کے آخر میں: بچے کا سر باہر نکلا، اس وقت وہ صحیح تھا، پھر باہر نکلنے سے پہلے مر گیا، وارث نہیں بنے گا اور نہ اُس کی نمازِ جنازہ پڑھی

جائے گی، (البحر الرائق، جلد2،ص:230-229)''۔

## مجنون کی نمازِ جنازہ

**سوال:**

45سال کا ایک پاگل شخص ہے، اس کے جنازہ میں کون سی دعا پڑھی جائے گی بالغ کی یا نابالغ کی، اگر نابالغ کی دعا پڑھ لی جائے تو کیا یہ کافی ہوگی؟، (عبدالرحمٰن، لانڈھی)۔

**جواب:**

نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد میت کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کی جاتی ہے، احادیث مبارکہ میں بہت سی دعائیں وارد ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ دعا فرماتے تھے:

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَأُنْثَانَا، اَللّٰھُمَّ مَنْ أَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْإِیمَانِ''۔

ترجمہ: ''اے اللہ! ہمارے زندہ و مردہ، حاضر و غائب، بڑے چھوٹے اور مرد و عورت کو بخش دے، اے اللہ! ہم میں سے تو جسے زندہ رکھے، اُسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے تو جس کو وفات دے، اُسے ایمان پر وفات دے، (سُنن ابوداؤد: 3201)''۔

مجنون (پاگل)، بے عقل اور بچے کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ مکلّف نہیں ہیں، تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے: ''وَلَا یُسْتَغْفَرُ فِیْھَا لِصَبِیٍّ وَمَجْنُوْنٍ وَمَعْتُوْہٍ لِعَدَمِ تَکْلِیْفِھِمْ''۔ ترجمہ: ''اور نمازِ جنازہ میں بچے، مجنون اور بے عقل کے لیے استغفار نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ احکام کے مُکلّف نہیں''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ھٰذَا فِی الْاَصْلِیِّ فَإِنَّ الْجُنُوْنَ وَالْعَتَہَ الطَّارِئَیْنِ بَعْدَ الْبُلُوْغِ لَا یُسْقِطَانِ الذُّنُوْبَ السَّالِفَۃَ کَمَا فِی ''شَرْحِ الْمُنْیَۃِ''۔

ترجمہ: ''یہ اُس مجنون اور معتوہ (فاتر العقل) کے بارے میں ہے، جو بچپن ہی سے اس میں

مبتلا ہو، اس لیے کہ بالغ ہونے کے بعد لاحق ہونے والا پاگل پن اور عقلی فتور سابق گناہوں کو ساقط نہیں کرتے، جیسا کہ "شرح المنیہ" میں ہے"۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 5، ص: 270، دمشق)

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَلَا يُسْتَغْفَرُ لِصَبِيٍّ، وَلَا لِمَجْنُوْنٍ وَيَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا وَاجْعَلْهُ لَنَا أَجْرًا وَذُخْرًا وَاجْعَلْهُ لَنَا شَافِعًا وَمُشَفَّعًا، كَذَا وَرَدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلِاَنَّهٗ لَا ذَنْبَ لَهُمَا"۔

ترجمہ: "اور بچے اور مجنون کے لیے (نمازِ جنازہ میں) دعائے مغفرت نہ کرے اور یہ دعا پڑھے: ترجمہ: "اے اللہ! تو اس کو ہمارے لیے پیش رو بنا اور اسے ہمارے لیے باعثِ اجر اور ذخیرۂ (آخرت) بنا اور اسے ہمارے لیے شفاعت کرنے والا اور مَقْبُولُ الشَّفَاعة کردے"، رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح وارد ہوا ہے، کیونکہ بچے اور مجنون کا گناہ ہی نہیں ہے (کہ اُن کے لیے استغفار کی جائے)، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 323)"۔

ایسا شخص جو پیدائشی طور پر یا بالغ ہونے سے پہلے مجنون ہوا، کبھی مُکلّف ہی نہ ہوا تھا، اس کی نمازِ جنازہ میں دعائے مغفرت نہیں پڑھی جائے گی البتہ اگر جنون بالغ ہونے کے بعد لاحق ہوا ہے، تو اس کے لیے دعائے مغفرت کی جائے گی کیونکہ بالغ ہونے کے بعد جنون لاحق ہونے کی درمیانی مدت میں وہ مُکلّف تھا اور جنون لاحق ہونے سے پہلے کے گناہ جنون سے ختم نہیں ہوں گے۔

شیخ ابراہیم حلبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالْمَجْنُوْنُ كَالطِّفْلِ ذَكَرَهٗ فِي "الْمُحِيْط" وَيَنْبَغِيْ أَنْ يُّقَيَّدَ بِالْجُنُوْنِ الْاَصْلِيِّ لِاَنَّهٗ لَمْ يُكَلَّفْ فَلَا ذَنْبَ لَهٗ كَالصَّبِيِّ بِخِلَافِ الْعَارِضِيِّ فَاِنَّهٗ قَدْ كُلِّفَ وَعُرُوْضُ الْجُنُوْنِ لَا يَمْحُوْ مَاقَبْلَهٗ بَلْ هُوَ كَسَائِرِ الْاَمْرَاضِ وَرَفْعَهٗ لِلتَّكْلِيْفِ"۔

ترجمہ: "مجنوں بچے کی مثل ہے، "محیط" میں اس کا بیان ہوا، بہتر یہ ہے کہ جنون کو اصل سے

مقیّد کیا جائے (یعنی جنون اصلی کہا جائے) کہ بچے کی طرح مُکلّف نہ ہونے کے سبب اس کا کوئی گناہ نہیں ہے، (بلوغت) کے بعد لاحق ہونے والے جنون کا حکم اس کے برعکس ہے، کیونکہ وہ (احکام کا) مُکلّف ہو چکا تھا اور (بلوغت کے بعد) لاحق ہونے والا جنون ماقبل کے گناہوں کو نہیں مٹاتا، بلکہ وہ باقی امراض کی طرح ہے اور احکام کا مُکلّف ہے، (حلبی کبیر، ص: 587)''۔ اگر کوئی شخص مستقل جنون کے مرض میں مبتلا ہوا اور بلوغت کے بعد بھی افاقہ نہ ہوا ہو تو وہ بچوں کی طرح شرعی احکام کا مُکلّف نہیں ہے اور اس کی نمازِ جنازہ میں بچوں والی دعا پڑھی جائے گی اور اگر کبھی بالغ ہونے کے بعد جنون سے اس قدر افاقہ ہوا ہو کہ چند نمازوں کا وقت گزر گیا تو اس کی نمازِ جنازہ میں بالغوں کی طرح دعائے مغفرت پڑھی جائے گی۔

چار بار تکبیریں کہنا اور قیام کرنا نمازِ جنازہ کے ارکان ہیں، کوئی تکبیر رہ گئی یا قیام نہ کیا تو نماز دہرانا ہوگی۔ نمازِ جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھنا، دوسری تکبیر کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود پڑھنا اور تیسری تکبیر کے بعد میت کے لیے دعا کرنا سُنّت مؤکّدہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جو دعائیں احادیث میں وارد ہیں، اُن میں سے کوئی دعا پڑھے اور ماثور دعائیں یاد نہ ہوں تو اُمورِ آخرت پر مبنی دعاؤں میں سے جو دعا چاہے، پڑھے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثُمَّ یُکَبِّرُ أُخْرٰی وَیَدْعُوْ لِلْمَیِّتِ وَجَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ وَلَیْسَ فِیْهَا دُعَاءٌ مُؤَقَّتٌ وَعَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم أَنَّهٗ کَانَ یَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَأُنْثَانَا، اَللّٰهُمَّ مَنْ أَحْیَیْتَهٗ مِنَّا فَأَحْیِهٖ عَلَی الْإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّیْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَی الْإِیْمَانِ، فَإِنْ کَانَ الْمَیِّتُ صَغِیْرًا عَنْ أَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰہُ تَعَالٰی أَنَّهٗ یَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا ذُخْرًا وَأَجْرًا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا شَافِعًا وَّمُشَفَّعًا، هٰذَا إِذَا کَانَ یُحْسِنُ ذٰلِكَ فَإِنْ کَانَ لَا یُحْسِنُ یَأْتِیْ بِأَیِّ دُعَاءٍ شَآءَ''۔

ترجمہ: ''پھر آخری تکبیر پڑھے اور میت کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے اور

نماز جنازہ کے لیے کوئی مخصوص دعا نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ یہ دعا فرماتے تھے: ''اے اللہ! ہمارے زندہ ومردہ، حاضر وغائب، بڑے چھوٹے اور مرد وعورت کو بخش دے، اے اللہ! ہم میں سے تو جسے زندہ رکھے، اُسے اسلام پر زندہ رکھ اور ہم میں سے تو جس کو وفات دے، اُسے ایمان پر وفات دے''، پس اگر میت بچے کی ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: ''اے اللہ! تو اس کو ہمارے لیے پیش رو بنا، اے اللہ! اسے ہمارے لیے باعثِ اجر اور ذخیرۂ (آخرت) بنا، اے اللہ! اسے ہمارے لیے شفاعت کرنے والا اور مقبولُ الشفاعۃ کر دے''، اگر یہ مسنون (وماثور) دعائیں اچھی طرح آتی ہوں، تو یہی پڑھے اور اگر یہ دعائیں اچھی طرح یاد نہ ہوں تو (آخرت سے متعلق) کوئی سی بھی دعا (جو یاد ہو) پڑھ لے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:164)''۔

البتہ اگر کسی نے نابالغ بچے یا پیدائشی مجنون کی نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد بھول کر بالغ کی دعا پڑھ لی یا بالغ وبالغہ کی نمازِ جنازہ میں بھول کر بچے کی دعا پڑھ لی، تب بھی نماز ادا ہو جائے گی، نمازِ جنازہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، بالغ کے لیے دعائے مغفرت نمازِ جنازہ کے بعد اور تدفین کے بعد بھی کر سکتے ہیں، بلکہ ہمیشہ کر سکتے ہیں۔

## وقف قبرستان کو بدلا نہیں جا سکتا

**سوال:**

ہمارے علاقے میں ایک قبرستان تھا، وقت کے ساتھ قبروں کے نشانات مٹ گئے، قبرستان کے ساتھ مسجد موجود ہے، بعض احباب نے قبرستان والی جگہ پر امام کی رہائش اور مدرسے کے کمرے تعمیر کر دیے ہیں، کیا یہ درست ہے؟، (محمد محسن، لاہور)۔

**جواب:**

مسلمانوں کے قبرستان کو (خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو) مسمار کرنا یا کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَسُئِلَ هُوَ (أَيِ الْقَاضِي الْإِمَامُ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ مَحْمُودُ الْأُوزْجَنْدِيُّ) عَنِ الْمَقْبَرَةِ فِي

اَلْقُریٰ اِذَا انْدَرَسَتْ وَلَم یَبْقَ فِیْھَا أَثَرُ الْمَوْتٰی لَاالْعَظْمُ وَلَا غَیْرُہٗ ھَلْ یَجُوْزُ زَرْعُھَا وَاسْتِغْلَالُھَا، قَالَ: لَا، وَلَھَاحُکْمُ الْمَقْبَرَۃِ، کَذَافِی ''الْمُحِیْط''۔

ترجمہ: ''شمس الائمہ امام قاضی محمود اوزجندی سے دیہات میں موجود ایسے قبرستان کی بابت پوچھا گیا کہ جس (قبرستان) کے نشانات مٹ چکے ہوں اور اُس میں میت کی ہڈیاں یا کوئی دوسرے آثار (اعضاء وغیرہ) باقی نہ رہے ہوں، تو کیا اس پر کھیتی کرنا اور اس سے غلہ حاصل کرنا جائز ہے؟، آپ نے جواب میں فرمایا: نہیں بلکہ وہ قبرستان ہی کے حکم میں ہے، جیسا کہ ''محیط'' میں ہے''۔ محشی نے اس پر حاشیہ لکھا:

'' قَوْلُہٗ: قَالَ لَا، ھٰذَا لَایُنَافِیْ مَاقَالَہُ الزَّیْلَعِیُّ فِیْ بَابِ الْجَنَائِزِ مِنْ أَنَّ الْمَیِّتَ اِذَابَلٰی وَصَارَ تُرَابًا جَازَ زَرْعُہٗ وَالْبِنَاءُ عَلَیْہِ، لِاَنَّ الْمَانِعَ ھُنَاکَوْنُ الْمَحَلِّ مَوْقُوْفًا عَلَی الدَّفْنِ فَلَایَجُوْزُ اِسْتِعْمَالُہٗ فِیْ غَیْرِہٖ فَلْیَتَاَمَّلْ وَلْیُحَرَّرْ''۔

ترجمہ: ''ایسا قبرستان جس کے آثار مٹ چکے ہیں، علامہ قاضی محمود اوزجندی نے اس میں کاشت کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، یہ ''امام زیلعی'' کے اس قول کے منافی نہیں ہے کہ جب میت بوسیدہ ہوکر مٹی ہوجائے تو اس میں عمارت بنانے اور کاشت کرنے کی اجازت ہے، ممانعت کا حکم اس زمین کے لیے ہے، جو قبرستان کے لیے وقف ہے، کیونکہ وقف کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے اور ''امام زیلعی'' کی اجازت اس قبرستان کے لیے ہے، جو وقف نہیں ہے، پس غور کر کے درست مسئلہ لکھنا چاہیے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، ص: 470)''۔ یہ حکم اُس صورت میں ہے کہ جب وقف مکمل ہوچکا ہو، تو اُس میں تبدیلی جائز نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں قبرستان والی جگہ پر امام کی رہائش گاہ اور مدرسہ تعمیر کرنا جائز نہیں ہے۔

## قبر پکی کرنے کا حکم

**سوال:**

قبر پکی کرنے سے کیا مراد ہے اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ (قاضی محمد اشرف، اورنگی ٹاؤن)

**جواب:**

قبر اندر سے کچی ہونا چاہیے، حقیقۃً قبر کچے گڑھے کا نام ہے، قبر کے اندر پکی اینٹیں لگانا مکروہ ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَيُسَوَّى اللَّبِنُ وَالْقَصَبُ لَا الْآجُرُّ الْمَطْبُوخُ وَالْخَشَبُ لَوْ حَوْلَهُ، أَمَّا فَوْقَهُ فَلَا يُكْرَهُ''۔

ترجمہ: ''قبر پر کچی اینٹیں اور بانس چن دے، پکی اینٹیں اور لکڑی اس کے گرد نہ لگائے، اوپر ہو تو مکروہ نہیں''، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ فِي الْحِلْيَةِ: وَكَرِهُوا الْآجُرَّ وَأَلْوَاحَ الْخَشَبِ، وَقَالَ الْإِمَامُ التُّمُرْتَاشِيُّ هٰذَا إِذَا كَانَ حَوْلَ الْمَيِّتِ، فَلَوْ فَوْقَهُ لَا يُكْرَهُ لِأَنَّهُ يَكُوْنُ عِصْمَةً مِنَ السَّبُعِ وَقَالَ مَشَايِخُ بُخَارٰى: لَا يُكْرَهُ الْآجُرُّ فِي بَلْدَتِنَا لِلْحَاجَةِ إِلَيْهِ لِضَعْفِ الْأَرَاضِي''۔

ترجمہ: ''حلیہ میں کہا: ''علماء نے پکی اینٹوں اور لکڑی کے تختوں کو مکروہ کہا ہے اور امام تمرتاشی نے فرمایا: یہ اُس وقت ہے جب میت کے اردگرد ہو اور اگر اس کے اوپر ہو تو مکروہ نہیں، اس لیے کہ یہ درندوں سے حفاظت کا ذریعہ ہوگا۔ مشائخ بخارا نے فرمایا: ہمارے شہروں میں پکی اینٹیں مکروہ نہیں ہیں کیونکہ زمین کمزور ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت ہے، (جلد 5، ص: 344-345، دمشق)''۔ یعنی اگر قبر کی جگہ کی زمین کچی ہو اور قبر کے بیٹھ جانے کا اندیشہ ہو تو قبر کی حفاظت کے لیے پکی اینٹیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''قبر پختہ بنانے میں حاصل ارشاد علمائے امجاد رحمۃ اللہ علیہم یہ ہے کہ اگر پکی اینٹ میّت کے متصل یعنی اس کے آس پاس کسی جہت میں نہیں کہ حقیقۃً قبر اسی کا نام ہے بلکہ گڑھا کچّا اور بالائے قبر پختہ ہے تو مطلقاً ممانعت نہیں، یہاں تک کہ امامِ اَجلّ فقیہِ مُجتہد اسمٰعیل زاہدی نے خاص لحد میں پکی اینٹ پرنَصّ فرمایا، جبکہ کچّے چوکے کی تہ ہو اور اپنی قبر مبارک میں یونہی کرنے کی وصیت فرمائی اور متصل میّت ممنوع مکروہ، مگر جبکہ بضرورت تری ونرمی زمین ہو، تو اس میں بھی حرج نہیں''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا: ''قبر کا پختہ کرانا بہتر ہے یا نہ کرانا؟، اگر پختہ بنانا بہتر ہے تو اس کی تعمیر میں کن خاص اور ضروری باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے، مثلاً: طول عرض بلندی اور صورت وغیرہ''۔ آپ نے جواب میں لکھا: ''قبر پختہ نہ کرنا بہتر ہے، اور کریں تو اندر سے کڑا کچا رہے، اوپر سے پختہ کر سکتے ہیں، طول وعرض موافق قبر میّت ہو اور بلندی ایک بالشت سے زیادہ نہ ہو اور صورت ڈھلوان بہتر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم''۔
(فتاویٰ رضویہ، جلد 9، ص: 425-421)

## میت کو عمامہ کے ساتھ دفن کرنے کا شرعی حکم

**سوال:**

آج کل یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ میت کے سر پر عمامہ باندھ کر دفن کیا جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟، (منور احمد نعیمی، ملیر)۔

**جواب:**

حدیث پاک میں ہے:

(۱) ''اِذَا کَفَّنَ أَحَدُکُمْ أَخَاہُ فَلْیُحَسِّنْ کَفَنَہٗ''۔

ترجمہ: ''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے، تو اچھا کفن دے، (صحیح مسلم: 2182)''۔ علماء ومشائخ کو عمامہ کے ساتھ دفن کرنا جائز ہے اور عوام کے لیے مکروہِ تنزیہی ہے، بہتر یہ ہے کہ عامۃ الناس کو عمامہ کے ساتھ دفن نہ کریں، لیکن اگر پہنا دیا تو گنہگار نہیں ہوگا، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَتُکْرَہُ الْعِمَامَۃُ لِلْمَیِّتِ فِی الْأَصَحِّ ''مُجْتَبٰی'' وَاسْتَحْسَنَھَا الْمُتَأَخِّرُوْنَ لِلْعُلَمَاءِ وَالْأَشْرَافِ وَلَا بَأْسَ بِالزِّیَادَۃِ عَلَی الثَّلَاثَۃِ وَیُحَسَّنُ الْکَفَنُ لِحَدِیْثِ حَسِّنُوْا أَکْفَانَ الْمَوْتٰی فَإِنَّھُمْ یَتَزَاوَرُوْنَ فِیْمَا بَیْنَھُمْ وَیَتَفَاخَرُوْنَ بِحُسْنِ أَکْفَانِھِمْ ''ظَھِیْرِیَّۃٌ''''۔

ترجمہ: ''صحیح ترین قول کے مطابق میت کے سر پر عمامہ باندھنا مکروہ ہے، بحوالہ: ''مجتبیٰ'' اور بعض متاخرین نے علماء ومشائخ کے لیے مستحسن قرار دیا ہے اور (مرد کے کفن میں) تین

کپڑوں سے زیادہ کرنے میں حرج نہیں ہے اور کفن اچھا بنانا چاہیے کیونکہ حدیث پاک میں ہے: مُردوں کے اچھے کفن بناؤ کیونکہ وہ باہم ملاقات کرتے ہیں اور اچھے کفن پر باہم فخر کرتے ہیں، بحوالہ: ''ظہیریہ''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''وَنَقَلَهُ قَبْلَهُ عَنِ ''الْمُجْتَبٰى'' الْكَرَاهَةُ لٰكِنْ قَالَ: فِي الْحِلْيَةِ عَنِ ''الذَّخِيْرَةِ'' مَعْزِيًّا إِلٰى عِصَامٍ أَنَّهُ إِلٰى خَمْسَةٍ لَيْسَ بِمَكْرُوْهٍ وَلَا بَأْسَ بِهٖ، ثُمَّ قَالَ: وَوُجِّهَ بِأَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَفَّنَ ابْنَهُ وَاقِدًا فِيْ خَمْسَةِ أَثْوَابٍ قَمِيْصٍ وَعِمَامَةٍ وَثَلَاثِ لَفَائِفَ وَأَدَارَ الْعِمَامَةَ إِلٰى تَحْتِ حَنَكِهٖ رَوَاهُ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُوْرٍ''۔

ترجمہ: ''اس سے قبل ''المجتبیٰ'' سے کراہت کو نقل کیا ہے، لیکن ''الحلیہ'' میں ''الذخیرہ'' کے حوالے سے ہے اور اُنہوں نے ''عِصام'' کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا: پانچ تک کپڑے مکروہ نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں، پھر کہا: اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے واقد کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا، قمیص، عمامہ اور تین لفافے اور عمامے کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے گھمایا، اسے سعید بن منصور نے روایت کیا، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 5، ص: 227-226، دمشق)''۔ لیکن جہاں لوگوں کے لیے میت کو عمامہ پہنانا مانوس ہو، تو ایسی چیزوں کو اختلاف کا سبب نہیں بنانا چاہیے، کیونکہ کسی امر مستحب پر اصرار اور اس کے ترک پر ملامت اسے واجب کا درجہ دینا ہے اور یہ درست نہیں ہے اور کوئی اپنے ذوق کے مطابق کر رہا ہے تو دوسروں کو اس پر بلاوجہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے، بہرحال عوام کے لیے یہ مکروہ تنزیہی ہے۔

## تابوت میں میت کو دفنانے کا حکم

**سوال:**

میت کو تابوت میں دفن کرنے کا کیا حکم ہے، (قاری بہادر خان، چترال)۔

**جواب:**

فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے: ''اگر فوت ہونے والا شخص مرد ہو تو بلا عذر اُسے تابوت

سمیت دفن کرنا مکروہ ہے اور اگر میت عورت ہے تو اُسے تابوت کے ساتھ دفن کرنا افضل ہے''، علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وَلَا بَأْسَ بِاتِّخَاذِ تَابُوْتٍ وَلَوْ مِنْ حَجَرٍ اَوْ حَدِیْدٍ (لَہٗ عِنْدَ الْحَاجَۃِ) کَرَخَاوَۃِ الْاَرْضِ''۔

ترجمہ: ''ضرورت وحاجت کے وقت مرد میت کے لیے تابوت بنانے میں حرج نہیں ہے، خواہ وہ پتھر کا ہو یا لوہے کا، حاجت سے مراد جیسے زمین کا نرم ہونا''۔

اسی طرح اگر زمین میں پانی ہے یا میت کے اعضاء کسی حادثے کے سبب منتشر ہیں، تو اُسے تابوت میں دفن کیا جا سکتا ہے۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اَمَّا اِذَا کَانَ لَہٗ سَقْفٌ اَوْ بِنَاءٌ مَعْقُوْدٌ فَوْقَہٗ کَقُبُوْرِ بِلَادِنَا وَلَمْ تَکُنِ الْاَرْضُ نَدِیَّۃً وَلَمْ یُلْحَدْ فَیُکْرَہُ التَّابُوْتُ''۔

ترجمہ: ''لیکن اگر قبر کی چھت ہو اور اس کے اوپر بھی کوئی تعمیر ہو جیسے ہمارے علاقے کی قبریں ہوتی ہیں اور زمین میں نمی نہ ہو اور لحد نہ بنائی ہوئی ہو تو تابوت میں دفن کرنا مکروہ ہے''۔۔۔ نیز فرماتے ہیں:

''لَا بَأْسَ لِلْمَرْاَۃِ مُطْلَقًا، وَبِہٖ صَرَّحَ فِیْ شَرْحِ الْمُنْیَۃِ فَقَالَ: وَفِی الْمُحِیْطِ: وَاسْتَحْسَنَ مَشَایِخُنَا اتِّخَاذَ التَّابُوْتِ لِلنِّسَاءِ، یَعْنِیْ: وَلَوْ لَمْ تَکُنِ الْاَرْضُ رَخْوَۃً، فَاِنَّہٗ اَقْرَبُ اِلَی السَّتْرِ وَالتَّحَرُّزِ عَنْ مَسِّھَا عِنْدَ الْوَضْعِ فِی الْقَبْرِ''۔

ترجمہ: ''اور عورت کو مطلقاً (یعنی کسی عذر کے بغیر بھی) تابوت میں دفن کیا جا سکتا ہے اور ''مُنْیۃ المصلی'' کی شرح میں اس کی تصریح کی گئی ہے اور ''محیط'' میں ہے: ہمارے مشائخ نے عورتوں کو تابوت میں دفن کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے، یعنی اگر زمین نرم بھی نہ ہو (تب بھی)، کیونکہ یہ ستر اور قبر میں رکھتے وقت میت کو چھونے سے اجتناب کا ذریعہ ہے، (ردالمحتار، ج:2، ص:235''۔ اور اگر خدانخواستہ کسی حادثے یا بارش کی کثرت یا اچانک قبر کھودے جانے کے سبب میت ظاہر ہو جائے، تو ستر قائم رہے گا۔

# روزے اور زکوٰۃ کے مسائل

عالمگیری، جلد 1،ص:199)

مسواک کی تری یا اس کی لکڑی کا کوئی ریزہ یا ریشہ حلق میں چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا، امام یحییٰ بن شرف النَّوَوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''لَوِ اسْتَاكَ بِسِوَاكٍ رَطْبٍ فَانْفَصَلَ مِنْ رُطُوبَتِهٖ أَوْ خَشَبِهِ الْمُتَشَعِّبِ شَيْءٌ وَابْتَلَعَهٗ أَفْطَرَ بِلَا خِلَافٍ''۔

ترجمہ: ''اگر مرطوب مسواک کی اور اس کی ریشے دار لکڑی میں کوئی ریشہ نگل لیا تو بالاتفاق روزہ ٹوٹ جائے گا، (المجموع شرح المہذب، جلد 6،ص:318)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''مسواک کرنا سنّت ہے، ہر وقت کر سکتا ہے، اگرچہ تیسرے پہر یا عصر کو، چبانے سے لکڑی کے ریزے چھوٹیں یا مزہ محسوس ہو تو نہ چاہئے، خلال کرنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں، روزہ بند ہونے سے پہلے خِلال کر لینا چاہیے تاکہ روزے کی حالت میں اس کی ضرورت نہ رہے، البتہ اگر سحری کھا کر فارغ ہُوا تھا کہ صبح ہوگئی تو اسی وقت خِلال کرے گا، اس میں حرج نہیں ہے، روزے میں منجن مَلنا نہ چاہیے''۔ (فتاویٰ رضویہ، جلد 10،ص:511، بتصرُّف)

منجن، ٹوتھ پاؤڈر اور پیسٹ اس سے مختلف ہے کہ اس میں ذائقہ بہت محسوس ہوتا ہے، نہ اس پر مسواک کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ مسواک کی سنت ادا کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے، حتی الامکان روزے کی حالت میں اس کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے، کیونکہ اس کے ذرّات کے حلق سے اندر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ایسی صورت میں روزہ فاسد ہو جائے گا، الغرض منجن یا ٹوتھ پاؤڈر یا پیسٹ سے ممانعت کا مشورہ احتیاط کی بنا پر ہے کہ غیر ارادی طور پر بھی بعض ذرات کا حلق میں چلے جانے کا امکان رہتا ہے،، تاہم محض ذائقہ محسوس ہونے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

## روزے کی قضا فی الفور واجب نہیں

**سوال:**
کسی شخص کے رمضان کے روزے قضا ہوگئے ہوں تو ان کی قضا کب تک رکھ سکتا ہے،(محمد طلحہ ہاشمی، کراچی)۔

**جواب:**
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَمَنْ کَانَ مِنکُم مَّرِیْضاً أَوْ عَلَیٰ سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ أَیَّامٍ أُخَرَ''۔
ترجمہ: ''سو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو (اور وہ روزے نہ رکھ سکے) تو دوسرے دنوں میں عدد (پورا کرنا لازم ہے)، (البقرہ:184)''۔
صحیح بخاری میں امام بخاری نے ایک باب باندھا: ''مَتٰی یُقْضیٰ قَضَاءُ رَمَضَانَ''، (رمضان کے روزوں کی قضا کب کی جائے)؟، اس باب کے تحت انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے حوالے سے درج ذیل روایات بیان فرمائی ہیں: ''وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: لَا بَأْسَ أَنْ یُفَرَّقَ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالیٰ: فَعِدَّۃٌ مِّنْ أَیَّامٍ أُخَرَ''۔
ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر یہ روزے متفرق رکھے جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو دوسرے دنوں میں عدد (پورا کرنا لازم ہے)، (البقرہ:184)''۔ قضا روزے رکھنے سے مراد یہ ہے کہ بلاناغہ تسلسل کے ساتھ رکھنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اپنی سہولت کے مطابق بیچ میں وقفہ بھی کرسکتے ہیں۔ نیز قضائے رمضان کا روزہ غیر رمضان میں اگر رکھنے کے بعد کسی وجہ سے ٹوٹ جائے یا توڑ دیا جائے تو اس کا کفارہ نہیں ہے، صرف قضا ہے۔
''عَنْ أَبِی سَلَمَۃَ قَالَ: سَمِعْتُ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا، تَقُوْلُ: کَانَ یَکُوْنُ عَلَیَّ الصَّوْمُ مِنْ رَمَضَانَ، فَمَا أَسْتَطِیْعُ أَنْ أَقْضِیَ إِلَّا فِی شَعْبَانَ، قَالَ یَحْیٰ: اَلشُّغْلُ مِنَ النَّبِیِّ أَوْ بِالنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''۔
ترجمہ: ''ابوسلمہ بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرماتے سنا: میرے ذمے

# صنعتی مقصد میں استعمال ہونے والی مشینری پر زکوٰۃ کا حکم

## سوال:1

ایک مشینری ہم نے باہر سے اس شرط پر خریدی کہ اُس کی آدھی قیمت ایڈوانس دیں گے اور آدھی قیمت مشینری نصب کرنے کے بعد ادا کریں گے۔ کیا مشینری کے لیے ادا کردہ یا مختص کی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے؟، جو مشینری فیکٹری میں لگی ہوئی ہے، اس پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟، (کامران خان، لاہور)۔

## سوال:2

ایک کارپینٹر کے ساتھ 35 لاکھ روپے میں دروازے بنوانے کا معاہدہ طے ہوا، دس لاکھ روپے ادائیگی کر دی ہے۔ اس نے کام پانچ جنوری کو شروع کرنا ہے۔ باقی پچیس لاکھ روپے کی ادائیگی کام مکمل ہونے پر ہے۔ جو باقی پچیس لاکھ روپے ہیں، کیا ان کی زکوٰۃ مجھ پر واجب ہے؟، (سید محمد نعمان قادری)۔

## جواب:

سال کے آخر میں آپ کی مِلک میں جتنا بھی سونا، چاندی، نقد رقم اور جو مال کاروبار میں لگا ہوا ہے، الغرض تمام ذرائع سے جمع شدہ اس سارے مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ زکوٰۃ کی ادائی کا وقت آنے سے پہلے آپ مشینری یا دروازے بنانے کے لیے جو رقم ادا کر چکے ہیں، تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگی، البتہ مشینری کے لیے درکار جو رقم ابھی آپ کے پاس موجود ہے، وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جو مشینری کارخانے میں صنعتی مقصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، ان کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے، یہی مشینری اگر کسی تاجر کے شوروم میں ہے اور وہ اس کا کاروبار کرتا ہے، تو ان کی موجودہ بازاری قیمت پر زکوٰۃ ہے، کیوں کہ اب یہ مالِ تجارت ہے، پیداوار کا ذریعہ نہیں ہے۔

## زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے دی جائے گی

**سوال:**

زکوٰۃ قمری حساب سے دی جائے گی یا شمسی؟ کیا شمسی حساب سے زکوٰۃ ادا کرنے والا گنہگار ہے؟ قمری حساب سے ادائیگی کی دلیل کیا ہے؟۔(انعام حسن مقدم، کراچی)۔

**جواب:**

سال سے مراد ہجری سال کے بارہ مہینے ہیں، چونکہ یہ چاند کے حساب سے ہوتا ہے، اس لئے اسے قمری سال Luminar Year کہا جاتا ہے۔ بعض دینی احکام جیسے عیدین، رمضان المبارک کے روزے، عدت کے احکام، حج اور زکوٰۃ قمری سال سے متعلق ہیں۔ قمری سال تقریباً 355 دنوں پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ شمسی سال 365 دنوں کا ہوتا ہے۔ اگر شمسی (Gragorian) سال کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے تو قمری حساب سے یہ ایک سال، دس دنوں پر ادا ہوئی، دس دن زائد کی زکوٰۃ اُس کے ذمے رہے گی۔ یعنی 32 شمسی سال (جسے عرفِ عام میں سن عیسوی کہا جاتا ہے) مکمل ہونے پر تقریباً 33 قمری سال ہوجاتے ہیں اور اس طرح ایک سال کی زکوٰۃ بیچ میں غائب ہوجاتی ہے، جس کا آخرت میں حساب دینا ہوگا۔

علامہ زین الدین ابن نُجیم حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”وَالْمُرَادُ بِكَوْنِهٖ حَوْلِيًّا أَنْ يَتِمَّ الْحَوْلُ عَلَيْهِ، وَهُوَ فِي مِلْكِهٖ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: لَا زَكَاةَ فِي مَالٍ حَتّٰى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ، قَالَ فِي الْغَايَةِ: سُمِّيَ حَوْلًا، لِاَنَّ الْاَحْوَالَ تَحُوْلُ فِيهِ، وَفِي ''الْقُنْيَةِ'' الْعِبْرَةُ فِي الزَّكَاةِ لِلْحَوْلِ الْقَمَرِيِّ“۔

ترجمہ: ”سال گزرنے سے مراد، کسی شخص کی مِلک میں موجود مال پر پورا سال گزرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے: ”کسی مال پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اُس مال پر پورا سال نہ گزر جائے“، ”الغایہ“ میں ہے: ”حول“ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ (درمیانِ سال کے) احوال بدلتے رہتے ہیں اور ”قُنیہ“ میں ہے: زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے قمری

سال کا اعتبار کیا جائے گا، (البحر الرائق، جلد 2، ص: 356)"۔

تنویر الابصار مع الدالمختار میں ہے:

"(وَحَوْلُهَا) أَيِ الزَّكَاةِ (قَمَرِيٌّ) "بَحْرٌ" عَنِ الْقُنْيَةِ (لَا شَمْسِيٌّ)"۔

ترجمہ: "زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے مال پر ایک قمری سال گزرنا شرط ہے، نہ کہ شمسی، "البحر الرائق" میں "قُنیہ" کے حوالے سے اسی طرح ہے"۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"عِبَارَتُهُ مَعَ الْمَتْنِ وَأَجَلُ سَنَةٍ قَمَرِيَّةٍ بِالْأَهِلَّةِ عَلَى الْمَذْهَبِ وَهِيَ ثَلٰثُمِائَةٍ وَأَرْبَعٌ وَخَمْسُوْنَ وَبَعْضُ يَوْمٍ، وَقِيْلَ: شَمْسِيَّةٌ بِالْأَيَّامِ وَهِيَ أَزْيَدُ بِأَحَدَ عَشَرَ يَوْمًا"۔

ترجمہ: "مذہبِ مختار کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کی مدت چاندوں کے اعتبار سے قمری سال ہے اور وہ 354 دن کامل اور ایک دن کا کچھ حصہ ہے، اور کہا جاتا ہے کہ شمسی سال دنوں کی گنتی کے اعتبار سے گیارہ دن زائد ہوتا ہے، (جلد 5، ص: 538، مطبوعہ: دمشق)"۔

## جمع شدہ ایڈوانس یا زرِ ضمانت پر زکوٰۃ نہیں ہے

**سوال:**

میرے چھوٹے بھائی نے دکان کے ایڈوانس کی مد میں دولاکھ روپے جمع کرائے ہوئے ہیں اور دکان میں ڈھائی لاکھ روپے کا مال بھی موجود ہے، ماہانہ کرایہ دس ہزار روپے دیتا ہے۔ کیا بھائی پر زکوٰۃ واجب ہے، کس چیز پر زکوٰۃ بنتی ہے؟، (محمد ریحان، ناظم آباد)۔

**جواب:**

ناپ تول کے موجودہ اَعشاری نظام (Matric System) کے اعتبار سے نصابِ شرعی کی کم از کم مقدار 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت یا مُتفرق مال جو اس کی بنیادی حاجت سے زائد ہو، جس کا مالک ہونے سے مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہوجاتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فَإِذَا كَانَتْ لَكَ مِائَتَا دِرْهَمٍ وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ،

فَفِیْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ ،وَلَیْسَ عَلَیْكَ شَیْءٌ یَعْنِیْ فِی الذَّهَبِ حَتّٰی تَکُوْنَ لَكَ عِشْرُوْنَ دِیْنَارًا، فَاِذَا کَانَتْ لَكَ عِشْرُوْنَ دِیْنَارًا وَّحَالَ عَلَیْهَا الْحَوْلُ، فَفِیْهَا نِصْفُ دِیْنَارٍ، فَمَازَادَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ''۔

ترجمہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جب تمہارے پاس دوسو درہم ہوں اوران پر ایک سال گزر جائے تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ ہے اور سونے پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں ہے جب تک کہ وہ بیس دینار نہ ہو، پس جب سونا بیس دینار ہوجائے اور اس پر ایک سال گزر جائے، تو اس پر نصف دینار زکوٰۃ ہے، پھر جب سونے کی مقدار بڑھتی چلی جائے تو اُسی حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی، (سنن ابوداؤد، جلد 1، ص: 221)''۔ واضح رہے کہ دوسو درہم چاندی کا موجودہ وزن 612.36 گرام ہے اور 20 دینار سونے کا موجودہ وزن 87.48 گرام ہے۔ایک تولہ 11.664 گرام کے برابر ہوتا ہے۔ اگر مال مخلوط ہے یعنی کچھ سونا، چاندی، نقد رقم یا مالِ تجارت وغیرہ، تو اس صورت میں وجوبِ زکوٰۃ کے لیے چاندی کا نصاب معتبر ہے، سونے کا نہیں، لیکن اگر مال صرف سونا ہے اور دیگر متفرق اموال میں سے کچھ بھی نہیں ہے، تو پھر سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے بھائی صاحبِ نصاب ہیں اور اُن پر زکوٰۃ کی ادائی لازم ہے۔ ایڈوانس کی رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ اس کی حیثیت رہن شدہ مال کی سی ہے کہ اس پر مالک کی ملکیت تو ہے، لیکن قبضہ نہیں ہے اور نہ وہ اس پر تصرُّف کرسکتا ہے۔ لہٰذا دکان میں جو ڈھائی لاکھ روپے مالیت کا مالِ تجارت ہے، اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر اس کے علاوہ کوئی نقد رقم یا چاندی/سونا وغیرہ ہے تو زکوٰۃ کی ادائی کے لیے اسے بھی مالیت میں جمع کرنا ہوگا۔

## زکوٰۃ کے چند پیچیدہ مسائل

زکوٰۃ کے حوالے سے چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں، اُمید ہے رہنمائی

فرمائیں گے۔(از: قادری فقیر، کراچی)۔

تمہید: ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ لوگ اپنی زیرِ ملکیت مالِ تجارت کا حکم الگ الگ پوچھتے ہیں، یہی صورت حال سونے اور چاندی کی بابت درپیش ہوتی ہے، شرعی حکم یہ ہے کہ جو قمری تاریخ کسی صاحب کی زکوٰۃ کا حساب لگانے کے لیے مقرر ہے، اس تاریخ کو جتنا نقد، بینک اکاؤنٹس، شیرز، بانڈز، سرٹیفکیٹس، کارخانے میں خام مال اور تیار مال، مارکیٹ میں واجب الوصول (Receivables) رقوم، سونا چاندی، تجارتی پلاٹ وعمارات وکارخانے وغیرہ، الغرض سب کی مجموعی مالیت نکال کر اس پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اگر آپ کے ذمے قرض ہے، تو وہ مجموعی مالیت سے منہا ہو جائے گا۔ البتہ اگر دس یا پندرہ یا بیس یا پچیس سال کی طویل مدت والے میعادی قرض ہیں، تو وہ منہا نہیں ہوں گے، صرف اُن کی رواں سال کی اقساط منہا ہوں گی۔ سال کے دوران جو آپ کے ذاتی اور انتظامی اخراجات ہو جاتے ہیں، وہ از خود مالیت سے نکل جاتے ہیں یعنی زکوٰۃ آمدنی پر نہیں لگتی بلکہ اختتامِ سال پر تمام تر ذاتی، انتظامی ودیگر مصارف وضع کرنے کے بعد جو مالیت بچ رہے، اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے، اب ہم سوال وجواب سلسلہ وار تحریر کریں گے:

## سوال: 1

اگر زمین کا سودا ایک لاکھ میں ہوا، زمین کا بیعانہ پچاس ہزار روپے دیا اور باقی پچاس ہزار روپے ادا کرنے باقی ہیں، تو زکوٰۃ کس پر لگے گی، جبکہ زمین کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا ہے، زمین مل بھی سکتی ہے اور نہیں بھی، دونوں امکانات موجود ہیں۔

## جواب:

آپ نے سوال کی جو نوعیت بتائی ہے، اس کی رو سے عقد مُتحقق نہیں ہوا، آپ کا یہ بیعانہ اگر قابلِ وصول ہے اور آپ کے پاس ثبوت وشواہد موجود ہیں، تو زکوٰۃ کا حساب نکالتے وقت اسے آپ اپنے مال میں جمع کریں گے۔

**سوال:2**

اگر کسی نے ایک زمین بلڈنگ بنانے کے لیے لی اور اس کی قیمت ایک کروڑ روپے ہے، تو زکوٰۃ بلڈنگ مکمل ہونے کے بعد لگے گی یا جو زمین کی رقم ادا کی ہے، اس پر لگے گی اور کب تک؟، کیونکہ بلڈنگ مکمل ہونے میں پانچ سال بھی لگ سکتے ہیں اور اس میں مزید پیسے بھی لگیں گے تو زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی؟۔

**جواب:**

چونکہ یہ زمین مالِ تجارت ہے، اس لیے اس کی موجودہ بازاری قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، جب اس کی تعمیر شروع ہوگی اور اگر تعمیر آپ اپنے مال سے کر رہے ہوں گے، تو ہر سال زکوٰۃ کا حساب لگاتے وقت اسٹرکچر سمیت زمین کی جو قیمت ہوگی، اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

**سوال:3**

بلڈنگ تعمیر ہو رہی ہے، ممبران سے اقساط کی صورت میں رقم وصول ہو رہی ہے اور تعمیر پر بھی رقوم خرچ ہو رہی ہیں، مثال کے طور پر پچاس لاکھ روپے لوگوں سے آئے اور پچیس لاکھ روپے خرچ کر دیے، باقی پچیس لاکھ روپے بلڈر کے پاس رکھے ہیں، تو زکوٰۃ کس پر ہوگی؟۔

**جواب:**

صورتِ مسئولہ میں خریدار اور بلڈر کے درمیان معاہدہ ''بیعِ استصناع'' کا ہے، خریدار نے بلڈر کو جو رقم دی ہے، نہ وہ رہن ہے اور نہ دَین کہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، وہ ثمن ہے اور تاوقتیکہ قبضہ خریدار کو منتقل ہو جائے، وہ بلڈر کی ملکیت ہے، لہٰذا بلڈنگ پر خرچ شدہ اور بلڈر کے پاس جمع شدہ رقم اس کی مِلک ہے اور اُسی پر اُس کی زکوٰۃ عائد ہوگی۔

**سوال:4**

اگر بلڈنگ مکمل ہوتی ہے اور اس میں ایک کروڑ نفع ہوتا ہے تو زکوٰۃ کیا نفع پر لگے گی، نیز یہ نفع خرچ بھی ہو چکا ہے، باقی بچا ہی نہیں ہے، کیونکہ جو نفع ہوا اس کی کوئی زمین خرید لی

اور اس زمین پر ہم زکوٰۃ نکال رہے ہیں تو کیا جو نفع ہوا تھا، اس پر زکوٰۃ ہوگی جبکہ وہ نفع موجود نہیں ہے۔

**جواب:**

اس کے لیے تمہیدی گفتگو کو دوبارہ پڑھ لیں، دورانِ تعمیر بلڈنگ کی زکوٰۃ کا حکم سوال نمبر 3 میں دے دیا گیا ہے، باقی مالکانہ بنیاد پر خریداروں کے نام قبضہ منتقل کرنے کے بعد وہ بلڈر کی مِلک سے خارج ہوجائے گی۔ منافع کی رقم سے جو بلڈر نے تجارتی پلاٹ خریدا، وجوب وادائے زکوٰۃ کے لیے وہ بلڈر کی مجموعی مالیت میں جمع ہوجائے گا۔ جو نقد ہے، وہ بلڈر کی مجموعی مالیت میں جمع ہو چکا ہے، اس پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی، اِلّا یہ کہ جو رقم سال کے دوران وہ اپنے ذاتی یا انتظامی یا تعمیری مصارف (سامان تعمیر مع کنٹریکٹر کی اجرت وغیرہ) پر خرچ کر چکے ہیں، وہ رقوم اَز خود اس کی مجموعی مالیت سے وضع ہو چکی ہیں۔

**سوال:5**

اگر کسی شخص کے پاس زمین ہے جو ایک کروڑ کی خریدی، آج اس کی مارکیٹ ویلیو دو کروڑ ہے، تو زکوٰۃ کس پر لگے گی جبکہ اس کے پاس رقم نہیں ہے، صرف زمین ہے جو کہ فروخت نہیں کی اور ہوسکتا ہے کہ ویلیو دو کروڑ ہو، مگر اس زمین کا گاہک نہیں ہے؟۔

**جواب:**

جو بھی زمین تجارتی مقاصد کے لیے خریدی گئی ہے، اس کی مارکیٹ ویلیو پر زکوٰۃ ہے، قیمت خرید کا اعتبار نہیں ہے، سونے، چاندی، مالِ تجارت، صنعتی خام مال وتیار مال کا یہی حکم ہے، قیمت سے مراد وہ ہے کہ جس پر وہ فروخت ہوسکتی ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر مستحسن نہیں بلکہ باعثِ گناہ ہے، لیکن بعد میں بھی بہر حال ادا کرنی ہوگی۔

**سوال:6**

اگر کسی شخص نے کوئی زمین خریدی اور اس پر عدالت میں کیس دائر ہوگیا، وہ اسے بیچ نہیں سکتا تو کیا اس کی قیمتِ خرید پر زکوٰۃ عائد ہوگی اور کب تک؟۔

**جواب:**

اگر تجارتی مقصد کے لیے خریدی گئی زمین کی فروخت اور دیگر مالکانہ تصرُّفات پر عدالت نے پابندی لگادی ہے اور خریدار کے غیر مشروط مالکانہ حقوق کو ابھی عدالت نے تسلیم نہیں کیا، تو ملکیت کے مُتحقق ہونے اور قبضہ منتقل ہونے تک اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ تاہم جب عدالت سے خریدار کے حق میں فیصلہ آجائے اور اسے قبضہ بھی مل جائے تو اس کے بعد رواں سال میں اس کو اُس کی زکوٰۃ دینی ہوگی، لیکن اگر اس کے پاس اُس زمین کی ٹھوس ملکیتی دستاویزات اور شواہد موجود ہیں، تو عدالت سے مالکانہ حق اور قبضہ ملنے پر پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔

**سوال:7۔**

اگر کسی شخص نے کوئی اسکول کرایہ پر دیا ہوا ہے اور ماہانہ کرایہ پانچ لاکھ روپے آتا ہے، سال کے آخر میں وہ کرایہ خرچ ہوجاتا ہے یا کسی کاروبار میں لگ جاتا ہے، تو زکوٰۃ آمدنی پر لگے گی یا اسکول کے لیے خریدی ہوئی زمین کی مالیت پر، یا جو خرچ کرلی ہے اور جس سے کوئی زمین خریدی ہے اُس پر؟۔

**جواب:**

صاحبِ نصاب نے جو اسکول کرائے پر دیا ہے، تو یہ مالِ تجارت نہیں ہے، بلکہ اس کا ذریعۂ معاش ہے، اُسے جو ماہانہ کرایہ ملتا ہے، وہ اُس کے دیگر ذرائع آمدن کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے، زکوٰۃ کے مالی سال کے اختتام پر یا زکوٰۃ کا حساب لگانے سے پہلے دورانِ سال جو خرچ ہوتا رہا، وہ ازخود اس کی ملکیت سے منہا ہوگیا ہے، سال کے اختتام پر تمام ذرائع سے جو اس کا مال جمع ہوگا، اُس پر زکوٰۃ ہوگی، اِس میں وہ پلاٹ بھی شامل ہوگا، جو کرائے کی آمدنی سے تجارتی مقصد کے لیے خریدا گیا ہے۔

**سوال:8۔**

اگر کوئی زمین خرید کر اللہ کے نام پر وقف کردے، کیا اُس زمین میں زکوٰۃ کی رقم

استعمال کر سکتے ہیں؟۔

**جواب:**

جو زمین کسی نے خرید کر اللہ کے نام پر وقف کر دی ہے، وہ اُس کی ملک سے نکل گئی اور اللہ کی مِلک ہوگئی ہے، اب وہ شخص نہ اُس زمین کا مالک ہے، نہ اُس پر مالکانہ تصرُّف کر سکتا ہے، البتہ وہ وقف کے مُتولی کے طور پر اس کے مالی وانتظامی معاملات کی نگرانی کر سکتا ہے اور اس میں واقف کا استحقاق کسی دوسرے شخص سے زیادہ ہے، موقوفہ جائیداد پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ وہ پوری جائیداد راہ خدا میں وقف ہو چکی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص نے زکوٰۃ کی ادائیگی کا وقت آنے سے پہلے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دیدیا ہو یا وقف کر دیا ہو تو اب اس مال کی زکوٰۃ اُس پر واجب نہیں ہے، کیونکہ وہ سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ ہو گیا۔ البتہ وقف کردہ زمین پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کی بابت جو سوال کیا گیا ہے، اس کے بارے میں واقف کو اپنے مقاصد اور تفصیلات بتانی ہوگی اور اس کے ذہن میں جو طریقۂ کار ہے، اُس کی وضاحت کرنی ہوگی۔ تب ہی ہم اُن تفصیلات کی روشنی میں شرعی حکم بتا سکیں گے، مطلقاً اجازت نہیں دے سکتے۔

**سوال:9**

لوگوں کو مدرسہ بنا کر دے دیا ہو، کیا اُس پر زکوٰۃ کی رقم استعمال ہو سکتی ہے؟۔

**جواب:**

آپ زکوٰۃ کی رقم سے براہِ راست مدرسہ بنا کر نہیں دے سکتے، البتہ اگر اس مدرسے میں مستحقِ زکوٰۃ طلبہ یا طالبات تعلیم پا رہے ہیں، ان کے جملہ مصارف کے لیے زکوٰۃ دے سکتے ہیں، اس کو شرعی طریقے کے مطابق خرچ کرنا اہل مدرسہ کی ذمہ داری ہے۔

**سوال:10**

زکوٰۃ کی رقم سے کسی کو کوئی یونیورسٹی بنا کر دی اور جس کو دی ہے، وہ اس کو کمرشل اور فی سبیل اللہ دونوں طریقے سے استعمال کرتے ہیں، کیا یہ طریقہ صحیح ہے اور اس پر زکوٰۃ کی رقم

کا خرچ کرنا جائز ہے؟۔

**جواب:**
کسی شخص نے زکوٰۃ کی رقم سے جو یونیورسٹی بنائی ہے، اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، البتہ وہاں جو مستحق طلبہ یا طالبات دینی یا عصری تعلیم پا رہے ہیں، اُن کے مصارف کے لیے آپ زکوٰۃ دے سکتے ہیں، یونیورسٹی چلانے والے فرد یا ادارے کی ذمے داری ہے کہ وہ شرعی حدود و قیود اور احکام کے مطابق ان مستحقین پر زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ (فطرہ، فدیہ، کفارات اور نذر) کی رقم خرچ کریں۔ یونیورسٹی کی تعمیر پر کسی صاحبِ نصاب نے زکوٰۃ کی جو رقم لگائی ہے، وہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، وہ زکوٰۃ بدستور اُس شخص کے ذمے واجب الادا ہے، اسے ادا کرنا ہوگا، چاہے جتنا وقت گزر گیا ہو، تاہم فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر گناہ کا سبب ہے۔ جب تک کاروباری اور رفاہی یعنی مخلوط ادارے کا تفصیلی طریقۂ کار معلوم نہ ہو، ہم حتمی رائے نہیں دے سکتے۔ سوال میں یہ بھی واضح نہیں ہے کہ وہ یونیورسٹی کس کی مِلک ہے، اگر وہ شخصی ملکیت ہے، تو وہ مالک کی کل مالیت کا حصہ ہے۔

**سوال:11**
اگر کسی صاحبِ نصاب نے پانچ لاکھ روپے کسی کو انویسٹ کرنے کے لیے دیے، ایک سال گزر گیا، کوئی نفع نہیں آیا، تو زکوٰۃ کس رقم پر لگے گی اور اگر دو سال بعد اس کا نفع ایک لاکھ آتا ہے تو زکوٰۃ نفع پر لگے گی یا کاروبار میں لگائی ہوئی اصل رقم پر؟۔

**جواب:** جو رقم کاروبار میں انویسٹ کی ہے، دیکھنا ہوگا کہ انویسٹر نے شراکت کا معاہدہ کیا ہے یا مضاربت کا اور آیا وہ معاہدہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں، تاہم ہر سال زکوٰۃ اصل مع منافع (یعنی مجموعی رقم) پر عائد ہوگی، اگر کسی سال نفع نہیں آیا تو صرف اصل مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگلے سال منافع آگیا ہے، تو اس سال منافع اور اصل رقم کے مجموعے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

**سوال:12**

اگر صاحبِ نصاب نے کسی کو قرض دیا اور وہ قرض واپس نہیں مل رہا تو کیا اس پر زکوٰۃ ہوگی؟۔

**جواب:**

آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا دین، ''دینِ ضعیف'' ہے، سال بہ سال اس کی زکوٰۃ آپ پر لازم نہیں ہے، لیکن تقدیرِ الٰہی سے آئندہ کبھی قرض کی وہ رقم واپس آپ کو مل گئی تو اس سال سے اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی، ماضی کے سالوں کی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر قرض خواہ کے پاس اس قرض کے ٹھوس قانونی ثبوت وشواہد موجود ہیں، تو قرض ملنے پر ماضی کے سالوں کی زکوٰۃ بھی اسے دینا ہوگی اور اگر اُس کے پاس ثبوت وشواہد موجود نہیں ہیں تو رقم ملنے پر پچھلے سالوں کی زکوٰۃ اُس پر عائد نہیں ہوگی۔

**سوال:13**

کسی صاحبِ نصاب نے کسی شخص کو دس ہزار روپے قرض دیا اور وہ ماہانہ ایک ہزار روپے واپس کر رہا ہے، تو زکوٰۃ کتنی رقم پر لگے گی؟۔

**جواب:**

آپ کے بیان کے مطابق آپ کا یہ دین، دینِ قوی ہے، زکوٰۃ کا حساب نکالتے وقت جتنا دَین مدیون کے ذمے باقی ہے، اسے بھی آپ اپنے مال میں شامل کریں گے اور جو اقساط آپ کو وصول ہو چکی ہیں، وہ از خود آپ کے مال میں جمع ہو چکی ہیں، الغرض سب پر زکوٰۃ ہے۔

**سوال:14**

مستحق لوگوں میں زکوٰۃ کی رقم سے راشن تقسیم کرنا صحیح ہے؟۔

**جواب:**

مستحقِ زکوٰۃ لوگوں کو زکوٰۃ کی رقم سے راشن، کپڑے، اشیائے ضرورت دی جا سکتی

ہیں، بشرطیکہ پہلے مستحقین کا تعین کرلیا جائے اور یہ چیزیں ان کی ملک کردی جائیں، ان اشیاء کی قیمت خرید زکوٰۃ میں شمار ہوگی۔ بازاروں اور چوراہوں پر جولنگر لگائے جاتے ہیں، ان پر زکوٰۃ اور تمام صدقاتِ واجبہ (فطرہ، فدیۂ صوم، کفارۂ قسم، کفارۂ صوم اور نذر) کی رقوم خرچ نہیں کی جاسکتیں، کیونکہ ایک تو ان کو مالکانہ تصرّف کا حق حاصل نہیں ہوتا، اس لیے کہ اُسی مقام پر بٹھا کر کھلانے سے تشہیر مقصود ہوتی ہے، دوسرا مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہیں ہوتا، تیسرا یہ کہ غیر مسلم بھی آکر شامل ہوجاتے ہیں، جبکہ صدقاتِ واجبہ صرف مسلم فقراء ومساکین کا حق ہے، البتہ نفلی خیرات غیر مسلم کو دی جاسکتی ہے۔

**سوال:15**

لوگوں کا علاج کروا کر زکوٰۃ کی رقم سے اسپتال کا بل ادا کرنا درست ہے؟۔

**جواب:**

اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اسپتال والوں کیساتھ اپنے بھیجے جانے والے (Referred) زکوٰۃ کے مستحق مریضوں کے علاج کے ضامن بننے کا ایک عمومی معاہدہ کرلیں، پھر جب آپ کے بھیجے ہوئے مستحق مریض کا علاج مکمل ہوجائے تو مریض کے سارے بل جمع کر کے زکوٰۃ دینے والا خود یا اس کا وکیل موقع پر مریض کو نقد رقم دیدے کہ اپنے اسپتال کے واجبات ادا کردو۔ امریکا اور مغرب میں اگرچہ ہیلتھ انشورنس کی پالیسی شریعت کے مطابق نہیں ہوتی، لیکن اُن کا فارمیٹ تقریباً اسی قسم کا ہوتا ہے، اسپتال یا ڈاکٹر مریض کا علاج مکمل کرنے کے بعد انشورنس کمپنی سے اپنا بل وصول کرتے ہیں۔

## پلاٹ پر زکوٰۃ کا حکم

**سوال:**

بچوں کے لیے جو پلاٹ خریدے، اُن پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے، نیز اُن کے فروخت کیے جانے پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟۔ پلاٹ ذاتی رہائش کے لیے خریدا یا کرائے پر دینے کے لیے خریدا، اس پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟۔

**جواب:**

جو پلاٹ ذاتی رہائش کے لیے خریدے گئے ہوں، اُن پر زکوٰۃ ادا نہیں کی جائے گی، اگر کسی موقع پر اُس پلاٹ کو فروخت کر دیتے ہیں تو پہلے صاحب نصاب ہونے کی صورت میں جب اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کریں گے تو اس رقم پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی اور اگر پہلے سے صاحبِ نصاب نہیں ہوں گے، تو اس وقت سے اس کا سال شروع ہوگا۔ البتہ جو پلاٹ یا مکان یا فلیٹ تجارت کی نیت سے خریدے کہ اس پر نفع حاصل کریں گے، اس کی مارکیٹ ویلیو پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

## کرائے کی آمدنی پر زکوٰۃ کا حکم

**سوال:**

دو کروڑ کا فلیٹ خریدا، سالانہ تین لاکھ روپے کرایہ آتا ہے، جو استعمال ہو جاتا ہے، سال کے آخر میں صرف پچاس ہزار روپے بچتے ہیں، مکان کی موجودہ مارکیٹ ویلیو چار کروڑ روپے ہے، زکوٰۃ کس رقم پر ہوگی؟۔

**جواب:**

یہ فلیٹ مال تجارت نہیں ہے، بلکہ آپ کا ذریعہ آمدنی ہے، اس لیے اس فلیٹ کی مارکیٹ ویلیو پر زکوٰۃ نہیں ہوگی بلکہ سال کے دوران جو آپ کے ذاتی اور انتظامی اخراجات ہو جاتے ہیں، وہ ازخود مالیت سے نکل جاتے ہیں یعنی زکوٰۃ اس فلیٹ کی آمدنی پر نہیں لگے گی بلکہ اختتامِ سال پر تمام تر ذاتی، انتظامی و دیگر مصارف وضع کرنے کے بعد جو مالیت بچ رہے گی، وہ آپ کے دیگر ذرائع آمدن، اموال، نقد، بانڈز، سرٹیفکیٹس، سونا چاندی اور مالِ تجارت کے ساتھ (اگر ہے) جمع ہوگی اور آپ کو اپنی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ دینی ہوگی، یعنی جب کوئی شخص ایک بار صاحبِ نصاب ہوگیا تو ہر آئٹم کی الگ الگ زکوٰۃ کا سوال غیر متعلق ہو جاتا ہے، اسے اپنے تمام ذرائع آمدن کو جمع کر کے زکوٰۃ نکالنی ہوگی، دوران سال جو رقم خرچ ہوگئی ہے، وہ ازخود منہا ہو جائے گی۔

# گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی

**سوال:**

ایک خاتون کے پاس ساڑھے سات تولہ سے زیادہ سونے کے زیورات ہیں، عرصہ پچیس سال سے زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی، اب وہ چاہتی ہیں کہ گزشتہ پورے عرصے کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ سونے کے سارے وزن پر سونے کی قیمت موجودہ نرخ کے مطابق لگائی جائے گی؟، زکوٰۃ اقساط میں ادا کی جاسکتی ہے یا یکمشت ادا کرنا ہوگی؟۔ ان کی ایک غیر شادی شدہ بیٹی ہے، کیا نصاب سے زائد سونا اسے دے سکتی ہے؟

(ڈاکٹر عبدالرزاق، کالا گوجراں جہلم)

**جواب:**

مذکورہ خاتون صاحبِ نصاب ہیں اور اُن پر زکوٰۃ واجب ہے، گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کی ادائی بھی اُن پر لازم ہے، ادائی میں تاخیر پر گنہگار ہوئیں، اللہ تعالیٰ سے اس پر توبہ واستغفار کریں اور فوری طور پر ماضی کے تمام سالوں کی زکوٰۃ کی ادائی کا اہتمام کریں، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ متوفّٰی 1161ھ لکھتے ہیں:

''وَتَجِبُ عَلَى الْفَوْرِ عِنْدَ تَمَامِ الْحَوْلِ حَتّٰی يَأْثَم بِتَأْخِيْرِهٖ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ، وَفِیْ رِوَايَةِ الرَّازِیْ عَلَى التَّرَاخِیْ حَتّٰی يَأْثَمَ عِنْدَ الْمَوْتِ، وَالْاَوَّلُ أَصَحُّ كَذَا فِی ''التَّهْذِيْبِ''۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ سال پورا ہونے پر فوراً واجب ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ کسی عذر کے بغیر زکوٰۃ کی ادائی میں تاخیر پر گنہگار ہوگا اور امام رازی کے نزدیک تاخیر سے مراد یہ ہے کہ موت کے وقت (تک اگر ادا نہ کی) گنہگار ہوگا اور پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، جیسا کہ ''تہذیب'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 170)''۔

اگر آپ کے پاس ریکارڈ ہے کہ گزشتہ سالوں کے اختتام پر سونے کی مقدار کیا تھی، تو ہر سال کے اختتام پر کل مقدار کے ڈھائی فیصد کی شرح سے پچھلے سال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور اسی ترتیب سے گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کریں اور زیادہ محتاط بات یہ ہے کہ

ہر سال کے اختتام پر موجود سونے کے وزن کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ وضع کرلیں اور پھر سونا دیں یا اس کے برابر موجودہ نرخ کے مطابق قیمت دیدیں۔

## ذاتی استعمال کے لیے خریدکردہ پلاٹ پر زکوٰۃ نہیں ہے

**سوال:**

میرے بیٹے مشترکہ خاندان کی صورت میں میرے ساتھ ہی رہتے ہیں، سب بالغ اور شادی شدہ ہیں، انہوں نے اپنے اپنے پلاٹ خریدے ہوئے ہیں لیکن مکان تعمیر کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، کیا ان پلاٹوں پر زکوٰۃ دینا ہوگی؟۔

**جواب:**

جو پلاٹ ذاتی رہائش کے لیے خریدے گئے ہوں، اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اگر کسی موقع پر اُس پلاٹ کو فروخت کردیتے ہیں تو پہلے سے صاحب نصاب ہونے کی صورت میں جب اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کریں گے تو اس رقم پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی اور اگر پہلے سے صاحبِ نصاب نہیں ہوں گے، تو اُس وقت سے اس کا سال شروع ہوگا۔ البتہ جو پلاٹ یا مکان یا فلیٹ تجارت کی نیت سے خریدے کہ اس پر نفع حاصل کریں گے، اس کی مارکیٹ ویلیو پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ اس میں خریدتے وقت کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے، اگر خریدتے وقت ذاتی استعمال کی نیت تھی، بعد میں نفع حاصل کرنے کے ارادے سے بیچنے کی نیت کرلی، تو جب تک بیچ نہ لے، اس پلاٹ پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔

## کرائے کے مکان کی قیمت پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی

**سوال:**

ایک بیٹے نے اسلام آباد میں مکان کرائے پر دیا ہوا ہے، کیا مکان کی پلاٹ سمیت قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟۔

**جواب:**

یہ مکان مال تجارت نہیں ہے، بلکہ اس کا ذریعہ آمدنی ہے، اس لیے اس مکان کی

مارکیٹ ویلیو پر زکوٰۃ نہیں ہوگی بلکہ سال کے دوران جو ذاتی اور انتظامی اخراجات ہوجاتے ہیں، وہ ازخود مالیت سے نکل جاتے ہیں، یعنی زکوٰۃ اس مکان کی آمدنی پر نہیں لگے گی بلکہ اختتامِ سال پر تمام تر ذاتی، انتظامی و دیگر مصارف وضع کرنے کے بعد جو مالیت بچ رہے گی، وہ آپ کے دیگر ذرائع آمدن، نقد، بانڈز، سرٹیفکیٹس، سونا چاندی اور مالِ تجارت کے ساتھ جمع ہوگی اور آپ کو اپنی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ دینی ہوگی، یعنی جب کوئی شخص ایک بار صاحبِ نصاب ہوگیا تو ہر آئٹم کی الگ الگ زکوٰۃ کا سوال غیر متعلق ہوجاتا ہے، اسے اپنے تمام ذرائع آمدن کو جمع کر کے زکوٰۃ نکالنی ہوگی، دورانِ سال جو رقم خرچ ہوگئی ہے، وہ ازخود منہا ہوجائے گی۔

## زکوٰۃ میں غیر شرعی تصرُّف کی درستگی

**سوال:**

ہمارا ادارہ ایک فلاحی ادارہ ہے، ہمارے ادارے کے پاس 1975ء میں جنرل فنڈ سے خریدے گئے 120 گز کے دو پلاٹ تھے۔ 1987ء میں مخیر حضرت کی زکوٰۃ سے 23 فلیٹوں پر مشتمل دو منزلہ عمارت تعمیر کی، اخراجات ساڑھے سات لاکھ روپے آئے۔ یہ فلیٹ ضرورت مند اور مستحق ممبران کے درمیان رہائش کے لیے تقسیم کیے گئے، لیکن مالکانہ حقوق نہیں دیے گئے۔ ہر دو سال بعد کمیٹی تبدیل ہوتی اور فلیٹ کے مکین بھی تبدیل ہوتے، جب کوئی کمیٹی ان مکینوں کو مالکانہ حقوق دینے کا ارادہ کرتی تو یہ احساس ہوتا کہ جس زمین پر یہ عمارت تعمیر کی گئی ہے، وہ ادارے کی ملکیت ہے۔ 1987ء میں عمارت کی تعمیر پر ساڑھے سات لاکھ روپے صرف ہوئے تھے، جبکہ اب اس طرح کی عمارت ایک کروڑ دس لاکھ روپے میں تعمیر ہوگی۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ ماضی کی غلطی کو کس طرح درست کیا جائے، زکوٰۃ اور جنرل فنڈ کا تناسب 1987ء کے حساب سے ہوگا یا آج کے دور کے حساب سے۔ ہمارے ادارے کی ملکیت بھی باقی رہے اور زکوٰۃ بھی ادا ہوجائے''۔

(عبدالکریم، سیکریٹری پوربندر میمن جماعت، کراچی)

**جواب:**

جس نادار فقیر اور مستحقِ زکوٰۃ کو زکوٰۃ کی رقم سے مکان یا فلیٹ بنا کر دیا جائے تو اُسے شرعی اور قانونی طور پر اس کا مالک بنانا ضروری ہے اور زکوٰۃ کی رقم سے مکان بنا کر دینے والے فرد یا فلاحی انجمن کو اس کے مالکانہ تصرُّف پر پابندی لگانے کا کوئی اختیار نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے تملیک (مالک بنانا) شرط ہے، یعنی جس مستحق کو زکوٰۃ نقد یا پلاٹ یا مکان کی صورت میں دی جارہی ہے، اُسے اُس مال پر تصرُّف کا مکمل اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ جو شخص اپنے مال پر زکوٰۃ ادا کررہا ہے، شرعاً اُسے بھی اِس طرح کی شرائط عائد کرنے کا اختیار حاصل نہیں اور جس ادارے یا انجمن کے توسط سے یہ کام انجام دیے جائیں، وہ بھی کسی قسم کی شرائط عائد نہیں کرسکتے کیونکہ اس طرح کی شرائط سے مالکانہ تصرُّف کا اختیار باطل ہوجاتا ہے، تنویرالابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''(هِيَ) لُغَةً اَلطَّهَارَةُ وَالنَّمَاءُ، وَشَرْعًا (تَمْلِيْكٌ) خَرَجَ الْاِبَاحَةُ، فَلَوْ أَطْعَمَ يَتِيْمًا نَاوِيًا الزَّكَاةَ لَا يُجْزِيْهِ، اِلَّا اِذَا دَفَعَ اِلَيْهِ الْمَطْعُوْمَ، كَمَا لَوْ كَسَاهُ بِشَرْطِ أَنْ يَعْقِلَ الْقَبْضَ''۔

ترجمہ: ''زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہیں: ''(مال کا) پاک ہونا اور (مال کا) بڑھنا''۔ زکوٰۃ کے شرعی معنی ہیں: ''فقیر کو مالِ زکوٰۃ کا مالک بنادینا''۔ تملیک کی قید سے محض مباح کردینا (یعنی فقرا کو مالِ زکوٰۃ کے استعمال کی عام اجازت دینا) خارج ہوگیا، پس اگر کسی شخص نے نادار یتیم کو زکوٰۃ کی نیت سے کھانا کھلا دیا، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مگر جب وہی کھانا یتیم کے حوالے کردیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، جیسے اگر ادائے زکوٰۃ کے لئے یتیم کو کپڑا پہنایا بشرطیکہ وہ قبضے کی حقیقت کو سمجھتا ہو (تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)''۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ''وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَّكُوْنَ الصَّرْفُ (تَمْلِيْكًا) لَا اِبَاحَةً كَمَا مَرَّ''۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط یہ ہے کہ نادار کو مالک بنادیا جائے نہ کہ محض استعمال کرنے کی اجازت دی ہو، جیسا کہ (گزشتہ سطور میں) گزرا''۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد:3، ص:161، 263-264)

آپ نے لکھا: ''یہ فلیٹ ضرورت منداور مستحق ممبران کے درمیان تقسیم کیے گئے، لیکن مالکانہ حقوق نہیں دیئے گئے''، 1987ء سے معاملات اسی طرح ہیں، یہ برا ہوا۔ آپ کی جماعت زکوٰۃ دینے والے شخص کی وکیل ہے اور وکیل کی ذمے داری ہے کہ زکوٰۃ مستحقین تک پہنچائے، آپ کی جماعت نے جو تصرُّف کیا ہے، یہ خلافِ شرع ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، آپ کی جماعت کی ہر دور کی انتظامیہ عنداللہ اس کے لیے جوابدہ ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ مُتوفّٰی 1161ھ لکھتے ہیں:

''وَتَجِبُ عَلَى الْفَوْرِ عِنْدَ تَمَامِ الْحَوْلِ حَتّٰى يَأْثَمَ بِتَأْخِيْرِهٖ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ، وَفِيْ رِوَايَةِ الرَّازِيْ عَلَى التَّرَاخِيْ حَتّٰى يَأْثَمَ عِنْدَ الْمَوْتِ، وَالْاَوَّلُ أَصَحُّ كَذَا فِيْ ''التَّهْذِيْبِ''۔

ترجمہ: ''اور زکوٰۃ سال پورا ہونے پر فوراً واجب ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ کسی عذر کے بغیر زکوٰۃ کی ادائی میں تاخیر پر گنہگار ہوگا اور امام رازی کے نزدیک تاخیر سے مراد یہ ہے کہ موت کے وقت (تک اگر ادا نہ کی تو) گنہگار ہوگا اور پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، جیسا کہ ''تہذیب'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 170)''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''(وَقِيْلَ: فَوْرِيٌّ) أَيْ وَاجِبٌ عَلَى الْفَوْرِ (وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى) كَمَا فِيْ ''شَرْحِ الْوَهْبَانِيَّةِ'' (فَيَأْثَمُ بِتَأْخِيْرِهَا) بِلَا عُذْرٍ (وَتُرَدُّ شَهَادَتُهٗ) لِاَنَّ الْاَمْرَ بِالصَّرْفِ اِلَى الْفَقِيْرِ مَعَهٗ قَرِيْنَةُ الْفَوْرِ وَهِيَ اَنَّهٗ لِدَفْعِ حَاجَتِهٖ وَهِيَ مُعَجَّلَةٌ فَمَتٰى لَمْ تَجِبْ عَلَى الْفَوْرِ لَمْ يَحْصُلِ الْمَقْصُوْدُ مِنَ الْاِيْجَابِ عَلٰى وَجْهِ التَّمَامِ وَتَمَامُهٗ فِيْ ''الْفَتْحِ''۔

ترجمہ: ''بعض نے کہا: زکوٰۃ فوری ہے یعنی زکوٰۃ فی الفور لازم ہوجاتی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ ''شرح وہبانیہ'' میں ہے، پس تاخیر کے ساتھ ادائی سے گناہ لازم لائے گا، جب کہ تاخیر عذر کے بغیر ہو اور ایسے شخص کی شہادت مردود ہے، کیونکہ حکم زکوٰۃ کے ساتھ مصرفِ زکوٰۃ فقراء کا ذکر کرنا اس پر قرینہ ہے کہ فی الفور ادائی ہو، کیونکہ زکوٰۃ دینا ضروریاتِ فقیر کو پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اس کو جلد ادا کرنا مقصود ہے اور اگر یہ فی الفور لازم نہ

ہوتو ایجابِ زکوٰۃ کا مقصد کامل طور پر حاصل نہ ہوگا، اس کی تفصیل فتح القدیر میں ہے"۔ (جلد5،ص:462، دمشق)

جس جنرل فنڈ سے آپ نے اپنی جماعت کے لیے پلاٹ خریدا ہے، بادی النظر میں وہ بھی نفلی صدقہ وخیرات کی رقم ہے، یہ پلاٹ کسی واقف نے کسی خاص مقصد کے لیے وقف تو کیا نہیں کہ اس کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا ضروری ہو۔ لہٰذا اگر آپ کی جماعت کو اس پر فلیٹ تعمیر کرنے اور مستحقین کو استعمال کے لیے دینے کا حق ہے، تو آپ انہیں مالکانہ بنیاد پر بھی دے سکتے ہیں، اس طرح آپ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی بری الذمہ ہو سکتے ہیں، ادائیگی میں تاخیر پر آپ کی تمام ادوار کی انتظامیہ کو اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنی چاہیے۔ لیکن اگر آپ یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے تو جس کمیٹی نے زکوٰۃ کا پیسہ ان فلیٹوں پر لگایا ہے، وہ تصرّف ناجائز تھا، وہ اس رقم کے ضامن اور کفیل وامین ہیں، انہیں اس کی تلافی کرنی ہوگی، کیونکہ زکوٰۃ کی وہ رقم کسی حادثے یا سرقے یا غصب یا ڈاکہ کے سبب ضائع نہیں ہوئی کہ آپ تاوان سے بری الذمہ ہو جائیں، دُرّ مختار میں ہے:

"وَلَا تُضْمَنُ بِالْهَلَاكِ مِنْ غَيْرِ تَعَدٍّ وَشَرْطُ الضَّمَانِ بَاطِلٌ كَشَرْطِ عَدَمِهِ فِي الرَّهْنِ خِلَافًا لِلْجَوْهَرَةِ"۔

ترجمہ: "تعدّی کے بغیر (امانت کی) ہلاکت پر ضامن نہیں ہوں گے اور ضمان کی شرط باطل ہے، جس طرح رہن میں ضمان نہ ہونے کی شرط لگائی جائے، "جوہرہ" نے اس سے اختلاف کیا ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد8،ص:413، بیروت)"۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"إِذَا طَلَبَ الْوَدِيعَةَ، فَقَالَ: أُطْلُبْهَا غَدًا، ثُمَّ قَالَ فِي الْغَدِ ضَاعَتْ، فَإِنَّهُ يُسْأَلُ، إِنْ قَالَ ضَاعَتْ قَبْلَ قَوْلِي أُطْلُبْهَا غَدًا، يَضْمَنُ، وَإِنْ قَالَ ضَاعَتْ بَعْدَهُ لَا، لِلتَّنَاقُضِ فِي الْأَوَّلِ دُوْنَ الثَّانِي، كَذَا فِي "الْفُصُوْلِ الْعِمَادِيَّةِ"۔

ترجمہ: "جب مالک نے اپنی امانت طلب کی تو رکھنے والے نے کہا: کل لینا، پھر کل کہا: وہ

امانت ضائع ہوگئی، تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کب ضائع ہوئی، اگر کہے: میرے ''کل لے جانا'' کہنے سے پہلے ضائع ہوئی، تو ضامن ہوگا اور اگر کہے: اس کے بعد ضائع ہوئی تو ضامن نہیں ہوگا کیونکہ پہلی صورت میں تناقض ہے اور دوسری میں نہیں ہے، ''فصول العمادیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:352)''۔

زکوٰۃ کی رقم علیحدہ کر کے رکھی، جب تک مستحقین تک نہ پہنچادے ادائیگی سے بری الذمہ نہیں ہوگا، اگر وہ مال ضائع ہو گیا تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، دُرِّ مختار میں ہے:

''وَلَا يَخْرُجُ عَنِ الْعُهْدَةِ بِالْعَزْلِ بَلْ بِالْأَدَاءِ لِلْفُقَرَاءِ''۔

ترجمہ: ''محض مال علیحدہ کر دینے سے زکوٰۃ کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں ہوگا، بلکہ فقراء کو ادا کر دینے کے بعد (ذمہ داری سے ادا ہوگا)''، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَلَوْ ضَاعَتْ لَا تَسْقُطُ عَنْهُ الزَّكَاةُ وَلَوْ مَاتَ كَانَتْ مِيْرَاثًا عَنْهُ، بِخِلَافِ مَا إِذَا ضَاعَتْ فِي يَدِ السَّاعِيْ لِأَنَّ يَدَهُ كَيَدِ الْفُقَرَاءِ ''بَحْرٌ'' عَنِ ''الْمُحِيْطِ''۔

ترجمہ: ''پس اگر وہ علیحدہ کیا ہوا مال ضائع ہو گیا تو اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی، اگر وہ فوت ہو جائے تو وہ مال بطور ترکہ تقسیم ہوگا، اگر وہ مال زکوٰۃ جمع کرنے والے وکیل کے قبضے میں ضائع ہوا تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی کیونکہ وکیل کا قبضہ دراصل فقیر ہی کا قبضہ ہے، ''البحر الرائق'' میں ''محیط سے روایت کیا گیا ہے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 5، ص:457، دمشق)''۔ لیکن انجمنوں کی انتظامیہ زکوٰۃ دینے والوں کی وکیل ہوتی ہے، فقراء کی نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آپ کی جماعت زکوٰۃ دینے والے اشخاص کی وکیل ہے اور وکیل کی ذمے داری ہے کہ زکوٰۃ مستحقین تک پہنچائے۔ آپ کی خواہش کے مطابق آپ کے ادارے کو ملکیت بھی حاصل رہے اور زکوٰۃ بھی ادا ہو جائے، یہ ناممکن ہے۔ آپ مستحقین زکوٰۃ کو اُن فلیٹوں کا مالک بنا دیں۔

## مالِ زکوٰۃ سے حج کرانے کا حکم

### سوال:

ایک شخص جو صاحبِ نصاب ہے، ہر سال اپنی زکوٰۃ مختلف مدارس، یتیم خانوں اور فلاحی اداروں کو ادا کرتا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ کسی مستحقِ زکوٰۃ کو تلاش کرے، پھر اس کو کچھ رقم گھر والوں کی ضروریات کے لیے دے اور اسے زکوٰۃ کی رقم سے حج پر بھیجے، کیا اس طرح اس کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟، (مخدوم صدیقی، ناظم آباد، کراچی)۔

### جواب:

اگر چہ بیک وقت ایک ہی فقیر کو زکوٰۃ کی بہت بڑی رقم دینا شرعاً پسندیدہ نہیں ہے، لیکن اگر دیدی تو ادا ہو جائے گی، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَیُکْرَہُ أَنْ یُّدْفَعَ إِلٰی رَجُلٍ مِائَتَیْ دِرْھَمٍ فَصَاعِدًا، وَإِنْ دَفَعَہٗ جَازَ کَذَا فِی ''الْھِدَایَۃ''۔

ترجمہ: ''اور ایک شخص کو (بیک وقت) دوسو درہم (یعنی مقدارِ نصاب کے برابر) یا اس سے زائد دینا مکروہ ہے، اگر دے دیا تو جائز ہے (یعنی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی)، ''ہدایہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص:188)''۔ بعض خاص صورتوں میں نصاب کی مقدار یا اس سے بھی زیادہ مال دینا کراہت کے بغیر جائز ہے، تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے، یعنی کسی خاص شخص یا اشخاص کے احوال پر موقوف ہے۔

علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر مرغینانی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے: ''وَقَالَ زُفَرُ لَا یَجُوْزُ'' یعنی امام زفر کے نزدیک کسی ایک مستحق کو بیک وقت اتنی رقم دینا جائز نہیں ہے (کہ وہ خود غنی اور صاحبِ نصاب ہو جائے، عدمِ جواز کے قول کا تقاضا یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی)، (الہدایہ، جلد 2، ص:78، مکتبۃ البشریٰ)''۔ علامہ محمد بن محمود بابرتی نے ''عنایہ'' شرح ہدایہ میں اس پر مدلّل اور مُفصّل بحث کی ہے، لیکن صاحبِ ہدایہ کا مختار قول یہی ہے کہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ کی حکمتوں میں لوگوں کو حج اور عمرے کرانا نہیں ہے، بلکہ مستحقین

کی حاجات اصلیہ کو پورا کرنا ہے، البتہ اگر کوئی فقیر و مسکین بے گھر ہے اور کوئی صاحبِ زکوٰۃ مکان خرید کر اسے اس کا مالک بناتا ہے، تو اس مکان کی قیمت غالب صورتوں میں 612,36 گرام چاندی یا بعض صورتوں میں 87,48 گرام سونے کی بازاری قیمت سے زائد ہوگی، لیکن چونکہ مکان حاجتِ اصلیہ ہے، اس لیے زکوٰۃ بلا کراہت ادا ہو جائے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنے کثیر مال سے نوازا ہے اور آپ کو کسی صالح مستحقِ زکوٰۃ شخص کو حج کرانے کا بھی شوق ہے، تو اپنے اصل مال میں سے یہ سعادت حاصل کیجیے، اس کو اس رقم کا مالک بنا دیجیے تاکہ وہ صاحبِ استطاعت ہو کر بطور فرض حج ادا کرے۔ لیکن اگر آپ زکوٰۃ کی رقم سے کسی شرعی فقیر کو حج کرانا ہی چاہتے ہیں تو اتنی رقم اس کی ملکیت کر دیں۔ اس شخص کی مرضی ہے کہ وہ اس رقم سے حج کرے یا اپنی اور کوئی ضرورت پوری کرے، آپ اسے مجبور نہیں کر سکتے، اگر آپ نے رقم اس کی ملکیت میں نہیں دی اور اس کے حج کے اخراجات گورنمنٹ یا کسی پرائیویٹ حج گروپ آرگنائزر کے حوالے کر دیے اور اس شخص کو حج پر بھیج دیا، تو آپ کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ اُس کا حج ادا ہو جائے گا۔

# حج اور عمرہ کے مسائل

## مکہ مکرمہ کا مستقل باسی یا عارضی رہائشی عمرے کا احرام تنعیم سے باندھے

**سوال:**

ایک عمرہ مکمل ہوجانے کے بعد دوسرا عمرہ کرنے کے لیے احرام کہاں سے باندھا جائے گا؟ (انعام الحق، راشد منہاس روڈ، کراچی)۔

**جواب:**

حدودِ حرم میں موجود شخص کے لیے "تَنْعِیم" سے احرام باندھنا افضل ہے، حدیث پاک میں ہے:

"اِنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، أَخْبَرَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يُرْدِفَ عَائِشَةَ وَيُعْمِرَهَا مِنَ التَّنْعِيمِ"۔

ترجمہ: "عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھائیں اور ان کو مقامِ تنعیم سے عمرہ کرائیں، (صحیح بخاری: 1784)"۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ذِكْرُ مَا يُسْتَفَادُ مِنْهُ فِيهِ أَنَّ الْمُعْتَمِرَ الْمَكِّيَّ لَا بُدَّ لَهُ مِنَ الْخُرُوجِ إِلَى الْحِلِّ ثُمَّ يُحْرِمُ مِنْهُ، وَإِنَّمَا عَيَّنَ التَّنْعِيمَ هُنَا دُونَ الْمَوَاضِعِ الَّتِي خَارِجَ الْحَرَمِ لِاَنَّ التَّنْعِيمَ أَقْرَبُ إِلَى الْحِلِّ مِنْ غَيْرِهَا وَفِي "التَّوْضِيحِ" وَيُجْزِءُ أَقَلُّ الْحِلِّ وَهُوَ التَّنْعِيمُ، وَأَفْضَلُهُ عِنْدَنَا الْجِعِرَّانَةُ، ثُمَّ الْحُدَيْبِيَّةُ"۔

ترجمہ: "اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ سے عمرہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حدودِ حرم سے نکل کر "حِلّ" میں جائے، آپ نے خارج حرم کی دوسری جگہوں کے مقابلے میں تنعیم کو اس لیے مقرر فرمایا کہ تنعیم خارج حرم میں سے حرم کے قریب ترین جگہ تھی اور "توضیح" میں ہے: قریب ترین حِلّ تنعیم سے عمرہ جائز ہے اور ہمارے نزدیک افضل

''جِعِرّانہ'' ہے، پھر حُدَیْبِیہ۔ (عمدۃ القاری، جلد 10، ص: 170 )''۔ آفاقیوں کے میقات (حج اور عمرے کی نیت باندھنے کی جگہ) اور حدودِ حرم کے درمیان جو خطہ ہے، اُسے ''حِلّ'' کہتے ہیں۔

حدودِ حرم اور منٰی میں رہنے والے لوگوں کے لیے حج کا احرام باندھنے کے لیے سارا حرم میقات ہے اور عمرے کا احرام باندھنے کے لیے میقات ''حِلّ'' ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَحَلَّ لِاَهْلِ دَاخِلِهَا يَعْنِیْ لِكُلِّ مَنْ وُجِدَ فِیْ دَاخِلِ الْمَوَاقِيْتِ دُخُوْلُ مَكَّةَ غَيْرَ مُحْرِمٍ مَا لَمْ يُرِدْ نُسُكًا لِلْحَرَجِ كَمَا لَوْ جَاوَزَهَا حَطَّابُوْ مَكَّةَ فَهٰذَا مِيْقَاتُهُ الْحِلُّ الَّذِیْ بَيْنَ الْمَوَاقِيْتِ وَالْحَرَمِ وَالْمِيْقَاتُ لِمَنْ بِمَكَّةَ يَعْنِیْ مَنْ بِدَاخِلِ الْحَرَمِ لِلْحَجِّ الْحَرَمُ وَلِلْعُمْرَةِ الْحِلُّ لِيَتَحَقَّقَ نَوْعُ سَفَرٍ وَالتَّنْعِيْمُ أَفْضَلُ''۔

ترجمہ: ''جو لوگ میقات کے اندر رہتے ہیں ان کے لیے احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہونا حلال ہے، جب تک وہ حج (یا عمرے) کا ارادہ نہ کریں، تاکہ وہاں (حِلّ) میں رہنے والوں کے لیے حرج نہ ہو، جیسا کہ مکہ کے لکڑ ہارے حدودِ حرم کے باہر سے لکڑیاں کاٹ کر احرام کے بغیر گزرتے ہیں، پس اس کا میقات حِلّ ہے، جو میقات اور حرم کے درمیان کا علاقہ ہے اور جو حرم کی حدود کے اندر کی جانب رہتا ہے، اس کا میقات حج کے لیے حرم اور عمرہ کے لیے حِلّ ہے تاکہ کچھ سفر متحقق ہو جائے اور ''تنعیم'' افضل ہے''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ يَعْنِیْ إِلَخ۔۔ أَشَارَ إِلٰى مَا فِی الْبَحْرِ مِنْ قَوْلِهٖ وَالْمُرَادُ بِالْمَكِّیِّ مَنْ كَانَ دَاخِلَ الْحَرَمِ سَوَاءٌ كَانَ بِمَكَّةَ أَوْ لَا، وَسَوَاءٌ كَانَ مِنْ أَهْلِهَا أَوْ لَا، فَيَشْمَلُ الْآفَاقِیَّ الْمُفْرِدَ بِالْعُمْرَةِ وَالْمُتَمَتِّعَ وَالْحَلَالَ مِنْ أَهْلِ الْحِلِّ إِذَا دَخَلَ الْحَرَمَ لِحَاجَةٍ كَمَا فِی ''اللُّبَابِ''، قَوْلُهٗ لِيَتَحَقَّقَ نَوْعُ سَفَرٍ لِأَنَّ أَدَاءَ الْحَجِّ فِیْ عَرَفَةَ، وَهِیَ فِی الْحِلِّ فَيَكُوْنُ إِحْرَامُ الْمَكِّیِّ بِالْحَجِّ مِنَ الْحَرَمِ لِيَتَحَقَّقَ لَهٗ نَوْعُ سَفَرٍ بِتَبَدُّلِ الْمَكَانِ، وَأَدَاءَ الْعُمْرَةِ فِی

الْحَرَامِ فَیَکُوْنُ إِحْرَامُهٗ بِهَا مِنَ الْحِلِّ لِیَتَحَقَّقَ لَهٗ نَوْعٌ مِنَ السَّفَرِ ''شَرْحُ النُّقَایَةِ لِلْقَارِی'' فَلَوْ عَکَسَ فَأَحْرَمَ لِلْحَجِّ مِنَ الْحِلِّ أَوْ لِلْعُمْرَةِ مِنَ الْحَرَمِ لَزِمَهٗ دَمٌ إِلَّا إِذَا عَادَ مُلَبِّیًا إِلَی الْمِیْقَاتِ الْمَشْرُوْعِ لَهٗ کَمَا فِی ''اللُّبَابِ'' وَغَیْرِهٖ''۔

ترجمہ: ''''یہ البحر الرائق'' کے قول کی طرف اشارہ ہے، جو یہ ہے: مکی سے مراد وہ ہے جو حدودِ حرم کے اندر ہو، خواہ وہ مکہ میں ہو یا نہ ہو (یعنی مضافات میں ہو) وہ مکہ کا رہائشی ہو یا نہ ہو، پس یہ قول اُس آفاقی کو بھی شامل ہوگا جو صرف عمرہ کرتا ہے، جو تمتُّع کرتا ہے اور اہلِ حِلّ میں سے جس نے احرام باندھا ہو، جب وہ کسی کام کے لیے حرم میں داخل ہو، جس طرح ''لُباب'' میں ہے۔ کیونکہ حج کی ادائیگی عرفات میں ہوتی ہے اور عرفات حل میں ہے (حَرم میں نہیں ہے)، پس مکی کے حج کا احرام حرم سے ہوگا تاکہ اس کے لیے مقام بدلنے کے ساتھ سفر کی کوئی صورت مُتحقق ہو۔ اور عمرہ کی ادائیگی حرم میں ہوتی ہے تو عمرہ کا احرام حِلّ سے ہوگا تاکہ اس کے لیے سفر کی کوئی نوع مُتحقق ہوجائے، بحوالہ: ''شرح النِّقَایَۃ لِلْقَارِی''۔ اگر اس نے اس کے برعکس کیا یعنی حج کا احرام حِلّ سے اور عمرہ کا حرم سے باندھا تو اس پر دَم لازم ہوگا، مگر جب وہ میقات کی طرف تلبیہ کہتے ہوئے لوٹے، جو اس کے لیے مشروع کیا گیا ہے، جس طرح ''لباب'' میں ہے (تو دَم لازم نہیں ہوگا)''۔

(حاشیہ ابن عابدین، جلد 6، ص: 530-532، دمشق)

## حج وعمرے کے حوالے سے خواتین کے مسائل

### سوال:

درج ذیل صورتوں میں عورت کیا کرے اور اس پر کیا لازم آتا ہے: (1) عورت نے حج یا عمرے کا احرام باندھا اور ایام شروع ہوگئے، اگر عمرے کا احرام توڑتی ہے تو اس پر کیا لازم آئے گا۔ (2) اگر عمرے کے لیے مکہ مکرمہ پہنچی اور ایام شروع ہوگئے تو وہ کیا کرے (3) اگر دورانِ حج منیٰ یا عرفات میں ایام شروع ہوگئے تو وہ کیا کرے۔ (4) اگر ایامِ حج حالتِ حیض میں گزر گئے اور واپسی کی فلائٹ 13 ذوالحجہ کو ہے، تو اب وہ کیا کرے۔

**جواب:**

(1-2-3-4) حج کا احرام باندھنے کے بعد جب عورت کو حیض آجائے تو وہ حج کے بقیہ تمام افعال ادا کرے، یعنی منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے وقوف سمیت، قربانی، رمی جمرات سمیت تمام ارکان ادا کرے، بیت اللہ کا طواف نہ کرے، اسی طرح نماز نہ پڑھے، تلاوت نہ کرے، اَذکار وتسبیحات و درود جاری رکھے اور پاک ہونے کے بعد طواف ادا کرے گی۔ اسی طرح عمرہ کا حکم ہے کہ حیض کی وجہ سے احرام کی پابندی برقرار رہے گی اور پاک ہونے کے بعد عمرہ کے افعال ادا کرے گی۔ اگر کسی عورت نے عمرہ کا احرام کھول دیا، تو دَم دینا ہوگا اور یہ دَم حدودِ حرم میں ہی دیا جائے گا اور عمرہ کی قضا لازم ہوگی۔ مِنیٰ و عرفات میں نمازوں کی ادائیگی کے علاوہ ذکر اذکار کیے جاتے ہیں، حائضہ عورت پر نماز معاف ہے، عرفات کے وقوف میں بھی طہارت شرط نہیں ہے۔

اگر حیض سے پاک ہونے تک مکہ میں ٹھہرنا اور پاکی کی حالت میں طوافِ زیارت کرنا ممکن نہ ہو، یعنی حکومتی اجازت کا نہ ہونا حارج ہو یا فلائٹ یا مَحرم یا شوہر کی روانگی کا مسئلہ درپیش ہو تو مجبوراً عورت حالتِ حیض ہی میں طوافِ زیارت کرلے اور اُس پر ''بَدَنَہ'' یعنی اونٹ یا گائے کی قربانی حدودِ حرم میں دینا واجب ہوگی۔ سابقہ ادوار میں ویزے اور واپس لوٹنے کی تاریخ کا تعین یا تحدید نہیں ہوا کرتی تھی اور نہ وطن واپس آکر دوبارہ جانے کی پابندیاں تھیں، جس کے سبب اس طرح کے عذر میں لوگ وہیں ٹھہر جاتے تھے یا دوبارہ جاکر ادا کرلیا کرتے تھے۔ مندرجہ بالا اعذار یا کسی اور عذر کے سبب عمرے میں اگر پاک ہونے تک رکنا ممکن نہ ہو تو حالتِ حیض ہی میں طواف کرلے اور حدودِ حرم میں دَم (یعنی بکری یا دنبے کی قربانی) دے اور حج و عمرہ دونوں صورتوں میں حالتِ حیض میں طواف کرنے پر اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار بھی کرے۔

حدیث پاک میں ہے:

''سَمِعْتُ الْقَاسِمَ يَقُوْلُ: سَمِعْتُ عَائِشَةَ تَقُوْلُ خَرَجْنَا لاَ نَرَى إِلَّا الْحَجَّ، فَلَمَّا كُنَّا

بِسَرِفَ حِضْتُ، فَدَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَأَنَا أَبْكِيْ، قَالَ: مَالَكِ أَنُفِسْتِ، قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: إِنَّ هٰذَا أَمْرٌ كَتَبَهُ اللهُ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ، فَاقْضِيْ مَا يَقْضِي الْحَاجُّ، غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوْفِيْ بِالْبَيْتِ"۔

ترجمہ: "حضرت قاسم بیان کرتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ہم حج کے لیے نکلے، جب "سَرِف" کے مقام پر پہنچے، تو مجھے حیض آ گیا، نبی ﷺ میرے پاس تشریف لائے، میں اس وقت رو رہی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا ہوا، کیا تمہیں حیض آ گیا، میں نے کہا: جی ہاں!، آپ نے فرمایا: یہ وہ چیز ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر لکھ دیا ہے، پس تم وہ افعال کرو جو تمام حجاج کرتے ہیں، سوائے اس کے کہ تم بیت اللہ کا طواف نہ کرنا، (صحیح بخاری: 294)"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک طویل حدیث میں بیان کرتی ہیں:

"فَدَخَلَ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَأَنَا أَبْكِيْ، فَقَالَ: مَا يُبْكِيْكِ، قُلْتُ: سَمِعْتُ كَلَامَكَ مَعَ أَصْحَابِكَ فَسَمِعْتُ بِالْعُمْرَةِ قَالَ: وَمَا لَكِ، قُلْتُ: لَا أُصَلِّيْ، قَالَ: فَلَا يَضُرُّكِ، فَكُوْنِيْ فِيْ حَجِّكِ، فَعَسَى اللهُ أَنْ يَرْزُقَكِيْهَا، وَإِنَّمَا أَنْتِ مِنْ بَنَاتِ آدَمَ، كَتَبَ اللهُ عَلَيْكِ مَا كَتَبَ عَلَيْهِنَّ، قَالَتْ: فَخَرَجْتُ فِيْ حَجَّتِيْ حَتّٰى نَزَلْنَا مِنًى، فَتَطَهَّرْتُ، ثُمَّ طُفْنَا بِالْبَيْتِ، وَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ الْمُحَصَّبَ، فَدَعَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ أَبِيْ بَكْرٍ، فَقَالَ: أَخْرِجْ بِأُخْتِكَ مِنَ الْحَرَمِ فَلْتُهِلَّ بِعُمْرَةٍ، ثُمَّ لِتَطُفْ بِالْبَيْتِ، فَإِنِّيْ أَنْتَظِرُكُمَا هَاهُنَا، قَالَتْ: فَخَرَجْنَا فَأَهْلَلْتُ، ثُمَّ طُفْتُ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، فَجِئْنَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ وَهُوَ فِيْ مَنْزِلِهٖ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ، فَقَالَ: هَلْ فَرَغْتِ، قُلْتُ: نَعَمْ، فَأَذَنَ فِيْ أَصْحَابِهٖ بِالرَّحِيْلِ، فَخَرَجَ فَمَرَّ بِالْبَيْتِ فَطَافَ بِهٖ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَدِيْنَةِ"۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میں رو رہی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیوں رو رہی ہو، میں نے عرض کی: میں نے صحابہ کے ساتھ آپ کی گفتگو سنی، میں نے عمرہ کی بابت سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا مسئلہ کیا ہے، میں نے عرض کی: میں نماز

نہیں پڑھ پاؤں گی، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے، بس اپنا حج جاری رکھو، امید ہے اللہ تمہیں عنقریب عمرہ نصیب فرمائے گا، تم آدم کی بیٹیوں میں سے ہو، اللہ نے دیگر بناتِ آدم کی طرح تم پر بھی یہ (حیض) لکھ دیا ہے، (حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں): پس میں نے اپنا حج جاری رکھا، یہاں تک کہ ہم منٰی میں اترے، پھر میں پاک ہوگئی، پھر ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا، پھر ہم وادیِ مُحَصَّب میں اترے، پھر آپ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو بلایا اور فرمایا: اپنی بہن (عائشہ) کے ساتھ حدودِ حرم سے نکلو، عمرے کی تلبیہ پڑھو (یعنی احرام باندھو)، پھر بیت اللہ کا طواف کرو، میں تم دونوں کا یہاں انتظار کروں گا۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: ہم (حدودِ حرم سے) نکلے، پھر میں نے عمرہ کے لیے تلبیہ پڑھی (یعنی احرام باندھا)، پھر میں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، پھر ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، وہ نصف شب کو اپنی جگہ پر ہی تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم فارغ ہوگئی ہو، میں نے عرض کی: جی ہاں! پھر آپ ﷺ نے صحابہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ وہاں سے نکل کر گئے، نمازِ فجر سے پہلے بیت اللہ کا طواف کیا، پھر (نمازِ فجر پڑھ کر) مدینہ منورہ روانہ ہو گئے"۔
(صحیح مسلم:1211)

**سوال:(5)**

اگر عمرے کا پروگرام پہلے سے طے ہے اور روانگی کے دن ایام شروع ہو گئے، تو وہ کیا کرے۔

**جواب:**

عمرے پر روانگی سے پہلے ایام شروع ہو گئے، تو اس صورت میں روانگی کی تاریخ آگے بڑھائی جا سکتی ہے، تو بڑھا لے، اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو غسل کر کے عمرے کا احرام باندھے اور مکہ جا کر پاک ہونے کا انتظار کرے، پاک ہو کر طواف و سعی کر لے اور عمرہ مکمل کر لے۔

**سوال:(6)**

احرام باندھ کرائیر پورٹ پہنچا تو پتا چلا کہ چیک ان بند ہوگیا ہے اور فلائٹ کلوز ہوگئی ہے یا معلوم ہوا کہ سیٹ کنفرم نہیں تھی، اب بظاہر اگلی فلائٹ 3 دن بعد دستیاب ہوگی تو کیا کرے، اگر احرام کھول دیتا ہے تو اس پر کیا لازم آئے گا۔

**جواب:**

اگر احرام کی نیت کر لی تھی تو اب اُس احرام کو پورا کرنا لازم ہے، اس لیے اُسے چاہیے کہ گھر واپس آکر جہاز کی سیٹ ملنے تک حالتِ احرام میں رہے اور احرام کی تمام پابندیوں پر عمل کرتا رہے، سیٹ کنفرم ہونے پر روانہ ہو جائے۔ لیکن اگر احرام کھول دیا تو گنہگار ہوگا اور اُس پر دَم بھی واجب ہوگا اور عمرے کی قضا بھی لازم ہوگی۔ عازمین حج وعمرہ کے لیے مشورہ یہ ہے کہ وہ گھر سے غسل کر کے لباس احرام پہن کر چلے جائیں، مرد احرام کی چادریں ایئر پورٹ پر جا کر اور معمول کا لباس اتار کر بھی پہن سکتے ہیں، جب سیٹ کنفرم ہو جائے اور بورڈنگ کارڈ مل جائے تو دو رکعت نفل پڑھ لیں اور جب فلائٹ روانہ ہو جائے تو نیت باندھ لیں اور تلبیہ پڑھ لیں، ورنہ بصورتِ دیگر واپس آجائیں اور نارمل لباس پہن لیں، چونکہ وہ مُحرم نہیں ہوئے تھے، اس لیے ان پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

## حج وعمرہ کے لیے محرم کی شرط

**سوال:**

ہم لوگ عمرے پر جا رہے ہیں، میرے ساتھ میری ایک دوست جس کی عمر 60 سال ہے، بغیر محرم کے ہمارے ساتھ جا سکتی ہے، (سیدہ ہما احسن، کراچی)۔

**جواب:**

خواتین کے لیے یہ شرط ہے کہ سفرِ شرعی کے دوران اسے اپنے شوہر یا کسی محرم کی رفاقت میسر ہو۔ مَحرم نسب، رضاعت (دودھ شریک کا رشتہ) یا مصاہَرت کے رشتے سے ایسے قریبی رشتہ دار مراد ہیں، جن کے ساتھ اُس عورت کا نکاح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو،

جیسے باپ، چچا، ماموں، بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد، خسر اور دودھ کے رشتے سے بھائی، باپ وغیرہ۔

امام علاء الدین ابی بکر بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَاَمَّا الَّذِیْ یَخُصُّ النِّسَآءَ فَشَرْطَانِ: أَحَدُھُمَا أَنْ یَّکُوْنَ مَعَھَا زَوْجُھَا أَوْ مَحْرَمٌ لَھَا، فَاِنْ لَمْ یُوْجَدْ اَحَدُھُمَا لَا یَجِبُ عَلَیْھَا الْحَجُّ''۔

ترجمہ: ''اور عورتوں کے لیے دو شرطیں خاص ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کا شوہر یا اس کا محرم اسکے ساتھ ہو، پس اگر ان دونوں میں سے کسی ایک (کی رفاقت) اسے نہ ملے، تو اس پر حج ادا کرنا واجب نہیں، (بدائع الصنائع، جز ثانی، صفحہ 87، 188 مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ہند)''۔

عورت اگر محرم کے بغیر حج یا عمرہ کے لیے جائے تو اگرچہ گنہگار ہوگی، لیکن حج یا عمرہ ادا ہوجائے گا، امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز محرم کے بغیر عورت کے حج پر جانے کی بابت لکھتے ہیں: ''عورت کا مَحرم یا شوہر کے بغیر سفر پر جانا حرام ہے، ہاں! اگر چلی جائے گی، گنہگار ہوگی، ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا، مگر حج ہوجائے گا کہ شوہر یا محرم کی معیت حج کے صحیح ہونے کے لیے شرط نہیں ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 10، ص: 707، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)''۔ یعنی شوہر یا محرم کی معیت مسافت شرعی کی مقدار سفر کے لیے شرط ہے۔

## حج وعمرہ کے ٹکٹ

**سوال:**

کسی بھی پروگرام میں بذریعہ قرعہ اندازی حج یا عمرہ کے ٹکٹ دینا جائز ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت، ممانعت یا حُرمت کا پہلو تو نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح آج کل محافل و مجالس میں حج وعمرہ کے ٹکٹ اور انعامات کا سلسلہ رائج ہے۔ کسی بھی سوال کے جواب پر یا کسی مقابلے میں ونر کو انعام دینا یا کسی کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام دینا جائز ہے اور انعام دینے میں کوئی شرعی حد بندی مالیت یا نوعیت کے اعتبار سے یا کوئی پابندی تو لازم نہیں مثلاً

نقد رقم یا گھریلو استعمال کی اشیاء یا موٹر سائیکل بطورِ انعام دینے کا کیا حکم ہے؟
(عامر فیاضی، کراچی)

**جواب:**

جس چیز میں ایک سے زائد افراد کا حق برابر ہو اور تمام فریق برضا ورغبت قرعہ اندازی سے فیصلے پر راضی ہوں تو اس صورت میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت مریم کی کفالت کے لیے بیت المقدس کے مُتولیوں میں قرعہ اندازی ہوئی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ"۔

ترجمہ: "اور (اے رسولِ مکرم!) آپ اس وقت ان کے پاس نہ تھے، جب وہ (قرعہ اندازی کے لیے) اپنے قلموں کو (دریا میں) ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا اور آپ ان کے پاس نہ تھے، جب وہ (اس مسئلے میں) باہم جھگڑ رہے تھے، (آل عمران: 44)"۔ اس کی تفصیل کُتبِ تفسیر میں موجود ہے۔ اسی طرح ایک حدیث پاک میں ہے:

"إِنَّ رَجُلًا أَعْتَقَ سِتَّةَ مَمْلُوْكِيْنَ لَهُ عِنْدَ مَوْتِهِ، لَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُمْ، فَدَعَا بِهِمْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، فَجَزَّأَهُمْ أَثْلَاثًا، ثُمَّ أَقْرَعَ بَيْنَهُمْ، فَأَعْتَقَ اثْنَيْنِ، وَأَرَقَّ أَرْبَعَةً، وَقَالَ لَهُ قَوْلًا شَدِيْدًا"۔

ترجمہ: "ایک شخص نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھ غلاموں کو آزاد کر دیا، ان (غلاموں) کے علاوہ اس کا کوئی (اور) مال نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا اور دو دو افراد پر مشتمل تین گروپوں میں تقسیم فرما دیا، پھر آپ نے ان تینوں گروپوں میں قرعہ اندازی فرمائی، تو آپ ﷺ نے دو افراد (جن کے نام کا قرعہ نکلا تھا) کو آزاد کر دیا اور باقی چار کو (ترکے کے طور پر) غلام رہنے دیا اور آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں سخت

کلمات فرمائے، (صحیح مسلم:1668)''۔ نبی کریم ﷺ کا اس شخص پر ناگواری کا اظہار فرمانا اس سبب سے تھا کہ ایک تہائی سے زیادہ ترکے کی وصیت کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کسی نے کردی ہے تو وہ غیر مؤثر ہوجاتی ہے۔ اس وقت درپیش صورت حال میں اس کا کل ترکہ یہی تھا، اس لیے آپ ﷺ نے قرعہ اندازی سے فیصلہ فرمایا، اس مسئلے کی باقی فقہی تفصیلات اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہیں۔

شریعتِ مُطہرہ میں فرائض، واجبات اور سُنن کی ادائی کے بعد اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال میں صدقاتِ جاریہ کو ترجیح دی گئی ہے، احادیث مبارکہ میں ہے:

(۱)''إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ''۔

ترجمہ:''جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے اعمالِ (خیر) کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین اعمال کے، اُس نے (اپنی زندگی میں) صدقۂ جاریہ کیا ہو یا علمِ نافع جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہو یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے، (صحیح مسلم:1631)''۔

(۲)''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ وَعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، وَوَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ''۔

ترجمہ:''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین اعمال کے: صدقۂ جاریہ کیا ہو یا علمِ نافع جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہو یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے، (سنن نسائی:3651)''۔

(۳)''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ وَعِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ وَوَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهُ''۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان فوت ہوجاتا ہے تو تین اعمال کے سوا (باقی اعمال کا سلسلہ) منقطع ہوجاتا ہے: صدقۂ

جاریہ، علمِ نافع جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہو یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے''۔

(سنن ترمذی:1376)

اس موضوع پر مندرجہ بالا تین حدیثیں ہیں، صحیح مسلم کی حدیث میں ''اِلَّا'' کا تکرار ہے اور سنن نسائی کی حدیث میں ''اِلَّا'' مکرر نہیں ہے۔

علامہ ابوالحسن عبید اللہ بن محمد عبد السلام رحمانی مبارکپوری لکھتے ہیں:

''علامہ نوراللہ سندھی نے کہا: ''اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ'' سے مراد یہ ہے کہ اس کے عمل کا ثواب منقطع ہوجاتا ہے، چونکہ ثواب کا تعلق عمل سے ہوتا ہے، اس لیے انقطاعِ ثواب کو انقطاعِ عمل سے تعبیر کیا اور استثناء کا اسی سے تعلق ہے: یعنی سوائے تین اعمال کے بنی آدم کا ہر عمل منقطع ہوجاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ بظاہر استثناء مشکل ہے اور ان توجیہات سے اشکال رفع ہوجاتا ہے۔ ابہری نے کہا: ''مِنْ'' زائدہ ہے اور تنوین اعمال کے عوض ہے اور ایک قول یہ ہے: ''عَنْهُ'' میں ضمیر زائد ہے اور معنی یہ ہوں گے: ''جب انسان مرجاتا ہے تو تین اعمال کے سوا اس کے اعمال (یعنی جزائے اعمال) منقطع ہوجاتے ہیں''۔ طیبی نے کہا: استثناء متصل ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے: ''اُس سے اس کے اعمال کا ثواب منقطع ہوجاتا ہے جیسے: نماز، زکوٰۃ وغیرہ، لیکن ان تین اعمال کا ثواب منقطع نہیں ہوتا، یعنی جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے بعد اس کے اعمال کا ثواب نہیں لکھا جاتا، کیونکہ ثواب عمل کی جزا ہے اور عمل انسان کی موت کے ساتھ منقطع ہوجاتا ہے، سوائے ایسے فعل کے کہ جس کا نفع دائمی ہو اور جاری وساری ہو، جیسے وقف قائم کرنا یا (دینی کتاب) تصنیف کرنا یا تعلیم دینا یا نیک اولاد اور نیک اولاد کو عمل کی جنس قرار اس لیے دیا ہے کہ کوئی شخص اپنی اولاد کے اس دنیا میں آنے کا سبب ہے اور اس کو نیکی کی ہدایت دینے کی وجہ سے اس کی صلاح کا بھی سبب ہے، غیر بھی دعا کرے تو میت کو نفع پہنچتا ہے، لیکن وَلَد کی تخصیص کی حکمت اولاد کو دعا پر برانگیختہ کرنا ہے، گویا اولاد پر واجب ہے کہ ماں باپ کے لیے دعا کرے''۔

''اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ الخ'': یہ ''اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ'' سے بدل ہے اور ''اِلَّا'' کا تکرار مفہوم کو

مزید مستحکم کر دیتا ہے اور اس کی اہمیت کی جانب متوجہ کرتا ہے اور سنن ابوداوٗد اور سنن نسائی کی روایت میں ''إِلَّا'' کے تکرار کے بغیر ہے اور ترمذی کی روایت میں ''إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ'' (کے بعد) صَدَقَةٌ لفظِ اِلَّا اور مِنْ جارہ کے بغیر ہے اور اگر ''صَدَقَةٍ'' جر کے ساتھ پڑھیں تو یہ ''ثَلَاثٍ (جَارِيَةٍ)'' سے بدل ہوگا، یعنی ثواب منقطع نہیں ہوگا جیسے: دائمی وقف کا اجر واقف کو ملتا رہتا ہے اور سنن نسائی اور سنن ابوداوٗد کا ترجمۃ الباب: ''بَابُ الصَّدَقَةِ عَنِ الْمَيِّتِ'' سے یہی ظاہر ہوتا ہے، (مرعاۃ المفاتیح، ج:۱، ص:۳۰۶)''۔

کیونکہ جب تک کسی کے صدقاتِ جاریہ کا فیضان اور اس کے فعلِ خیر کے آثار اس کی وفات کے بعد بھی اس دنیا میں باقی ہیں، اُس شخص کے نامۂ اعمال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب لکھا جاتا رہے گا۔

''بعض لوگ یہ کہہ کر بلیک میلنگ کرتے ہیں کہ ہم تو لوگوں کو مدینہ منورہ بھیجتے ہیں، آپ مدینہ منورہ ضرور بھیجیں، لیکن اس کا اَحسن طریقہ یہ ہے: ''اگر کوئی صاحبِ حیثیت شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لوگوں کو حج یا عمرہ کرانا چاہتا ہے تو خاموشی سے صالح اور مُتقی افراد کو تلاش کرے اور اپنے اس نیک عمل کو کسی تشہیر کے بغیر پایۂ تکمیل تک پہنچائے، یہی شِعارُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ''۔

ترجمہ: ''پس لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں (ہمارے کاموں کا) دنیا میں (صلہ) دیدے اور اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، (البقرہ:200)''، حدیث پاک میں ہے:

''كُنَّا نَعُدُّ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّ الرِّيَاءَ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْإِسْنَادِ''۔

ترجمہ: ''ہم عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ریاکاری کو شرکِ اصغر شمار کرتے تھے، یہ حدیث سنداً صحیح ہے، (المُستدرک للحاکم:7937)''۔ الغرض تاجدارِ مدینہ ﷺ نے صدقاتِ

جاریہ کی جو ترغیب فرمائی ہے، اُس پر عمل کریں اور ایسے دینی مدارس و جامعات قائم کریں، جن میں دینی و عصری تعلیم کا حسین امتزاج ہو یا نام و نمود کے شوق کے بغیر انسانی رفاہی خدمات انجام دیں''۔

لوگ جلسوں میں نام و نمود کے لیے عمرے کے ٹکٹ بانٹتے پھرتے ہیں، اہلِ مجالس اور بعض پیرانِ عظام مجالس میں مجمع بڑھانے کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں۔ شاید اُن کے تقویٰ و کردار میں وہ کشش نہیں رہی کہ ان ترغیبات کے بغیر لوگ اُن کی مجالس میں کھچے چلے آئیں۔ حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، امام اہلسنت اعلیحضرت امام احمد رضا قادری، حضرت قبلہ سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمہم اللہ اجمعین اور دیگر اکابر اُمّت رحمہم اللہ تعالیٰ کے اَعراس پر عمرے کے ٹکٹ نہیں بٹتے، سینکڑوں سال بعد بھی اُن کے علم و تقویٰ اور اخلاص و للّٰہیت کے سبب لوگ اُن مجالس میں کھچے چلے آتے ہیں۔ آج علم، تقویٰ اور اخلاص کا متبادل عمرے کے ٹکٹوں کو بنالیا گیا ہے، ہمیں فقط علم، تقویٰ، اخلاص کے زوال اور ریاکاری کے کلچر پر افسوس ہے، شریعت کا حکم ظاہر پر لگتا ہے، باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

ہم تو خرافات پر مبنی پروگرام نہیں دیکھتے، لیکن آج کل الیکٹرانک میڈیا پر افطار کے اوقات میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات میں جس بے ہودہ اور بے ہنگم انداز سے لوگوں کو تحائف تقسیم کیے جارہے ہوتے ہیں اور لوگوں کے بیان کے مطابق خاص طور پر خواتین کا موٹر سائیکل کے لیے اینکر سے اصرار کرنا اور پھر نامحرم اینکر کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ہال کا چکر لگانا، اینکر کے ساتھ سیلفیاں بنوانا، یہ تمام باتیں شریعت کے خلاف ہیں اور حُرمت کے جو احکام اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیان فرمائے ہیں، کھلے عام اُن کی نافرمانی اور پامالی ہے۔ باقی جہاں تک نقد رقوم، گھریلو استعمال کی اشیاء یا موٹر سائیکل/کار وغیرہ کا تعلق ہے، تو ہمیں نہیں معلوم کہ یہ رقوم یا اشیاء کس مد سے دی جاتی ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے، اگر ان کا مقصد تجارت کو فروغ دینا ہے، کاروبار کو ترقی دینا ہے، تو یہ ایک

خالص تجارتی اور کاروباری معاملہ ہے، لیکن اس میں بھی شرعی حدود کی پاسداری ضروری ہے۔ البتہ اگر یہ اشیاء اپنی عاقبت سنوارنے اور اللہ کی رضا کے لیے دی جاتی ہیں، تو مقصد واضح کیا جائے تاکہ شریعت کی روشنی میں حکم بیان کیا جائے۔ رمضان المبارک میں چونکہ افطار سے پہلے، افطار کے وقت اور افطار کے بعد پرائم ٹائم ہوتا ہے، اس لیے ان اوقات میں پاکیزہ روحانی فضا میں مذہبی پروگراموں کو ترجیح دی جانی چاہیے، یہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

## وقوفِ عرفہ کے موقع پر عورت کو حیض آجانا

**سوال:**

ایک خاتون حج کا خطبہ اور نمازِ ظہر وعصر ادا کرنے کے بعد حائض ہوگئی، بقیہ ارکان کی ادائیگی کس طرح کرے گی؟، (شہزادی بیگم، کراچی)۔

**جواب:**

حج کے کل ایام پانچ ہیں: پہلا دن آٹھ ذوالحجہ: احرام میں داخل ہونے اور حج کی نیت کرنے کے بعد تلبیہ پڑھنا، منیٰ کو روانگی، رات منیٰ میں قیام دوسرا دن نو ذوالحجہ: منیٰ میں نمازِ فجر ادا کر کے عرفات پہنچنا، خطبہ سن کر نمازِ ظہر وعصر ملا کر پڑھنا، غروبِ آفتاب کے بعد مزدلفہ روانہ ہونا، مزدلفہ میں مغرب وعشا ملا کر ادا کرنا۔ تیسرا دن دس ذوالحجہ: جمرۂ عقبہ پر رمی، قربانی (حج کا دَمِ شکر) کے بعد ایک پور کے برابر بال کترنا اور بیت اللہ جا کر طوافِ زیارت کرنا، سعی کرنا اور رات منیٰ میں گزارنا۔ چوتھا دن گیارہ ذوالحجہ: زوال کے بعد تینوں جمرات کی رمی کرنا، بارہ کی رات منیٰ میں رہنا سنت ہے۔ پانچواں دن بارہ ذوالحجہ: زوال کے بعد تیسرے دن تینوں جمرات کی رمی، حج مکمل ہوگیا، مکہ سے روانگی کے وقت طوافِ وداع واجب ہے۔

نو ذوالحجہ عرفات کے میدان میں وقوف (ٹھہرنا) حج کا رکنِ اعظم ہے، حیض ونفاس والی عورت اور جنبی آدمی کا وقوف صحیح ہے، حج ادا ہو جائے گا، وقوفِ مزدلفہ، وقوفِ منیٰ، رمیِ

جمرات اور مُتمتع کی قربانی کے لیے طہارت شرط نہیں ہے، لہٰذا یہ واجبات حائض عورت حالتِ حیض میں بھی ادا کرسکتی ہے۔

طوافِ زیارت حج کا دوسرا رکنِ اعظم ہے، اسے طوافِ اِفاضہ اور طوافِ فرض بھی کہتے ہیں۔ دس ذوالحجہ کی طلوعِ فجر سے طوافِ زیارت کا وقت شروع ہوتا ہے اور بارہ ذوالحجہ کے غروبِ آفتاب تک رہتا ہے، چونکہ حیض ونفاس عذر من جانب العباد نہیں ہے، بلکہ من جانب اللہ ہے، اس لیے عذر من جانب اللہ کی صورت میں تاخیر پر دَم یا کفارہ نہیں ہے۔ اگر حائض اور اس کے محرم کے لیے واپس روانگی میں تاخیر کی گنجائش ہے، تو وہ اپنی ریزرویشن منسوخ کر کے اسے مناسب وقت تک مؤخر کردیں اور حیض ختم ہونے پر غسل کر کے پاک ہوجائیں اور پھر طواف فرض ادا کریں، اس کے بعد حسبِ سہولت طوافِ وداع کر کے رختِ سفر باندھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس کی گنجائش اور سہولت نہ ہو تو حالتِ حیض میں طوافِ زیارت کرلیں اور حدودِ حرم میں کفارے کے طور پر بَدَنہ (یعنی اونٹ یا گائے) کی قربانی دینی ہوگی، ویسے عذر من جانب اللہ کے لیے قانون میں رعایت ہونی چاہیے، کیونکہ یہ عبادت حج کا مسئلہ ہے اور مسلم حکومتوں کو اس سلسلے میں سہولت فراہم کرنی چاہیے، غیر مسلم ممالک سے آنے والے تو واپسی کی تقدیم وتاخیر کے معاملے میں خود مختار ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ سابق رزرویشن کی منسوخی اور نئی ریزرویشن کے لیے کچھ اضافی رقم دینی ہوتی ہے، لیکن مسلم حکومتوں کو اضافی رقم نہیں لینی چاہیے۔

سعی کے لیے طہارت لازمی نہیں بلکہ مستحب ہے۔ علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ معذور کے حج وعمرہ کی سعی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وَاِنْ سَعٰی جُنُبًا اَوْحَائِضًا اَوْ نَفَسًا فَسَعْیُہٗ صَحِیْحٌ"۔

ترجمہ: "اور اگر حیض ونفاس والی عورت اور جنبی شخص (یعنی جس پر غسل واجب ہو) سعی کریں، تو (ان کا سعی کرنا) صحیح ہے (یعنی سعی کے لیے طہارت شرط نہیں)"۔

(فتاویٰ عالمگیری، ج:1، ص:41، ص:247)

علامہ مفتی امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں: ''مستحب یہ ہے کہ باوضو سعی کرے''۔
(بہارِ شریعت، حصہ ششم، جلد 1، ص:435)

## پیدل حج کرنے کی منّت ماننا

**سوال:**

(1): پیدل حج کرنے کا ثواب زیادہ ہے یا سواری پر حج کرنے کا، (2): اگر پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے تو کیا اس کا پورا کرنا واجب ہے، اگر نذر پوری نہیں کرتا تو کیا اس پر کفارہ لازم آئے گا، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ پیدل حج کرنے کا اجر ایک لاکھ گنا ہے، پس سوال یہ ہے کہ ایسی نذر ماننے والا مشقت وتکلیف برداشت کرکے عزیمت پر عمل کرے یا سواری پر حج کرے، (مختار احمد، کراچی)۔

**جواب:**

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ''۔

ترجمہ: ''اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دیجیے، وہ آپ کے پاس دور دراز راستوں سے پیدل اور ہر دبلے اونٹ پر سوار ہو کر آئیں گے، (الحج:27)''۔ اس آیت میں چونکہ پیدل اور سوار ہو کر دونوں صورتوں میں حج کا بیان ہے، لہٰذا پیدل حج کی منّت ماننا شرعاً درست ہے۔ علامہ عمر بن علی حنبلی اس آیت کے تناظر میں لکھتے ہیں:

''بَدَاَ اللهُ بِذِكْرِ الْمُشَاةِ تَشْرِیْفًا لَهُمْ ''، ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پیدل حج کرنے والوں کا ذکر پہلے فرمایا اور یہ اُن کو شرف عطا کرنا ہے، اُس کے بعد انہوں نے وہ حدیث لکھی ہے جو آگے آرہی ہے، (اللباب فی علوم الکتاب، ج:14، ص:74)''۔

اب اس موضوع پر چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

(1) ''عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم رَاٰی شَیْخًا یُهَادٰی بَیْنَ ابْنَیْهِ، قَالَ: مَا بَالُ هٰذَا، قَالُوْا: نَذَرَ أَنْ یَّمْشِیَ، قَالَ: إِنَّ اللهَ عَنْ تَعْذِیْبِ هٰذَا نَفْسَهٗ لَغَنِیٌّ،

وَأَمَرَهُ أَنْ يَرْكَبَ''۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دیکھا: (حج کے موقع پر) ایک شخص اپنے دو بیٹوں کے سہارے جارہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اسے کیا ہوا؟، لوگوں نے بتایا: اس نے پیدل حج کرنے کی نذر مانی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ جو اپنے آپ کو عذاب دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے اور آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم فرمایا، (صحیح البخاری:1865)''۔

(2) ''عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عَنْ أُخْتِهِ نَذَرَتْ أَنْ تَمْشِيَ إِلَى الْكَعْبَةِ، فَقَالَ: إِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنْ نَذْرِ أُخْتِكَ لِتَرْكَبْ وَلْتُهْدِ بَدَنَةً وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ وَتُهْدِي هَدْيًا''۔

ترجمہ: ''عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں: انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اپنی بہن کے بارے میں سوال کیا کہ انہوں نے پیدل چل کر کعبہ جانے کی منت مانی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تمہاری بہن کی نذر سے بے نیاز ہے، اُسے چاہیے کہ وہ سواری پر جائے اور ایک بدنہ ہدیہ دے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: ''وہ ہدی یعنی دم دے''، (صحیح ابن خزیمہ:3045، سنن ابوداؤد:3296)''۔ بکری یا دنبے کی قربانی کو ہدی بھی کہتے ہیں اور دم بھی۔

(3) ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! إِنَّ أُخْتِي نَذَرَتْ يَعْنِي أَنْ تَحُجَّ مَاشِيَةً، فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: إِنَّ اللهَ لَا يَصْنَعُ بِشِقَاءِ أُخْتِكَ شَيْئًا، فَلْتَحُجَّ رَاكِبَةً، وَلْتُكَفِّرْ عَنْ يَمِينِهَا''۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: یارسول اللہ! میری بہن نے پیدل حج کرنے کی منّت مانی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: اللہ تمہاری بہن کو مشقت میں ڈال کر کیا کرے گا، اُسے چاہیے کہ وہ سوار ہو کر حج کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، (سنن ابوداؤد:3295)''۔

فقہی ضابطہ یہ ہے کہ جب ایک ہی چیز کے بارے میں ایک جگہ حکم مطلق ہو، جیسے حدیث نمبر 1 میں ہے اور دوسری جگہ قید کے ساتھ ہو، جیسے حدیث نمبر 2 اور 3 میں ہے، تو مطلق کو مقیّد پر محمول کریں گے اور وہاں بھی قید (جانور کی قربانی دینا یا قسم کا کفارہ) کا اعتبار ہوگا۔

امام علاء الدین کاسانی نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو منّت مان کر اپنے اوپر پیدل حج کرنا واجب کردے تو وہ سوار ہوکر حج کرے اور حرم میں ایک بکری کی قربانی دے''۔ حدیث مبارک میں اپنے آپ کو ناقابلِ برداشت مشقت میں ڈالنے کو اپنی جان کو عذاب دینے سے تعبیر فرمایا ہے، کیونکہ شریعت نے اُس سے پیدل حج کا مطالبہ نہیں کیا، منّت مان کر پیدل حج کرنے کی پابندی خود اُس نے اپنے اوپر عائد کی۔ اس کے برعکس اگر کسی ایسی بات کی منّت مانی ہو جو نہ خود عبادتِ مقصودہ ہے اور نہ اُس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ ہے، تو ایسی شرط لغو ہوگی اور جس عبادت کی منّت مانی ہے، اُسے پورا کرنا ہوگا، حدیث پاک میں ہے:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: بَيْنَا النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَخْطُبُ، إِذَا هُوَ بِرَجُلٍ قَائِمٍ، فَسَأَلَ عَنْهُ، فَقَالُوا أَبُو إِسْرَائِيلَ، نَذَرَ أَنْ يَقُومَ وَلَا يَقْعُدَ، وَلَا يَسْتَظِلَّ، وَلَا يَتَكَلَّمَ، وَيَصُومَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مُرْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَقْعُدْ، وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص کو (دھوپ میں) کھڑے دیکھا، آپ نے اس کے بارے میں پوچھا (یہ کیوں کھڑا ہے؟)، لوگوں نے بتایا: یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں، سائے میں بھی نہیں آئے گا، بات بھی نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس سے کہو کہ یہ بات کرے، سائے میں بھی آئے، بیٹھے بھی اور اپنا روزہ پورا کرے، (صحیح البخاری: 6704)''۔ یہی وجہ ہے کہ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کا کفارہ دینے کا حکم نہیں فرمایا، کیونکہ دھوپ میں کھڑا ہونا یا کلام نہ کرنا نہ عبادتِ مقصودہ

ہے اور نہ اس کی جنس سے کوئی عبادت ہے، لہٰذا یہ شرط لغو ہے اور روزہ پورا کرنا اس پر واجب ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ہر وہ فعل جس سے انسان کو تکلیف پہنچے، خواہ انجام کے اعتبار سے ہو اور اس کا مشروع ہونا کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو، جیسے ننگے پیر چلنا اور دھوپ میں بیٹھنا، تو نہ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور نہ اس سے نذر منعقد ہوگی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابو اسرائیل کو صرف روزہ پورا کرنے کا حکم فرمایا اور کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے: آپ کو علم تھا کہ روزہ رکھنا اس پر مشقت کا باعث نہیں ہے اور اس کو بیٹھنے، باتیں کرنے اور سائے میں جانے کا حکم دیا۔ علامہ قرطبی نے کہا ہے: ''ابو اسرائیل کے اس قصے میں جمہورِ فقہاء کے اس موقف پر واضح دلیل ہے کہ جس نے معصیت کی نذر مانی یا ایسے کام کی نذر مانی جو عبادت نہیں ہے تو اس نذر کو توڑنے سے کفارہ واجب نہیں ہوتا، (فتح الباری، ج:7، ص:761، دارالمعرفہ، بیروت)''۔

آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، وہ یہ ہے:

''عَنْ زَاذَانَ، قَالَ: مَرِضَ ابْنُ عَبَّاسٍ مَرَضًا شَدِيدًا، فَدَعَا وَلَدَهُ فَجَمَعَهُمْ فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم يَقُولُ: مَنْ حَجَّ مِنْ مَكَّةَ مَاشِيًا حَتَّى يَرْجِعَ إِلَى مَكَّةَ كَتَبَ اللهُ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ سَبْعَ مِائَةِ حَسَنَةٍ، كُلُّ حَسَنَةٍ مِثْلُ حَسَنَاتِ الْحَرَمِ، قِيلَ: وَمَا حَسَنَاتُ الْحَرَمِ، قَالَ: بِكُلِّ حَسَنَةٍ مِائَةُ أَلْفِ حَسَنَةٍ، هٰذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ، وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ''۔

ترجمہ: ''زاذان بیان کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ شدید بیمار ہوگئے، انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلا کر جمع کیا، پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جو مکہ سے پیدل حج کرنے کے لیے نکلا، یہاں تک کہ مکہ لوٹ آیا، اللہ تعالیٰ اس کو ہر قدم کے بدلے سات سو نیکیاں عطا فرمائے گا، ہر نیکی حرم کی نیکیوں کی مثل ہوگی، پوچھا گیا: حرم کی نیکیاں کیسی ہیں؟، فرمایا: ہر نیکی ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے، (المُستدرک علی الصحیحین للحاکم: 1692)''۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے، لیکن امام بخاری اور امام

مسلم نے اس کی تخریج نہیں کی۔ یہ حدیث "اَلسُّنَنُ الْکُبْرٰی لِلْبَیْهَقِی، جلد 10، ص:78، اَلْمُعْجَمُ الْکَبِیْر، جلد 3، ص:169 اور مَجْمَعُ الزَّوَائِد، جلد 3، ص:209 میں بھی موجود ہے۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث درج ذیل ہے:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: مَا آسٰی عَلٰی شَیْئٍ اِلَّا عَلٰی أَنِّی لَمْ أَحُجَّ مَاشِیًا اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: مَنْ حَجَّ رَاکِبًا کَانَ لَهٗ بِکُلِّ خُطْوَةٍ حَسَنَةٌ، وَمَنْ حَجَّ مَاشِیًا کَانَ لَهٗ بِکُلِّ خُطْوَةٍ یَخْطُوْهَا سَبْعُوْنَ حَسَنَةً مِنْ حَسَنَاتِ الْحَرَمِ، قَالَ: قُلْتُ: وَمَا حَسَنَاتُ الْحَرَمِ قَالَ: اَلْحَسَنَةُ بِمِائَةِ أَلْفٍ"۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مجھے کسی چیز کا افسوس نہیں ہے، سوائے اس کے کہ میں نے پیدل حج نہیں کیا کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس نے سوار ہو کر حج کیا، اس کو ہر قدم پر ایک نیکی ملے گی اور جس نے پیدل حج کیا، اس کو ہر قدم پر حرم کی ستّر نیکیاں ملیں گے، پوچھا گیا: حرم کی نیکیاں کیسی ہیں؟، فرمایا: ہر نیکی ایک لاکھ نیکیوں کے برابر ہے، (اَلْکَامِل فِی ضُعَفَاءِ الرِّجَالِ، ج: 5، ص:424)"۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پیدل حج کرنے کو زیادہ اجر کا باعث سمجھتے تھے۔ تاہم خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سواری پر حج کرنا ثابت ہے، لہٰذا یہ آپ کا فعلِ مبارک ہے، نیز اس میں یہ حکمت تھی کہ سب لوگ مناسبِ حج سیکھ لیں اور پیدل حج کرنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قولی حدیث ہے، فلہٰذا سنت ہے، حدیث پاک میں ہے:

"اِنَّ ابْنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ: رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ یَرْکَبُ رَاحِلَتَهٗ بِذِی الْحُلَیْفَةِ، ثُمَّ یُهِلُّ حَتّٰی تَسْتَوِیَ بِهٖ قَائِمَةً"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو (اہلِ مدینہ کی میقات) ذُوالْحُلَیْفَه کے مقام پر سواری پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا، پھر آپ نے احرام باندھا، حتیٰ کہ سواری سیدھی کھڑی ہوگئی، (صحیح البخاری:1514)"۔

علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اَلرُّکُوْبُ فِی سَفَرِ الْحَجِّ وَالرُّکُوْبُ فِیْهِ وَالْمَشْیُ سَوَاءٌ فِی الْإِبَاحَةِ، وَالْکَلَامُ فِی الْأَفْضَلِیَّةِ، فَقَالَ قَوْمٌ: اَلرُّکُوْبُ أَفْضَلُ اِتِّبَاعًا لِلنَّبِی ﷺ وَلِفَضْلِ النَّفَقَةِ، فَإِنَّ النَّفَقَةَ فِیْهِ کَالنَّفَقَةِ فِی سَبِیْلِ اللهِ سَبْعُمِائَةِ ضِعْفٍ''۔

ترجمہ: ''سفرِ حج میں پیدل چلنا یا سواری پر بیٹھ کر جانا دونوں یکساں طور پر مباح ہیں، کلام افضلیت میں ہے، فقہاء کی ایک جماعت نے کہا: سواری پر سفر کرنا افضل ہے کیونکہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فعل کا اتّباع ہے اور پیدل کے مقابلے میں سواری پر حج کا خرچ زیادہ ہے، کیونکہ حج کے سفر پر جو رقم خرچ ہوتی ہے، وہ انفاق فی سبیل اللہ کے زمرے میں آتی ہے اور انفاق فی سبیل اللہ کا اجر سات سو گنا ہے، (عمدۃ القاری، جلد 9، ص: 186)''۔ اِنْفَاقِ فِی سَبِیْلِ اللہ کا اجر سورۃ البقرہ: 261 میں چودہ سو گنا تک بتایا گیا ہے، عام طور پر احادیثِ مبارکہ میں سات سو گنا تک بتایا گیا ہے، (صحیح مسلم: 1151، مسند احمد: 19036، مجمع الزوائد: 5268)۔

''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اَلْحُجَّاجُ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ، یُعْطِیْهِمْ مَا سَأَلُوْا، وَیَسْتَجِیْبُ لَهُمْ مَا دَعَوْا، وَیُخْلِفُ عَلَیْهِمْ مَا أَنْفَقُوا الدِّرْهَمَ أَلْفَ أَلْفٍ''۔

ترجمہ: انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں، وہ جو مانگیں اللہ تعالیٰ انہیں عطا فرماتا ہے اور جو دعا کریں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور ایک درہم کے بدلے میں انہیں دس لاکھ درہم (کے برابر اجر) عطا فرماتا ہے، (شُعَبُ الْإِیمان: 3810)''۔ یہ حدیث ضعیف ہے اور فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیثیں معتبر ہیں۔ لیکن یہ لگا بندھا ضابطہ نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اُس کے حُسنِ نیت اور اخلاص کے مطابق عطا فرماتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: ''بنی آدم کے ہر نیک کام کا بدلہ دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا کر عطا کیا جاتا ہے، (صحیح

مسلم: 1151)''۔

صحیح البخاری: 1865 کی شرح میں علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ظاہریہ (غیر مقلدین) نے کہا: جو چلنے سے عاجز ہو، اُس پر کوئی دم نہیں ہے، کیونکہ چلنے کی نذر ماننا، نذرِ شرعی نہیں ہے اور اس میں بدن کو تھکانا ہے، باقی فقہاء کے اس میں اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے: حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے: ''جو بیت اللہ کا پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانے اور پھر اس کو پورا کرنے سے عاجز آجائے تو جتنا چل سکتا ہو چلے اور پھر سوار ہوجائے اور ہدی دے''، حضرات عطاء، حسن، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا یہی قول ہے، امام ابوحنیفہ نے فرمایا: ''اگر عجز کے بغیر سوار ہوا تو حانث ہونے کی بنا پر قسم کا کفارہ دے گا''، اسے امام طحاوی نے روایت کیا اور امام شافعی نے فرمایا: ''احتیاط یہ ہے کہ دم دے اور جو طاقت نہ رکھے، اُس سے دم ساقط ہوجائے گا''، اُن کی دلیل یہ ہے: ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''سوار ہوجائے اور دم دے''۔ دوسرا قول یہ ہے: ''واپس لوٹ کر پھر دوبارہ حج کرے اور جتنی جگہ پچھلے حج میں سوار ہوکر چلا تھا، اتنی جگہ پیدل چلے اور اس پر کوئی دم نہیں ہے، یہ حضرات ابن عمر، ابن عباس، نخعی اور ابن جبیر رضی اللہ عنہم کا قول ہے، اسے امام مالک نے مؤطا میں بیان کیا ہے'' اور تیسرا قول یہ ہے: ''واپس لوٹ کر جتنی جگہ سوار ہوا تھا، پیدل چلے اور دم بھی دے، حضرات ابن عباس، نخعی اور ابنُ المُسَیَّب رضی اللہ عنہم سے بھی یہ قول مروی ہے، امام مالک نے احتیاطاً دونوں چیزوں یعنی پیدل چلنے اور دم دینے کا حکم دیا، (عمدۃ القاری، ج: 10، ص: 321)''۔

ہماری نظر میں سواری پر سفر کرنے والا اور پیدل چلنے والا دونوں بیت اللہ تک کی مسافت کو طے کرتے ہیں، ایک مال خرچ کرتا ہے اور دوسرا جسمانی مشقت اٹھاتا ہے اور دونوں عنداللہ ماجور ہیں اور احادیثِ مبارکہ میں بیان کردہ اجر کے حق دار ہیں۔ بہت سے معاملات بندوں کے احوال کے اعتبار سے ہوتے ہیں، کسی کے لیے مال خرچ کرنا مشکل ہوتا ہے اور کسی کے لیے جسمانی مشقت برداشت کرنا، سو ہر ایک کو اُس کے حال کے مطابق

اجر ملے گا، لیکن اپنے آپ کو ناقابلِ برداشت مشقت اور اذیت میں مبتلا کرنا شریعت کا مطلوب نہیں ہے، تاہم اگر کسی نے پیدل حج کرنے کی منت مانی ہے تو وہ اُسے پورا کرے اور اگر چلنے سے عاجز ہے تو سوار ہو جائے اور حرم میں دم دے۔

علامہ علی القاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"(أَنْ تَرْكَبَ) أَيْ لِلْعَجْزِ (وَتُهْدِيَ هَدْيًا) وَأَقَلُّهُ شَاةٌ وَأَعْلَاهُ بَدَنَةٌ، فَالشَّاةُ كَافِيَةٌ وَالْأَمْرُ بِالْبَدَنَةِ لِلنَّدْبِ، قَالَ الْقَاضِي: لَمَّا كَانَ الْمَشْيُ فِي الْحَجِّ مِنْ عِدَادِ الْقُرُبَاتِ وَجَبَ بِالنَّذْرِ وَالْتَحَقَ بِسَائِرِ أَعْمَالِهِ الَّتِي لَا يَجُوزُ تَرْكُهَا إِلَّا لِمَنْ عَجَزَ وَيَتَعَلَّقُ بِتَرْكِهِ الْفِدْيَةُ وَاخْتُلِفَ فِي الْوَاجِبِ فَقَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: تَجِبُ بَدَنَةٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ: يَجِبُ دَمُ شَاةٍ كَمَا مُجَاوَزَةِ الْمِيقَاتِ وَحَمَلُوا الْأَمْرَ بِالْبَدَنَةِ عَلَى الِاسْتِحْبَابِ وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَأَظْهَرُ قَوْلَيِ الشَّافِعِيِّ وَقِيلَ: لَا يَجِبُ فِيهِ شَيْءٌ وَإِنَّمَا أُمِرَ بِالْهَدْيِ عَلَى وَجْهِ الِاسْتِحْبَابِ دُونَ الْوُجُوبِ"۔

ترجمہ: "اگر چلنے سے عاجز ہے تو سوار ہو جائے اور حرم میں ہدی دے، اس کی کم از کم مقدار بکری ہے اور زیادہ سے زیادہ اونٹ یا گائے ہے، پس بکری کی قربانی کافی ہے اور اونٹ یا گائے کی قربانی مستحب ہے، قاضی عیاض نے کہا: جب پیدل حج کرنا عبادات میں سے ہے تو نذر ماننے سے واجب ہوگا اور اُن اعمال کے ساتھ لاحق ہوگا جن کا ترک صرف عجز کی صورت میں جائز ہے اور اس کے ترک سے فدیہ لازم آئے گا اور اس کے بارے میں اختلاف ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بدنہ واجب ہے، بعض نے فرمایا: بکری کا دم دینا واجب ہے، جیسے حج یا عمرے کے لیے سفر کرنے والا میقات سے بغیر احرام کے گزر جائے تو اُسے بکری کا دم دینا ہوتا ہے اور بَدَنہ کے حکم کو استحباب پر محمول کیا ہے اور امام مالک کا قول بھی یہی ہے اور امام شافعی کا زیادہ واضح قول بھی یہی ہے اور بعض نے کہا: کچھ بھی واجب نہیں ہوتا اور ہدی کا حکم بطورِ استحباب کے ہے، وجوب کے طور پر نہیں ہے"۔

(مرقاۃ المفاتیح، ج:6،ص:2253)

علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''نَذَرَ الْمُكَلَّفُ حَجًّا مَاشِيًا مَشٰى مِنْ مَّنْزِلِهٖ وُجُوْبًا فِي الْاَصَحِّ حَتّٰى يَطُوْفَ الْفَرْضَ لِانْتِهَاءِ الْاَرْكَانِ وَلَوْ رَكِبَ فِيْ كُلِّهٖ اَوْ اَكْثَرِهٖ لَزِمَهٗ دَمٌ وَفِيْ اَقَلِّهٖ بِحِسَابِهٖ''۔

ترجمہ: ''اگر عاقل بالغ مرد یا عورت نے پیدل حج کرنے کی منّت مانی تو صحیح ترین قول کے مطابق اس پر واجب ہے کہ اپنے گھر سے پیدل چلے یہاں تک کہ طوافِ فرض (یعنی طوافِ زیارت) ادا کرلے، کیونکہ اس پر ارکانِ حج کا اختتام ہوجاتا ہے اور اگر پورا سفر یا اُس کا اکثر حصہ سواری پر طے کیا تو اُس پر دم لازم آئے گا اور اگر پورے سفر سے کم حصہ سواری پر طے کیا تو درمیانی بکری کی قیمت لگا کر مسافت کے تناسب سے صدقہ دے، (حاشیہ ابن عابدین، ج:7، ص:59-458)''، اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اگر سفر کا بعض حصہ سواری پر طے کیا تو درمیانی بکری کے اعتبار سے قیمت لگا کر اُس تناسب سے صدقہ دے اور عمرے کا اختتام حَلْق پر ہوگا اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ حج کا اختتام بھی طواف سے پہلے یا بعد حَلْق پر ہو، خواہ حَلْق طوافِ زیارت سے پہلے ہو یا بعد میں، تاکہ احرام سے باہر آجائے''۔ صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''پیدل حج کرنے کی منّت مانی تو واجب ہے کہ گھر سے طوافِ فرض تک پیدل ہی رہے اور پورا سفر یا اکثر سواری پر کیا تو دَم دے اور اگر اکثر پیدل رہا اور کچھ سواری پر تو اُسی حساب سے بکری کی قیمت کا جتنا حصہ اس کے مقابل آئے، خیرات کرے۔ پیدل عمرہ کی منّت مانی تو سر مونڈانے تک پیدل رہے، (بہارِ شریعت حصہ ششم، ص:1215، مکتبۃ المدینہ کراچی)''۔ اگر نصف سفر سواری پر کیا ہے تو درمیانی بکری کی نصف قیمت خیرات کرے اور اگر تہائی سفر سواری پر کیا ہے تو تہائی قیمت خیرات کرے۔

# مالِ حرام سے حج کی قبولیت کا حکم

**سوال:**

2010ء میں ہم تین افراد (والدہ ، بہن اور میں ) نے اپنا فریضۂ حج ادا کیا ، تینوں کے اخراجات والدہ نے کیے ، میری والدہ کا یو بی ایل میں اکاؤنٹ تھا ، اسی اکاؤنٹ سے تمام اخراجات ادا کیے ، کچھ عرصہ بعد خیال آیا ان پیسوں میں سود کی رقم بھی شامل ہوگئی تھی ، اب ہم پریشان ہیں کہ حج ادا ہوا یا نہیں ؟ ، (سید محمد فواد ، کراچی )۔

**جواب:**

فرض حج آپ کے ذمے سے ساقط ہوگیا ، البتہ مالِ حرام کی آمیزش حج کی قبولیت میں مانع ہے جیسا کہ امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں : سود کے روپیہ سے جو کارِ نیک کیا جائے اُس میں استحقاقِ ثواب نہیں ، حدیث شریف میں ہے : جو مال حرام لے کر حج کو جاتا ہے جب لبیک کہتا ہے ، ہاتف غیب سے جواب دیتا ہے : ''لَا لَبَّیْكَ وَلَا سَعْدَیْكَ وَحَجُّكَ مَرْدُوْدٌ عَلَیْكَ حَتّٰی تَرُدَّ مَا فِیْ یَدَیْكَ''۔

ترجمہ : ''نہ تیری بارگاہِ الٰہی میں حاضری قبول ہے اور نہ ہی تیرا نذرانۂ بندگی قبول ہے ، اور تیرا حج تجھے واپس لوٹایا جاتا ہے (یعنی یہ مقبول نہیں ہے ) تاوقتیکہ تو یہ مالِ حرام جو تیرے قبضے میں ہے اُسے ان کو لوٹا دے ، جو اس کے حق دار ہیں ۔ حدیث میں ہے : رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں : ''اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ'' ، ترجمہ : ''بے شک اللہ عزّوجل پاک ہے ، پاک ہی چیز کو قبول فرماتا ہے'' ، (فتاویٰ رضویہ ، جلد 23 ، ص : 541 )''۔ لیکن اگر آپ کی والدہ کی اصل کمائی حلال تھی اور وہ اتنی تھی کہ آپ تینوں کے حج کے لیے کافی تھی ، تو اس حلال کمائی سے حج کی نیت کرنی چاہیے ، محض سود کی ملاوٹ سے اصل حلال رقم حرام نہیں ہوگی ۔

# نکاح کے مسائل

## نکاح کے بعد رخصتی کب ضروری ہے

**سوال:**

اگر نکاح ہو جائے اور رخصتی ایک یا دو سال بعد ہو تو کیا یہ شرعاً جائز ہے''۔

(رائے ثقلین رضوی، سرگودھا)

**جواب:**

شریعت کی رُو سے دو مرد گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور زوجین کے ایک دوسرے پر حقوق شرعاً ثابت ہو جاتے ہیں، اس کے بعد باوقار طور پر رخصتی کی جاسکتی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سات سال کی عمر میں ہوا اور رخصتی نو سال کی عمر میں ہوئی۔

رخصتی کے لیے شرعاً کسی مدت کا تعین نہیں ہے، اپنی سہولت کے مطابق فریقین طے کر سکتے ہیں، لیکن جب سہولت ہو، جلدی کرنا بہتر ہے تاکہ زوجین اِغوائے نفس اور مکرِ شیطان سے محفوظ رہیں، لیکن اس کے لیے شریعت میں کوئی لگا بندھا ضابطہ مقرر نہیں ہے۔

## دودھ پلانے والی ماں کے بیٹے یا پوتے سے نکاح نہیں ہوسکتا

**سوال:**

شاہد کی دادی کا کہنا ہے کہ اس نے شاہد کے چچا کی بیٹی فاطمہ کو 58 سال کی عمر میں دودھ پلایا، فاطمہ کی عمر ایک سال تھی اور بقول دادی کے اس وقت چھاتی کا ایک حصہ خشک اور دوسرے میں سفید لیس دار پانی تھا۔ کیا اس سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، شاہد کا فاطمہ سے نکاح جائز ہے یا نہیں؟ (زیب الرحمٰن، کراچی)۔

**جواب:**

کسی بچے یا بچی کو مدتِ رضاعت (یعنی ڈھائی سال کی عمر کے اندر) دودھ پلانے سے رضاعت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور جو رشتے نسب سے حرام ہیں، رضاعت کے سبب

بھی حرام ہوجاتے ہیں، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ لِی رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہوجاتے ہیں جونسب سے حرام ہوتے ہیں''۔ (صحیح مسلم:3505)

آپ کے بقول دادی کا کہنا ہے کہ ''اس وقت چھاتی کا ایک حصہ خشک اور دوسرے میں سفید لیس دار پانی تھا''، تو اگر اس حصے سے دودھ پیا تو رضاعت ثابت ہوجائے گی،

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَشَرْعًا مَصٌّ مِنْ ثَدْيِ آدَمِيَّةٍ وَلَوْبِكْرًا أَوْ مَيِّتَةً أَوْ آيِسَةً''۔

ترجمہ: ''اور شرعاً (حکم یہ ہے کہ) کنواری یا مردہ عورت یا بوڑھی عورت کا دودھ پیا تو رضاعت ثابت ہوجائے گی''۔ آگے چل کے مزید لکھتے ہیں: ''وَلَبَنُ بِكْرٍ بِنْتِ تِسْعِ سِنِيْنَ فَأَكْثَرَ مُحَرِّمٌ''۔ ترجمہ: ''نوسال عمر والی کنواری یا زیادہ عمر والی عورت کا دودھ پیا، حُرمت رضاعت ثابت ہوجائے گی، (جلد9، ص:31، دمشق)''۔

دودھ پینے والی لڑکی کا نکاح دودھ پلانے والی عورت کے بیٹوں، پوتوں سے نہیں ہوسکتا کہ یہ اس کے بیٹوں کی رضاعی بہن اور پوتوں کی رضاعی پھوپھی ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَاحِلَّ بَيْنَ الرَّضِيْعَةِ وَوَلَدِ مُرْضِعَتِهَا أَيِ الَّتِي أَرْضَعَتْهَا وَوَلَدِ وَلَدِهَا لِأَنَّهُ وَلَدُ الْأَخِ''۔

ترجمہ: ''دودھ پینے والی لڑکی کا نکاح دودھ پلانے والی ماں کے بیٹے سے جائز نہیں ہے (کیونکہ وہ اس کا رضاعی بھائی ہے) اور اسی طرح اس کے پوتے سے بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کا رضاعی بھتیجا ہے، (جلد9، ص:59-58، دمشق)''۔ یعنی دودھ پلانے والی عورت کا بیٹا اس دودھ پینے والی لڑکی کا رضاعی بھائی اور اُس رضاعی بھائی کا بیٹا اس کا

رضاعی بھتیجا ہے اور رضاعت کے رشتے سے دونوں اس پر حرام ہیں۔

آپ نے لکھا ہے: ''دادی کے اس وقت چھاتی کا ایک حصہ خشک اور دوسرے میں سفید لیس دار پانی تھا''، حُرمتِ رضاعت اُس دودھ سے ثابت ہوتی ہے، جس میں بچے کے نشوونما کی صلاحیت موجود ہے، یہاں بظاہر ایسا نہیں ہے، لہٰذا واضح شواہد کے بغیر حُرمت کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ: وَإِذَا نَزَلَ لِلرَّجُلِ لَبَنٌ فَأَرْضَعَ بِهٖ صَبِيَّةً لَمْ يَتَعَلَّقْ بِهٖ تَحْرِيمٌ، لِأَنَّهٗ لَيْسَ بِلَبَنٍ عَلَى التَّحْقِيقِ فَلَا يَتَعَلَّقُ بِهِ النُّشُوْءُ وَالنُّمُوُّ، وَهٰذَا لِأَنَّ اللَّبَنَ إِنَّمَا يُتَصَوَّرُ مِمَّنْ يُتَصَوَّرُ مِنْهُ الْوِلَادَةُ، وَقَدْ يُذْكَرُ فِي بَعْضِ الْحِكَايَاتِ أَنَّهُ اتَّفَقَ لِرَجُلٍ إِرْضَاعُ صَغِيْرٍ، فَإِنْ صَحَّ فَهُوَ مِنْ خَوَارِقِ الْعَادَاتِ لَا يُبْنَى الْفِقْهُ بِاعْتِبَارِهٖ، وَعَلٰى هٰذَا يَلْزَمُ أَنَّهٗ لَوْ نَزَلَ لِبِكْرٍ لَمْ تَبْلُغْ سِنَّ الْبُلُوْغِ لَبَنٌ لَا يَتَعَلَّقُ بِهِ التَّحْرِيْمُ، وَيُحْكَمُ بِأَنَّهٗ لَيْسَ لَبَنًا، كَمَا لَوْ نَزَلَ لِلْبِكْرِ مَاءٌ أَصْفَرُ لَا يَثْبُتُ مِنْ إِرْضَاعِهٖ تَحْرِيْمٌ وَالْوَجْهُ الْفَرْقُ بِعَدَمِ التَّصَوُّرِ مُطْلَقًا، فَإِذَا تَحَقَّقَ لَبَنًا تَثْبُتُ الْحُرْمَةُ، بِخِلَافِ الرَّجُلِ، لِأَنَّ الْحُكْمَ لَازِمٌ دَائِمًا بِأَنَّهٗ لَيْسَ بِلَبَنٍ''۔

ترجمہ: ''اگر (خارق عادت کے طور پر) مرد کا دودھ نکل آئے اور وہ بچے کو دودھ پلا دے، تو اس سے حُرمت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ تحقیق یہ ہے کہ یہ دودھ نہیں ہے، اس لیے اس کے ساتھ بچے کی نشوونما متعلق نہیں ہے، کیونکہ دودھ اس سے متصور ہوتا ہے، جس سے بچے کی پیدائش متصور ہو، بعض حکایات میں ہے: ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ایک مرد نے چھوٹے بچے کو دودھ پلایا، اگر یہ درست ہے تو یہ خارق عادت ہے اور اس پر قیاس کر کے کسی فقہی ضابطے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، اس پر لازم آئے گا کہ اگر کسی نابالغہ کنواری لڑکی کا دودھ اتر آیا، تو یہ ایسا دودھ ہے، جس کے ساتھ حُرمت رضاعت متعلق نہیں ہے اور حکم یہی لگایا جائے گا کہ یہ دودھ نہیں ہے، جیسے کسی کنواری لڑکی کے ہاں زرد رنگ کا مائع اتر آیا (اور کسی بچے کو پلا دیا) تو اس کے ساتھ حُرمتِ رضاعت متعلق نہیں ہوگی اور فرق کا سبب یہ ہے کہ جہاں مطلقاً دودھ متصور ہی نہ ہو (اس پر حُرمت رضاعت کا حکم عائد نہیں ہوگا)، پس جب دودھ ہونا ثابت

ہوجائے تو حُرمت رضاعت بھی ثابت ہوجائے گی، مرد کا مسئلہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ اس سے حُرمت رضاعت ثابت نہ ہونے کا حکم دائمی طور پر لازم ہے، کیونکہ وہ دودھ ہے ہی نہیں، (فتح القدیر، جلد 3، ص:436)''۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ مسئلے میں جب تک واضح شواہد نہ ہوں، حُرمت کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، لہٰذا شاہد کا فاطمہ کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

## رضاعت کی مدت دو یا ڈھائی سال

### سوال:

آپ نے تفہیم المسائل، جلد پنجم، ص:363 اور جلد ہشتم، ص:248 پر لکھا ہے: ''جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ مدتِ رضاعت (یعنی ڈھائی سال کی عمر تک) پیا ہے، اس پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد خواہ وہ دودھ پلانے سے پہلے کی ہو یا بعد کی، اسی طرح اس رضاعی ماں کی کسی دوسرے شوہر سے اولاد، سب اس دودھ پینے والے کے لیے رضاعی بہن بھائی ہوگئے''، کیا دودھ پلانے کی مدت ڈھائی سال ہے، حالانکہ قرآن کریم دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتائی گئی ہے، (علامہ مولانا عبداللہ، گوجرانوالہ)۔

### جواب:

آپ کا فرمان بجا ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے، اس سے زیادہ مدت کے لیے دودھ پلانے کی اجازت نہیں ہے، البتہ حُرمتِ رضاعت کے ثبوت کے لیے ڈھائی سال کی مدت مقرر ہے، دُرِّ مختار میں ہے:

''فِی وَقْتٍ مَخْصُوْصٍ هُوَحَوْلَانِ وَنِصْفٌ عِنْدَهٗ وَحَوْلَانِ فَقَطْ عِنْدَهُمَا وَهُوَالْاَصَحُّ ''فَتْحٌ'' وَبِهٖ یُفْتٰی کَمَا فِی ''تَصْحِیْحِ الْقُدُوْرِیِّ'' عَنِ الْعَوْنِ، لٰکِنْ فِی ''الْجَوْهَرَةِ'' اَنَّهٗ فِی الْحَوْلَیْنِ وَنِصْفٍ، وَلَوْبَعْدَ الْفِطَامِ مُحَرَّمٌ وَعَلَیْهِ الْفَتْوٰی''۔

ترجمہ: ''(حُرمتِ رضاعت کا رشتہ) ایک مخصوص مدت تک قائم ہوتا ہے، امامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی مدت ڈھائی سال ہے اور صاحبین کے نزدیک دو سال ہے، یہی صحیح ترین قول ہے (بحوالہ: فتح القدیر) اور اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے، جس طرح ''تصحیح القدوری'' میں

''عون'' سے مروی ہے، لیکن ''اَلْجَوہَرَۃُ النَّیِّرَہ'' میں ہے: یہ (مدت) پورے ڈھائی سال ہے، اگر دودھ چھڑانے کے بعد بھی کسی بچے نے عورت کا دودھ پیا ہو، تو اس سے حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی اور فتویٰ اسی پر ہے''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 9، ص: 33-32، دمشق)

علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَثَبَتَ أَنَّ بَعْدَ الْحَوْلَيْنِ رَضَاعٌ، فَلَا يُمْكِنُ قَطْعُ الْوَلَدِ عَنِ اللَّبَنِ دَفْعَةً وَاحِدَةً، فَلَا بُدَّ مِنْ زِيَادَةِ مُدَّةٍ يَعْتَادُ فِيهَا الصَّبِيُّ مَعَ اللَّبَنِ الْفِطَامِ، فَيَكُونُ غِذَاؤُهُ اللَّبَنُ تَارَةً وَالطَّعَامُ أُخْرَىٰ إِلَىٰ أَنْ يَنْسَى اللَّبَنَ، وَأَقَلُّ مُدَّةٍ تَنْتَقِلُ بِالْعَادَةِ سِتَّةُ أَشْهُرٍ اعْتِبَارًا بِمُدَّةِ الْحَبَلِ''۔

ترجمہ: ''پس ثابت ہوا کہ دودھ پلانے کی مدت مکمل دو سال کے بعد تک ہے کیونکہ بچے سے ایک دم دودھ چھڑانا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے ضروری ہے کہ حُرمتِ رضاعت کی مدت دو سال سے بڑھائی جائے گی جس میں بچہ عادتاً دودھ چھوڑنے کے عمل سے گزرتا ہے، سو کبھی اس کی غذا دودھ ہوتا ہے اور کبھی دوسری چیزیں، یہاں تک کہ وہ دودھ کو بھول جائے اور کم سے کم مدت جس میں بچہ پوری طرح دودھ سے دوسری غذا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چھ ماہ ہے، اس کو کم سے کم مدتِ حمل پر قیاس کریں گے (جو چھ ماہ ہے)''۔

(عمدۃ القاری، جلد 20، ص: 135)

صدرالشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مسئلہ: بچہ کو دو برس تک دودھ پلایا جائے، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ دودھ پینے والا لڑکا ہو یا لڑکی اور یہ جو بعض عوام میں مشہور ہے کہ لڑکی کو دو برس تک اور لڑکے کو ڈھائی برس تک پلا سکتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ یہ حکم دودھ پلانے کا ہے اور نکاح حرام ہونے کے لیے ڈھائی برس کا زمانہ ہے، یعنی دو برس کے بعد اگرچہ دودھ پلانا حرام ہے مگر ڈھائی برس کے اندر اگر دودھ پلا دے گی، حرمت نکاح ثابت ہو جائے گی اور اس کے بعد اگر پیا، تو حرمت نکاح

نہیں، اگرچہ پلانا جائز نہیں، (بہارِ شریعت، جلد دوم، حصہ ہفتم، ص:36)''۔ لہٰذا ان دونوں مقامات پر ایک طرح سے اجمال رہ گیا ہے، جس پر آپ کو اشکال پیدا ہوا۔ اِس اجمال کی تفصیل اور وضاحت یہ ہے کہ مدتِ رضاعت بلاشبہ دوسال ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمائی ہے: ''وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ''۔ ترجمہ: ''مائیں اپنے بچوں کو پورے دوسال دودھ پلائیں، یہ (حکم) اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے، (البقرہ:233)''۔ (۲) ''وَفِصَالُهٗ فِیْ عَامَیْنِ''، ترجمہ: ''اور اس کا دودھ چھڑانا دو برس میں ہے، (لقمان:14)''۔ لیکن چونکہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے، اس لیے فقہائے کرام نے بر بنائے احتیاط حُرمتِ رضاعت کے ثبوت کے لیے ڈھائی سال کی مدت مقرر کی ہے، کیونکہ جو بچے صرف ماں کے دودھ سے پرورش پاتے ہیں، ان کا یک دم دودھ چھڑانا مشکل ہوتا ہے، بچہ دودھ پینے کی ضد کرتا ہے، یہاں تک کہ بعض عورتیں بچے کا دودھ چھڑانے کے لیے اپنے پستان پر ایلوا یا مرچ یا کوئی کڑوی چیز لگاتی ہیں کہ بچے دودھ سے مُتنفر ہوجائے، یہاں تک کہ جو بچے بوتل سے نپل کے ذریعے مصنوعی دودھ پیتے ہیں، وہ بھی یک دم دودھ نہیں چھوڑ پاتے۔

## نافرمان ہوکر گھر سے چلی جانے والی بیوی کا نفقہ شوہر پر لازم نہیں ہے

**سوال:**

اگر بیوی بغیر کسی وجہ کے اور بغیر پوچھے گھر سے چلی جائے تو کیا طلاق دینا جائز ہے؟

(شاہد خان ماہی، شاہ کوٹ، پنجاب)

**جواب:**

اسلامی تعلیمات کا منشا اور مزاج تو یہ ہے کہ شوہر و بیوی کے مابین ''رشتۂ نکاح'' تاحیات قائم رہے، مگر بعض ناگزیر حالات میں طلاق اور خلع کا راستہ بھی رکھا ہے تاکہ طبائع کے اختلاف کی وجہ سے زندگی ایک دوسرے کے لئے جہنّم نہ بن جائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر زوجین کے درمیان اختلافات زیادہ بڑھ

جائیں تو دونوں کے خاندانوں سے ایک ایک بزرگ یا زیرک ودانا اور اصلاح پسند نمائندہ چن کر ان دونوں کو ثالث مقرر کیا جائے تاکہ وہ زوجین کے درمیان اختلاف کو رفع کرسکیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا''۔

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں ان دونوں (میاں بیوی) کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم شوہر کے خاندان سے اور ایک حَکَم (ثالث) بیوی کے خاندان سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت (کی صورت) مقدر فرمالے گا، بے شک اللہ خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہے، (النساء:35)''۔

طلاق اگرچہ ناگزیر صورت حال میں ایک مشروع ومباح امر ہے، لیکن یہ تمام مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) ''عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ الطَّلَاقُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(تمام) حلال امور میں جو امر اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ ناراضی کا باعث ہے، وہ طلاق ہے''۔ (سنن ابوداؤد:2171)

(۲) ''عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَیْئًا عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ اَبْغَضَ اِلَیْهِ مِنَ الطَّلَاقِ''۔

ترجمہ: ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، (رواہ الدارقطنی:3939)''۔

(۳) ''عَنْ ثَوْبَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَیُّمَا امْرَاَةٍ سَاَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا مِنْ غَیْرِ بَاْسٍ فَحَرَامٌ عَلَیْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ''۔

ترجمہ:''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو عورت کسی ناگزیر مجبوری (اور ناقابل برداشت صورت حال) کے بغیر اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے، (یہ الفاظ ترمذی شریف کے ہیں)، (سُنن ترمذی: 1187، سُنن ابوداؤد: 2221، سُنن ابن ماجہ: 2134)''۔ تاہم اگر طلاق دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے تو بہتر یہ ہے کہ اُس طُہر میں، جس میں بیوی سے قربت نہ کی ہو، اُسے ایک طلاق دیں، عدت کے دوران شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کا حق حاصل ہے، اگر اُس نے رجوع نہ کیا تو عدت گزرنے کے بعد یہ ایک طلاقِ بائن ہو جائے گی اور نکاح ختم ہو جائے گا مہر اگر ادا نہیں کیا تو لازم ہو جائے گا اور عدت گزرنے کے بعد عورت اپنی مرضی سے کسی بھی شخص کے ساتھ نکاح کے لیے آزاد ہوگی جبکہ کوئی مانعِ شرعی نہ ہو اور باہمی رضامندی سے پہلے طلاق دہندہ شوہر کے ساتھ نیا مہر مقرر کر کے نکاح کر سکتی ہے، لیکن اُس شوہر کے پاس آئندہ صرف دو طلاقوں کا حق رہے گا، یہ پہلی طلاق خدانخواستہ آئندہ دی جانے والی طلاق کے ساتھ جمع ہونے کے لیے مؤثر رہے گی۔

اگر عورت مرد کی طرف سے کسی ایذا رسانی کے بغیر مرد کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو اور شوہر کے حقوق کا خیال نہ رکھے تو ایسی عورت قرآن کریم اور فقہِ اسلامی کی اصطلاح میں ''ناشزہ'' یعنی نافرمان (Disobedient) کہلاتی ہے اور ایسی عورت کا نان نفقہ، رہائش، علاج معالجہ وغیرہ شوہر کے ذمے لازم نہیں ہے، جب تک کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو جائے، علامہ نظام الدین لکھتے ہیں: ''فَاِنْ نَشَزَتْ فَلَا نَفَقَةَ لَهَا حَتّٰى تَعُوْدَ اِلٰى مَنْزِلِهٖ''، ترجمہ: ''اگر عورت نافرمان ہو کر شوہر کے گھر سے نکل جائے تو جب تک وہ واپس (شوہر کے) گھر لوٹ کر نہ آجائے، اس کا نان نفقہ شوہر کے ذمے نہیں''۔
(فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، ص: 545)

## بہو سے زنا

**سوال:**

ایک شخص محمد خان نے اپنی بہو سے زبردستی زنا کیا، لڑکی اپنی بہنوں کے گھر چلی گئی، محمد خان کی بیوی قرآن کی قسم دے کر واپس لے آئی، سسر محمد خان نے دوبارہ یہی حرکت کی، جرگہ بیٹھا، جرگے نے فیصلہ پیر صاحب میاں اعظم خان کے حوالے کیا، پیر صاحب نے لڑکی کو مجرم سے چھ لاکھ روپے دلوائے، تھانہ پولیس سے آزاد کرا دیا اور فریقین میں صلح کرا دی۔ سوال یہ ہے:

۱۔ کیا سسر کا بہو سے زنا کرنے کے بعد بیٹے کے ساتھ نکاح برقرار رہے گا۔

۲۔ کیا پیر صاحب کا یہ فیصلہ شریعت کی رُو سے درست ہے۔

۳۔ سسر محمد خان کی شرعی سزا کیا ہے، برادری و اہلِ محلہ اس سے تعلق رکھیں یا نہیں؟

(محمد اسلم خان نیازی، لیاری کراچی)

**جواب:**

وہ عورتیں، جن سے نکاح حرام ہے، ان کو 9 قسم پر منقسم کیا جاتا ہے، جس میں ایک قسم حرمتِ مصاہرت ہے، جو مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوت سے چھوئیں یا ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھیں، تو اُس عورت کے اصول و فروع مرد پر حرام ہو جائیں گے اور مرد کے اصول و فروع عورت پر حرام ہو جائیں گے، اس کو حرمتِ مصاہرۃ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَکَمَا تَثْبُتُ هٰذِهِ الْحُرْمَةُ بِالْوَطْءِ تَثْبُتُ بِالْمَسِّ وَالتَّقْبِيْلِ وَالنَّظَرِ إِلَى الْفَرْجِ بِشَهْوَةٍ كَذَا فِي ''الذَّخِيْرَةِ''۔

ترجمہ: ''حرمت مصاہرت، جس طرح وطی (مباشرت) سے ثابت ہوتی ہے، اسی طرح شہوت کے ساتھ چھونے، بوسہ لینے اور فرج (شرمگاہ) کی طرف نظر کرنے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ ''ذخیرہ'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1 ص: 275,274)''۔

سسر کے زنا کرنے کے بعد عورت اور اس کے شوہر کے درمیان حرمت مصاہرت کا تعلق قائم ہو چکا ہے، اس لیے دونوں کو فوراً علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ ایسی صورت میں نکاح کے ازالے کے لیے جو الفاظ کہے جائیں وہ طلاق نہیں بلکہ ''مُتارکہ'' کہلاتے ہیں، شوہر یوں کہے: ''میں نے تجھے نکاح سے آزاد کیا یا میں نے تجھے چھوڑ دیا''۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَبِحُرْمَةِ الْمُصَاهَرَةِ لَا يَرْتَفِعُ النِّكَاحُ حَتّٰى لَا يَحِلَّ لَهَا التَّزَوُّجُ بِآخَرَ إِلَّا بَعْدَ الْمُتَارَكَةِ وَانْقِضَاءِ الْعِدَّةِ وَالْوَطْءُ بِهَا لَا يَكُوْنُ زِنًا''۔

ترجمہ: ''حُرمتِ مصاہرت سے نکاح (از خود) ختم نہیں ہوتا، لہٰذا (عورت) کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی، جب تک شوہر متارکہ نہ کرے اور عدت نہ گزر جائے، اس دوران اگر (لاعلمی کی بنا پر) شوہر نے مباشرت کی ہے، تو وہ زنا نہیں ہوگا یعنی اسے زنا کی حد نہیں لگے گی، (جلد 8، ص: 124، دمشق)''۔

اگر شرعی معیار (یعنی چار عینی گواہوں یا مجرم کے اقرار) سے مُجاز عدالت کے سامنے جرم ثابت ہو جائے تو شریعت کی رُو سے یہ جرم ''موجبِ حد'' ہے اور اس پر حَدِّ شرعی نافذ کرنے کا اختیار حاکمِ وقت یا مُجاز عدالت کے پاس ہے۔ فقہاء اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور اگر وہ غیر مُحصِن ہے تو اس کو کوڑے مارے جائیں گے۔ چونکہ یہ شخص (مُسَمّٰی محمد خان) عاقل و بالغ اور شادی شدہ ہے، اس لیے اس کی سزا رجم ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے عمل مبارک اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، جو حدِ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔ قانون یہ بھی دیکھتا ہے کہ جرم کس عدالت کے دائرۂ اختیار میں سرزَد ہوا ہے، حدود قائم کرنا حاکمِ اسلام یا اُس کے مقررہ و مُجاز قاضی کا کام ہے۔ لوگوں یا کسی برادری یا قبیلے یا جرگے کو قانون ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں ہے۔ جرگے نے جرمانہ چھ لاکھ روپے کیا ہو یا چھ کروڑ روپے، اس سے حرام حلال نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے فعلِ حرام کی حُرمت مرتفع ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَزَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، قَالاَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! اِقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللهِ، فَقَامَ خَصْمُهُ فَقَالَ: صَدَقَ، اِقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللهِ، فَقَالَ الْأَعْرَابِيُّ: إِنَّ ابْنِي كَانَ عَسِيفًا عَلَى هٰذَا، فَزَنٰى بِامْرَأَتِهِ، فَقَالُوا لِي عَلَى ابْنِكَ الرَّجْمُ، فَفَدَيْتُ ابْنِي مِنْهُ بِمِائَةٍ مِنَ الْغَنَمِ وَوَلِيدَةٍ، ثُمَّ سَأَلْتُ أَهْلَ الْعِلْمِ، فَقَالُوا: إِنَّمَا عَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ، وَتَغْرِيبُ عَامٍ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللهِ، أَمَّا الْوَلِيدَةُ وَالْغَنَمُ فَرَدٌّ عَلَيْكَ، وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ، وَأَمَّا أَنْتَ يَا أُنَيْسُ لِرَجُلٍ فَاغْدُ عَلَى امْرَأَةِ هٰذَا، فَارْجُمْهَا، فَغَدَا عَلَيْهَا أُنَيْسٌ فَرَجَمَهَا"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد الجُہنی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی نے آکر کہا: یا رسول اللہ! ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کیجیے، اس کا فریق مخالف کھڑا ہوا، اُس نے کہا: اس نے سچ کہا ہے، ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کیجیے، دیہاتی نے کہا: میرا بیٹا اس کے یہاں مزدور تھا، اُس نے اِس کی بیوی سے زنا کیا، پس لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے بیٹے کو رجم کیا جائے گا تو میں نے سو بکریوں اور ایک باندی کو اپنے بیٹے کے فدیہ میں دیا، پھر میں نے اہلِ علم سے سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہارے بیٹے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے شہر بدر کیا جائے گا، تب نبی ﷺ نے فرمایا: میں تم دونوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، رہی باندی اور بکریاں تو وہ تمہیں واپس دی جائیں گی اور تمہارے بیٹے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے شہر بدر کیا جائے گا اور آپ ﷺ نے ایک مرد سے فرمایا: اور تم اے اُنیس! صبح اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اور (زنا کا اعتراف کرنے کی صورت میں) اس کو سنگسار کردو (جیسا کہ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے)، پھر صبح کو حضرت اُنیس نے اس عورت کو رجم کردیا، (صحیح البخاری: 2696)"۔

اِس حدیثِ مبارک کی رُو سے جرمانہ واپس کردینا چاہیے، اس طرح تو مالدار لوگوں

کے لیے بدکاری کا راستہ کھل جائے گا کہ بدکاری کریں اور پھر پیسے دے کر اپنی جان چھڑالیں، اللہ تعالیٰ کی حدود کو پیسے کے عوض مُعطّل کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ پیر صاحب کا عمل بھی خلافِ شرع ہے، پیر صاحب کی اولین شرعی ذمے داری یہ تھی کہ جس خاتون سے اس کے سسر نے بدکاری کی ہے، اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان فوراً علیحدگی کراتے، کیونکہ اب وہ عورت اپنے شوہر پر حرام ہو چکی ہے۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ پیرِ طریقت بننے کا حق دار وہی ہے، جو عالمِ شریعت اور عاملِ شریعت ہو۔

اگر محمد خان کے جرم کی محلے یا برادری یا قبیلے میں تشہیر نہ ہوئی ہوتی تو اس پر پردہ ڈالنا بہتر تھا، ایک حدیثِ مبارک میں ہے: ایک شخص رجم کے دوران تکلیف کی تاب نہ لاکر بھاگا، تو ایک شخص نے اسے گدھے کی ہڈی سے مارا اور وہ گر کر مر گیا، پھر وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور یہ ماجرا بیان کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا، پھر فرمایا: اے ہَزَّال! اگر تم نے اس کی پردہ پوشی کی ہوتی، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوتا، (مسند احمد: 21892)''۔ لیکن اس جرم کی چونکہ تشہیر ہو چکی ہے، لہٰذا جب تک محمد خان کے بیٹے اور اس کی مذکورہ بیوی کے مابین علیحدگی نہ ہو اور محمد خان صدقِ دل سے اس کبیرہ گناہ پر شرمندہ ہو کر توبہ نہ کریں، اُس وقت تک اُن سے میل جول اور معاشرتی روابط رکھنا درست نہیں ہے۔

نوٹ: ہم برتقدیرِ صدقِ سائل (یعنی اس تقدیر پر کہ سائل کا بیان درست ہے) حکمِ شرع بیان کرتے ہیں، ہمارا فتویٰ قضا نہیں ہوتا، ایسے الزامات کو شواہد کی روشنی میں رَد یا قبول کرنا اور حدِّ شرعی نافذ کرنا عدالت اور حکومت کی طرف سے مقررہ مُجاز قاضی کا کام ہے۔

## خُسر محرم ہے

**سوال:**

شوہر کے زندہ ہوتے ہوئے خُسر بہو کے لیے محرم ہے یا نہیں اور شوہر کے مرنے کے بعد خسر بہو کے لیے محرم ہوگا یا نہیں اور بہو اس کے ساتھ حج یا عمرے یا کسی بھی سفر پر جاسکتی

ہے؟۔(عامر لاکھانی، کراچی)۔

**جواب:**

مَحرم سے مراد کسی عورت کا وہ مرد رشتے دار ہے، جس کے ساتھ شریعت کی رُو سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے، اس کے تین اسباب ہیں: (۱) وہ رشتے جو نسب کے سبب قائم ہوتے ہیں، جیسے باپ، دادا، نانا، چچا، ماموں، بھائی، بھتیجا (بھائی کا بیٹا)، بھانجا (بہن کا بیٹا)، بیٹا، پوتا، نواسا وغیرہ۔(۲) رضاعت (اپنی ماں کے سوا کسی غیر عورت کا مدتِ رضاعت میں دودھ پینے) کے سبب قائم ہونے والے رشتے، جیسے رضاعت کے رشتے سے باپ، دادا، نانا، بھائی، بھتیجا، بھانجا، چچا، ماموں، بیٹا، پوتا، نواسا، (۳) رشتۂ مصاہرت، اسے اردو میں سسرالی رشتہ اور انگریزی میں In-Law کہتے ہیں، جیسے خُسر، ساس، داماد، بہو وغیرہ۔ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے نکاح وقتی طور پر تو حرام ہوتا ہے لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام نہیں ہوتا، جیسے بہنوئی کہ جب تک ایک بہن اس کے نکاح میں ہے، دوسری بہن کا اُس کے ساتھ نکاح حرام ہے، لیکن اگر پہلی بہن کو طلاق دیدی یا وہ قضائے الٰہی سے فوت ہوگئی تو عدتِ طلاق یا عدتِ وفات گزرنے کے بعد دوسری بہن کا اس کے ساتھ نکاح جائز ہے، اس لیے بہنوئی مَحرم نہیں ہے، لہٰذا خواہرِ نسبتی (سالی) کا بہنوئی کے ساتھ حج یا عمرہ یا کسی بھی سفر پر جانا جائز نہیں ہے۔ چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد مرد رشتے دار یا شوہر کے بھائی (جیٹھ، دیور) سے پردہ واجب ہے، کیونکہ وہ مَحرم نہیں ہے۔

پس خُسر بہو کے لیے مَحرم ہے، کیونکہ اس کے ساتھ بہو کا نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے، خواہ شوہر زندہ ہو یا فوت ہوگیا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ''۔

ترجمہ: ''اور تمہارے نسبی بیٹوں کی بیویاں (تم پر حرام کی گئیں)، (النساء:23)''۔

دُرِّ مختار میں ہے: ''وَزَوْجَةَ اَصْلِهٖ وَفَرْعِهٖ مُطْلَقًا وَلَوْ بَعِيْدًا دَخَلَ بِهَا اَوْ لَا''، ترجمہ: ''اور اپنی اصل (باپ دادا) اور فرع (بیٹے اور پوتے) کی زوجہ مطلقاً حرام ہیں، اگرچہ بعید

ہوں، خواہ اس کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم ہوا یا نہ ہوا ہو، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 8، ص:104، دمشق)''۔ چونکہ خُسر مَحرم ہے، اس لیے بہو اُس کے ساتھ حج یا عمرے کے سفر پر جاسکتی ہے، تاہم بلاضرورت اور بے تکلف خَلوت میں میل جول سے احتراز کیا جائے۔ خاص طور پر جبکہ وہ عمر رسیدہ نہ ہوں، کیونکہ آج کل کئی ناخوشگوار واقعات میڈیا میں رپورٹ ہورہے ہیں اور اگر ظنِ غالب ہے کہ خُسر اَخلاقی گراوٹ کا حامل ہے، تو عزتِ نفس، آبرو کے تحفظ اور کسی ناخوشگوار صورت حال میں مبتلا ہونے سے بچنے کے لیے اس کے ساتھ سفر اور خلوت سے گریز کیا جائے۔

علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثُمَّ صِفَةُ الْمَحْرَمِ أَنْ يَكُوْنَ مِمَّنْ لَا يَجُوْزُ لَهٗ نِكَاحُهَا عَلَى التَّأْبِيْدِ إِمَّا بِالْقَرَابَةِ أَوِ الرَّضَاعِ أَوِ الصِّهْرِيَّةِ، لِأَنَّ الْحُرْمَةَ الْمُؤَبَّدَةَ تُزِيْلُ التُّهْمَةَ فِي الْخَلْوَةِ، وَلِهٰذَا قَالُوْا: إِنَّ الْمَحْرَمَ إِذَا لَمْ يَكُنْ مَأْمُوْنًا عَلَيْهِ لَمْ يَجُزْ لَهَا أَنْ تُسَافِرَ مَعَهٗ''۔

ترجمہ: ''مَحرم وہ شخص ہے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہو، خواہ حرمتِ نکاح رشتۂ قرابت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ رضاعت کی وجہ سے ہو یا رشتۂ مصاہرت (سسرالی رشتہ) کی وجہ سے، کیونکہ دائمی حرمت سے خلوت میں تہمت کا اندیشہ زائل ہوجاتا ہے، اسی لیے فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر مَحرم بھی قابلِ اعتماد نہ ہو (یعنی اس سے آبرو محفوظ نہ ہو) تو اس کے ساتھ بھی عورت کا سفر پر جانا جائز نہیں ہے، (بدائع الصنائع، جز ثانی، ص: 187-188، مطبوعہ مرکز اہل سنت برکات رضا، گجرات، ھند)''۔

# طلاق کے مسائل

# طلاق کے الفاظ

**سوال:**

عبدالمجید ولد احمد حسین کا اپنے بھائی عبدالعزیز سے جھگڑا ہوا اور جھگڑے کے دوران عبدالمجید نے چار پانچ مرتبہ یہ کہا: ''مجھ پر طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے، اگر میں اس حویلی میں رہا تو''۔ بقول عبدالمجید یہ بات اس نے ایک مرتبہ کہی جبکہ گواہوں کا کہنا ہے کہ چار پانچ مرتبہ کہی۔ عبدالمجید کا کہنا ہے کہ اس گھر میں نہ رہنے سے مراد مستقبل میں نہ رہنے کی تھی، یہ واقعہ مغرب عشاء کے درمیان پیش آیا اور وہ رات عبدالمجید نے اسی گھر میں گزاری، دوسرے دن صبح دس گیارہ بجے وہ معمولی ضرورت کا سامان لے کر گھر سے چلا گیا، اس واقعے کے بعد عبدالمجید حویلی میں نہیں گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟، (ڈاکٹر محمد سونا خان، ڈیرہ اسماعیل خان)۔

**جواب:**

شوہر کے الفاظ: ''مجھ پر طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے''، عُرف میں صریح ہیں، اگر یہ الفاظ شوہر نے تعلیقاً نہ کہے ہوتے تو براہِ راست بلا نیت طلاق واقع ہوجاتی۔ کُتبِ فقہ میں اس کی نظیر یوں بیان کی گئی ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَمِنَ الْاَلْفَاظِ الْمُسْتَعْمَلَةِ الطَّلَاقُ يَلْزَمُنِیْ، وَالْحَرَامُ يَلْزَمُنِی، وَعَلَیَّ الطَّلَاقُ، وَعَلَیَّ الْحَرَامُ، فَيَقَعُ بِلَا نِيَّةٍ لِلْعُرْفِ، فَلَوْ لَمْ يَكُنْ لَهُ امْرَأَةٌ يَكُونُ يَمِيْنًا فَيُكَفِّرُ بِالْحِنْثِ تَصْحِيحُ الْقُدُورِیّ''۔

ترجمہ: ''مستعمل الفاظ میں (جو طلاق کے قائم مقام ہیں): مجھے طلاق لازم ہے، حرام مجھے لازم ہے، مجھ پر طلاق، مجھ پر حرام، تو عرف کی وجہ سے نیت کے بغیر طلاق واقع ہوجائے گی، اگر اس کی بیوی نہ ہو تو یہ یمین (قسم) ہوگی اور قسم توڑنے کی صورت میں وہ کفارہ ادا کرے گا بحوالہ: ''تصحیح القدوری''۔ (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 9، ص: 168، دمشق)

مذکورہ شخص نے تین طلاق کو اس حویلی میں بدستور رہنے کے ساتھ مشروط اور مُعلق کیا ہے، کیونکہ ''اگر میں اس حویلی میں رہا'' کا مستفاد یہ ہے کہ اگر میں نے اب یہاں مستقل سکونت جاری رکھی تو میری بیوی پر تین طلاق، یعنی اگر وہ مستقبل میں حویلی میں اپنی سکونت باقی رکھتا ہے، تو حانث ہوجائے گا اور اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ یہ مراد نہیں ہوتا کہ اگر وہ راتوں رات فوراً نہ نکلا تو اس کی بیوی پر تین طلاق، جبکہ سوال میں بیان کی گئی صورت میں صبح ہوتے ہی وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ضروری سامان اور کپڑے لے کر روانہ ہوگیا۔ اس صورت میں اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، اس مسئلے کی نظیر درج ذیل ہے:

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''(حَلَفَ لَا یَسْکُنُ هٰذِهِ الدَّارَ أَوِالْبَیْتَ أَوِالْمَحَلَّةَ) یَعْنِی الْحَارَّةَ (فَخَرَجَ وَبَقِیَ مَتَاعُهُ وَأَهْلُهُ) حَتّٰی لَوْ بَقِیَ وَتِدٌ (حَنِثَ) وَاعْتَبَرَ مُحَمَّدٌ نَقْلَ مَا تَقُوْمُ بِهِ السُّکْنٰی، وَهُوَ أَرْفَقُ وَعَلَیْهِ الْفَتْوٰی، قَالَهُ ''الْعَیْنِیُّ''۔

ترجمہ: ''اس نے قسم کھائی: وہ اس مکان یا محلے میں نہیں رہے گا، وہ خود نکل گیا، اس کا سامان اور اس کے اہل وہاں رہ گئے، یہاں تک کہ اگر ایک کیل بھی باقی رہ گئی تو وہ حانث ہوجائے گا، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان چیزوں کے منتقل کرنے کا اعتبار کیا ہے، جن کے ساتھ سکونت کا اہتمام ہوتا ہے، یہ قول زیادہ نرم ہے (یعنی اس میں آسانی ہے) اسی پر فتویٰ ہے، یہ ''علامہ عینی'' کا قول ہے''، مزید لکھتے ہیں:

''اِشْتَغَلَ بِطَلَبِ دَارٍ أُخْرٰی أَوْ دَابَّةٍ وَإِنْ بَقِیَ أَیَّامًا أَوْ کَانَ لَهُ أَمْتِعَةٌ کَثِیْرَةٌ فَاشْتَغَلَ بِنَقْلِهَا بِنَفْسِهِ وَإِنْ أَمْکَنَهُ أَنْ یَسْتَکْرِیَ دَابَّةً لَمْ یَحْنَثْ''۔

ترجمہ: ''دوسرے گھر کی تلاش یا سواری کی تلاش میں مشغول ہوگیا (اس کوشش میں) اگرچہ کئی دن وہاں ٹھہرا رہا یا سامان بہت زیادہ ہے اور خود ہی اس سامان کے منتقل کرنے میں مشغول ہوگیا اگرچہ یہ اس کے لیے ممکن ہو کہ سواری کرائے پر لے، وہ حانث نہیں

ہوگا"۔(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 11، ص:363-362، دمشق)

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"هُوَالصَّحِيحُ لِاَنَّ طَلَبَ الْمَنْزِلِ مِنْ عَمَلِ النَّقْلَةِ فَصَارَ مُدَّةُ الطَّلَبِ مُسْتَثْنًى إِذَا لَمْ يُفَرِّطْ فِي الطَّلَبِ "فَتْحٌ""۔

ترجمہ: "یہی قول صحیح ہے، اس لیے کہ مکان تلاش کرنا منتقل ہونے کا عمل ہے، پس مکان تلاش کرنے کی مدت مُستثنیٰ ہوگی، جبکہ وہ مکان تلاش کرنے میں کوتاہی نہ کرے، بحوالہ: "فتح القدیر"، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 11، ص:363-362، دمشق)"۔ یہاں تو صبح ہی چلا گیا اور اس کے بعد اس حویلی میں نہیں گیا، تو حانث نہیں ہوا اور اس کی بیوی بدستور اس کے نکاح میں ہے، البتہ اس کے بعد اگر وہ واپس اس گھر میں چلا گیا تو شرط کے پائے جانے کے سبب بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ اگر وہ دوبارہ اس حویلی میں جا کر رہنا چاہتا ہے تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ بیوی کو ایک طلاق رجعی دیدے، عدت کے دوران رجوع نہ کرے، عدت گزرنے کے بعد وہ بائن ہوجائے گی۔ وہ دونوں وہاں جا کر الگ الگ کمروں میں رہ لیں، پھر آپس میں نیا مہر مقرر کر کے عقدِ ثانی کر لیں۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"فَحِيلَةُ مَنْ عَلَّقَ الثَّلَاثَ بِدُخُولِ الدَّارِ أَنْ يُطَلِّقَهَا وَاحِدَةً ثُمَّ بَعْدَ الْعِدَّةِ تَدْخُلُهَا فَتَنْحَلُّ الْيَمِينُ فَيَنْكِحُهَا"۔

ترجمہ: "جس آدمی نے گھر میں داخل ہونے کو تین طلاقوں کے ساتھ معلق کیا، اس کا حیلہ یہ ہے کہ اسے ایک طلاق دیدے، پھر عدت کے بعد وہ گھر میں داخل ہو تو قسم ختم ہوجائے گی، پھر شوہر اس سے نکاح کر لے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 9، ص:485، دمشق)"۔

## طلاقِ صریح

**سوال:**

ایک مسلم نوجوان کی ایک مسلمان خاتون کے ساتھ ایک سال قبل شادی ہوئی، دونوں

اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، وہ امریکہ آئے اور آٹھ ماہ سے شمالی امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ پھر بدقسمتی سے ان کے آپس میں اختلافات اور جھگڑے شروع ہوگئے اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ شوہر نے دو ہفتے بیوی کو مار پیٹ کی، خراشیں بھی آئیں، دونوں باقاعدہ نمازی ہیں۔ بیوی نے شوہر سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور اس نے طلاق کا مطالبہ کیا، لیکن وہ دل سے طلاق نہیں چاہتی تھی، وہ صرف شوہر کا متشددانہ رویہ بدلنا چاہتی تھی۔ ان میں پھر ایک بات پر جھگڑا ہوا۔ شوہر رات بھر سو نہ سکا، شوہر اتنا بیزار و پریشان ہوا کہ اس نے فجر کے بعد بیوی سے تین بار کہا: ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں''۔ کچھ دیر اس کمرے میں چکر کاٹنے کے بعد اس نے پھر تین بار یہی کلمات دہرائے۔ عورت خاموش رہی، لیکن شوہر نے سہ بارہ یہی کلمات دہرائے۔

اب وہ دونوں پشیمان ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ آیا ان کے درمیان طلاق واقع ہو چکی ہے۔ شوہر قرآن پر قسم کھا کر کہتا ہے کہ اسے بالکل یاد نہیں کہ اس نے طلاق کے کلمات کہے ہیں۔ وہ بیوی کے لیے ناشتہ بھی تیار کر کے لایا مگر اس نے نہیں کھایا۔ ان کا امریکہ میں کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا طلاق واقع ہوگئی ہے جبکہ وہ غصے کی کیفیت میں تھا اور اس کی طلاق دینے کی نیت بھی نہیں تھی اور وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے طلاق یاد نہیں ہے، جبکہ بیوی کہتی ہے کہ اس نے طلاق دی ہے، (معرفت: ڈاکٹر خالد اعوان، امریکہ)۔

**جواب:**

مفتی کو غیب کا علم نہیں بلکہ فریقین کے بیان کردہ احوال کی روشنی میں شرعی حکم بیان کرنا مفتی کا کام ہے۔ اُن کے سچا یا جھوٹا ہونے کا فیصلہ اُن کے اور رب کے درمیان کا معاملہ ہے چنانچہ اگر کوئی فریق غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، تو اُس کا وبال خود اُس پر ہے۔ اسی طرح اگر کسی گواہ نے جھوٹا بیان دیا ہے، تو عنداللہ وہ بھی گنہگار ہے۔

طلاقِ صریح میں نیت کی ضرورت نہیں، علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر فرغانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"فَالصَّرِیْحُ قَوْلُهٗ أَنْتِ طَالِقٌ، وَمُطَلَّقَةٌ، وَطَلَّقْتُكِ فَهٰذَا يَقَعُ بِهِ الطَّلَاقُ الرَّجْعِيُّ، لِأَنَّ هٰذِهِ الْأَلْفَاظَ تُسْتَعْمَلُ فِي الطَّلَاقِ، وَلَا تُسْتَعْمَلُ فِي غَيْرِهٖ، فَكَانَ صَرِيْحًا۔۔۔ وَلَا يَفْتَقِرُ إِلَى النِّيَّةِ، لِأَنَّهٗ صَرِيْحٌ فِيْهِ لِغَلَبَةِ الْإِسْتِعْمَالِ"۔

ترجمہ: "پس صریح (طلاق کے الفاظ یہ ہیں): تجھے طلاق ہے، تو مُطلّقہ ہے اور میں نے تجھے طلاق دی، اِن کلمات سے طلاق رجعی واقع ہوجائے گی، اِس لئے کہ یہ الفاظ طلاق ہی میں استعمال ہوتے ہیں اور طلاق کے غیر میں استعمال نہیں کیے جاتے، پس یہ صریح ہیں اور نیت کی ضرورت نہیں ہے، اِس لئے کہ کثرتِ استعمال کے سبب یہ صریح ہے"۔

(ہدایہ، جلد 3، ص: 143)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"(صَرِيْحُهٗ مَالَمْ يُسْتَعْمَلْ إِلَّا فِيْهِ) وَلَوْ بِالْفَارِسِيَّةِ"۔

ترجمہ: "صریح وہ (الفاظ) ہیں جو طلاق کے علاوہ دوسرے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتے، اگر چہ وہ فارسی میں ہوں"۔ علامہ ابن عابدین شامی اِس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"فَمَا لَا يُسْتَعْمَلُ فِيْهَا إِلَّا فِي الطَّلَاقِ فَهُوَ صَرِيْحٌ يَقَعُ بِلَا نِيَّةٍ"۔

ترجمہ: "پس وہ الفاظ جو طلاق کے علاوہ (کسی اور معنیٰ) میں استعمال نہیں ہوتے، وہ صریح ہیں اور اُن سے نیت کے بغیر بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے"۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 4، ص: 337)

آپ کے بیان کے مطابق مذکورہ شخص نے غصے میں طلاق دی ہے، طلاق غصے ہی میں دی جاتی ہے ایسی حالت نہیں تھی جس میں عقل زائل ہوگئی ہو اور یہ پتا نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں:

"غصہ مانعِ وقوعِ طلاق نہیں بلکہ وہی طلاق پر حامل ہوتا ہے، تو اُسے مانع قرار دینا گویا حکمِ طلاق کا راساً (سِرے سے) ابطال (باطل قرار دینا) ہے، ہاں! اگر شدّتِ غیظ وجوشِ

غضب اس حد کو پہنچ جائے کہ اس سے عقل زائل ہو جائے، خبر نہ رہے کہ کیا کہتا ہوں، زبان سے کیا نکلتا ہے، تو بیشک ایسی حالت کی طلاق ہرگز واقع نہ ہوگی''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 12، ص:383)

ائمہ و مشائخ عظام نے تصریح فرمائی ہے کہ غصہ ارادۂ طلاق کی علامت ہے، ملک العلماء علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَحَالُ الْغَضَبِ وَمُذَاکَرَۃُ الطَّلَاقِ دَلِیْلُ اِرَادَۃِ الطَّلَاقِ ظَاھِرًا، فَلَا یُصَدَّقُ فِی الصَّرْفِ عَنِ الظَّاھِرِ''۔

ترجمہ: ''غصہ کی حالت اور مذاکرۂ طلاق ظاہری طور پر طلاق کے ارادہ پر دلیل ہوتے ہیں، لہٰذا طلاق کے کلمات بولنے کے بعد اگر شوہر کلام کی ظاہری معنی کے خلاف مراد بیان کرے، تو اُس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، (بدائع الصنائع، جلد 3، ص:149)''۔

صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''آج کل اکثر لوگ طلاق دے بیٹھتے ہیں، بعد کو افسوس کرتے اور طرح طرح کے حیلہ سے یہ فتویٰ لیا چاہتے ہیں کہ طلاق واقع نہ ہو۔ ایک عذر اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ غصہ میں طلاق دی تھی، مفتی کو چاہیے کہ یہ امر ملحوظ رکھے کہ مطلقاً غصہ کا اعتبار نہیں، معمولی غصہ میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ صورت کہ عقل غصہ سے جاتی رہے، بہت نادر ہے، لہٰذا جب تک اس کا ثبوت نہ ہو محض سائل کے کہہ دینے پر اعتماد نہ کرے (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:113)''۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''طلاق اکثر غصے ہی میں ہوتی ہے اور غصہ میں جو طلاق دی جاتی ہے، واقع ہوتی ہے، مگر جب کہ غصہ اِس حد کا ہو کہ عقل تکلیفی زائل ہو جائے کہ غصہ کی شدت میں مجنون اور پاگل کی طرح ہو جائے کہ اسے کچھ امتیاز ہی باقی نہ رہے، جو کچھ کہے اُس کا علم نہ رہے کہ کیا کہتا ہے تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی، مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر واقع میں اس حد کا غصہ نہ ہوا اور لوگوں پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ مجھے بالکل خبر نہیں کہ کیا کہا تو اپنے اس جھوٹے بیان سے

مؤاخذہ اُخروی سے بری نہ ہوگا۔ اور وہ بیان طلاق کو عنداللہ منع نہ کرے گا اور اگر معمولی غصہ تھا تو جتنی طلاقیں دی ہیں، واقع ہیں، (فتاویٰ امجدیہ دوم، ص: 197)''۔

اس ساری تفصیل کے بعد مذکورہ سوال کے مندرجات کی روشنی میں اب دونوں پشیمان ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ آیا ان کے درمیان طلاق واقع ہو چکی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ طلاق واقع ہو چکی ہے اور عورت، مرد پر حُرمتِ مُغلظہ کے ساتھ حرام ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے بعد شوہر نے اپنا رُخ تبدیل کرتے ہوئے یہ کہا کہ وہ ''قرآن پر قسم کھا کر کہتا ہے کہ اسے بالکل یاد نہیں کہ اس نے طلاق کے کلمات کہے ہیں''، نیز اس نے یہ کہا کہ ''اس کی طلاق دینے کی نیت بھی نہیں تھی'' ان الفاظ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ''فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَامَ تَحْتَ الْمِیْزَابِ'' (بارش سے بھاگ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا)، شوہر یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ غصہ اس درجے کا تھا کہ اس کی عقل زائل ہو گئی تھی، اور ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، لہٰذا عدمِ وقوعِ طلاق کا فتویٰ صادر کیا جائے۔

آپ کے بیان کے مطابق شوہر نے قسم کھا کر یہ کہا: ''مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے طلاق کے کلمات کہے ہیں''، ان قسمیہ کلمات میں اس نے اپنی یادداشت کی نفی کی ہے، اس میں نفی واثبات دونوں کی گنجائش موجود ہے، نیز اس نے یہ کہا: ''میری طلاق دینے کی نیت بھی نہیں تھی''، اس میں ایک طرف وہ اپنی یادداشت کی نفی کر رہا ہے اور دوسری طرف تاکید کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ میری طلاق دینے کی نیت بھی نہیں تھی، اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذاکرۂ طلاق موجود تھا اور طلاقِ صریح کے لیے نیت کا ہونا ضروری نہیں، مزید یہ کہ نیت کی نفی کرنا بالواسطہ طلاق کا اقرار ہے، اگر کلمہ طلاق کہا ہی نہیں تو نیت کا انکار کیونکر متصور ہوگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شوہر حیلے بہانے سے کام لیتے ہوئے طلاق دینے کے باوجود غصے کو زوالِ عقل کی آڑ بنا کر چاہتا ہے کہ حرام حلال ہو جائے۔ لہٰذا چونکہ شرعی گواہی موجود نہیں ہے اور عورت کو یقین ہے کہ شوہر نے اُسے تین طلاقیں دی ہیں، تو وہ شوہر کو اپنے اوپر قابو نہ دے اور جس طرح بھی بن پڑے، اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔

## بیوی شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی

### سوال:

میرے شوہر نے مجھے نکاح کے بعد طلاق کا حق دے رکھا ہے، جس کے بعد ایک موقع پر میں نے اپنے شوہر کے فون پر SMS کیا: ''میں تمہیں طلاق دیتی ہوں، طلاق دیتی ہوں، طلاق دیتی ہوں''، کیا اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے؟، (طیبہ یاسمین، گجرات)۔

### جواب:

شریعت کا منشا یہ ہے کہ زوجین خوشگوار ازدواجی زندگی گزاریں، لیکن اگر کبھی حالات نامساعد ہوجائیں اور زوجین کا اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے رشتۂ نکاح کو جاری رکھنا دشوار ہوجائے اور نباہ کی کوئی صورت نہ بن سکے تو شوہر کو یہ حکم ہے کہ ''تَسْرِیْحٌ بِإِحْسَانٍ'' کرتے ہوئے طلاق دے کر بیوی کو اپنی زوجیت سے علیحدہ کردے۔ شوہر کو طلاق کا اختیار اس لیے دیا تاکہ طلاق کم سے کم واقع ہو کیونکہ عورت فطری طور پر جلدباز ہوتی ہے اور بسا اوقات بغیر سوچے کوئی فیصلہ کرلیتی ہے اور بعد میں اسے افسوس ہوتا ہے، اس کے مقابل مرد نتیجے پر بھی غور کرتا ہے۔

شوہر کی طرف سے تفویض کیے جانے پر بیوی کو طلاق کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے، لیکن اس اختیار کی صورت میں وہ خود پر طلاق واقع کرے گی، شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی، جبکہ آپ نے سوال میں جو صورت درج کی ہے، اس کے مطابق بیوی نے شوہر کو تین بار کہا: ''میں تمہیں طلاق دیتی ہوں''، اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلِهٰذَا لَوْ مَلَّكَهَا الطَّلَاقَ فَطَلَّقَتْهُ لَا يَقَعُ ''بَحْرٌ''۔

ترجمہ: ''اگر مرد نے عورت کو طلاق کا مالک بنایا، عورت نے مرد کو طلاق دے دی، تو طلاق واقع نہیں ہوگی بحوالہ: ''البحر الرائق''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 9، ص: 230، دمشق)

نیز تفویضِ طلاق کا حق استعمال کرنے سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ تفویض شرعی شرائط کے مطابق ہے اور شوہر کی طرف سے تفویضِ طلاق کا حق دائمی ہے، نیز شوہر نے کتنی طلاق کا حق تفویض کیا ہے۔ اس کے کلمات فقہائے کرام نے یہ بتائے ہیں کہ شوہر نکاح منعقد ہونے (یعنی ایجاب وقبول) کے بعد بیوی سے کہے: ''تم جب کبھی بھی چاہو اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہو''۔ ان الفاظ سے صرف ایک طلاق کا حق عورت کو حاصل ہوگا، جب تک تین طلاق کی صراحت نہ ہو۔ اسی طرح ایجاب وقبول اور نکاح منعقد ہونے سے پہلے جو نکاح نامے کے کالم میں لکھ دیا جاتا ہے: ''شوہر نے طلاق کا حق بیوی کو تفویض کر دیا ہے''، یہ شرعاً غیر مؤثر ہے، کیونکہ ایجاب وقبول اور انعقادِ نکاح سے پہلے وہ عورت اس کی بیوی بنی ہی نہیں اور خود اس کو (نکاح سے پہلے) اُس وقت طلاق کا اختیار نہیں ہوتا تو وہ یہ حق بیوی کو کیسے تفویض کر سکتا ہے، کیونکہ خود شوہر کو یہ حق نکاح منعقد ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے، اس پر ہم تفصیلی طور پر لکھ چکے ہیں۔ آپ کے سوال میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ شوہر نے تین طلاقوں کا حق تفویض کیا ہے، جو الفاظ سوال میں مذکور ہیں ان کے مطابق تو صرف ایک طلاق کا حق تفویض کیا گیا ہے، اس لیے آپ کو تین طلاق کا حق حاصل ہی نہیں ہے اور ایک طلاق کا حق بھی اس صورت میں کہ تفویضِ طلاق شریعت کے مطابق ہوئی ہو، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آپ کا نکاح بدستور قائم ہے۔

# وراثت کے مسائل

## ترکے کا ایک مسئلہ

**سوال:**

ایک شخص کا انتقال ہوا ہے، اس کے ورثاء میں دو بیٹے، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ ہیں، اس نے ترکے میں ستر لاکھ روپے مالیت کا ایک مکان چھوڑا ہے، اس کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا، (مدثر حسین نقشبندی قادری، امام ومدرس مسجد نور الہدی، برانکس، نیو یارک)۔

**جواب:**

ازروئے شرع کسی بھی وفات یافتہ شخص کے ترکے کو تقسیم کرنے سے قبل تین قسم کے مصارف وضع کیے جاتے ہیں: (۱) مصارف تکفین وتدفین (2) متوفّٰی کے ذمہ اگر کسی کا قرض ہو، تو اس کی ادائیگی (3) اگر متوفی نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ تہائی ترکے کی حد تک اس وصیت کا نفاذ، بشرطیکہ یہ وصیت کسی شرعی وارث کے حق میں نہ ہو۔ یہ تین امور تقسیمِ وراثت سے مقدم ہوتے ہیں، ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں برصدقِ بیان سائل اگر ورثاء وہی ہیں جو سوال میں مذکور ہیں، تو مُتوفّٰی شخص کا کل ترکہ 8 حصوں میں منقسم ہوگا، ان میں سے بیوہ کو ایک حصہ، دونوں بیٹوں کو 4 حصے (فی کس دو حصے) اور تین بیٹیوں کو 3 حصے (فی کس ایک ایک حصہ) ملیں گے۔

## اسلامی قانونِ وراثت اِجباری ہے

**سوال:**

اگر میرے دادا نے وراثت میں زمین چھوڑی ہو اور میرے والد کو پتا نہ ہو یا دلچسپی نہ ہو اور میرے والد کے انتقال کے بعد میرے بھائیوں کو معلوم ہوجاتا ہے کہ میرے دادا نے وراثت میں زمین چھوڑی تھی، میرے بھائی اس زمین کو آباد کر دیتے ہیں۔ زمین کو آباد کرنے کے دوران کوئی دوسرا فریق میرے بھائیوں پر عدالت میں کیس کر دیتا ہے کہ یہ

زمین ہماری قوم نے آپ کے دادا کو نہیں دی تھی، لیکن وہ کیس میرے بھائی جیت جاتے ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس زمین میں میرا بھی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ وہ مجھے میرا حصہ نہیں دیتے اور کہتے ہیں: ہمارے معاشرے میں بہنوں کو کسی نے بھی زمین نہیں دی ہے، (ایک مظلوم خاتون)۔

**جواب:**

آپ کے والد کا ترکہ اُن کے تمام شرعی ورثاء کے درمیان اسلامی قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہوگا، کسی بھی وارث کے حصے کو روکنا اور نہ دینا ظلم اور غصب ہے۔ آپ کے بھائیوں کی یہ سوچ بھی جہالت پر مبنی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بہنوں کو کسی نے بھی زمین نہیں دی ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ النساء آیات: 10، 11 اور 176 میں اَحکام وراثت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ فقہِ اسلامی میں علم المیراث ایک مستقل فن ہے، جسے نصف علم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وراثت کی تقسیم اجباری ہے، اس میں کسی کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے اور قرآن کا صریح حکم ہے: ترجمہ: '' (وراثت میں) مرد کا حصہ دو (عورتوں) کے برابر ہے، (النساء: 11)''، یعنی ترکے میں بیٹے کا حصہ بیٹی سے دگنا ہوگا۔ علاقائی یا برادری کی رسوم اگر شریعت کے خلاف ہیں تو اُنہیں رد کر دیا جائے، حکومت پر بھی لازم ہے کہ وہ وفات پانے والے افراد کی زرعی زمین اور منقولہ جائیداد کی ورثاء کے نام منتقلی کے لیے اسلامی قانونِ وراثت کے نفاذ کو یقینی بنائے اور محکمۂ مال کا جو متعلقہ افسر اس کی خلاف ورزی کرے، اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

## وصیت میں زیادتی یا خلاف شرع بات کی اصلاح کی جاسکتی ہے

**سوال:**

جب کوئی وصیت کرتا ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت پر اسی طرح عمل کرنا ہوگا یا اس میں کوئی تبدیلی جائز ہے جیسے قبر والی جگہ کا معاملہ ہے، اگر ورثاء پاکستان لے جانا چاہیں تو کیا حکم ہے، اگرچہ ان تمام باتوں کا علم وصیت کرنے والے کو ہے یا نہیں، اس سلسلے

میں کیا حکم ہے؟، (مولانا عرفان مدنی، انگلینڈ)۔

**جواب:**

شریعت میں وصیت کرنے کا مطلب بطورِ احسان کسی کو اپنے مرنے کے بعد اپنے مال یا کسی منفعت کا مالک بنانا ہے، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اَلْاِیْصَاءُ فِی الشَّرْعِ تَمْلِیْكٌ مُضَافٌ إِلٰی مَا بَعْدَ الْمَوْتِ یَعْنِیْ بِطَرِیْقِ التَّبَرُّعِ سَوَاءٌ کَانَ عَیْنًا أَوْ مَنْفَعَةً، کَذَا فِی "التَّبْیِیْنِ"۔

ترجمہ: "شریعت میں "اِیصاء" یعنی وصیت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مرنے کے بعد کسی کو تبرُّع (فضل واحسان) کے طور پر اپنے مال یا کسی منفعت کا مالک بنانا، "تبیین" میں بھی اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص: 90)"۔

فلاں شخص میرا جنازہ نہ پڑھے یا فلاں میرا جنازہ پڑھائے یا کسی خاص جگہ دفن کرنے کی وصیت کرنا باطل ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أَوْصٰی بِأَنْ یُّدْفَنَ فِیْ دَارِہٖ فَوَصِیَّتُهٗ بَاطِلَةٌ إِلَّا أَنْ یُّوْصِیَ أَنْ یُّجْعَلَ دَارُہٗ مَقْبَرَةً لِّلْمُسْلِمِیْنَ، وَفِیْ "الْفَتَاوٰی" وَ "الْخُلَاصَةِ": وَلَوْ أَوْصٰی أَنْ یُّدْفَنَ فِیْ بَیْتِهٖ لَا یَصِحُّ وَیُدْفَنَ فِیْ مَقَابِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَلَوْ أَوْصٰی بِأَنْ یُّصَلِّیَ عَلَیْهِ فَلَانٌ، فَقَدْ ذَکَرَ فِیْ "الْعُیُوْنِ": أَنَّ الْوَصِیَّةَ بَاطِلَةٌ وَفِیْ "الْفَتَاوٰی" وَ "الْخُلَاصَةِ": وَھُوَ لَا یَصِحُّ"۔

ترجمہ: "(کسی نے) وصیت کی کہ مجھے میرے گھر میں دفن کیا جائے، تو یہ وصیت باطل ہے، البتہ اگر وہ وصیت کرے کہ اس کے گھر کو مسلمانوں کا قبرستان بنادیا جائے (تو یہ وصیت درست ہے)، "فتاویٰ" اور "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے: اور اگر (کسی نے) وصیت کی کہ اسے اس کے گھر میں دفن کیا جائے تو یہ وصیت صحیح نہیں ہے، اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور اگر (کسی نے) وصیت کی: میرا جنازہ فلاں شخص پڑھائے، تو "عیون البصائر" میں بیان کیا ہے: یہ وصیت باطل ہے، اور "فتاویٰ" اور "خلاصۃ الفتاویٰ" میں ہے:

یہ وصیت صحیح نہیں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 6، ص:95)''۔

اگر میت نے وصیت میں کوئی خطا کی یا کسی وارث کے حق میں ظلم کیا تو ولی یا وصی اُس وصیت میں تصحیح کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ''۔

ترجمہ: ''پھر جس کو وصیت کرنے والے سے بے انصافی یا گناہ کا خوف ہو، پس وہ اُن کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے، (البقرہ:182)''۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والا وصیت کرتے ہوئے کسی زیادتی یا گناہ کا ارتکاب کرے، تو اُسے اصلاح پر آمادہ کرنا چاہیے۔

تفسیر معالم التنزیل میں ہے:

''إِذَا أَخْطَأَ الْمَيِّتُ فِي وَصِيَّتِهٖ أَوْ جَارَ مُتَعَمِّدًا، فَلَا حَرَجَ عَلٰی وَلِيِّهٖ أَوْ وَصِيِّهٖ أَوْ وَالِي أُمُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ أَنْ يُّصْلِحَ بَعْدَ مَوْتِهٖ بَيْنَ وَرَثَتِهٖ وَبَيْنَ الْمُوْصٰی لَهُمْ، وَيَرُدُّ الْوَصِيَّةَ إِلَی الْعَدْلِ وَالْحَقِّ (فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ)، أَيْ: لَا حَرَجَ عَلَيْهِ''۔

ترجمہ: ''جب میت نے وصیت میں خطا کی یا جان بوجھ کر ظلم کیا اور ولی یا وصی یا مسلمانوں کا حاکم اس کی موت کے بعد اُس کے وارثوں اور مُوصیٰ لہم (جن کے حق میں وصیت کی گئی ہے)، کے درمیان صلح کرادے تو اُن پر کوئی حرج نہیں ہے اور وصیت کو عدل وحق کی طرف لوٹا دیا جائے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں یعنی کوئی حرج نہیں ہے، (جلد 1، ص:65)''۔

اگر کوئی شخص کسی وارث کو محروم کردے یا کسی شخص کے لیے اس قدر زیادہ وصیت کرے جس سے دوسرے حق داروں کے حصوں میں کمی ہو تو وہ شخص گنہگار ہوگا، حدیث پاک میں ہے:

''إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ''۔

ترجمہ: ''ایک مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے رہتے ہیں، پھر ان کو موت آجاتی ہے اور وہ وصیت میں (کسی کو) ضرر پہنچاتے ہیں تو ان کے لیے دوزخ واجب ہو جاتی ہے، (سُنن ابوداؤد:2868)''۔

علامہ ابوالحیان اندلسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اَیْ عَلِمَ بَعْدَ مَوْتِ الْمُوْصِیْ اَنَّ الْمُوْصِیَ حَافَ وَجَنَفَ وَتَعَمَّدَ اِذَایَةَ بَعْضِ وَرَثَتِهٖ، فَاَصْلَحَ مَا وَقَعَ بَیْنَ الْوَرَثَةِ مِنَ الْاِضْطِرَابِ وَالشِّقَاقِ، فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ، وَقَالَ عَطَاءٌ: الْمَعْنٰی: ''فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا'' فِیْ عَطِیَّتِهٖ لِوَرَثَتِهٖ عِنْدَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ، فَاَعْطٰی بَعْضًا دُوْنَ بَعْضٍ، فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ اَنْ یُّصْلِحَ بَیْنَ وَرَثَتِهٖ فِیْ ذٰلِكَ''۔

ترجمہ: ''موصی (وصیت کرنے والے) کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے اپنی وصیت کے ذریعے کسی پر ظلم کیا ہے اور وارثوں میں سے دانستہ بعض کو اذیت پہنچائی ہے اور وارثوں کے درمیان جو اضطراب اور اختلاف پیدا ہوگیا تھا، اُس نے اس کی اصلاح کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور عطاء نے کہا: پس جس کو اپنی موت کے وقت اپنے وارثوں کے لیے وصیت کرنے والے کی طرف سے عطیہ دینے میں بے انصافی یا گناہ کا خوف ہو کہ بعض کو دے اور بعض کو نہ دے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اس کے وارثوں کے درمیان اصلاح کرادے، (البحر المحیط، البقرہ:182)''۔

میت کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل کرنا نہ شریعت کا حکم ہے اور نہ شریعت کی نظر میں یہ شعار پسندیدہ ہے، یہ لوگوں کی اپنی خواہشات یا خاندانی روایات ہیں، جن کو وہ ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بالفرض اگر کوئی برطانیہ میں مقیم ہے اور مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ اس کی میت پاکستان لے جاکر اس کے آبائی قبرستان میں دفن کی جائے، تو ایسی وصیت پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔

## قاتل، مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا

**سوال:**

ملک غلام محمد کو اس کے چھوٹے بیٹے ملک عماد نے اس کی جائیداد اپنے نام کروانے کے لیے ڈنڈوں اور لاتوں سے مارا، جسم کی ساری ہڈیاں توڑ دیں، 88 سالہ ملک غلام محمد نے دم توڑ دیا، کیا ملک عماد کو اُس کے والد ملک غلام محمد کے ترکے سے حصہ ملے گا؟

(ملک محمد نصر، کوئٹہ)

**جواب:**

اگر آپ کا بیان درست ہے کہ ملک عماد نے اپنے والد ملک غلام محمد کو قتل کیا ہے تو اُسے ترکے سے حصہ نہیں ملے گا کیونکہ قاتل اپنے مقتول کی وراثت سے محروم رہتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلْقَاتِلُ لَا یَرِثُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قاتل وارث نہیں ہوتا ہے، (سُنن ترمذی:2109)''۔

امام سراج الدین محمد بن عبدالرشید سجاوندی حنفی نے وراثت سے محرومی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا: ''وَالْقَتْلُ الَّذِیْ یَتَعَلَّقُ بِهٖ وُجُوْبُ الْقِصَاصِ أَوِالْکَفَّارَةِ''۔

ترجمہ: ''وہ قتل مقتول کی وراثت سے محرومی کا سبب بنتا ہے، جس کے نتیجے میں (سزا کے طور پر) قصاص یا (قتلِ خطا کی صورت میں) کفارہ واجب ہوتا ہے، (سراجی، ص:12)''۔

## ترکے کا ایک مسئلہ

**سوال:**

میرے والد محترم کی ایک صابن فیکٹری تھی، 1998ء میں والد نے فیکٹری کی تمام مشینری، میٹریل، 2 دکانیں اور پانچ گاڑیاں اپنے پانچوں بیٹوں کو ہبہ کر دیں۔ ہر شے میں برابر برابر تمیز کر دی، جو چیزیں نام ہوسکتی تھیں، نام پر کر دیں اور باقی چیزوں کا قبضہ دے دیا

اور خود لاتعلق ہوگئے، اس وقت تین بھائی بالغ اور دو بھائی نابالغ تھے، ان کا قبضہ بھی بڑے بھائیوں کو دے دیا۔ اس کے علاوہ ستر لاکھ روپے جو والد صاحب کے بینک اکاؤنٹ میں تھے، دو بھائیوں کے نام اکاؤنٹ کھلوایا، کیونکہ یہ دونوں بھائی ہی کاروبار سنبھالتے تھے، اگر نابالغ بیٹوں کے نام کراتے تو کاروبار میں پیسہ لگانے میں دشواری ہوتی۔ کاروبار علیحدہ کرانے کی صورت میں کسی ایک بیٹے کے پاس بھی اتنا سرمایہ نہ ہوتا کہ ہر بیٹا علیحدہ سے کاروبار چلا سکے۔ فیکٹری کی زمین، عمارت اور رہائشی مکان کے بارے میں والد صاحب نے واضح کر دیا کہ یہ میری ملکیت ہے اور میرے بعد ورثاء کا حق ہوگا۔ 2002ء میں والد صاحب فوت ہوگئے، ورثاء میں دو بیوائیں، پانچ بیٹے اور نو بیٹیاں چھوڑے۔ ترکے میں سے بھائیوں نے ہر بہن کو دس لاکھ روپے دیئے، معلوم یہ کرنا ہے کہ جو چیزیں والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہبہ کیں، کیا اس میں ہم بہنوں کا حصہ بنتا ہے اور کیا والد صاحب فیکٹری کی جگہ اپنے نام رکھ کر بقیہ کاروبار ہبہ کر سکتے ہیں۔ کاروبار پر بھائیوں کا پہلے سے قبضہ تھا، اس وقت بھی تمام بھائی مل کر کاروبار چلا رہے ہیں، (بلال، ڈیرہ اسماعیل خان)۔

**جواب:**

سائل بلال صاحب، جن کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے، کا استفتاء محکمۂ اوقاف سندھ کے مفتی منیر احمد طارق صاحب نے مجھے رائے دینے کے لیے ارسال کیا ہے، یہ فتویٰ 1431ھ سے گردش میں ہے اور چھ اداروں کے مراکزِ افتاء کے جوابات منسلک ہیں، لیکن حیرت ہے کہ کسی فتوے میں تمام سوالوں کے جوابات نہیں ہیں۔ بحیثیت مجموعی جامعہ امدادیہ کا فتویٰ نسبتاً زیادہ واضح ہے۔

دارالعلوم کراچی کے فتوے میں لکھا ہے:

''جہاں تک سوال میں ذکر کردہ ستر لاکھ روپے کے گفٹ کا تعلق ہے، تو اگر یہ رقم فیکٹری کے اثاثوں میں شامل تھی، جیسا کہ سوال سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں فیکٹری کے ہبہ کے ساتھ اس کا ہبہ بھی درست ہوگیا، پانچوں بھائی اس رقم کے مساوی طور پر شریک

ہو گئے، اگرچہ قانونی مجبوری کی وجہ سے اکاؤنٹ دو بھائیوں کے نام کھولا گیا ہو، اب یہ رقم بھی والد صاحب مرحوم کی وراثت میں تقسیم نہیں ہوگی''۔ غالباً اسی کی متابعت میں دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب نے لکھا: ''فیکٹری اور اس کے اثاثے کی صحتِ ہبہ کی بات درست ہے، البتہ والد کے اکاؤنٹ کی رقم کو فیکٹری کا اثاثہ قرار دینے میں تَرَدُّد ہے، ہاں اگر وہ رقم فیکٹری کے ورکنگ کیپٹل کی ہو تو اثاثہ بلاتَرَدُّد ہوسکتا ہے، لیکن رقم فیکٹری کے ورکنگ کیپٹل کی ہے، یہ امر محتاجِ ثبوت رہے گا''۔

ہمیں جو استفتاء دیا گیا ہے، اس میں فیکٹری کی مشینری اور دیگر ساز وسامان کی بابت لکھا ہے: ''لیکن ہر شے میں ہر بھائی کے حصے کی تمیز کردی (آگے اس کی تفصیل درج ہے)''، اسی طرح نقد رقم کے بارے میں لکھا ہے:

''اس کے علاوہ ستر لاکھ روپے کا بینک اکاؤنٹ، جو کہ والد صاحب کے نام پر تھا، اپنے نام سے اکاؤنٹ سے خارج کر کے ستر لاکھ روپے میں سے ہر بھائی کے حصے کی تمیز کر کے دو بھائیوں کے نام مشترکہ اکاؤنٹ کھلوایا، یعنی والد صاحب نے رقم کا بھی ہبہ کیا (آگے دو بھائیوں کے نام اکاؤنٹ کھلوانے کی وجہ لکھی ہے)''۔ غرض کہ کارخانے اور نقد رقم دونوں میں ''ہر بھائی کے حصے کی تمیز (یعنی علیحدہ نام بہ نام تعین) کے الفاظ لکھے ہیں اور بادی النظر میں بڑے بھائیوں کو دو نابالغ بھائیوں کا وکیل بھی بنا دیا، سو وہ رقم بھی باپ نے مساوی طور پر پانچوں بیٹوں کے نام ہبہ کردی، وہ اگر فیکٹری کے ورکنگ کیپٹل کا حصہ تھی، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے، تو دارالعلوم کراچی اور دارالعلوم دیوبند کے نزدیک بھی بلاتردد یہ ہبہ مؤثر ہے، لیکن اگر اس رقم کو ورکنگ کیپٹل سے الگ بھی مان لیا جائے تو اس کو بھی برابر حصص کے ساتھ پانچ بیٹوں کو ہبہ کر دیا گیا ہے اور کاروبار کے انچارج دو بڑے بھائی ان کے وکیل ہیں، جیسا کہ ''اگر مگر'' کے بغیر دارالعلوم امدادیہ کے فتویٰ میں واضح موقف اختیار کیا گیا ہے۔ جامعہ اشرفیہ کے فتویٰ میں ستر لاکھ روپے کی رقم کو بیٹوں کے نام ہبہ سے خارج کر کے ترکے میں شامل کیا گیا ہے۔

آج کل "آن لائن" رقوم کا ٹرانسفر ہوتا ہے، دست بدست قبضہ نہیں ہوتا اور اسے عملاً اور قانوناً اداشدہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں باپ نے اکاؤنٹ سے اپنا نام نکال لیا اور یہ تب ہوتا ہے کہ والد بینک سے رقم نکال کر بیٹوں کے حوالے کردے، پھر نئے دستخط کنندگان کے نام، جنہیں Authorised Signatories یا Account Holder کہا جاتا ہے، نیا اکاؤنٹ کھلتا ہے، کارخانے کے دیگر اثاثوں میں تو تمیز اور تخلیہ سے ملکیت منتقل ہوگئی اور ہبہ مکمل ہوگیا، جبکہ نقد رقم تو باپ نے بالفعل اپنے نام سے نکال کر پانچ بیٹوں کے الگ الگ حصوں کا تعین کر کے دیدی اور انتظامی وجوہ کی بنا پر دو بھائیوں کے نام اکاؤنٹ کھل گیا۔ آج کل تو بیع وشراء کے معاملات میں مبیع پر بالفعل قبضے سے پہلے کاغذات بیع وشراء کی وصولی پر قبضۂ حکمی (Constructive Possession) کو تسلیم کر کے ضامن بینک بائع کو دوسرے ملک میں ادائیگی کردیتا ہے۔

اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ باپ نے صرف پانچ بیٹوں کو ہبہ دیا ہے اور بیٹیوں کو محروم رکھا ہے، یہ ہبہ اگرچہ شرعاً اور قانوناً مؤثر ہوگیا ہے، لیکن باپ کا یہ فعل حدیث مبارک کی رُو سے ناپسندیدہ ہے، اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف فرمائے، کیونکہ زندگی میں اولاد کو ہبہ کرنے کی صورت میں بیٹوں اور بیٹیوں کو برابر دینا چاہیے۔

تمام فتاویٰ میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ کارخانے کی زمین کا ہبہ بیٹوں کے نام نہیں ہوا اور مجھے بھی اس سے اتفاق ہے، لہٰذا کارخانے کی زمین اور مکان باپ کا ترکہ ہے، جو تمام ورثاء میں قانونِ شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا۔ تقسیم وراثت کے پہلے تین ضروری امور نمٹانے کے بعد کل ترکہ 304 حصوں میں منقسم ہوگا اور ان میں سے ورثاء کے حصوں کی ترتیب حسبِ ذیل ہوگی:

دو بیواؤں کا مجموعی حصہ: 38　(فی کس 19 حصے)

پانچ بیٹوں کا مجموعی حصہ: 140　(فی کس 28 حصے)

نو بیٹیوں کا مجموعی حصہ: 126　(فی کس 14 حصے)

مزید یہ کہ بھائیوں نے شریعت کے مطابق ترکے کی تقسیم کے بغیر بہنوں کو دس لاکھ روپے فی کس دیدیے، اس میں بیواؤں کو بھی کچھ نہیں ملا۔ اصولی طور پر پہلے ترکے کی شریعت کے مطابق تقسیم ہونی چاہیے، کیونکہ ترکے کی تقسیم اجباری ہے، اختیاری نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر بعض یا تمام بالغ ورثاء اپنا پورا یا بعض حصہ بہنوں کو دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں، البتہ نابالغ ورثاء کے حصے میں یہ تصرُّف نہیں ہوسکتا۔

کاروبار مشترک ہے، اس میں سب بھائیوں کا حصہ برابر ہے اور نفع بھی برابر تقسیم ہونا چاہیے، اگر کچھ بھائی عملاً کاروبار کو سنبھال رہے ہیں یا ان کی کاروباری مہارت اور تجربہ زیادہ ہے، تو باہم بیٹھ کر نفع میں ان کا تناسب زیادہ رکھا جاسکتا ہے، لیکن وہ خدمات کی الگ سے تنخواہ یا مقررہ اضافہ نہیں لے سکتے، تاہم اس کے باوجود مالکانہ حقوق میں سب بھائیوں کا حصہ برابر رہے گا۔ دو یا تین بھائیوں کو کاروبار پر یکطرفہ مالکانہ قبضے کا حق نہیں ہے۔

## ہبہ اور ترکہ کی تقسیم

**سوال:**

والدین کا انتقال ہو چکا ہے، والد صاحب نے اپنی زندگی میں مکان اور تمام اختیارات والدہ کو دے دیئے تھے۔ مکان فروخت کر کے والدہ نے ایک فلیٹ خرید لیا تھا جو کہ سب سے چھوٹے بیٹے آصف کے نام کر دیا تھا، تمام اختیار اور قبضہ محمد آصف کے پاس ہے، باقی سب بیٹے الگ رہتے ہیں۔ بیماری سے کچھ دن پہلے والدہ نے زبانی دونوں بیٹوں سے کہہ دیا تھا کہ اس گھر کو فروخت کر کے آصف کو چھوٹا مکان دلا دو، اب اس گھر کا کیا کریں۔ والدہ کا ترکہ ساڑھے بائیس لاکھ روپے میرے پاس تھے، جو تمام ورثاء کے درمیان شرعی تناسب سے تقسیم کر دیئے ہیں، اس میں آصف کا جو حصہ ہے، وہ میرے پاس رکھا ہے۔ بڑے بھائی کا کہنا ہے کہ ساڑھے بائیس لاکھ روپے میں سے آصف کو حصہ نہیں دیں گے اور فلیٹ فروخت کر کے آصف کو چھوٹا فلیٹ دلا دیں گے اور بقیہ بچنے والی رقم سے آصف کو کچھ نہیں دیں گے۔ آصف کو کچھ دماغی تکلیف رہتی ہے، کیا فلیٹ بیچنا صحیح ہے اور آصف کے

حصے کا میں کیا کروں، (شبانہ، دستگیر، کراچی)۔

**جواب:**

ہبہ کے لیے ضروری ہے کہ موہوب لہٗ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) اُس شے موہوبہ (ہبہ کی جانے والی چیز) پر قبضہ بھی کرلے، تو ہبہ تام (مکمل) ہوجاتا ہے اور وہ شے واہب (ہبہ کرنے والے) کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، پھر وہ موہوب لہٗ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) اُس ہبہ شدہ چیز کا مالک ہے کہ جس طرح چاہے اُس میں تصرُّف کرے۔ قبضہ چاہے حقیقی طور پر ہو یا حکمی، علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ فِی التَّتَارخَانِیَۃ: قَدْ ذَکَرْنَا اَنَّ الْھِبَۃَ لَاتَتِمُّ اِلَّابِالْقَبْضِ وَالْقَبْضُ نَوْعَانِ حَقِیْقِیٌّ وَأَنَّہٗ ظَاھِرٌ، وَحُکْمِیٌّ وَذٰلِکَ بِالتَّخْلِیَۃِ''۔

ترجمہ: ''تاتارخانیہ میں ہے: ہم ذکر کرچکے ہیں کہ بے شک ہبہ قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور قبضہ کی دو قسمیں ہیں: حقیقی: وہ تو ظاہر ہے اور حکمی تو وہ تخلیہ سے ہوتا ہے، (منحۃ الخالق علی حاشیۃ بحرالرائق، جلد 7، ص: 486)''۔ تخلیہ سے مراد یہ ہے کہ ہبہ شدہ چیز کو اپنے استعمال، تصرُّف اور قبضے سے نکال دینا تاکہ جس شخص کو یہ ہبہ کی گئی ہے، وہ اس پر قبضہ کرسکے اور اس کے قبضے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہبہ میں پسندیدہ عمل تو یہ ہے کہ تمام اولاد کو مساوی دیا جائے، لیکن اگر مساوات کا لحاظ کیے بغیر کسی ایک کو دیدیا تو شرعاً ناپسندیدہ ہونے کے باوجود نافذ ہوجائے گا۔ مذکورہ فلیٹ محمد آصف کو ہبہ کردیا گیا، ان کا قبضہ ہونے کے ساتھ ہی ہبہ مکمل ہوگیا، اب وہ فلیٹ محمد آصف کی ملکیت ہے، محمد آصف کی اجازت کے بغیر نہ فروخت کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی اس میں سے حصے کا مطالبہ کرسکتا ہے، والدہ کا یہ کہنا: ''اس گھر کو فروخت کرکے آصف کو چھوٹا مکان دلادو''، محض ایک مشورہ ہے، اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔

ساڑھے بائیس لاکھ روپے جو والدہ کا ترکہ ہے، ''لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ'' (ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے حصے کے برابر ہے، النساء: 11) کے تحت ان کے بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے، جس میں محمد آصف کو بھی حصہ ملے گا۔ اس کا حصہ جو

بھائی یا بہن امانت دار اور دیانت دار ہوں انہیں کے پاس محفوظ رکھا جائے تا کہ کفایت سے محمد آصف کے مالی معاملات پر صرف کر سکیں اور اس کا تحریری ریکارڈ بھی رکھیں۔

## وراثت کا حصہ لینے کے بعد دوبارہ مطالبہ کرنا

**سوال:**

ہمارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے، ان کا ایک پلاٹ تھا، بڑے بھائی نے اس پلاٹ میں اپنا حصہ مانگا، جو مارکیٹ ویلیو کے مطابق ان کو دے دیا گیا، پلاٹ کی ویلیو بھی بڑے بھائی نے خود ہی معلوم کی تھی، حصہ لے کر بھائی نے کہا: اب میرا کوئی تعلق نہیں، تم لوگ لڑو مرو، مجھے اس معاملے میں نہیں گھسیٹنا، یہ تقریباً بارہ سال پرانی بات ہے۔ اب ہم بھائی بہنوں نے اس پلاٹ کو فروخت کرنے کا ارادہ کیا ہے، تو بڑے بھائی جو اپنا حصہ لے چکے ہیں، کہہ رہے ہیں کہ اب پلاٹ مہنگا فروخت ہوا ہے اور تم لوگوں کا حصہ زیادہ بنا ہے، لہٰذا مجھے جو فرق نکلتا ہے دیا جائے، اس بارے میں شرعی حکم بیان فرمائیں۔

(سلطانہ نبیل، کراچی)

**جواب:**

آپ کے بیان کے مطابق مذکورہ پلاٹ کی تقسیم باہمی رضامندی سے ہوئی تھی، اِس لیے اب آپ کے بڑے بھائی کا مزید حصے کا مُطالبہ درست نہیں ہے۔ جو تقسیم باہمی رضامندی سے ہو چکی ہے، وہ شرعاً مؤثر اور نافذ ہے اور مذکورہ پلاٹ سے آپ کے بھائی کو مزید کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر الفرغانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَلَوِ اخْتَلَفَا فِي التَّقْوِيمِ لَمْ يَلْتَفِتْ اِلَيْهِ، لِاَنَّهُ دَعْوَى الْغَبْنِ، وَلَا مُعْتَبَرَ بِهِ فِي الْبَيْعِ، فَكَذَا فِي الْقِسْمَةِ لِوُجُودِ التَّرَاضِيْ، اِلَّا اِذَا كَانَتِ الْقِسْمَةُ بِقَضَاءِ الْقَاضِيْ، وَالْغَبْنُ فَاحِشٌ، لِاَنَّ تَصَرُّفَهُ مُقَيَّدٌ بِالْعَدْلِ"۔

ترجمہ: "اگر دونوں (شریک) قیمت لگانے میں اختلاف کریں، تو اس کی جانب التفات

نہیں کیا جائے گا، اِس لیے کہ یہ غبن کا دعویٰ ہے اور اس کا بیع میں اعتبار نہیں کیا جاتا، اسی طرح باہمی رضامندی سے جو تقسیم ہو جائے، اس میں بھی غبن کا اعتبار نہیں ہوگا، مگر اُس صورت میں جب قاضی کے فیصلے کے تحت تقسیم ہوئی ہو اور غبن فاحش ہو (یعنی دونوں حصوں کی طے کردہ قیمت میں نمایاں فرق ہو اور ایسا لگے کہ ایک فریق کے ساتھ کھلا دھوکا ہوا ہے)، تو پھر اس تنازعے پر توجہ دینا ہوگی، کیونکہ قاضی کے تصرُّف کے لیے عدل کی قید ہے"۔ مزید لکھتے ہیں:

"وَإِذَا كَانَ أَرْضٌ وَّبِنَاءٌ، فَعَنْ أَبِيْ يُوْسُفَ رَحِمَهُ اللهُ أَنَّهُ يُقْسَمُ كُلُّ ذٰلِكَ عَلٰى اِعْتِبَارِ الْقِيْمَةِ، لِأَنَّهُ لَا يُمْكِنُ اِعْتِبَارُ الْمُعَادَلَةِ إِلَّا بِالتَّقْوِيْمِ، وَعَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ: أَنَّهُ يُقْسَمُ الْأَرْضُ بِالْمِسَاحَةِ، لِأَنَّهُ هُوَ الْأَصْلُ فِي الْمَمْسُوْحَاتِ، ثُمَّ يُرَدُّ مَنْ وَّقَعَ الْبِنَاءُ فِيْ نَصِيْبِهٖ أَوْ مَنْ كَانَ نَصِيْبُهٗ أَجْوَدَ دَرَاهِمَ عَلَى الْاٰخَرِ حَتّٰى يُسَاوِيَهٗ، فَتَدْخُلُ الدَّرَاهِمُ فِي الْقِسْمَةِ ضَرُوْرَةً كَالْاَخِ لَا وِلَايَةَ لَهٗ فِي الْمَالِ، ثُمَّ يَمْلِكُ تَسْمِيَةَ الصِّدَاقِ ضَرُوْرَةَ التَّزْوِيْجِ"۔

ترجمہ: "اور جب زمین اور عمارت پر مشتمل جائیداد (کی تقسیم) ہو، تو امام ابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ ہر ایک کو قیمت کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے گا، اس لیے کہ (حصوں کے) برابر برابر ہونے کا اعتبار قیمت لگانے سے ہی ممکن ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ زمین کو پیمائش کر کے تقسیم کیا جائے گا، اِس لیے کہ قابلِ پیمائش اشیاء میں یہی اصل ہے، پھر جس کے حصہ میں عمارت واقع ہوئی ہو یا جس کا حصہ عمدہ ہو، وہ دوسرے کو کچھ نقد رقم دے یہاں تک کہ وہ اس کے برابر ہو جائے، تو ضرورت کی بنا پر دراہم (یعنی نقد رقم) تقسیم میں داخل ہوں گے، جیسے بھائی کو اپنی چھوٹی بہن کے مال میں تصرُّف کا اختیار نہیں ہے لیکن نکاح کی ضرورت کی بنا پر اُسے مہر مُقرّر کرنے کا اختیار ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص: 87-78)"۔

## ترکے سے محروم رکھنا ظلم ہے

**سوال:**

میرے شوہر کے انتقال کو آٹھ سال ہو چکے ہیں، میرے شوہر کے چھ بھائی اور تین

بہنیں ہیں۔ ان کی زندگی میں ان کے والد کے ترکے کی بابت فیصلہ ہوا کہ ہر بیٹے کے حصے میں ڈیڑھ کروڑ روپے آئیں گے۔ دوسرے نمبر کے بیٹے نے لڑ جھگڑ کر ڈھائی کروڑ روپیہ لیا، اب وہ پراپرٹی پانچ کروڑ کی ہے۔

میرے شوہر کے انتقال کے ایک سال بعد ہمارا حصہ الگ کرنے کے لیے ایک زمین لی اور اس میں چھ فلیٹ بنوائے تاکہ ایک میں میں رہوں اور باقی کرایہ پر اٹھا کر اپنا گزر سکوں، اس سارے معاملے میں ڈیڑھ کروڑ لاگت آئی ،ایک سال بعد میری مرضی کے خلاف اس میں دو فلیٹ مزید بنوائے اور میرے دو دیوروں کو دے دیئے۔ میرے جیٹھ بلڈر ہیں، انہوں نے اردو بازار میں ایک بلڈنگ بنائی، جس میں میرے ابو نے دو فلیٹ خریدے اور میرے نام کر دیئے، وہ فلیٹ بھی میرے جیٹھ نے مجھے نہیں دیئے اور کہا کہ ان فلیٹوں کی قیمت تمہارے گھر میں ملادی ہے۔ آٹھ سال گزرنے کے باوجود پراپرٹی میرے حوالے نہیں کی جبکہ زمین میرے اور میرے بچوں کے نام ہے اور نہ ہی کرایہ میرے ہاتھ میں دیا۔ دو سال پہلے بڑے جیٹھ نے نارتھ ناظم آباد میں 500 گز کا مکان خریدا، جس کی آج قیمت چھ کروڑ ہے، وہ گھر دو بھائیوں کے نام ہے، جن کا بزنس میں بھی حصہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو میرا اور میرے بچوں کا حصہ بنتا تھا، اس میں بھی میرے جیٹھ نے اپنے دو بھائیوں کو رکھا اور مزید تین بہنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُن کا بھی اس بلڈنگ میں حصہ ہے مجھے اور میرے بچوں کو اُن کے اصل حق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں، شرعی رہنمائی فرمائیں۔

(تہمینہ طارق، ناظم آباد کراچی)

## جواب:

آپ کے بقول آپ کے سسر کے ترکے سے اُن کے ہر بیٹے کو ڈیڑھ کروڑ روپے ملے ہیں اور اتنا ہی آپ کے شوہر کے حصے میں آیا، جسے عملی طور پر مکمل نافذ نہیں کیا گیا، آپ کے جیٹھ کا اس حصے میں تصرُّف اور حق دار کو اُس کے حق سے محروم رکھنا ناجائز، ظلم و زیادتی ہے اور ظلماً مال غصب کرنا ہے، اس پر حدیث پاک میں بڑی وعید آئی ہے: ''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا

مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ اِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ''۔ترجمہ:''جو شخص (کسی کی) زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُسے (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق پہنائے گا، (صحیح مسلم:4055)''۔

اسلام کا قانونِ وراثت اجباری ہے، اس پر عمل کرنا شریعت کی رُو سے لازم ہے کہ ہر وارث کا حصہ اس کی ملکیت میں دیدیا جائے، محض کسی کے لیے مکان یا جائداد کا استعمال مباح کرنے سے وراثت کی تقسیم مکمل ہوتی ہے، کسی کے محض زبانی دست بردار ہونے سے اس کا حق ساقط نہیں ہوتا، ہر وارث کا حصہ اس کی ملک اور تصرُّف میں دینا ضروری ہے۔

آپ کا سوال پیچیدہ ہے، کیونکہ آپ کے شوہر کا حصہ براہ راست آپ اور آپ کی اولاد کے قبضے اور مِلک میں نہیں دیا گیا، بلکہ آپ کے دیور نے از خود اس میں تصرُّف کیا ہے اور یہی تنازع کا سبب ہے، اب اس میں کاروبار کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔اس لیے بہتر یہ ہے کہ فریقین ایک مستند مفتی اور تعمیر کے شعبے سے وابستہ دو خداترس ماہرین پر مشتمل ایک ثالثی کونسل (مجلس تحکیم) تشکیل دیں اور وہ جو فیصلہ کریں، اُسے تمام فریق تسلیم کریں۔

## مُورِث کی وفات سے پہلے فوت شدہ وارث نہیں بنتا

**سوال:**

اگر بیٹی والد سے پہلے فوت ہو جائے تو کیا اس کا یا اس کے بچوں کا والد کی وراثت میں حصہ ہو گا، جبکہ اس کے دوسرے بہن بھائی حیات ہوں؟، (افتخار احمد)۔

**جواب:**

وارث اسے کہتے ہیں جو وراثت یا ترکے میں اپنے حصے کا حق دار ہو اور مُورِث اسے کہتے ہیں جو ترکہ چھوڑ کر وفات پا چکا ہو۔اگر کسی شخص کی زندگی میں اُس کا کوئی بیٹا یا بیٹی فوت ہو جائے اور اُس شخص کے مزید بیٹے اور بیٹیاں حیات ہوں، تو فوت شدہ بیٹے، بیٹی یا اُن کی اولاد کو اس شخص کے ترکے سے کچھ نہیں ملے گا، وارث صرف وہی ورثاء بنتے ہیں جو مُورِث کی وفات کے وقت حیات ہوں، کیونکہ تقسیمِ وراثت کا ایک مسلّمہ اصول ہے:''قریب کا

وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے''، اسے ''اصولِ حَجب'' بھی کہتے ہیں۔ تاہم اگر آپ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کی اولاد کو بطورِ استحسان کچھ دے دیں، تو اجر پائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا''۔

ترجمہ: ''اور جب (ترکے کی) تقسیم کے موقع پر قرابت دار، یتامیٰ اور مساکین آجائیں (جو شرعاً وارث نہیں بن سکتے)، تو انہیں بھی (رضا کارانہ طور پر) ترکے میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو، (النساء:8)''۔

قرآن کا یہ حکم ایجابی (Obligatory) تو نہیں ہے، استحبابی ہے، اس کی حیثیت مقاصدِ خیر کے لیے سفارش اور ترغیب کی ہے۔ لہٰذا جتنا حصہ والد کی وفات کے وقت اُس فوت شدہ بیٹے یا بیٹی کے حیات ہونے کی صورت میں اسے ملنا چاہیے تھا، اگر تمام ورثاء اتفاقِ رائے سے اتنا یا اس سے کچھ کم تبرُّعاً اور استحساناً رضا کارانہ طور پر تقسیم ترکہ سے پہلے ان کی اولاد کو بطورِ ہبہ دیدیں تو یہ ایک مستحسن امر ہوگا، صلہ رحمی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوگا اور اس کا انہیں اجر ملے گا۔ قرآن مجید اس کی حکمت بیان فرماتا ہے:

''وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ۪ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا''۔

ترجمہ: ''اور لوگ (یہ سوچ کر) ڈریں کہ اگر وہ (فوت ہونے کے بعد) اپنے پیچھے (خدانخواستہ) کمزور (بے سہارا) اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں ان کے (برباد ہونے کا) خوف ہوتا، تو انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور درست بات کہیں، (النساء:9)''۔ پس قرآنِ کریم نے بتایا کہ اپنے پسماندگان پر کسی ایسے مشکل مرحلے کا تصور کرکے غیر وارث نادار اور کمزور رشتے داروں پر ترس کھا کر تقسیم وراثت کے وقت ان کی مدد کرلیا کرو۔

# ترکے کا ایک مسئلہ

**سوال:**

میرے پانچ بچے ہیں: ۴ بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹے کا ابھی ایک ماہ قبل ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا ہے۔ جبکہ تقریباً ایک سال قبل میرے خاوند کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ میری تمام بچے شادی شدہ ہیں۔ بیٹے کی تقریباً 6 سال قبل شادی ہوئی تھی۔ اسکی اب تک کوئی اولاد نہیں ہے۔ بہو اب امید سے ہے۔ میرے شوہر سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ شوہر کی تنخواہ سے گھر کا گزارہ اچھے طریقے سے چلتا تھا۔ تقریباً 5 یا 6 سال قبل میرے شوہر سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد شوگر کی بیماری کی وجہ سے ان کی بینائی چلی گئی تھی۔ انکی ریٹائرمنٹ پر ملنے والے پیسے اور کچھ پیسے جو ہم نے تمام عمر اپنی آمدنی میں سے بچت کے ذریعے جمع کیے تھے۔ ان پیسوں سے ہم نے ایک مکان خریدنا چاہا اور اس سلسلے میں ایک مکان کا سودا کیا۔ چونکہ میرے شوہر نابینا ہوچکے تھے۔ تو اس کی تمام ڈیل ہمارے اکلوتے بیٹے کے ذریعے سے ہوئی اور اس کی تمام ادائیگی میرے شوہر کے بینک اکاؤنٹ سے ہوئی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ وہ مکان ہمارے بیٹے نے خریدتے وقت اپنے نام کروالیا تھا۔ جبکہ ہماری نیت یہ تھی کہ ہماری تمام چیزیں اور اپنی بچت اور شوہر کو ریٹائرمنٹ پر ملنے والے پیسے شرعی اور قانونی طریقے سے تمام بچوں میں منتقل کی جائے۔

ہمارے علم میں یہ بھی آیا ہے کہ اس نے کچھ اور چیزیں بھی خریدی تھیں۔ جبکہ اس کی سرکاری ملازمت میں گریڈ 7 کی تنخواہ کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو کہ کچھ عرصے قبل گریڈ 11 میں upgrade ہوئی تھی۔ (اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس سرکاری ملازمت میں کتنی پراپرٹی خریدی جاسکتی ہے)۔ والد کے نابینا ہونے کے بعد اس نے والد کے ساتھ جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوایا۔ اور ان کے پیسے ان کی مرضی کے خلاف استعمال کیے۔ جسکا علم ہونے پر میں نے اور اس کے والد نے کئی بار اس سے تکرار بھی کی

جس پر یہ ہم سے بہت بدتمیزی کرتا رہا ہے۔ان تمام باتوں کا علم ہماری بہو(رضوان کی بیوہ) کو بھی ہے۔اب بیٹے کے انتقال کے بعد یہ بات بھی علم میں آئی ہے کہ اس نے کورنگی کے جس مکان میں ہم اپنے سسر کے وقت سے رہتے ہیں۔اس کے کاغذات بھی میرے علم میں لائے بغیر میری الماری سے نکال کر کچھ عرصے قبل اپنے نام کروا لیے ہیں۔اور اس مکان کے کاغذات میری بہو اپنے ساتھ لے کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔یہ معلوم ہونے کے بعد میں شدید پریشانی میں مبتلا ہوں کہ میرے گھر کی چھت چھن گئی تو میں بیوہ عورت کہاں جاؤں گی۔اسکے علاوہ میرے بیٹے کی سرکاری ملازمت تھی جسکے بقایا جات کی ادائیگی کے لیے بھی کوشش کرنی ہے اور وہاں سے ملنے والے بقایا جات میں سے کس کس کا حصہ ہوگا۔آپ سے درخواست ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں راہنمائی فرمائیں کہ اس تمام صورتحال میں میری تمام بیٹیوں کا اور میرا اور میری بہو(میرے بیٹے کی بیوہ) کا شرعی طور پر کیا حصہ بنتا ہے۔تاکہ ہم خاندان کے دوسرے لوگوں کو اس سلسلے میں بیچ میں ڈال کر اس معاملے کو حل کرانے کی کوشش کریں۔میرے شوہر کے ورثہ میں۔میں اور میری 4 بیٹیاں اور میرے بیٹے کی بیوہ شامل ہیں، (شمیم اختر بیوہ محمد رمضان)۔

**جواب:**

آپ کے بیان کے مطابق آپ کے فوت شدہ بیٹے نے دھوکا دہی سے مذکورہ جائداد اپنے نام منتقل کرائی، اُس کا یہ عمل ناجائز، ظلم اور گناہ ہے، حدیث پاک میں ہے:

''مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا، طَوَّقَهُ اللهُ اِيَّاهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ''۔

ترجمہ: ''جو شخص کسی کی زمین کا ایک بالشت ٹکڑا بھی ظلماً (یعنی ناحق) لے گا، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (سزا کے طور پر) سات زمینوں کا طوق پہنائے گا''۔

(صحیح مسلم:4055)

محض اپنے نام پر منتقل کرانے سے مذکوہ جائداد کی ملکیت اسے حاصل نہیں ہوگی اور وہ جائداد بدستور آپ کے مرحوم شوہر کا ترکہ قرار پائے گی اور اصولِ وراثت کے قوانین کے

تحت ورثاء کے درمیان تقسیم کی جائے گی، ہم یہ شرعی حکم بیان کررہے ہیں، اب آپ کے بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو ان تمام باتوں کا اس کی زندگی میں علم ہو چکا تھا، اگر آپ اس کی زندگی میں قانونی چارہ جوئی کرتیں تو شاید عدالت سے آپ کو آسانی کے ساتھ ریلیف مل جاتا، اب بھی کیا ایسا ہو سکتا ہے، کوئی قانونی ماہر آپ کی رہنمائی کرسکتا ہے، ورنہ خدا خوفی اس کا محرک ہو سکتی ہے، جو دنیا پرستی کے اس دور میں ناپید ہوتی جارہی ہے، اگر آپ کے بیٹے میں خوفِ خدا ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ یہ دھوکا دہی نہ کرتا۔

آپ کے فوت شدہ شوہر کا کل ترکہ 48 حصوں میں تقسیم ہوگا: بیوہ (شمیم اختر) کو 6 حصے چاروں بیٹیوں کو 28 حصے (فی کس 7 حصے) اور فوت شدہ بیٹے کو تقسیمِ ترکہ کے حوالے سے زندہ فرض کر کے اس کے چودہ حصے ہوں گے، جو اس کے ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوں گے، جس میں آپ کا بھی چھٹا حصہ ہوگا۔

فوت شدہ بیٹے کو والدین کی وراثت سے ملنے والا حصہ اور اُس کے ذاتی ترکے کی تقسیم آپ کی بہو کے وضعِ حمل تک موقوف رہیں گے۔ کیونکہ وضعِ حمل کی صورت میں اس کے ہاں بیٹا بھی ہو سکتا ہے اور بیٹی بھی ہو سکتی ہے، بعض اوقات جڑواں بچے (Twins) پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی صنف یعنی لڑکا یا لڑکی ہونے کا مسئلہ ہوگا، خدانخواستہ حمل ساقط بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ وضعِ حمل تک اس کے ترکے کی تقسیم موقوف کر دی جائے اور وضعِ حمل کے بعد جو بھی صورت ہو، اس کے مطابق اس وقت دارالافتاء سے اُس وقت کے وارثوں کے حصص معلوم کر لیے جائیں۔

آپ کے فوت شدہ بیٹے کو ملنے والا جی۔ پی فنڈ اور بینک اکاؤنٹ ترکے میں شامل ہوگا، کموٹیشن اگر اس کا استحقاق ہے، تو ترکے میں شامل ہوگا۔ پینشن گورنمنٹ کے قانون کے مطابق بیوہ کے نام جاری ہوتی ہے، لہٰذا وہ ترکے میں شامل نہیں ہوگی، باقی تفصیلات جب سامنے آئیں گی تو ان کا شرعی حکم بتادیا جائے گا۔

# خرید وفروخت کے مسائل

# بیع بالاقساط

**سوال:**

ایک موٹر سائیکل شوروم کا مالک نقد موٹر سائیکل مبلغ چالیس ہزار روپے میں فروخت کرتا ہے اور ادھار وہی موٹر سائیکل مبلغ پچاس ہزار روپے میں فروخت کرتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ خریدار مبلغ دس ہزار روپے نقد جمع کراتا ہے اور بقیہ چالیس ہزار روپے چھ ماہ میں یکمشت یا آسان اقساط میں ادا کرتا ہے، (محمد فاروق، ضلع مظفر گڑھ)۔

**جواب:**

مختلف افراد، کمپنیاں اور ادارے ادھار پر سامان فروخت کرتے ہیں اور قیمت اقساط میں وصول کی جاتی ہے، قیمت، ادائیگی کی مدت اور قسطیں باہمی رضامندی سے طے کر لی جاتی ہیں، عام طور پر یہ موجودہ بازاری قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ بائع فروخت شدہ چیز یعنی مَبیع خریدار کے حوالے کر کے اس کی ملک میں دے دیتا ہے۔ یہ عقد شرعاً صحیح ہے، بشرطیکہ اس میں یہ قرار نہ دیا ہو کہ اگر خدانخواستہ مقررہ مدت میں پوری قیمت ادا نہ کی جا سکی تو اضافی مدت کے عوض قیمت میں کسی خاص شرح سے کوئی اضافہ ہوگا۔ اگر تاخیری مدت کے عوض قیمت میں اضافہ کر دیا تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔ فی نفسہٖ حدودِ شرع کے اندر ایسی بیع جائز ہے، فقہ میں اسے بیع ''بالتقسیط'' کہتے ہیں۔

بیع میں نقد اور ادھار کی صورت میں علیحدہ علیحدہ قیمتیں مقرر کرنے کی شرعی حیثیت کے حوالے سے علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے تین صورتیں تحریر فرمائی ہیں:

(۱) زید کوئی چیز ادھار فروخت کرتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ دوسرے نقد فروخت کرنے والوں کے مقابلے میں گراں فروش ہے۔

(۲) زید علانیہ کہتا ہے کہ اس کے سامان کی نقد قیمت سو روپیہ اور ادھار ایک سو بیس روپیہ ہے۔

(۳) زید سامان قسطوں پر فروخت کرتا ہے اور ایسے سامان کو جس کی نقد قیمت عام طور پر سو روپیہ ہے، دس روپیہ ماہانہ کی بارہ قسطوں میں فروخت کرتا ہے۔

ان صورتوں میں پہلی اور تیسری صورت جائز ہے اور دوسری صورت جس میں زید علانیہ کہتا ہے کہ اس چیز کی نقد قیمت سو روپیہ اور ادھار ایک سو بیس روپیہ ہے، خواہ وہ ادھار روپیہ بھی بالاقساط وصول کیا جائے یا یک مشت، نقد اور ادھار قیمتوں میں فروخت کرنے کی وجہ سے ناجائز ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے دو بیعوں کو ایک بیع میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، (سنن ترمذی: 1231)''۔

امام ترمذی ''بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ'' کی ایک صورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وَقَدْ فَسَّرَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ قَالُوا: بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ أَنْ يَقُولَ أَبِيعُكَ هٰذَا الثَّوْبَ بِنَقْدٍ بِعَشَرَةٍ وَبِنَسِيئَةٍ بِعِشْرِينَ''۔

ترجمہ: ''بعض اہلِ علم نے ''بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ'' کی تفسیر یہ کی ہے: ''کوئی شخص خریدار سے کہے: میں تمہیں یہ کپڑا نقد دس کا اور ادھار بیس کا بیچتا ہوں''۔

شیخ شوکانی اس حدیث پر طویل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فِيهَا الدَّلَالَةُ عَلَى الْمَنْعِ مِنَ الْبَيْعِ إِذَا وَقَعَ عَلٰى هٰذِهِ الصُّورَةِ، وَهِيَ أَنْ يَقُولَ نَقْدًا بِكَذَا وَنَسِيئَةً بِكَذَا، لَا إِذَا قَالَ: مِنْ أَوَّلِ الْأَمْرِ نَسِيئَةً بِكَذَا فَقَطْ وَكَانَ أَكْثَرَ مِنْ سِعْرِ يَوْمِهِ''۔

ترجمہ: ''اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ جب بیع اس صورت پر واقع ہو کہ بائع کہے کہ یہ چیز نقد اتنے کی اور ادھار اتنے کی تو یہ بیع ناجائز ہے، البتہ اگر وہ ابتداءً کہے کہ یہ چیز ادھار اتنے کی ہے، حالانکہ اس کی قیمت اس دن کی قیمت سے بہت زیادہ لگائی ہو تو یہ جائز ہے، (نیل الاوطار، ج:5، ص:181)۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''رَجُلٌ بَاعَ عَلٰی اَنَّہٗ بِالنَّقْدِ بِکَذَا وَبِالنَّسِیْئَۃِ بِکَذَا وَاِلٰی شَھْرٍ بِکَذَا وَاِلٰی شَھْرَیْنِ بِکَذَا لَمْ یَجُزْ، کَذَا فِی ''الْخُلَاصَۃِ''۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے اس طور پر بیع کی کہ یہ چیز نقد اتنے کی ہے اور ادھار اتنے کی یا ایک ماہ کے ادھار پر اتنے کی ہے اور دو ماہ کے ادھار پر اتنے کی ہے تو یہ ناجائز ہے، اسی طرح خلاصہ میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:3،ص:136)''۔

(مقالاتِ سعیدی،ص:400-399)

صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بیع میں ثمن کا معین کرنا ضروری ہے، درمختار میں ہے: ''وَشُرِطَ لِصِحَّتِہٖ مَعْرِفَۃُ قَدْرِ مَبِیْعٍ وَثَمَنٍ'' اور جب ثمن معین کر دیا جائے تو بیع چاہے نقد ہو یا ادھار سب جائز ہے، اس میں ہے: ''وَصَحَّ بِثَمَنٍ حَالٍّ وَمُؤَجَّلٍ اِلٰی مَعْلُوْمٍ'' اور یہ بھی ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی چیز کو کم یا زیادہ جس قیمت پر مناسب جانے بیع کرے، تھوڑا نفع لے یا زیادہ، شرع میں اس کی ممانعت نہیں، مگر صورت مسئولہ میں یہ ضرور ہے کہ نقد یا ادھار دونوں سے ایک صورت کو معین کر کے بیع کرے اور اگر معین نہ کیا اور مجمل رکھا کہ نقد اتنے کو اور ادھار اتنے کو تو یہ بیع فاسد ہوگی اور ایسا کرنا جائز نہ ہوگا، (فتاویٰ امجدیہ، ج:3،ص:181)''۔

بعض قارئین کو بیع بالتقسیط کے جواز اور ممانعت کی حکمت سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ثمن کو معلّق نہ رکھا جائے، قطعی طور پر طے کر دیا جائے، لیکن جب یہ کہا جائے: ''فلاں چیز نقد اتنے کی ہے اور قسطوں پر اتنے کی''، تو ثمن طے نہ ہوا بلکہ معلّق ہو گیا، جبکہ بیع بائع اور مشتری کے درمیان باہمی رضامندی سے مَبیع اور ثمن کے قطعی طور پر طے ہونے کا نام ہے، خواہ بیع نقد ہو یا ادھار، لیکن جب مبیع اور ثمن بائع اور مشتری کے درمیان طے ہو جائیں اور مَبیع مشتری کے حوالے کر دی جائے، اس پر اُسے قبضہ دے دیا جائے، تو مِلک تام ہو جاتی ہے اور بیع منعقد ہو جاتی ہے۔

## یہ بیع فاسد ہے

**سوال:** خریدار، شوروم مالک سے مبلغ چالیس ہزار روپے نقد والا موٹر سائیکل ادھار میں ساٹھ ہزار روپے میں چھ ماہ کی ادائیگی کی شرط پر لیتا ہے اور اُس پر قبضہ نہیں کرتا، اُسی مجلس میں شوروم مالک سے کہتا ہے کہ موٹر سائیکل میں نے بیچنا ہے، تو شوروم مالک چالیس ہزار روپے کی نقد لے لیتا ہے اور خریدار کو رقم دے دیتا ہے، حالانکہ خریدار اُس مالک کو ساٹھ ہزار روپے چھ ماہ بعد ادا کرنے کا پابند ہے۔ کیا مذکورہ بالا دونوں صورتیں شرعاً جائز ہیں یا نہیں؟ (محمد فاروق، ضلع مظفر گڑھ)

**جواب:** اس بیع میں نہ مشتری نے مبیع پر قبضہ کیا اور نہ بائع نے ثمن پر، اس لیے یہ بیع منعقد نہیں ہوئی، نیز یہ بیع عینہ کی وہ صورت ہے، جو ناجائز ہے، علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَمَنِ اشْتَرٰی جَارِيَةً بِأَلْفِ دِرْهَمٍ حَالَةً أَوْنَسِيْئَةً فَقَبَضَهَا، ثُمَّ بَاعَهَا مِنَ الْبَائِعِ بِخَمْسِمِائَةٍ قَبْلَ أَنْ يُنْقِدَ الثَّمَنَ الْأَوَّلَ، لَا يَجُوْزُ الْبَيْعُ الثَّانِيْ، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللهُ: يَجُوْزُ لِأَنَّ الْمِلْكَ قَدْ تَمَّ فِيْهَا بِالْقَبْضِ فَصَارَ الْبَيْعُ مِنَ الْبَائِعِ وَمِنْ غَيْرِهٖ سَوَاءٌ، وَصَارَ كَمَا لَوْبَاعَ بِمِثْلِ الثَّمَنِ الْأَوَّلِ أَوْ بِالزِّيَادَةِ أَوْ بِالْعَرْضِ وَلَنَا قَوْلُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا لِتِلْكَ الْمَرْأَةِ وَقَدْ بَاعَتْ بِسِتِّمِائَةٍ بَعْدَمَا اِشْتَرَتْ بِثَمَانِ مِائَةٍ بِئْسَمَا شَرَيْتِ وَاشْتَرَيْتِ، أَبْلِغِيْ زَيْدَ بْنَ أَرْقَمَ أَنَّ اللهَ تَعَالٰى أَبْطَلَ حَجَّهٗ وَجِهَادَهٗ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ لَمْ يَتُبْ وَلِأَنَّ الثَّمَنَ لَمْ يَدْخُلْ فِيْ ضَمَانِهٖ فَإِذَا وَصَلَ إِلَيْهِ الْمَبِيْعُ، وَوَقَعَتِ الْمُقَاصَةُ بَقِيَ لَهٗ فَضْلُ خَمْسِمِائَةٍ وَذٰلِكَ بِلَا عِوَضٍ، بِخِلَافِ مَا إِذَا بَاعَ بِالْعَرْضِ لِأَنَّ الْفَضْلَ إِنَّمَا يَظْهَرُ عِنْدَ الْمُجَانَسَةِ"۔

ترجمہ: "جس نے ایک باندی ایک ہزار درہم میں نقد یا ادھار خریدی اور اسے قبضے میں لے

لیا، پھر قیمت ادا کرنے سے پہلے بائع پر پانچ سو درہم میں فروخت کر دیا، تو یہ بیع ثانی جائز نہیں ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ بیع جائز ہے کیونکہ (قیمت پر باہمی رضامندی کے بعد) مبیع پر مشتری کے قبضے سے بیع مکمل ہوگئی، اب وہ (سابق) بائع پر بیچے یا کسی اور پر حکم یکساں ہے، یہ ایسا ہی ہے کہ خواہ وہ پہلی قیمت پر بیچے یا اس سے زیادہ قیمت پر بیچے یا سامان کے عوض بیچے (تمام صورتیں برابر ہیں)۔ اس کے ناجائز ہونے پر اَحناف کی دلیل یہ حدیث ہے: "ایک عورت نے حضرت زید بن ارقم سے ایک باندی آٹھ سو درہم میں خریدی اور پھر اسے انہی پر واپس چھ سو درہم میں بیچ دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (کو پتا چلا تو آپ) نے اسے فرمایا: تم نے برا سودا کیا، آپ نے یہ بھی فرمایا: زید بن ارقم کو (میری طرف سے) بتادو کہ اگر آپ نے توبہ نہ کی تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ جو حج اور جہاد کیا تھا، وہ سب باطل ہو گئے، کیونکہ قیمت بائع کے ضمان میں داخل نہیں ہوئی، پھر جب اس کے پاس مبیع پہنچی اور لین دین ہوا تو اس کے پاس پانچ سو زیادہ بچ گئے اور یہ کسی عوض کے بغیر ہے، اس لیے جائز نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اسے سامان کے بدلے میں بیچا ہو تو بیع جائز ہوگی، کیونکہ زیادتی اس صورت میں ناجائز ہے، جبکہ مبیع اور ثمن دونوں ایک ہی جنس کے ہوں (اور اختلافِ جنس کی صورت میں زیادتی جائز ہے)، (ہدایہ، جلد 5، ص: 111)"۔

یہاں بیع کے فاسد ہونے کا سبب یہ ہے کہ ایک چیز کسی سے ایک قیمت پر اُدھار خریدی اور پھر بعینہٖ وہی چیز اس بائع اول پر پہلے سے کم قیمت پر نقد بیچ دی، یہ خرید وفروخت ناجائز ہے، کیونکہ یہ قرض پر نفع حاصل کرنے کا ایک حیلہ ہے۔ البتہ اگر تکمیلِ بیع کے بعد پہلے بائع پر وہی چیز سابق قیمت پر یا اس سے زائد پر بیچی تو یہ جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں ممانعت کی وہ علت رفع ہو جاتی ہے۔

## گروپ انشورنس کا حکم

**سوال:**

اساتذہ کی ماہانہ تنخواہوں میں سے کچھ روپے ہر ماہ ضلعی حکومت گروپ انشورنس کے

نام سے کٹوتی کرتی ہے اور ضلعی حکومت کا اس معاملے میں پوسٹل لائف انشورنس سے الحاق ہے اور ٹیچر کی وفات کی صورت میں پوسٹل لائف انشورنس والے اس رقم کو بڑھا کر دورانِ ملازمت وفات پانے والے شخص کے ورثاء کو ادا کرتے ہیں۔ شرعی لحاظ سے ورثاء کے لیے یہ رقم وصول کرنا اور اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟۔

(محمد سیف اللہ، کوٹ مومن، ضلع سرگودھا)

**جواب:**

مُرَوّجہ انشورنس کا عقد غیر شرعی عناصر کی وجہ سے ناجائز ہے، لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔ اس کے متبادل تکافل شرعی طریقۂ کار کی وجہ سے جائز ہے۔ ضلعی انتظامیہ کو چاہیے کہ گروپ انشورنس پر گروپ تکافل کو ترجیح دیں اور سودی لین دین کے معاملات سے گریز کریں، سودی رقم کا استعمال اور لین دین حرام ہے۔ اسی طرح بعض اسلامی مالیاتی ادارے کارپوریشنوں، کمپنیوں، محکموں اور اداروں کے لیے ملازمین کی پراویڈنٹ فنڈ کی جمع شدہ رقوم کے لیے مضاربت کے شرعی اصول پر مبنی اسکیمیں بناتی ہیں۔ لہٰذا کارپوریشنوں، کمپنیوں، محکموں اور اداروں کی ملازمین کی انجمنیں یا یونینیں (CBA) اپنے اداروں کے سربراہان کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ ملازمین کی جی پی فنڈ کی جمع شدہ رقوم کے لیے اسلامی تمویل (Financing) کے طریقے اختیار کریں اور جس ملازم کو اپنے جی پی فنڈ سے رقم نکلوانی ہو، وہ اسے بلاسود دیدی جائے، کیونکہ یہ اُس کا حق ہے۔ اسی طرح گروپ تکافل کی پروڈکٹس بھی مارکیٹ میں متبادل کے طور پر موجود ہیں۔

## خون کی تجارت کا شرعی حکم

**سوال:**

کیا جانوروں کا خون تجارت کے لیے فروخت ہوسکتا ہے، اس کی کھاد بنائی جاتی ہے، جو زمین کی زرخیزی کے لیے اچھی مانی جاتی ہے۔ نیز برائلر مرغی کھانا جائز ہے یا ناجائز بعض لوگ اس کو حرام قرار دیتے ہیں کہ اس کی خوراک (Feeding) میں دمِ مسفوح (یعنی ذبح

کے وقت بہنے والا خون) اور دیگر ناپاک اشیاء شامل ہوتی ہیں، (امیر خان، خیبر پختونخوا)۔

**جواب:**

دَمِ مسفوح (یعنی حلال جانور کے ذبح کے وقت بہنے والے خون) کی حُرمت قرآن کریم سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ" ترجمہ: "تم پر (یہ) چیزیں حرام کی ہیں: مُردار اور بہتا ہوا خون، (البقرہ:173، النحل:115)"۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

"(بَطَلَ بَيْعُ مَا لَيْسَ بِمَالٍ كَالدَّمِ) الْمَسْفُوْحِ فَجَازَ بَيْعُ كَبِدٍ وَطِحَالٍ (وَالْمَيْتَةِ سِوٰى سَمَكٍ وَجَرَادٍ"۔

ترجمہ: "ایسی اشیاء جو مال نہ ہوں، جیسے ذبح کے وقت بہنے والا خون اور مُردار کی بیع باطل ہے، تلّی اور کلیجی کی بیع جائز ہے (یعنی اِن پر دَمِ مَسفوح کا اطلاق نہیں ہوتا) اور (شکار کے ذریعے) جو مچھلی اور ٹڈی مر جائے، وہ حلال ہے (یعنی اُس پر مردار کا اطلاق نہیں ہوتا)، (جلد 7،ص:171)"، حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ الْحُوْتُ، وَالْجَرَادُ"۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لیے دو مردار حلال کیے گئے ہیں: مچھلی اور ٹڈی، (ابن ماجہ:3218)"۔

مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جس مچھلی کا شکار نہ کیا جاسکے، بلکہ دریا ہی اُسے مار دے کہ اُسے کنارے پر پھینک دے، وہ بھی حلال ہے۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: "يُحِلُّ مَيْتَتَهُ" دریا کا مارا ہوا جانور حلال ہے، لہٰذا اگر مچھلی دریا میں ہی مر کر تر جائے، وہ حرام ہے کہ وہ دریا کی ماری ہوئی نہیں ہے، بلکہ بیماری کی ماری ہوئی ہے اور اگر تیر یا گولی سے ماری جائے تو حلال ہے کہ یہ شکار کی ہوئی

ہے، یہ فرق خیال میں رہے، (تفسیر نعیمی، ج:7، ص:81-80)"۔

علامہ علاء الدین ابوبکر کاسانی حنفی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالْمَرْوِیُّ عَنْ أَبِی حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ أَنَّهُ قَالَ: اَلدَّمُ حَرَامٌ وَأَکْرَهُ السِّتَّةَ، أَطْلَقَ اِسْمَ الْحَرَامِ عَلَی الدَّمِ الْمَسْفُوْحِ وَسَمّٰی مَاسِوَاهُ مَکْرُوْهًا لِأَنَّ الْحَرَامَ الْمُطْلَقَ مَاثَبَتَتْ حُرْمَتُهُ بِدَلِیْلٍ مَّقْطُوْعٍ بِهٖ، وَحُرْمَةُ الدَّمِ الْمَسْفُوْحِ قَدْ ثَبَتَتْ بِدَلِیْلٍ مَّقْطُوْعٍ بِهٖ وَهُوَ النَّصُّ الْمُفَسَّرُ مِنَ الْکِتَابِ الْعَزِیْزِ قَالَ اللهُ تَعَالٰی عَزَّشَانُهٗ: "قُلْ لَّآ أَجِدُ فِیْ مَآ أُوْحِیَ إِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ إِلَّا أَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ" وَانْعِقَادُ الْإِجْمَاعِ أَیْضًا عَلٰی حُرْمَتِهٖ، فَأَمَّا حُرْمَةُ مَاسِوَاهُ مِنَ الْأَشْیَاءِ السِّتَّةِ فَمَا ثَبَتَتْ بِدَلِیْلٍ مَّقْطُوْعٍ بِهٖ بَلْ بِالْإِجْتِهَادِ أَوْ بِظَاهِرِ الْکِتَابِ الْعَزِیْزِ الْمُحْتَمَلِ لِلتَّأْوِیْلِ أَوِ الْحَدِیْثِ لِذٰلِکَ فَصَّلَ بَیْنَهُمَا فِی الْإِسْمِ فَسَمّٰی ذٰلِکَ حَرَامًا وَّذَا مَکْرُوْهًا"۔

ترجمہ: "امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ سے روایت ہے اُنہوں نے فرمایا: "دَمِ مَسفُوح حرام ہے اور باقی اشیاء کو میں مکروہ قرار دیتا ہوں، (امام اعظم نے) دَمِ مَسفُوح پر حرام کا اطلاق کیا اور خون کے سوا باقی اشیاء کو مکروہ کہا ہے، اس لیے کہ حرام مطلق وہ ہے، جس کی حُرمت دلیل قطعی سے ثابت ہو اور بہنے والے خون کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت ہے اور وہ ایک ایسی نص سے ثابت ہوتی ہے، جس کی خود قرآن مجید میں تفسیر کردی گئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "آپ کہہ دیجیے کہ جو اَحکام مجھ پر نازل ہوئے، میں ان میں کسی چیز کو جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا ذبح کے وقت بہنے والا خون یا خنزیر کا گوشت، (الانعام:145)"۔ اور اس کی حرمت پر اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے جبکہ اس کے علاوہ جو دوسری چھ اشیاء ہیں: اُن کی حرمت دلیل قطعی سے ثابت نہیں ہوئی بلکہ اجتہاد یا ظاہرِ کتاب سے ثابت ہوئی ہے، جس میں تاویل کا بھی احتمال ہے یا پھر حدیث کے ساتھ ثابت ہوئی ہے، اسی لیے اِن کے نام میں بھی فرق کیا ہے، اُسے حرام قرار دیا اور باقی اشیاء کو مکروہ کہا ہے، (بدائع الصنائع، جلد خامس، ص:90)"۔

ہمارے فقہائے کرام نے ''دَمِ مَسفوح'' کی بیع کی حُرمت کا قول اِس بنا پر کیا تھا کہ یہ مال نہیں ہے، چنانچہ علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بَيْعُ الْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَالْحُرِّ بَاطِلٌ لِاَنَّهَا لَيْسَتْ اَمْوَالًا فَلَا تَكُونُ مَحَلًّا لِلْبَيْعِ''۔

ترجمہ: ''مُردار، خون اور آزاد آدمی کی بیع باطل ہے کیونکہ یہ چیزیں مال نہیں ہیں، تو یہ بیع کا محل بھی نہ ہوں گی، (ہدایہ مع فتح القدیر، جلد6،ص:371)''۔

لیکن اب دَمِ مَسفوح مال بن چکا ہے اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ یہ کھاد (Fertilizer) بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کے علاوہ مرغیوں کی خوراک (Poltry Feed) میں استعمال ہوتا ہے اور ان صنعتوں سے وابستہ لوگ اسے خریدتے ہیں، تو مَذبَح (ButcherySlaughter House) والوں کے لیے اُسے فروخت کرنا اور اُس کی قیمت لینا جائز ہے، البتہ انسان کے کھانے یا پینے کے حوالے سے اُس کی حُرمت قطعی، ابدی اور دائمی ہے۔

اسی طرح حرام چیز کسی مخلوط میں مل جائے، اس کی ماہیت بدل جائے تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے، تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَلَا مِلْحٌ كَانَ حِمَارًا أَوْ خِنْزِيرًا وَلَا قَذَرٌ فِي بِئْرٍ فَصَارَ حَمْأَةً لِانْقِلَابِ الْعَيْنِ، بِهِ يُفْتٰى''۔

ترجمہ: ''اور وہ نمک ناپاک نہیں ہے، جو (اپنے اصل وجود کے اعتبار سے) گدھا تھا یا خنزیر تھا، (پھر وہ نمک کی کان میں گر کر تحلیل (Dissolve) ہوکر نمک بن گئے اور ان کی سابق ماہیت باقی نہ رہی) اور کنویں میں گری ہوئی وہ گندگی بھی ناپاک نہیں ہے، جو (تحلیل ہوکر) کالی مٹی کی شکل میں کیچڑ بن گئی، کیونکہ اب اس کی سابق حقیقت بدل گئی ہے، اسی پر فتویٰ ہے''، اس کے تحت علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''(لِانْقِلَابِ الْعَيْنِ) عِلَّةٌ لِلْكُلِّ، وَهٰذَا قَوْلُ مُحَمَّدٍ، وَذَكَرَ مَعَهُ فِي الذَّخِيرَةِ وَالْمُحِيطِ أَبَا حَنِيفَةَ حِلْيَةٌ قَالَ فِي الْفَتْحِ: وَكَثِيرٌ مِنَ الْمَشَايِخِ اِخْتَارُوهُ، وَهُوَ الْمُخْتَارُ، لِاَنَّ الشَّرْعَ رَتَّبَ وَصْفَ النَّجَاسَةِ عَلٰى تِلْكَ الْحَقِيقَةِ وَتَنْتَفِي الْحَقِيقَةُ بِانْتِفَاءِ بَعْضِ

أَجْزَاءِ مَفْهُوْمِهَا فَكَيْفَ بِالْكُلِّ۔۔۔۔وَنَظِيْرُهٗ فِي الشَّرْعِ النُّطْفَةُ نَجِسَةٌ وَتَصِيْرُ عَلَقَةً وَهِيَ نَجِسَةٌ وَتَصِيْرُ مُضْغَةً فَتَطْهُرُ، وَالْعَصِيْرُ طَاهِرٌ فَيَصِيْرُ خَمْرًا فَيَنْجُسُ وَيَصِيْرُ خَلًّا فَيَطْهُرُ''۔

ترجمہ:''یہ بات کہ ماہیت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے، یہ علّت (Cause) سب چیزوں کے لیے ہے، اور یہ امام محمد کا قول ہے اور اس کے ساتھ ''حلبہ'' میں ''ذخیرہ اور ''محیط'' کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا بھی قول ہے۔علامہ ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی قول مختار ہے، کیونکہ شریعت نے اسی حقیقت پر وصفِ نجاست کو مرتب کیا ہے اور اپنے مفہوم کے بعض اجزاء کی نفی سے بھی حقیقت کی بھی نفی ہو جاتی ہے، تو جب کسی چیز کے تمام اجزاء (اپنی سابقہ ہیئت کے ساتھ معدوم ہو جائیں)، تو اس کی حقیقت معدوم کیوں نہیں ہو گی)؟۔۔۔۔۔۔آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں: اور شرع میں اس کی نظیر یہ ہے کہ نطفہ (منی) نجس ہے اور وہ (ماں کے رحم میں) جب عَلَقہ (منجمد خون (Bloodsucker) کی شکل اختیار کرتا ہے، تب بھی وہ نجس ہوتا ہے اور پھر جب وہ مُضغہ (گوشت کا لوتھڑا (Embryo) بن جاتا ہے، تو پاک ہو جاتا ہے۔اور پھل وغیرہ سے کشید کیا ہوا رس پاک ہوتا ہے، پھر جب پھلوں کا رس سڑ جانے سے خمر (شراب) بن جاتا ہے، تو نجس ہو جاتا ہے (کیونکہ اب اس کی حقیقت بدل گئی ہے)، پھر یہی شراب جو حرام اور نجس ہے جب (نمک اور لیموں ڈالنے سے) سرکہ بن جاتا ہے، تو (اپنی حقیقت کے بدل جانے سے) پاک ہو جاتا ہے''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار، جلد: 1، ص:463)

مرغیوں کی خوراک کا شرعاً طیّب وطاہر ہونا ضروری نہیں ہے، دیہاتوں میں دیسی مرغیاں چل پھر کر غلاظت بھی کھاتی ہیں، اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ ایسی مرغیوں کو ذبح کرنے سے پہلے تین دن تک بند کر کے خوراک دی جائے تاکہ بدبو زائل ہو جائے، جبکہ مرغیوں کی تیار خوراک (یعنی پولٹری فیڈ) میں دمِ مسفوح کی ماہیت بدل جاتی ہے۔دمِ

مسفوح کی بیع قیاس کی بنا پر فقہائے کرام نے ممنوع قرار دی ہے، لیکن اِس کی بیع کی حُرمت پر کوئی نصِ صریح نہیں ہے۔ اب چونکہ اس کی ایک منفعت ثابت ہے لہٰذا یہ مال ہے اور استحساناً اس کی بیع جائز ہے۔

دمِ مَسفوح کی اس بیع کی اباحت کا قول اُسی اصول پر مبنی ہے، جس کے تحت ہمارے فقہائے کرام نے نجس العین اشیاء کی بیع کو منفعت کی بنا پر مباح قرار دیا ہے۔

علامہ برہان الدین علی بن حسن بن ابوبکر الفرغانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَالَ: وَلَا بَأْسَ بِبَيْعِ السِّرْقِيْنِ، وَيُكْرَهُ بَيْعُ الْعَذِرَةِ، وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللهُ لَا يَجُوْزُ بَيْعُ السِّرْقِيْنِ أَيْضًا لِأَنَّهُ نَجِسُ الْعَيْنِ، فَشَابَهَ الْعَذِرَةَ وَجِلْدَ الْمَيْتَةِ قَبْلَ الدِّبَاغِ، وَلَنَا أَنَّهُ مُنْتَفَعٌ بِهِ، لِأَنَّهُ يُلْقٰى فِي الْأَرَاضِيْ لِاسْتِكْثَارِ الرِّيْعِ، فَكَانَ مَالًا، وَالْمَالُ مَحَلٌّ لِلْبَيْعِ، بِخِلَافِ الْعَذِرَةِ، لِأَنَّهُ لَا يُنْتَفَعُ بِهَا إِلَّا مَخْلُوْطًا، وَيَجُوْزُ بَيْعُ الْمَخْلُوْطِ هُوَ الْمَرْوِيُّ عَنْ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ، وَهُوَ الصَّحِيْحُ، وَكَذَا يَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ بِالْمَخْلُوْطِ لَا بِغَيْرِ الْمَخْلُوْطِ فِي الصَّحِيْحِ"۔

ترجمہ: "امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: گوبر کی بیع میں کوئی حرج نہیں اور پاخانہ (انسانی براز یا فُضلہ) کی بیع مکروہ ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گوبر کی بیع بھی جائز نہیں، اس لیے کہ وہ نجس العین ہے، تو یہ پاخانہ اور دباغت سے پہلے مُردار کی کھال کے مشابہ ہو گیا اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس کو پیداوار بڑھانے کے لیے زمینوں میں ڈالا جاتا ہے، تو یہ مال ہو گیا اور مال بیع کا محل ہے، بخلاف پاخانہ کے، اس لیے کہ اِس سے مخلوط ہونے کی صورت ہی میں نفع اٹھایا جاتا ہے اور مخلوط کی بیع جائز ہے، امام محمد رحمہ اللہ سے یہی روایت ہے اور یہی صحیح ہے اور صحیح روایت کے مطابق ایسے ہی مخلوط سے انتفاع جائز ہے جبکہ غیر مخلوط سے جائز نہیں ہے، (ہدایہ، جلد 7، ص: 224)"۔

علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"(وَبَيْعُ رَجِيْعِ آدَمِيٍّ لَّمْ يَغْلِبْ عَلَيْهِ التُّرَابُ) فَلَوْ مَغْلُوْبًا بِهِ جَازَ كَسِرْقِيْنٍ وَبَعْرٍ،

وَاکْتَفٰی فِی ''الْبَحْرِ'' بِمُجَرَّدِ خَلْطِہٖ بِتُرَابٍ''۔

ترجمہ:''آدمی کے پاخانے کی بیع باطل ہے،جس میں مٹی غالب نہ ہواور اگر مٹی غالب ہو اور وہ مغلوب ہو،تو بیع جائز ہے،جیسے گوبر اور مینگنی کی بیع جائز ہے اور''البحر الرائق''میں تو محض مٹی کے مل جانے پر اکتفا کیا ہے(یعنی مٹی کے غالب ہونے کی بھی قید نہیں لگائی)''۔

(ردالمحتار علی الدر المختار،جلد 7،ص:179،بیروت)

## بینک ملازمین کی ایڈوانس تنخواہوں پر اضافی وصولی ناجائز ہے

**سوال:**

بینک ملازمین کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے ادارے سے کچھ ماہ کی تنخواہیں پیشگی (Advance) لے سکتے ہیں،اس رقم کی کٹوتی ان کی ماہانہ تنخواہ سے بالاقساط ہوتی ہے اور اس رقم پر بینک کچھ فیصد اضافی بھی لیتا ہے،کیا یہ سود ہے؟

(محمد صدیق،ایڈیٹر ماہنامہ شمشاد،چمن)

**جواب:**

بینک اپنے ملازمین کو کچھ ماہ کی ایڈوانس تنخواہ کے نام پر جو رقم دیتا ہے،یہ قرض ہے اور اس کی یکمشت یا بالاقساط ادائی بینک ملازم پر واجب ہے،لیکن بینک قرض کی اصل رقم پر جو کچھ فیصد اضافی رقم لیتا ہے،یہ سود ہے اور یہ شریعت کی رُو سے ناجائز ہے،اگر اس اضافی ادائی کے بغیر ایڈوانس نہ مل سکتا ہو،تو پھر یہ نہیں لینا چاہیے،اپنے وسائل میں گزارہ کریں۔

شرعی اصول ہے:''قرض پر حاصل ہونے والا نفع سود ہے''۔حدیث پاک میں ہے:

''کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَۃً فَھُوَ رِبًوا، اَلْحَارِثُ عَنْ عَلِیٍّ''۔

ترجمہ:''یعنی قرض پر منفعت حاصل ہو،وہ سود ہے،(اس کی تخریج حارث نے سیدنا علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہُ الْکَرِیْم سے کی اور حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہُ الْکَرِیْم نے اس کو نبی کریم ﷺ سے روایت کیا)،(کنزالعمال:15516)''۔

# سیکورٹی کی ملازمت

## سوال:

میں ایک سیکیورٹی کمپنی میں ملازم ہوں، میری ڈیوٹی زرعی ترقیاتی بنک کی سیکورٹی کی ہے۔ یہ سیکیورٹی کمپنی بنک کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ میری تنخواہ اور دیگر مراعات سیکورٹی کمپنی کی طرف سے ہی آتی ہے۔ کیا میرا اس سیکورٹی کمپنی میں کام کرنا جائز ہے؟۔ کہیں میں سود میں ملوث تو نہیں ہوں اور یہ کہ میں یہ نوکری جاری رکھ سکتا ہوں کہ نہیں؟

(طارق محمود، لاہور)

## جواب:

زرعی ترقیاتی بینکوں کو گورنمنٹ اپنے بجٹ سے رقم دیتی ہے، جس سے بینک کاشتکاروں کو آسان اقساط پر قرض فراہم کرتا ہے۔ بینک کے جو ملازم سود کا حساب کتاب لکھتے یا طے کرتے ہوں، اُن کی ملازمت ناجائز ہے، ڈرائیور اور چوکیدار کی ملازمت اور تنخواہ جائز ہے۔

مفتی وقارالدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”بینکوں میں صرف سود ہی کی رقم نہیں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ بینک میں تو ملک کے تمام ٹیکس جمع ہوتے ہیں اور دوسرے بینک جب کھولے جاتے ہیں تو ابتداءً اس کے شرکاء اپنے روپے سے شروع کرتے ہیں، اس کے بعد لوگوں کے روپے بھی اس میں جمع ہوتے ہیں اور لوگ بینک سے قرض بھی لیتے ہیں اور سود کا لینا دینا شروع ہوتا ہے۔ بینک اس کے علاوہ اور بہت سے کام کرتے ہیں، لہٰذا بینک کا سرمایہ مخلوط ہوجاتا ہے، اس سے تنخواہ لینے کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مخلوط آمدنی سے دوسرے لوگوں کا لینا جائز نہیں ہوتا ہے اور اگر بینکوں سے تنخواہ وغیرہ لینا حرام ہوجائے تو پھر پاکستان کے کسی بھی شخص کی آمدنی حلال نہیں رہے گی۔ بینکوں میں ملازمت کرکے تنخواہ لینے کی دو صورتیں ہیں: اگر ملازم کو سود لکھنا پڑتا ہے تو اس کی ملازمت بھی ناجائز اور تنخواہ لینا بھی ناجائز۔ احادیث میں سود کا کاغذ لکھنے والے کے

بارے میں سخت وعید آئی ہے اور جن ملازمین کو سود لکھنا نہیں پڑتا مثلاً دربان اور ڈرائیور وغیرہ تو ان کی ملازمت بھی جائز ہے اور تنخواہ بھی، (وقار الفتاوی، جلد سوم، ص:325)"۔

ہماری فہم کے مطابق علامہ مفتی وقار الدین رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی آمدنی مخلوط ہے، یعنی کچھ جائز ہے اور کچھ ناجائز، تو اپنا حق لینے والا یہ سمجھے کہ میں آمدنی کے جائز حصے سے اپنا حق لے رہا ہوں، نہ کہ ناجائز حصے سے اور ناجائز پیسہ اپنی جگہ ناجائز ہی رہتا ہے مگر جائز پیسے کو ناجائز نہیں بناتا۔

## سپروائزری سرٹیفکیٹ کا معاوضہ

**سوال:**

میں ایک انجینئر ہوں، ملازمت کے حصول میں آسانی کے لیے انجینئرنگ کونسل نے ہمیں سپروائزری سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے۔ کچھ ادارے ہمیں ملازمت دینے کے بجائے صرف سرٹیفکیٹ استعمال کرنے کے لیے ہمیں کچھ معاوضہ دینے کو تیار ہوتے ہیں، جس کی بنا پر وہ اپنے ادارے میں ہمیں ملازم ظاہر کرتے ہیں۔ کیا ہمیں اس رقم کا لینا درست ہے؟

(محمد احسان، کراچی)

**جواب:**

اجارے کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ ادارہ کام کی نوعیت، مدت اور اجرت کا تعین کر کے آپ کے ساتھ خدمات کا اجارہ کرے، اس میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے۔ لیکن آپ نے جو صورت بتائی ہے، یہ جھوٹ اور دھوکا دہی کی ہے کہ آپ کے نام "پاکستان انجینئرنگ کونسل" کے جاری کردہ سرٹیفکیٹ کو دکان پر آویزاں کر کے دکاندار یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کے ہاں کام کی نگرانی باقاعدہ ایک کوالیفائیڈ انجینئر کرتا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پس آپ کے لیے یہ اُجرت اور آپ دونوں کا یہ عقد ازروئے شریعت ناجائز ہے، حدیث پاک میں ہے: "مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا"۔ ترجمہ: "جس نے ہمیں دھوکا دیا، وہ ہم میں سے نہیں، (صحیح مسلم:283)"۔ آپ کے لیے اُس رقم کا لینا بھی جائز نہیں ہے۔

# کمپنی کا تاخیر سے آنے پر جرمانہ عائد کرنا

**سوال:**

میں ایک کمپنی میں نومبر 2015ء میں اکاؤنٹنٹ لگا، مجھے بتایا گیا کہ آپ کی ڈیوٹی صبح10 بجے تا شام 6 بجے اور تنخواہ 25 ہزار روپے ہے، اس کے علاوہ کوئی بات نہیں بتائی گئی، میں نے جون2016 تک کام کیا۔ اکثر آدھا گھنٹہ تاخیر سے جاتا تھا، کمپنی والے کہتے تھے کہ ٹائم پر آیا کریں۔ میں نے 5 جولائی کو جون کی تنخواہ مانگی تو جواب ملا کہ آپ تاخیر سے آتے ہیں، لہٰذا آپ سے پچاس ہزار روپے بطور جرمانہ کاٹیں گے، پچیس ہزار تنخواہ سے لے لیے اور بقیہ پچیس ہزار مجھ سے طلب کیے۔ جون کے مہینے اور جولائی کے پانچ دن کی تنخواہ =/29000 روپے بنتی تھی، جب کمپنی والوں نے مجھے تنخواہ دینے سے انکار کیا اور مجھ سے مزید پچیس ہزار روپے طلب کیے تو میرے پاس کمپنی کے چوبیس ہزار روپے جو تعمیرات کے لیے مجھے دیئے تھے اور وہ میں نے بطور تنخواہ رکھ لیے اور کمپنی کو مطلع کر دیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ میرا یہ عمل درست ہے یا نہیں؟ (محمد ریحان، ناظم آباد کراچی)

**جواب:**

بحیثیت ملازم ڈیوٹی کے اوقات کی پابندی کرنا آپ پر لازم تھا اور آپ کی ذمے داریوں کا تعین کرنا ادارے کا کام تھا۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ تاخیر سے آتے تھے، فرض کریں کہ مہینے میں ایامِ کار 26 دن بنتے ہیں، تو آپ کا مجموعی ناغہ 13 گھنٹے بنتا ہے، کمپنی حساب کر کے آپ کی تیرہ گھنٹے کی تنخواہ منہا کرنے کی مجاز ہے، باقی تنخواہ کی ادائی کمپنی کے ذمے لازم ہے۔ کمپنی کا پورے ماہ کی تنخواہ کاٹ دینا اور مزید پچیس ہزار روپے جرمانے کے طور پر وصول کرنا ناجائز ہے۔ اسی طرح آپ کا 24 ہزار روپے بلا اجازت روک لینا ناپسندیدہ عمل ہے، لیکن اگر کمپنی آپ کا جائز حق دینے پر رضامند نہ ہو تو آپ تیرہ گھنٹے کی اُجرت وضع کر کے باقی رقم رکھ سکتے ہیں۔

شریعت میں تعزیر بالمال منسوخ ہے، علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَأَفَادَ فِي الْبَزَّازِيَّةِ أَنَّ مَعْنَى التَّعْزِيرِ بِأَخْذِ الْمَالِ عَلَى الْقَوْلِ بِهِ إِمْسَاكُ شَيْءٍ مِنْ مَالِهِ عَنْهُ مُدَّةً لِيَنْزَجِرَ ثُمَّ يُعِيدُهُ الْحَاكِمُ إِلَيْهِ، لَا أَنْ يَأْخُذَهُ الْحَاكِمُ لِنَفْسِهِ أَوْ لِبَيْتِ الْمَالِ كَمَا يَتَوَهَّمُهُ الظَّلَمَةُ إِذْ لَا يَجُوزُ لِأَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ أَخْذُ مَالِ أَحَدٍ بِغَيْرِ سَبَبٍ شَرْعِيٍّ''۔

ترجمہ: ''''بزازیہ'' میں اس پر افادہ بیان کیا کہ تعزیر بالمال کا جہاں قول ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ملزم کا وہ مال کچھ مدت کے لئے روک لیا جائے تاکہ وہ جرم سے باز آجائے، پھر حاکم وہ مال واپس کردے گا، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حاکم اس مال کو اپنے لیے یا بیت المال کے لیے وصول کرے جیسا کہ ظالم لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کیونکہ کسی مسلمان کو شرعی وجہ کے بغیر کسی کا مال لینا جائز نہیں ہے''۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَفِي شَرْحِ الْآثَارِ التَّعْزِيرُ بِالْمَالِ كَانَ فِي ابْتِدَاءِ الْإِسْلَامِ ثُمَّ نُسِخَ''۔

ترجمہ: ''اور ''شرح الآثار'' میں ہے: تعزیر بالمال ابتداءً اسلام میں جائز تھی، پھر منسوخ ہوگئی، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، ص: 77، بیروت)''۔ پس مذکورہ کمپنی کو آپ پر مالی جرمانہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

## سونا قرض پر لے کر ادا کرنے کا طریقہ

**سوال:**

مجھے رقم کی سخت ضرورت تھی میں نے اپنے عزیز سے بات کی اس نے اپنا سونا مجھے دیا میں نے اس کو بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لی اب میں یہ قرض لوٹانا چاہتا ہوں معلوم یہ کرنا ہے واپسی کی صورت کیا ہوگی؟، جتنا سونا لیا اسی کی مقدار میں سونا واپس دیا جائیگا؟ یا بیچتے وقت جتنے کا بکا وہ رقم دی جائے گی، (انس رضا، کراچی)۔

**جواب:**

قرض کا حکم یہ ہے کہ جو چیز لی گئی ہے، اُس کی مثل (اس جیسی) ادا کی جائے۔ قرض کی

واپسی کے وقت قرض کے طور پر لی ہوئی چیز کی مثل دینی ہوگی، نہ اُس سے بہتر اور نہ کمتر، البتہ بہتر ادا کرنے کی صورت میں اگر پہلے سے طے نہیں کیا تھا تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔ علامہ کمال الدین المعروف بابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"إِنَّ الدُّيُوْنَ تُقْضٰى بِأَمْثَالِهَا فَيَجِبُ لِلْمَدْيُوْنِ عَلٰى صَاحِبِ الدَّيْنِ مِثْلُ مَا لِصَاحِبِ الدَّيْنِ عَلَيْهِ"۔

ترجمہ: "قرضوں کی ادائیگی ان کی مثل کے ساتھ ہوتی ہے، پس مدیون (مقروض) پر واجب ہے کہ وہ دائن (قرض خواہ) سے لیے ہوئے قرض کی مثل اس کو لوٹائے"۔

(فتح القدیر، جلد 8، ص:420)

لہٰذا اگر سونا قرض لیا جائے تو جس مقدار میں قرض لیا گیا اتنی ہی مقدار واپس کرنا از روئے شریعت لازم ہے، اس میں سونے کی قیمت کے اتار چڑھاؤ کا کوئی اعتبار نہیں، سونے کی مقدار کا اعتبار ہوگا۔ تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

"عَقْدٌ مَخْصُوْصٌ أَيْ بِلَفْظِ الْقَرْضِ وَنَحْوِهٖ يَرِدُ عَلٰى دَفْعِ مَالٍ بِمَنْزِلَةِ الْجِنْسِ مِثْلِيٍّ خَرَجَ الْقِيْمِيُّ لِاٰخَرَ لِيَرُدَّ مِثْلَهٗ۔۔۔۔ فَيَصِحُّ اسْتِقْرَاضُ الدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيْرِ وَكَذَا كُلُّ مَا يُكَالُ أَوْ يُوْزَنُ أَوْ يُعَدُّ"۔

ترجمہ: "یہ ایک مخصوص عقد کا نام ہے، خواہ قرض کے نام سے ہو یا اس کے ہم معنیٰ کسی نام سے ہو، یہ ایسے مال پر وارد ہوتا ہے جو بمنزلہ جنس کے دوسرے کو مثلی مال سپرد کرنے پر ہوتا ہے، اس سے قیمت والی چیز خارج ہوگئی ۔۔۔۔۔۔ پس دراہم و دنانیر کا قرض کے طور پر لینا صحیح ہے اور اسی طرح ہر وہ چیز جو ناپ تول یا گنتی والی ہو، (جلد 15، ص:197، دمشق)"۔ واضح رہے کہ اُس دور میں درہم چاندی کا ہوتا تھا اور دینار سونے کا اور اس کا ایک مخصوص وزن ہوتا تھا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"لَوِ اسْتَقْرَضَ مِنْ اٰخَرَ حِنْطَةً فَاَعْطٰى مِثْلَهَا بَعْدَ مَا تَغَيَّرَ سِعْرُهَا فَإِنَّهٗ يُجْبَرُ الْمُقْرِضُ

عَلَى الْقَبُوْلِ كَذَا فِي مُخْتَارِ الْفَتَاوٰى وَيَجُوْزُ اِسْتِقْرَاضُ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَزْنًا وَلَا يَجُوْزُ عَدَدًا كَذَا فِي "التَّتَارْخَانِيَةِ"۔

ترجمہ: "اگر کسی نے دوسرے شخص سے گندم قرض لی، تو اس کا نرخ بدل جانے پر بھی اتنی ہی (وزن کی مقدار) دینا ہوگی اور قرض خواہ کو اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، "مختار الفتاویٰ" میں اسی طرح ہے۔ اور سونے اور چاندی کا وزن کے ساتھ ادھار لین دین جائز ہے، گن کر جائز نہیں، "تاتارخانیہ" میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص: 202)"۔ اس میں یہ شرط ہے کہ عقد کے وقت بائع ثمن پر یا مشتری مبیع پر قبضہ کرلے۔

## غنی کا قرض کی ادائی میں تاخیر کرنا مذموم ہے

**سوال:**

آٹھ سال پہلے زید نے بکر سے دس تولے سونا ادھار لیا اور جلد از جلد واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ زید نے بکر کے دس تولے میں سے کچھ واپس کردیا ہے، زید غنی ہے اور سونا واپس کرسکتا ہے، لیکن بقیہ سونا واپس کرنے میں مسلسل ٹال مٹول کررہا ہے۔ اس کے اس عمل پر کیا حکم لگے گا؟، (عبدالرحیم، کورنگی)۔

**جواب:**

مالدار شخص کا قرض کی ادائیگی میں تاخیر کرنا قابلِ مذمت فعل ہے، اس میں اختلاف ہے کہ جو شخص عمداً تاخیر کرے، اس کا یہ فعل گناہ کبیرہ ہے یا نہیں؟، لیکن اگر وہ بار بار اس طرح کرے تو فاسق قرار دیا جائے گا۔ حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غنی کا (قرض کی ادائیگی میں) تاخیر کرنا ظلم ہے، (صحیح بخاری: 2287)"۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب باندھا: "لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالٌ" (جس کا حق ہوتا ہے، اس کو تقاضا کرنے میں سختی کی گنجائش ہوتی ہے) اس کے تحت لکھا:

"وَيُذْكَرُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عُقُوبَتَهُ وَعِرْضَهُ قَالَ سُفْيَانُ: عِرْضُهُ يَقُولُ مَطَلْتَنِي وَعُقُوبَتُهُ الْحَبْسُ"۔

ترجمہ: "اور نبی ﷺ سے روایت ہے: جس کے پاس قرض ادا کرنے کی گنجائش ہو، اس کا تاخیر کرنا اس کی سزا اور اس کی عزت کو حلال کر دیتا ہے، عزت کو حلال کرنا یہ ہے کہ قرض خواہ کہے: تم مجھ سے ٹال مٹول کر رہے ہو اور اس کی سزا اس کو قید کرنا ہے"۔

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ يَتَقَاضَاهُ، فَأَغْلَظَ لَهُ، فَهَمَّ بِهِ أَصْحَابُهُ، فَقَالَ: دَعُوهُ فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ سے ایک شخص نے اپنے قرض کا تقاضا کیا اور اس نے سختی سے بات کی، تو آپ ﷺ کے اصحاب نے اس (کو مارنے یا ڈانٹنے) کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، کیونکہ حق دار کو سختی سے بات کرنے کی اجازت ہوتی ہے، (صحیح بخاری: 2401)"۔

اگر کوئی شخص ادائے قرض کی نیت کر لے تو اُسے تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ قرض کی ادائیگی میں آسانی فرما دیتا ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ أَدَاءَهَا أَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ، وَمَنْ أَخَذَ يُرِيدُ إِتْلَافَهَا أَتْلَفَهُ اللّٰهُ"۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے لوگوں سے مال لیا اور وہ ان کو ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے (ان اموال کو) ادا کرنے کے اسباب مقدر فرما دے گا اور جو لوگوں کے مال (قرض کے طور پر) لے کر ان کو تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو تلف کر دے گا"۔
(صحیح بخاری: 2387)

ضرورت کے بغیر قرض لینا تو کوئی پسندیدہ روش نہیں ہے، لیکن بعض اوقات انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ناگزیر طور پر قرض لیتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وسائل دستیاب

ہوتے ہی جتنی جلدی ممکن ہو، اس قرض سے چھٹکارا حاصل کرے اور جب تک وسائل دستیاب نہ ہوں تو قرض خواہ سے مہلت مانگے اور جو مقروض شخص قرض کی ادائی کا ارادہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسباب پیدا فرماتا ہے۔ اگر کوئی قرض لیتا ہے اور بروقت ادائیگی کی نیت بھی ہے تو قرض لینا مذموم نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس لیے قرض سے پناہ مانگا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بروقت ادائیگی کا اہتمام نہ ہو سکے، صحیح بخاری کی حدیث میں ہے:

''عَنْ عُرْوَةَ أَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، أَخْبَرَتْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يَدْعُوْ فِي الصَّلَاةِ وَيَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ، فَقَالَ لَهُ قَائِلٌ: مَا أَكْثَرَ مَا تَسْتَعِيْذُ يَا رَسُوْلَ اللهِ مِنَ الْمَغْرَمِ، قَالَ: إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ''۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نماز میں دعا مانگتے تھے اور (تعلیمِ اُمّت کے لیے) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے: اے اللہ! میں قرض اور گناہ سے تیری پناہ میں آتا ہوں، تو ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ قرض سے بہت زیادہ پناہ طلب کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص جب مقروض ہوتا ہے تو وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور (قرض ادا کرنے کا) وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، (صحیح البخاری: 2397)''۔

## سونے کا ادھار لین دین

**سوال:**

سونا ادھار لینا جائز ہے یا نہیں؟، (عبدالرحیم، کورنگی)۔

**جواب:**

سونے کا ادھار لین دین جائز ہے، لیکن جس مقدار میں قرض لیا گیا اتنی ہی مقدار واپس کرنا ازروئے شریعت لازم ہے، اس میں سونے کی قیمت کے اتار چڑھاؤ کا کوئی

اعتبار نہیں، سونے کی مقدار کا اعتبار ہوگا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَیَجُوْزُ اِسْتِقْرَاضُ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَزْنًا وَلَا یَجُوْزُ عَدَدًا کَذَا فِی ''التَّتَارْخَانِیَۃِ''۔

ترجمہ: ''اور سونے اور چاندی کو وزن کے ساتھ قرض لینا دینا جائز ہے، گن کر جائز نہیں، ''تاتارخانیہ'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، ص: 202)''۔

## قرض کی واپسی

**سوال:**

ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے: آپ اور آپ کے اہل وعیال کو اللہ تعالیٰ صحت، تندرستی اور سلامتی عطا فرمائے اور آپ کے علم سے مسلمانوں کو مستفید کرے، آپ کی خدمت میں ایک سوال ہے، برائے مہربانی دین کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہماری مشکل دور فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آج سے تقریباً چھ سال پہلے محترمہ روبینہ آفتاب (جو کہ کینیڈا میں مقیم ہیں) نے محمد نذیر ملک (جو کہ پچھلی کئی دہائیوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں)، کو ٹیلیفون کیا کہ وہ اپنے کریڈٹ کارڈ کے بلز اور ان کے اوپر سود کی رقم کی ادائیگیوں میں پھنسی ہوئی ہیں اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے انہوں نے نذیر ملک صاحب سے تیس ہزار کینیڈین ڈالر قرض کے طور پر مانگے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ ایک سال میں یہ رقم واپس کردیں گی۔ اس زمانے میں سعودی ریال کی شرحِ مبادلہ ایک کینیڈین ڈالر کے بدلے میں 3.864 تھی۔ محمد نذیر ملک نے 115,992 سعودی ریال کو اس وقت کے ریٹ کے مطابق روبینہ آفتاب کے اکاؤنٹ میں منتقل کیے اور وہ تیس ہزار کینیڈین ڈالر کی صورت میں اُن کو مل گئے، پیسے بھجوانے کی تاریخ 17 دسمبر 2012 تھی، اس کی رسید بھی موجود ہے۔

ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد روبینہ آفتاب نے نذیر ملک کو دوبارہ سعودیہ میں فون کیا اور کہا کہ ان کے بیٹے کی عنقریب شادی ہونے والی ہے، اس لیے

وہ اس پیسے کو اپنے گھر کی بیسمنٹ کی مرمت میں استعمال کر رہی ہیں، پھر کچھ عرصے بعد انہوں نے کہا: میرے پاس ابھی پیسے نہیں ہیں، لیکن جیسے ہی پاکستان میں موجود خاندانی وراثت والا گھر بکے، آپ اس میں سے میرے پیسے کاٹ لیں۔ اس بات کو آج تقریباً چھ سال گزر چکے ہیں، بالآخر وہ گھر بک گیا ہے۔ ان چھ سالوں میں ریال کی شرحِ مبادلہ تقریباً وہی ہے، جبکہ کینیڈین ڈالر کی شرحِ مبادلہ گر چکی ہے، یعنی وہ devalue ہو چکا ہے، اسی طرح پاکستانی روپیہ کا ریٹ بھی گر چکا ہے۔ نذیر ملک نے روبینہ آفتاب سے تقاضا کیا کہ وہ انہیں قرض ریال کی صورت میں واپس کر دیں یا ریال کی موجودہ شرحِ مبادلہ کے مطابق انہیں کینیڈین ڈالر یا پاکستانی روپے دے دیں۔ اس کے برعکس روبینہ آفتاب کہتی ہیں: ریال سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، میں کینیڈین ڈالر کی موجودہ شرحِ مبادلہ کے مطابق پاکستانی روپے دوں گی، اس صورت میں نذیر ملک صاحب کا نقصان ہو رہا ہے۔ پس سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کا شرعی حل کیا ہے، آیا نذیر ملک صاحب بطورِ قرض دیے گئے سعودی ریال کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں یا روبینہ آفتاب صاحبہ کا موقف درست ہے، ہم آپ کی توجہ اور قیمتی وقت کے بیحد شکر گزار ہیں، (ڈاکٹر شہرام ملک، جانسن سٹی، امریکہ)۔

**جواب:**

آپ کے بیان کے مطابق محمد نذیر ملک صاحب نے سعودی عرب سے سعودی ریال میں محترمہ روبینہ آفتاب کو رقم دی جو اُن کو کینیڈین ڈالرز کی صورت میں ملی۔ لہٰذا انہوں نے جتنے سعودی ریال دیے، اُن کی شرحِ مبادلہ بعد میں کم ہوگئی ہو یا زیادہ، وہ اتنے ریال کے حق دار ہیں اور محترمہ روبینہ آفتاب کو اُتنی مقدار میں سعودی ریال اُن کو واپس کرنے چاہئیں۔ کسی نے احسان کیا ہو تو اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے، ایسے ہی تلخ تجربات کی وجہ سے لوگ ضرورت کے وقت دوسروں کو قرض دینے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا شِعار یہ تھا:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا تَقَاضَى رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَأَغْلَظَ لَهُ فَهَمَّ بِهِ

أَصْحَابُهُ، فَقَالَ: دَعُوهُ، فَإِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا وَاشْتَرُوا لَهُ بَعِيرًا فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ وَقَالُوا: لَا نَجِدُ إِلَّا أَفْضَلَ مِنْ سِنِّهِ، قَالَ: اشْتَرُوهُ فَأَعْطُوهُ إِيَّاهُ، فَإِنَّ خَيْرَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً"۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سخت کے ساتھ (اپنے قرض کا) تقاضا کیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نے اُس (کو ڈانٹنے یا مارنے کا) ارادہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، کیونکہ جس کا حق ہوتا ہے، اس کو بات کرنے گنجائش ہوتی ہے، اس کے لیے ایک اونٹ خرید کر اس کو دے دو، انہوں نے عرض کی: (ہمیں اُس جیسا اونٹ نہیں مل رہا، بلکہ) اس سے بہتر مل رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہی خرید کر اس کو دے دو، کیونکہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرض اچھی طرح ادا کرے، (صحیح البخاری:2390)"۔اس سے محدثین کرام وفقہائے امت نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی مقروض قرض کی واپسی کے وقت تبرُّعاً کچھ زائد دے دے تو یہ جائز ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی، بشرطیکہ یہ زیادتی نہ پہلے سے طے شدہ (Conditional) ہو اور نہ ہی معہود (Understood) ہو۔معہود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو بار بار کا تجربہ ہو کہ یہ شخص جب بھی قرض لیتا ہے، کچھ بڑھا کر دیتا ہے اور اسی اضافے کی امید پر وہ اُسے قرض دے، تو ان دوصورتوں میں یہ زیادتی رِبا ہے اور حرام ہے، ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی ہے۔

البتہ اگر محمد نذیر ملک صاحب نے بازار سے کینیڈین ڈالرز خرید کر روبینہ آفتاب کو بھیجے ہوں تو پھر وہ کینیڈین ڈالرز ہی کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔بہتر یہ ہے کہ قرض کے لین دین کے وقت لوگ یا تو سونے کو معیار بنالیں یا کسی مُستحکم کرنسی کو معیار بنالیں اور طے کرلیں کہ قرض کی واپسی اتنی مقدار سونے یا ڈالر یا یورو یا آسٹریلین پاؤنڈ یا ریال میں ہوگی تاکہ بعد میں جہالت وجہِ نزاع نہ بنے۔میں نے سنا ہے: پاکستان کے قبائلی علاقے میں جب لوگ قرض کا لین دین کرتے ہیں تو وہ دیار کی لکڑی کو مکعب فٹ (Cubic Foot) کے اعتبار سے معیار بنالیتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ہمارے ہاں بہت سی چیزوں کو لوگ معاملہ کرتے

وقت مبہم (Ambiguous) چھوڑ دیتے ہیں اور پھر اس پر تنازعات پیدا ہوتے ہیں، جیسے نکاح کے موقع پر جو تحائف یا زیورات لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کو اور لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو ملتے ہیں، اس کے بارے میں نکاح نامے میں یہ نہیں لکھتے کہ یہ کس کی ملک ہوں گے اور بعد میں تفریق کی صورت میں تنازعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

## قرعہ اندازی کے ذریعے کسی ایک فرد کو کمیٹی کی رقم دینے کا حکم

**سوال:**

ہم دس لوگ مل کر آپس میں کمیٹی مبلغ دس ہزار روپے کی ڈالتے ہیں، اُس کے بعد ہر ماہ کے شروع میں بذریعہ قرعہ اندازی جس کا نام نکل آتا ہے، اُسے وہ رقم مبلغ (ایک لاکھ روپے) دے دی جاتی ہے اس ضمن میں معلوم کرنا تھا کہ آیا یہ کمیٹی ڈالنا جائز ہے یا نہیں۔

(حفیظ اللہ، کوئٹہ)

**جواب:**

قرعہ اندازی قرآن کریم سے بھی ثابت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ''۔

ترجمہ: ''اور آپ اس وقت ان کے پاس نہ تھے، جب وہ (قرعہ اندازی کے لیے) اپنے قلموں کو ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا اور آپ ان کے پاس نہ تھے، جب وہ (اس مسئلے میں باہم) جھگڑ رہے تھے، (آل عمران: 44)''۔

اسی طرح ایک حدیث پاک میں ہے:

''اِنَّ رَجُلًا اَعْتَقَ سِتَّةَ مَمْلُوْكِيْنَ لَهُ عِنْدَ مَوْتِهِ، لَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُمْ، فَدَعَا بِهِمْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، فَجَزَّاَهُمْ اَثْلَاثًا، ثُمَّ اَقْرَعَ بَيْنَهُمْ، فَاَعْتَقَ اثْنَيْنِ، وَاَرَقَّ اَرْبَعَةً، وَقَالَ لَهُ قَوْلًا شَدِيْدًا''۔

ترجمہ: ''ایک شخص نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھ غلاموں کو آزاد کر دیا، ان (غلاموں)

کے علاوہ اس کا کوئی مال نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلایا اور دو دو افراد پر مشتمل تین گروپوں میں تقسیم فرمادیا، پھر آپ نے ان تینوں گروپوں میں قرعہ اندازی فرمائی، جن دو کے نام کا قرعہ نکلا، اُنہیں آزاد کردیا اور باقی چار کو (ترکے کے طور پر) غلام رہنے دیا، آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں سخت کلمات فرمائے، (صحیح مسلم:1668)"۔ یعنی آپ ﷺ نے اس کے اس عمل کو پسند نہیں فرمایا، کیونکہ مرض وفات میں اپنے مال میں تصرُّف وصیت کے درجے میں ہوتا ہے اور وصیت صرف تہائی مال تک جائز ہے۔ اس حدیث مبارک کی تشریح میں فقہی مذاہب ہیں، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں ہے۔

لیکن مندرجہ بالا آیت مبارکہ اور حدیث مبارک اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ کسی ایسی صورت حال میں جہاں سب کا حق برابر ہو اور کسی ایک کی بھی حق تلفی نہ ہوتی ہو، تو ترجیح کے تعین کے لیے قرعہ اندازی جائز ہے۔ پس آپ نے جو صورتِ حال بیان کی ہے، اس میں کمیٹی کے تمام شرکاء کا حق برابر ہے، نہ کسی کا حق تلف ہوتا ہے، نہ کسی کی رقم جزوی یا کلی طور پر ڈوبتی ہے، بلکہ سب کا مال محفوظ اور مضمون (Guaranteed) ہے، بس فقط سب کی رضامندی سے قرعہ اندازی کی جاتی ہے کہ کسے پہلے ملے گا اور کسے بعد میں، اس لیے یہ جائز ہے۔ جس ترتیب سے قرعہ اندازی میں نام آئے گا، جتنی قسطیں وہ ادا کرچکا ہوگا، وہ اس کا اپنا مال ہے اور باقی اقساط اس پر قرض ہوں گی اور جس کا نام سب سے آخر میں آئے، وہ سب اس کا اپنا مال ہے۔ ہاں! یہ شرط لازم ہے کہ جن کے نام بالترتیب شروع میں آئیں، وہ اپنی بقیہ اقساط پابندی سے ادا کریں کہ یہ رقم اُن پر قرض ہے اور ادائی کے لیے اس کو یہ مہلت دی گئی ہے۔

## ٹوکن والے مال کی خرید وفروخت

**سوال:**

میری کلر کی دکان ہے اور میں حلال روزی کمانا چاہتا ہوں، لیکن مجھے اس میں شبہ ہے۔ کلر یا پینٹ بنانے والی اکثر کمپنیاں پینٹ کے ڈبوں میں مختلف مالیت کے ٹوکن ڈال

دیتی ہیں اور ڈبوں پر ٹوکن کی کم مالیت لکھ دیتی ہیں اور اصل قیمت چھپا دیتی ہیں۔ یہ اس لیے کرتی ہیں کہ گاہک رخریدار کو پتا نہ چلے اور پیسے کاریگر کو مل جائیں، دوکان والے اکثر ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر کاریگر خوش ہوگا تو مزید بزنس یا گاہک لے آئیگا اور کاریگر بھی صاف دکان والے کو کہتا ہے کہ اگر آپ نے ٹوکن کی صحیح قیمت گاہک کو بتائی تو ہم آپ کا کلرر پینٹ نہیں اٹھائیں گے اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ گاہک بھی اس کاریگر کی بات مانتا ہے اور دوکان والے کو نقصان ہی ہوتا ہے۔ پھر اکثر کاریگر ٹوکن مالک کو بغیر بتائے دوکان والے کو دے کر اس کے پیسے لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ہیں اور یہی مارکیٹ میں اکثر ہو رہا ہے۔ 1۔کیا ٹوکن کے پیسے پینٹر رکاریگر کو لینا جائز ہے؟ 2۔کیا دوکان والا ہر گاہک کو ٹوکن کی اصل مالیت بتانے کا پابند ہے یا نہیں کیونکہ ایک تو ڈبوں پر مالیت لکھی ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ کمپنی جان بوجھ کر اصل قیمت چھپاتی ہے۔ سوال 3: کچھ کمپنیاں ایسی ہیں جو ٹوکن تو نہیں ڈالتی اور گاہک اس لیے لیتے ہیں کہ چیز اچھی ہوگی لیکن پھر وہی کاریگر کا مسئلہ بیچ آجاتا ہے، اس لیے دوکاندار اس ڈبے کو گاہک کو مہنگا بیچ کر وہی ٹوکن کی قیمت کاریگر کو دے دیتا ہے۔ اب ان حالات میں کیا کیا جائے؟ رہنمائی فرمائیں، (شمس عمرانی، کراچی)۔

**جواب:**

آپ نے سوال میں جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض سیل پیک مصنوعات کے ڈبوں میں ٹوکن رکھے جاتے ہیں، یہ لوگوں کی بشری کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا حربہ ہے۔ تاہم اگر مال کی مقدار اور معیار درست ہے، اسے پیکٹ یا ڈبے پر بیان کیے گئے فارمولے کے مطابق بنایا گیا ہے اور کوئی خیانت نہیں کی گئی تو ڈبے یا پیکٹ کے اندر انعامی ٹوکن رکھنے سے کوئی شرعی خرابی لازم نہیں آتی، بشرطیکہ جس کے نام نکلے، اسے انعام دیدیا جائے اور ظاہر ہے یہ انعام اس کا حق ہے، جس کے پیسے سے یہ مال خریدا گیا ہے، ہاں! اگر وہ خود کاریگر سے کہے: تم رکھ لو تو ٹھیک ہے۔ بائع اور مشتری کے درمیان جس قیمت پر اتفاق ہوجائے، اس پر شرعاً بیع جائز ہوتی ہے۔ لیکن آپ کی بیان کردہ

مثالوں میں "کاریگر یا پینٹر" ایک تیسرا فریق ہے اور اصل خریدار سے بالا دکاندار اور کاریگر میں کمیشن کا ایک غیر علانیہ معاہدہ ہوتا ہے، جس سے اصل خریدار کو بے خبر رکھا جاتا ہے، یہ غَرر ہے، اسے ہم انگریزی میں Deception اور Betray سے تعبیر کر سکتے ہیں۔
مغربی ممالک میں مصنوعات پر قیمتیں درج ہوتی ہیں اور اگر کسی پروڈکٹ پر کمیشن یا ڈسکاؤنٹ دینا ہو تو وہ بھی Cash Memo پر درج ہوتا ہے، یہاں بھی بعض بڑے ڈیپارٹمنٹل یا سپر اسٹور شاید ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری مارکیٹ کی معیشت بحیثیت مجموعی دستاویزی (Documented) نہیں ہوتی، مصنوعات پر قیمتیں درج نہیں ہوتیں، اس لیے اس طرح کے چور دروازے کھلے رہتے ہیں۔ مصنوعات پر قیمتیں درج نہ ہونے کے سبب بارگیننگ (یعنی بھاؤ تاؤ) کی گنجائش رہتی ہے، جو گاہک جس طرح پھنس جائے۔ اس طرح کے ضابطے حکومت ہی بنا سکتی ہے کہ ہر قابل ذکر پروڈکٹ پر اس کی قیمت درج ہو اور کمیشن یا ڈسکاؤنٹ کا فارمولا بھی واضح ہو۔

ہم نے دکان پر اپنے عالم کو بھیج کر معلومات حاصل کیں، ان کو دکاندار نے جو معلومات فراہم کیں، وہ یہ ہیں: پہلے صرف دیسی کمپنیاں ڈبوں میں ٹوکن رکھتی تھیں، پھر ملٹی نیشنل کمپنیوں نے عدالت سے رجوع کیا تو عدالت نے تمام کمپنیوں کو ٹوکن کی مالیت ڈبوں پر لکھنے کا پابند کیا، اس کے بعد ایک آدھ کمپنی کے سوا ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بھی ٹوکن رکھنا شروع کر دیے، لیکن اب ہوتا یہ ہے کہ: مثلاً ڈبے پر سو روپے لکھا ہے، تو اندر سو سو روپے کے دو ٹوکن نکلیں۔ دکاندار کا اس میں کردار یہ ہے کہ جو شخص ٹوکن لے کر آئے، خواہ کاریگر ہو یا مالک یعنی اصل خریدار، دکاندار اس کو ٹوکن پر درج رقم ادا کر دیتا ہے اور دکاندار اس ادائیگی پر کمپنی سے سروس چارج لیتا ہے، جس طرح بجلی، گیس اور ٹیلیفون کے یوٹیلیٹی بل بنک وصول کرتے ہیں اور اُن اداروں سے طے شدہ سروس چارج لے لیتے ہیں، اس صورت میں دکاندار کا کاروبار شرعاً حلال ہے۔

پینٹر یا کاریگر کو چاہیے کہ وہ اصل خریدار یا مالک کو بتادے کہ اس میں ٹوکن ہے اور آپ مجھے اجازت دیدیں کہ ٹوکن کے پیسے لے کر میں رکھ لوں، اگر مالک اجازت

دیدے، تواس کے لیے یہ جائز ہو جائے گا اور اگر وہ اصل خریدار یا مالک سے چھپا کر خود وصول کر لیتا ہے تو یہ خیانت ہے اور مالِ حرام ہے۔ اگر مالک کہے کہ میں ٹوکن کے برابر رقم تمہاری اُجرت سے کاٹوں گا تو یہ جائز ہے، لیکن اس سے سیلز پروموشن کے لیے کمپنی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اب اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کمپنی ٹوکن کی مالیت کے برابر مال کی کوالٹی (معیار) یا مقدار میں کمی کرتی ہے، تو یہ کمپنی کی خیانت ہے اور فعلِ حرام ہے۔ اگر کمپنی مال کی مقدار اور معیار میں کمی نہیں کرتی بلکہ اپنے منافع میں سے یہ رعایت دیتی ہے تو اس میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے، لیکن یہ کاریگروں کی بشری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے کاروبار کو بڑھاوا دینا ہے تو یہ اخلاقاً درست نہیں ہے، کیونکہ اس سے اخلاقی کمزوریاں فروغ پاتی ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ ٹوکن وغیرہ کچھ نہیں ہے، بس دکاندار کاریگر کا خفیہ معاہدہ ہوتا ہے کہ تم مجھ سے مال لو اور میں تمہیں فلاں مال پر اتنے فیصد الگ سے دوں گا اور وہ مال معیار اور مقدار کے حساب سے ناقص ہوتا ہے، یہ کمیشن کاریگر کے لیے ناجائز ہے، کیونکہ اس کا نقصان اصل خریدار کو پہنچتا ہے اور دکاندار کا کاریگر کے ساتھ یہ خفیہ معاہدہ بھی ناجائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے: ''وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''۔ ترجمہ: ''اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ (اور حدِ شرع سے) تجاوز کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو، (المائدہ:2)''۔ اور یہاں کاریگر اور دکاندار خیانت کرنے میں ایک دوسرے کے معاون بن رہے ہیں۔

## عاقدین کا باہمی رضامندی سے بیع کو فسخ کرنا

### سوال:

عامر نے اپنا مکان سلیم کو تین سال کی قسطوں پر ساڑھے چار لاکھ روپے میں فروخت کیا، سلیم نے ایک لاکھ نواسی ہزار روپے قسطوں میں ادا کیے، دو لاکھ اکسٹھ ہزار روپے اس کے ذمے واجب الادا ہیں، چھ سال کا عرصہ گزر چکا، سلیم نے مزید کوئی رقم ادا نہیں کی۔ اب عامر نے سلیم سے یہ طے کیا ہے کہ یہ مکان مجھے فروخت کر دو۔ اب دونوں اس بات پر

رضامند ہیں کہ عامر سلیم کو ایک لاکھ نواسی ہزار روپے واپس کردے اور سلیم عامر کو مکان کا قبضہ دے دے گا، کیا یہ سودا جائز ہے؟، (عامر، کورنگی)۔

**جواب:**

فریقین کے درمیان کسی عقد کے ختم کرنے یا دوسرے کے کہنے پر مبیع یا ثمن لوٹا دینا اور دوسرے کا لے لینا، شرعی اصطلاح میں ''اقالہ'' کہلاتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ أَقَالَ مُسْلِمًا أَقَالَهُ اللهُ عَثْرَتَهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی مسلمان سے اقالہ کیا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کی لغزش دفع فرمادے گا، (سُنن ابوداؤد: 3460)''۔ اقالہ کے معنی ہیں: ''بائع اور مشتری کا باہمی رضامندی سے بیع کا فسخ کرلینا بایں طور پر کہ بائع مبیع کو واپس لے لے اور مشتری کو ثمن واپس کردے''۔

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''فَعَبَّرَ بِالْعَقْدِ وَيَصِحُّ بِلَفْظَيْنِ مَاضِيَيْنِ وَهٰذَا رُكْنُهَا أَوْ أَحَدُهُمَا مُسْتَقْبَلٌ كَأَقِلْنِي فَقَالَ أَقَلْتُكَ''۔

ترجمہ: ''اسے عقد سے تعبیر کیا ہے اور یہ ماضی کے دو لفظوں کے ساتھ صحیح ہوتا ہے اور یہی اس کا رکن ہے یا دونوں میں سے ایک مستقبل کا صیغہ ہو جیسے ایک نے کہا: تو میرے ساتھ اقالہ کر، دوسرے نے کہا: میں نے تیرے ساتھ اقالہ کیا''۔

(حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 15، ص: 53، دمشق)

جو ثمن بیع میں تھا، اُسی پر یا اُس کی مثل پر اقالہ ہوسکتا ہے، اگر کم یا زیادہ پر اقالہ ہوا تو شرط باطل ہے اور اقالہ صحیح ہوگا یعنی اتنا ہی دینا ہوگا جو بیع میں ثمن تھا۔ علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَإِنْ شَرَطَ أَكْثَرَ مِنْهُ أَوْ أَقَلَّ فَالشَّرْطُ بَاطِلٌ وَيَرُدُّ مِثْلَ الثَّمَنِ الْأَوَّلِ''۔

ترجمہ: ''پس اگر ثمنِ اول سے زیادہ یا اس سے کم کی شرط لگائی، تو شرط باطل ہے اور بائع ثمنِ

اول کا مثل ہی واپس کرے گا''۔ مزید لکھتے ہیں:

'' فَالْاِقَالَةُ عَلَی الثَّمَنِ الْاَوَّلِ لِتَعَذُّرِ الْفَسْخِ عَلَی الزِّیَادَةِ، اِذْ رَفْعُ مَا لَمْ یَکُنْ ثَابِتًا مُحَالٌ فَیَبْطُلُ الشَّرْطُ، لِاَنَّ الْاِقَالَةَ لَا تَبْطُلُ بِالشُّرُوْطِ الْفَاسِدَةِ، بِخِلَافِ الْبَیْعِ''۔

ترجمہ: ''پس اقالہ ثمنِ اوّل پر ہی ہوگا، کیونکہ زیادتی پر بیع کا فسخ کرنا متعذر رہے کیونکہ اقالہ شروطِ فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا، بیع کا معاملہ اس کے برعکس ہے (کہ وہ شروطِ فاسدہ سے باطل ہوجاتی ہے)، (ہدایہ، جلد 5، ص:149)''۔ پس صورتِ مسئولہ میں آپ سلیم کو اُس سے وصول کی ہوئی رقم ایک لاکھ نواسی ہزار روپے واپس کردیں اور وہ آپ کو مکان کا قبضہ دیدے، تو یہ اقالہ (یعنی فسخِ بیع) شرعاً درست ہوگا۔

## انعامی رقم ٹیکس کی مد میں ادا کرنا

### سوال:

میں نے پڑھا تھا کہ حکومت کا عوام پر غیر ضروری ٹیکس لگانا حرام ہے اور عوام کا ان ٹیکس سے بچنے کے لیے حیلے بہانے کرنا درست ہے، اگر کوئی ٹیکسیشن کا ماہران کو ظلم قرار دے تو آج کل اس ظالمانہ ٹیکس سے بچنا ناممکن ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم پرائز بونڈ کے انعام سے ملنے والی رقم سے ٹیکس ادا کرسکتے ہیں؟، کیونکہ پرائز بونڈ حرام ہیں تو کیا ہم اگر خود پرائز بونڈ کی انعامی رقم استعمال نہ کریں بلکہ حکومت سے ہی لے کر حکومت کو ہی ٹیکس کی مد میں ادا کردیں تو کیا ایسا کرسکتے ہیں؟ (عبدالروف، کراچی)۔

### جواب:

آپ کا یہ نظریہ درست نہیں کہ پرائز بانڈ حرام ہیں، اس لیے اُن پر حاصل ہونے والا انعام ٹیکس کی مد میں دینا چاہیے۔ انعامی بانڈز کی خرید وفروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز ہے، بانڈ پر درج قیمت (Face value) پر خرید وفروخت میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ اس کی انعامی رقم کے جواز پر علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے علماء اہلسنت وجماعت کے نزدیک یہ انعامی رقم لینا جائز ہے، اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ

اختلاف فقہی دلائل کی بنیاد پر ہے، یہ مسلکی نوعیت کا اصولی یا اعتقادی اختلاف نہیں ہے۔
ہر دور کے نئے پیش آنے والے مسائل ''مجتہد فیہ'' ہوتے ہیں، یعنی جن پر اُس عہد کے اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم کو شرعی دلائل کی روشنی میں جواز یا عدمِ جواز کا حکم لگانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات علماء کی فقہی آراء اِن کے بارے میں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں عام مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ جن علماء کی فقاہت، اجتہادی اہلیت اور علمی دیانت پر انہیں زیادہ اعتماد ہے، اُن کی رائے پر عمل کریں۔ لیکن یہ ترجیح دین داری اور آخرت کی جوابدہی کی بنیاد پر ہونی چاہیے، نہ کہ محض خواہشِ نفس کا اِتّباع کیا جائے۔ ان بانڈز کا اجراء حکومتِ پاکستان کرتی ہے، بینک نہیں کرتے، وہ صرف ان کی خرید وفرخت کے لیے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں، اِس میں کوئی سودی معاہدہ بھی شامل نہیں ہے، نہ مشروط (Conditional) اور نہ معہود (Understood)۔ یہ اختلاف ربٰو کی حرمت میں نہیں ہے، کیونکہ ربٰو کی حُرمت تو قطعی ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ انعامی بانڈز پر دیا جانا والا انعام سود ہے یا نہیں۔
جن علماء نے اسے حرام قرار دیا، انہوں نے اسے سود اور قمار (Gambling) کہا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ فتویٰ دلائل کی بنیاد پر درست نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تفہیم المسائل کی جلد چہارم میں ہم لکھ چکے ہیں اور اگر کسی کو مزید تفصیلی دلائل سے آگہی مطلوب ہو تو علامہ غلام رسول سعیدی کی شرح صحیح مسلم جلد 4، ص: 111 تا 126، علامہ مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ کی وقار الفتاویٰ، جلد اول، ص: 226 تا 232 اور مفتی رفیق حسنی صاحب کی ''رفیق الفقہاء'' کا مطالعہ فرمائیں۔

## پیشگی ماہانہ کرائے کی واپسی لازم نہیں ہے

**سوال:**

کسی شخص نے مکان کرایہ پر لیا اور عرف کے مطابق ماہانہ کرایہ بھی پیشگی ادا کر دیا، اب اگر کسی مجبوری کے سبب کرایہ دار چند دن بعد ہی مکان خالی کر دے، مثلاً آٹھ دن بعد مکان خالی کر دیا، تو کیا اب بقیہ 22 دن کا کرایہ واپس لینے کا حق دار ہے، (منور احمد، ملیر)۔

**جواب:**

کرایہ پیشگی ادا کرنے کی صورت میں جتنے ماہ کے لیے مکان کرائے پر دیا اتنی مدت کے لیے اجارہ منعقد اور لازم ہوگیا، لہٰذا کرائے دار یک طرفہ اجارہ ختم نہیں کرسکتا، یک طرفہ اجارہ ختم کرنے کی صورت میں باقی مدت کے کرائے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثُمَّ الْأُجْرَةُ تَسْتَحِقُّ بِأَحَدِ مَعَانٍ ثَلَاثَةٍ: إِمَّا بِشَرْطِ التَّعْجِيلِ أَوْ بِالتَّعْجِيلِ أَوْ بِاسْتِيفَاءِ الْمَعْقُودِ عَلَيْهِ، فَإِذَا وُجِدَ أَحَدُ هٰذِهِ الْأَشْيَاءِ الثَّلَاثَةِ فَإِنَّهُ يَمْلِكُهَا، كَذَا فِي ''شَرْحِ الطَّحَاوِيِّ'' وَكَمَا يَجِبُ الْأَجْرُ بِاسْتِيفَاءِ الْمَنَافِعِ يَجِبُ بِالتَّمَكُّنِ مِنِ اسْتِيفَاءِ الْمَنَافِعِ إِذَا كَانَتِ الْإِجَارَةُ صَحِيحَةً حَتّٰى اَنَّ الْمُسْتَأْجِرَ دَارًا أَوْ حَانُوتًا مُدَّةً مَعْلُوْمَةً وَلَمْ يَسْكُنْ فِيهَا فِي تِلْكَ الْمُدَّةِ مَعَ تَمَكُّنِهِ مِنْ ذٰلِكَ تَجِبُ الْأُجْرَةُ، كَذَا فِي ''الْمُحِيطِ''۔

ترجمہ: ''پھر اُجرت کا استحقاق تین باتوں میں سے کسی کے پائے جانے سے ہوتا ہے یا تو تعجیل شرط ہو یا تعجیل کرکے ادا کردے یا جس منفعت کے لیے اجارہ کیا ہے، وہ منفعت حاصل کرلے، پس جب ان تین باتوں میں سے کوئی بات پائی گئی تو مُوْجِر (مکان یا دکان کا مالک یعنی Land Lord) اُجرت کا مالک ہوگیا، جیسا کہ ''شرح الطحاوی'' میں ہے، اور جس طرح منفعت حاصل کرلینے سے اجرت واجب ہوتی ہے، اسی طرح منفعت حاصل کرنے کی قدرت پائے جانے سے بھی واجب ہوجاتی ہے بشرطیکہ اجارہ صحیح ہو، حتی کہ اگر کسی شخص نے کوئی دکان یا مکان کسی معلوم مدت کے لیے کرایہ پر لیا، اس مکان یا دکان میں اس مدت تک نہ رہا حالانکہ وہ اس پر قادر تھا (یعنی کوئی مانع نہ تھا)، وہ رہ سکتا تھا تو کرایہ واجب ہوگا، ''محیط'' میں اسی طرح ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:413)''۔

پس دریافت کردہ صورت میں کرایہ دار پر پورے مہینے کا کرایہ لازم ہے اور اگر وہ مہینے کے دوران خالی بھی کردے تو بقیہ دنوں کا کرایہ واپس لینے کا حق دار نہیں ہے، کیونکہ پورے مہینے کا پیشگی کرایہ دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اجارہ پورے مہینے کے لیے ہے۔

# متفرقات

# خواب کی تعبیر

## سوال:

میری والدہ دو سال قبل فوت ہوئیں، وہ کینسر کی مریضہ تھیں اور تکلیف کاٹتے فوت ہوگئیں۔ میں ہر روز رات کو سونے سے پہلے اپنی والدہ کے ایصالِ ثواب کے لئے سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ کے رکوع اور آیت الکرسی اور سورۂ ملک، درود پاک اور قل شریف پڑھتا ہوں۔ اکثر و بیشتر ان کے نام کا صدقہ کھانے کی شکل میں غریبوں کو بانٹتا ہوں یا پیسوں کی شکل میں دیتا رہتا ہوں۔ ابھی ۱۰ محرم والے دن بھی غریبوں کو کھانا کھلایا۔ کل رات غالباً فجر سے آدھا گھنٹہ قبل خواب میں دیکھا: میری والدہ بیمار نہیں ہیں، بالکل ٹھیک ہیں، مجھے اپنے ساتھ لیا، گھر کی گیلری میں لے گئیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں اور میرا سر پکڑ کر نیچے کیا، پھر میرے ماتھے پر بوسہ دیا، میرے ہاتھ میں پرانا زرد چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا تھا، اس پر سورۂ بقرہ کی آخری تین آیات: ''لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ'' لکھی تھیں، خواب کے بعد میرا گمان بن گیا کہ یہ بھی امی کے لیے پڑھوں۔ یاد نہیں کہ انھوں نے اشارہ دیا یا خود سوچ لیا۔ پھر آج صبح میں نے امی کے لیے فجر کی نماز کے بعد وہ آخری تین آیات بھی احتیاطاً پڑھ دی۔ پھر کل رات ہی ایک اور خواب دیکھا کہ میں نے گھر میں ایک مرغی پکڑی اور اس کو ذبح کرنا چاہا لیکن اس کا سر خود الگ ہوگیا اور خون بھی نہیں نکلا۔ بہر حال میں نے فوراً اس کے گلے پر چھری پھیری اور دور تک خون کی دھار کو جاتے دیکھا، (محمد طاہر مشتاق، نئی دہلی، انڈیا)۔

## جواب:

آپ نے خواب میں کاغذ کے ٹکڑے پر سورہ بقرہ کی آخری آیات لکھی ہوئی دیکھیں، احادیث میں ان آیات کی بڑی فضیلت وارد ہے، خواب کی تعبیر کے حوالے سے بھی اس کی برکات مسلم ہیں، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: مَنْ قَرَأَ بِالْاٰیَتَیْنِ مِنْ

آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِیْ لَیْلَةٍ کَفَتَاهُ"۔

ترجمہ:"حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات کو سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات پڑھے گا، وہ (آیات) اس کو کافی ہوں گی"۔
(صحیح البخاری:500)

تعبیر الرویا کے مستند عالم علامہ عبدالغنی النابلسی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"(وَمَنْ رَاٰی) اَنَّهٗ قَرَاَ (سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ) فِی الْمَنَامِ اَوْ شَیْئًا مِّنْهَا اَوْ تُلِیَتْ عَلَیْهِ، قَالَ نَافِعٌ وَابْنُ کَثِیْرٍ :یُرْزَقُ عِلْمًا وَعُمُرًا طَوِیْلًا وَصَلَاحًا فِیْ دِیْنِهٖ وَنَجَاةً فِیْ وَلَدِهٖ وَوَافَقَهُ الْکِسَائِیْ عَلٰی ذٰلِكَ، وَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا:مَنْ تَلَاهَا فِیْ مَنَامِهٖ اَوْ بَعْضَهَا اِنْتَقَلَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ وَیَکُوْنُ حَظُّهٗ فِی الْمَوْضِعِ الَّذِیْ یَنْتَقِلُ اِلَیْهِ، وَقَالَ ابْنُ فَضَالَةَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰی: اِنْ تَلَاهَا فِی النَّوْمِ اِنْ کَانَ قَاضِیًا قَرُبَتْ مُدَّتُهٗ وَاِنْ کَانَ عَالِمًا طَالَ عُمُرُهٗ وَحَسُنَتْ حَالَتُهٗ، وَقَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ: مَنْ قَرَاَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ فَاِنَّهٗ یَکُوْنُ جَامِعًا لِلدِّیْنِ مُسَارِعًا اِلٰی کُلِّ ثَوَابٍ وَیَکُوْنُ طَوِیْلَ الْعُمُرِ قَلِیْلَ الشَّرِّ صَابِرًا عَلَی الْاَذٰی"۔

ترجمہ:"اور جس نے خواب میں دیکھا کہ اس نے سورۂ بقرہ یا اس کا کوئی حصہ پڑھا یا اس کے سامنے پڑھا گیا، امام نافع اور علامہ ابن کثیر نے کہا: اس کو علم، درازیِ عمر اور دین کی راستی اور اولاد میں کامیابی نصیب ہوگی اور امام کسائی نے ان کی موافقت کی ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: جو سورۂ بقرہ یا اس کے کچھ حصے کو خواب میں تلاوت کرے، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگا اور اس کا حصہ اس جگہ ہوگا جہاں وہ منتقل ہوگا اور ابن فضالہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر قاضی خواب میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کرے اس کی مدت قریب ہوگی اور اگر پڑھنے والا عالم ہے، تو اس کی عمر دراز ہوگی اور اس کی حالت اچھی ہوگی اور بعض علماء نے کہا: جس نے سورۂ بقرہ (خواب میں) پڑھی تو وہ دین کا جامع اور ہر ثواب کی طرف جلدی کرنے والا ہوگا اور اس کی عمر طویل ہوگی اس کا شر کم ہوگا اور مصیبتوں پر صبر کرنے والا

ہوگا، (تعطیرالانام باب السین)''۔

علامہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَمن قَرَاَ سُوْرَۃَ الْبَقَرَۃِ فِی مَنَامِہٖ جَمَعَ اللّٰہُ لَہٗ دِیْنَہٗ وَسَارَعَ اِلٰی کُلِّ خَیْرٍ وَعَاشَ طَوِیْلاً''۔

ترجمہ: ''اور جو خواب میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کرے، اللہ اس کے لیے اس کے دین (کی سعادات) کو جمع فرماتا ہے اور وہ ہر بھلائی کی طرف سبقت کرتا ہے اور لمبی عمر پاتا ہے، (تعبیرالرؤیا بَابُ سُوَرِ القرآن)''۔ الغرض خواب میں سورۂ بقرہ یا اس کے کچھ حصے کی تلاوت کرنا یا سننا، نیک فال ہے اور ہر شخص اپنے مقتضیٰ حال کے مطابق اس کی تعبیر مذکورہ بالا اکابر کی بیان کردہ تعبیرات کی روشنی میں اَخذ کرسکتا ہے۔

خواب میں مرغی دیکھنا بھی خیر ہی کے معنیٰ میں ہے، علامہ ابن سیرین فرماتے ہیں:

''وَقِیْلَ: مَنْ رَاٰی اَنَّہٗ ذَبَحَ دَجَاجَۃً فَاِنَّہٗ یَقْتَضُّ جَارِیَۃً وَمَنْ صَادَھَا نَالَ مَالًا مِنَ الْعَجَمِ''۔

ترجمہ: ''اور بعض (ماہرینِ تعبیر) نے کہا: جس نے خواب میں دیکھا کہ اس نے مرغی کو ذبح کیا تو وہ باکرہ خاتون سے نکاح کرے گا اور جو اس کو شکار کرے تو اس کو عجم سے مال ملے گا، (تعبیرالرویا: باب حرف الدّال)''۔ اور جو آپ نے دیکھا کہ خود ہی مرغی کا سر کٹ گیا تو آپ کو ان میں سے جو خیر پہنچے گا وہ کسی اور کے توسط سے یا اس کے ہاتھ سے نکل کر آپ تک پہنچے گا۔

مجموعی طور پر آپ کا خواب ایک مبارک خواب ہے جو کہ صلہ رحمی اور والدین کے ساتھ بعد الوفات نیکی اور ان کے ایصالِ ثواب کے لیے خیرات وحسنات اور صدقات کی قبولیت اور دنیا و آخرت کی نعمتوں کا سبب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ آپ اپنے وظائف کو جاری رکھیں اور سورۃ البقرہ کی آخری آیات کو اپنے وظائف میں شامل کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: بَيْنَمَا جِبْرِيلُ قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ، سَمِعَ نَقِيضًا مِنْ فَوْقِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ، فَقَالَ: هٰذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ الْيَوْمَ لَمْ يُفْتَحْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ، فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ، فَقَالَ: هٰذَا مَلَكٌ نَزَلَ إِلَى الْأَرْضِ لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ، فَسَلَّمَ، وَقَالَ: أَبْشِرْ بِنُورَيْنِ أُوتِيتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، وَخَوَاتِيمُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيتَهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ایک دن جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک آواز سنی، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سراوپر اٹھایا، حضرت جبریل نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے، جس کو صرف آج کھولا گیا ہے اور آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا پھر اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا حضرت جبریل نے کہا: یہ فرشتہ جو آج نازل ہوا ہے، آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا، اُس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: آپ کو ان دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے ایک سورہ فاتحہ اور دوسرا سورہ بقرہ کی آخری آیات، ان میں سے آپ جو حرف بھی پڑھیں گے آپ کو اس کا مصداق مل جائے گا، (مسلم:806)''۔

آپ اپنی والدہ مرحومہ کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں، کینسر کی بیماری یقیناً تکلیف دہ ہوتی ہے، مگر مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایسی بیماریوں میں بشارتیں بھی دی ہیں، اَحادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) ''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو جو بھی بیماری، تکلیف، غم، حزن، اذیت اور غم پہنچے، یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چبھے، تو اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے گناہ مٹا دیتا ہے، (صحیح بخاری:5641)''۔

(۲) ''مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيبُهُ أَذًى، مَرَضٌ فَمَا سِوَاهُ، إِلَّا حَطَّ اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَاتِهِ، كَمَا تَحُطُّ

الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا"۔

ترجمہ: "مسلمان کو بیماری یا اس کے علاوہ جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ (اس کے سبب) اس کے گناہوں کو ساقط کر دیتا ہے، جیسے درخت سے پتے جھڑتے ہیں"۔

(صحیح بخاری: 5660)

(۳) "حَدَّثَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ دَخَلَ عَلٰى أُمِّ السَّائِبِ أَوْ أُمِّ الْمُسَيِّبِ، فَقَالَ: مَا لَكِ يَا أُمَّ السَّائِبِ أَوْ يَا أُمَّ الْمُسَيِّبِ تُزَفْزِفِيْنَ، قَالَتْ: اَلْحُمّٰى، لَا بَارَكَ اللهُ فِيهَا، فَقَالَ: لَا تَسُبِّي الْحُمّٰى، فَإِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَايَا بَنِي آدَمَ، كَمَا يُذْهِبُ الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ"۔

ترجمہ: "حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ اُمّ السائب یا اُمّ المسیّب کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا: اے اُمّ السائب یا اُمّ المسیّب! تمہیں کیا ہوا جو کانپ رہی ہو، عرض کی: بخار ہے، خدا اس میں برکت نہ کرے، فرمایا: بخار کو برا نہ کہو کہ وہ آدمی کی خطاؤں کو اس طرح دور کرتا ہے، جیسے بھٹی لوہے کے میل کو دور کرتی ہے"۔

(صحیح مسلم: 2575)

(۴) "عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ اللهَ قَالَ: إِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِيْ بِحَبِيْبَتَيْهِ فَصَبَرَ، عَوَّضْتُهُ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ، يُرِيْدُ: عَيْنَيْهِ"۔

ترجمہ: "حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میں اپنے بندے کی آنکھوں کی بینائی لے لوں، پھر وہ اس پر صبر کرے، تو آنکھوں کے بدلے میں اسے جنت عطا کروں گا"۔

(صحیح بخاری: 5653)

(۵) "إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ مَنْزِلَةٌ، لَمْ يَبْلُغْهَا بِعَمَلِهِ ابْتَلَاهُ اللهُ فِي جَسَدِهِ أَوْ فِي مَالِهِ أَوْ فِي وَلَدِهِ، قَالَ أَبُوْ دَاوُدَ: زَادَ ابْنُ نُفَيْلٍ ثُمَّ صَبَّرَهُ عَلٰى ذٰلِكَ، ثُمَّ اتَّفَقَا، حَتّٰى يُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِي سَبَقَتْ لَهُ مِنَ اللهِ تَعَالٰى"۔

ترجمہ:''جب بندہ کے لیے علمِ الٰہی میں کوئی (بلند) مرتبہ مقرر ہوتا ہے اور وہ اعمال کے سبب اس رتبہ کو نہیں پہنچ پاتا، تو اللہ تعالیٰ بدن یا مال یا اولاد میں سے اسے کسی آزمائش میں مبتلا فرما دیتا ہے، امام ابوداؤد فرماتے ہیں: ابن نفیل نے اس پر اتنا زائد فرمایا: پھر اسے صبر (کی توفیق) دیتا ہے، یہاں تک کہ اسے اس مرتبے پر فائز فرما دیتا ہے، جو اس کے لیے علمِ الٰہی میں مقرر ہے، (سُنن ابوداؤد:3090)''۔

(۶) ''عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يُعْطٰى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ''۔

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب قیامت کے دن (دنیا میں) مصیبت میں مبتلا لوگوں کو ثواب دیا جائے گا تو عافیت والے تمنا کریں گے ،کاش (دنیا میں) قینچیوں سے اُن کی کھالیں کاٹی جاتیں، (سُنن ترمذی:2402)''۔ تو وہ بھی اس اجر کے حق دار قرار پاتے۔

(۷) ''حَدَّثَنِي عَطَاءُ بْنُ أَبِي رَبَاحٍ، قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ عَبَّاسٍ: أَلَا أُرِيْكَ امْرَأَةً مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، قُلْتُ: بَلٰى، قَالَ: هٰذِهِ الْمَرْأَةُ السَّوْدَاءُ، أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَتْ: إِنِّي أُصْرَعُ وَإِنِّي أَتَكَشَّفُ، فَادْعُ اللهَ لِي، قَالَ: إِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ، وَإِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللهَ أَنْ يُعَافِيَكِ فَقَالَتْ: أَصْبِرُ، فَقَالَتْ: إِنِّي أَتَكَشَّفُ، فَادْعُ اللهَ لِي أَنْ لَا أَتَكَشَّفَ، فَدَعَا لَهَا''۔

ترجمہ:''عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں: حضرت ابن عباس نے مجھ سے فرمایا: کیا میں تمہیں جنتی عورت نہ دکھاؤں، میں نے کہا: کیوں نہیں (ضرور دکھائیے)، انہوں نے کہا: یہ وہ سیاہ فام عورت ہے، جو نبی ﷺ کے پاس آئی تھی اور عرض کی: مجھ پر مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرا ستر کھل جاتا ہے، آپ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو تم صبر کرو اور تم کو جنت مل جائے گی اور اگر تم چاہو تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس مرض سے شفا دے، اس عورت نے کہا: میں صبر کروں گی ،لیکن (دورہ پڑنے پر) میرا ستر کھل جاتا ہے، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ میرا ستر نہ

کھلے، سو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی ستر پوشی کے لیے دعا فرمائی، (صحیح بخاری: 5652)"۔

## ضرر رساں کتوں کو مارنا

**سوال:**

ہمارے اسکول میں کتوں کی بہتات ہوگئی ہے، ان کے بچوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، جو چند دنوں میں بڑے ہوکر مزید مسائل بڑھائیں گے۔ اس کے سبب ہم بہت پریشان ہیں، کیا ہم دوا دے کر انہیں مار سکتے ہیں؟

(اساتذہ مسلم دستگیر گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول، FB ایریا، کراچی)

**جواب:**

کتے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہوں اور سگ گزیدگی کے واقعات کی کثرت ہو تو کتوں کو مارنے کا حکم دیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینے میں کتوں کی بہتات کے سبب اُن کے قتل کرنے کا حکم فرمایا:

(۱) "عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: أَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بِقَتْلِ الْكِلَابِ فَأَرْسَلَ فِيْ أَقْطَارِ الْمَدِيْنَةِ أَنْ تُقْتَلَ"۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور مدینہ کے اطراف میں کتوں کو قتل کرنے کے لیے لوگ روانہ کیے"۔ (صحیح مسلم: 1570)

(۲) "عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم يَأْمُرُ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، فَنَنْبَعِثُ فِي الْمَدِيْنَةِ وَأَطْرَافِهَا فَلَا نَدَعُ كَلْبًا إِلَّا قَتَلْنَاهُ، حَتّٰى إِنَّا لَنَقْتُلُ كَلْبَ الْمُرَيَّةِ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ يَتْبَعُهَا"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے، پھر مدینہ اور اس کے اطراف میں کتوں کا پیچھا کیا گیا اور ہم نے کوئی کتا مارے بغیر نہیں چھوڑا، حتیٰ کہ دیہاتیوں کی اونٹنی کے ساتھ جو کتا رہتا تھا، ہم نے اس کو بھی مار

ڈالا،( صحیح مسلم:1570)''۔

(۳)''جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يَقُولُ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، حَتّٰى إِنَّ الْمَرْأَةَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِيَةِ بِكَلْبِهَا فَنَقْتُلُهُ، ثُمَّ نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ قَتْلِهَا، وَقَالَ: عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ الْبَهِيمِ ذِي النُّقْطَتَيْنِ، فَإِنَّهُ شَيْطَانٌ''۔

ترجمہ:''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ کوئی عورت دیہات سے اپنا کتا لے کر آتی تو ہم اس کتے کو بھی قتل کر دیتے، پھر نبی ﷺ نے اس کو قتل کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا: اس کالے سیاہ کتے کو قتل کر دو جو دو نقطے والا ہو، کیونکہ وہ شیطان ہے،( صحیح مسلم:1572)''۔

(۴)''عَنِ ابْنِ الْمُغَفَّلِ، قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، ثُمَّ قَالَ: مَا بَالُهُمْ وَبَالُ الْكِلَابِ، ثُمَّ رَخَّصَ فِي كَلْبِ الصَّيْدِ وَكَلْبِ الْغَنَمِ''۔

ترجمہ:''حضرت ابن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا: کتے لوگوں کو کیا تکلیف دیتے ہیں! پھر آپ ﷺ نے شکاری کتے اور بکریوں (کی حفاظت) کے کتوں کی اجازت دی،( صحیح مسلم:1573)''۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَلَوْ كَانَ لِرَجُلٍ كَلْبٌ عَقُورٌ يَعَضُّ كُلَّ مَنْ يَمُرُّ عَلَيْهِ فَلِأَهْلِ الْقَرْيَةِ أَنْ يَقْتُلُوهُ۔ قَرْيَةٌ فِيهَا كِلَابٌ كَثِيرَةٌ وَلِأَهْلِ الْقَرْيَةِ مِنْهَا ضَرَرٌ يُؤْمَرُ أَرْبَابُ الْكِلَابِ أَنْ يَقْتُلُوا الْكِلَابَ فَإِنْ أَبَوْا رُفِعَ الْأَمْرُ إِلَى الْقَاضِي حَتّٰى يُلْزِمَهُمْ ذٰلِكَ كَذَا فِي ''مُحِيطِ السَّرَخْسِي''۔

ترجمہ:''اگر کسی شخص کے پاس کاٹنے والا کتا ہے، جو ہر گزرنے والے کو کاٹتا ہے، پس بستی والوں کو اجازت ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں''۔۔۔۔۔کسی بستی میں کتوں کی بہتات ہو اور وہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہوں، کتوں کے مالکان کو حکم دیا جائے گا کہ ان کتوں کو قتل کر دیں، پس اگر وہ انکار کریں، تو قاضی (شہر) سے مرافعہ کیا جائے، یہاں تک کہ وہ لازمی حکم جاری کر دیں، ''محیط سرخسی'' میں اسی طرح ہے،( فتاویٰ عالمگیری، جلد5،ص:360)''۔

اگر اسکول میں کتوں کی بہتات سے آپ کے لیے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور ان کے لیے کوئی مُتبادل انتظام بھی دستیاب نہیں ہے، تو آپ انہیں اذیت پہنچا کر نہ ماریں، البتہ جلد اثر کرنے والی زہریلی دوا کے ذریعے انہیں مار سکتے ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

''اَلْهِرَّةُ اِذَا كَانَتْ مُؤْذِيَةً لَا تُضْرَبُ وَلَا تُعْرَكُ أُذُنُهَا بَلْ تُذْبَحُ بِسِكِّيْنٍ حَادٍّ كَذَا فِي ''الْوَجِيْزِ لِلْكَرْدَرِي''۔

ترجمہ: ''بلی جب ایذا دیتی ہو تو اُسے (اذیت دینے کے لیے) نہ ماریں اور نہ اُس کے کان کھینچیں بلکہ تیز چھری سے ذبح کر دیں، جیسا کہ ''وجیز کردری'' میں ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد خامس، ص: 361)''۔ یعنی اس طرح جان سے ماریں کہ اس سے چھٹکارا بھی مل جائے اور ایک جاندار کو اذیت بھی کم سے کم ہو۔

''عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ، فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ، وَإِذَا كَانَ ذٰلِكَ هُوَ الَّذِيْ يَجِبُ أَنْ يُمْتَثَلَ فِي غَيْرِ بَنِيْ آدَمَ كَانَ امْتِثَالُهُ فِيْمَا حَلَّ قَتْلُهُ مِنْ بَنِيْ آدَمَ أَوْلٰى''۔

ترجمہ: ''شداد بن اوس بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب تم ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور تمہیں چاہیے کہ اپنی چھری کی دھار تیز کر لو اور اپنے ذبیحے کو راحت پہنچاؤ''۔ اور جب جانوروں میں نبی ﷺ کی احتیاط کا یہ عالَم ہے، تو جس بنی آدم کا (قصاص میں یا کسی اور سزائے موت میں) قتل کرنا (ازروئے شریعت) حلال ہو، تو اُس میں اور زیادہ احتیاط کرنی چاہیے، (شرح مشکل الآثار: 4643)''۔ حدیث میں اچھے طریقے سے قتل یا ذبح کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس جاندار کی جان لینا ضروری ہو، تو اس جاندار کو اذیّت پہنچانا ناگزیر ہے، لیکن پھر بھی کوشش کرنی چاہیے کہ حتی الامکان اذیّت کم سے کم ہو۔

## نومولود بچے کا مزار پر عقیقہ کرنا یا نوبیاہتا جوڑے کی مزار پر حاضری

**سوال:**

ہمارے ہاں بعض افراد کے ہاں ایک پرانی رسم چلی آرہی ہے کہ جب بھی کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے سر کے بال پہلی بار کسی پیر بزرگ کے مزار پر منڈوائے جاتے ہیں اور سر منڈواتے وقت کسی جانور کی قربانی دی جاتی ہے۔اس رسم کے لیے دین اسلام میں کیا حکم ہے۔اس کے علاوہ نئے شادی شدہ جوڑے کا پیر یا بزرگ کے مزار یا دربار پر حاضری ضروری قرار دیتے ہیں، رہنمائی فرمائیں، (مختیار احمد قادری، بلوچستان)۔

**جواب:**

بچے کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کرنا اور بال منڈانا سنت ہے۔

حدیث پاک میں ہے: ''مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ، فَاَهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَأَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى''۔

ترجمہ: ''لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، پس تم اس کے لیے (صدقے کے جانور کا) خون بہاؤ اور اس سے تکلیف دہ چیز (بالوں کو) دور کرو، (صحیح البخاری: 5471)''۔آپ نے جس رسم کا ذکر کیا ہے، اُس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے، اور نہ ہی از روئے شریعت نئے شادی شدہ جوڑے کی کسی مزار پر حاضری ضروری ہے، البتہ بعض خوش حال لوگ شادی کی خوشی میں عمرہ ادا کرتے ہیں، یہ سعادت کی بات ہے، لیکن لازم نہیں ہے۔

## یتیم کی تعریف

**سوال:**

جانوروں میں جس کی ماں مرجائے، وہ یتیم ہے، انسانوں میں جس کا باپ مرجائے، وہ یتیم کہلاتا ہے، انسانوں میں جس کی ماں مرجائے، وہ کیا کہلاتا ہے، (قاضی محمد اشرف، کراچی)۔

**جواب:**

لغت کی معروف کتاب ''المنجد'' میں ہے:

''اَلْيَتِيْمُ مَنْ فَقَدَ اَبَاهُ وَلَمْ يَبْلُغْ الرِّجَالَ۔۔۔۔۔وَمِنَ الْبَهَآئِمِ الَّذِیْ فَقَدَ أُمَّهٗ''۔

ترجمہ: ''جس بچے کا باپ فوت ہوجائے اور وہ بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچا، وہ یتیم ہے''۔
اور جانوروں میں ماں فوت ہوجائے، تو یتیم ہے، (ص:923)''۔

علامہ ابوحیان محمد بن یوسف اندلسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَالْیُتْمُ فِی بَنِیْ آدَمَ فَقْدُ الْاَبِ، وَھُوَ جَمْعٌ یَشْمَلُ الذُّکُوْرَ وَالْاِنَاثَ وَیَنْقَطِعُ ھٰذَا الْاِسْمُ شَرْعًا بِالْبُلُوْغِ، فَلَا بُدَّ مِنْ مَجَازٍ، اِمَّا فِی الْیَتَامٰی لِاِطْلَاقِہٖ عَلَی الْبَالِغِیْنَ اعْتِبَارًا وَتَسْمِیَۃً بِمَا کَانُوْا عَلَیْہِ شَرْعًا قَبْلَ الْبُلُوْغِ مِنِ اسْمِ الْیُتْمِ''۔

ترجمہ: ''اور بنی آدم میں یتیم وہ ہے جو باپ سے محروم ہوجائے اور یہ مذکر اور مونث (یعنی بیٹا بیٹی) دونوں کو شامل ہے اور بچے کے بالغ ہونے پر اس پر یتیم کا اطلاق نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہوتو مجازاً ہے۔ بالغوں پر جو یتیم کا اطلاق ہوتا ہے، وہ باعتبار ماضی کے ہوتا ہے (یعنی بالغ ہونے کے بعد وہ حقیقت میں یتیم نہیں رہتا)، (البحر المحیط، النساء، آیت:6)''۔

جانوروں کی نسل کا مدار ماں (یعنی مادہ) پر ہوتا ہے، لہٰذا جانوروں کے لیے ماں کے گم/ فوت ہونے پر اسے یتیم شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق باپ کفیل ہوتا ہے، اس لیے اس کی وفات سے بچہ کفیل سے محروم ہوجاتا ہے اور ماں شفیق ہوتی ہے، اس لیے ماں کی وفات سے انسان مادری شفقت سے محروم ہوجاتا ہے۔ یتیم کی فقہی تعریف وہی ہے، جو اوپر بیان ہوئی، البتہ ہمارے عرف میں جس کی ماں فوت ہوجائے، اسے بھی یتیم کہتے ہیں اور وہ بھی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا جائے۔

علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''انسانوں میں یتیم اس شخص کو کہتے ہیں، جس کا باپ بچپن میں فوت ہوگیا ہو اور حیوانات میں یتیم اس کو کہتے ہیں، جس کی ماں بچپن میں فوت ہوگئی ہو اور بعض اہلِ لغت یتیم اس شخص کو کہتے ہیں، جس کے ماں باپ دونوں فوت ہوگئے ہوں''۔

(تبیان القرآن، ج:12، ص:758)

## محمد نام رکھنا

### سوال:

میری والدہ نے نیت کی تھی کہ اگر ان کا نواسا ہوا تو اس کا نام محمد رکھیں گے، مگر کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ محمد نام نہیں رکھنا چاہیے کہ اس نام کی بے حرمتی ہوگی اور گستاخی کے مرتکب بھی ہوسکتے ہیں کہ کسی نے بچے کو ڈانٹا تو گستاخی ہوگی۔ برائے مہربانی یہ بتایئے کہ بچے کا نام محمد بن قمر یا محمد قمر احمد رکھنا مناسب ہے، (عمارہ قمر، خانیوال)۔

### جواب:

رسول اللہ ﷺ نے اپنے نام پر نام رکھنے پر بشارت دی:

(۱) ''مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُوْدٌ ذَكَرٌ فَسَمَّاهُ مُحَمَّدًا حُبًّا لِيْ وَتَبَرُّكًا بِاسْمِيْ كَانَ هُوَ وَمَوْلُوْدُهُ فِي الْجَنَّةِ، اَلرَّافِعِيْ عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ''۔

ترجمہ: ''جس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور وہ میری محبت میں اور میرے نام کی برکت حاصل کرنے کے لیے اس کا نام محمد رکھے، وہ اور اس کا لڑکا دونوں جنت میں جائیں گے، اس حدیث کو رافعی نے ابوامامہ سے روایت کیا، (کنز العمال: 45223)''۔

(۲) ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ وُلِدَ لَهُ ثَلَاثَةٌ فَلَمْ يُسَمِّ أَحَدَهُمْ مُحَمَّدًا فَقَدْ جَهِلَ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کے تین بیٹے ہوں اور اس نے کسی ایک کا نام بھی محمد نہ رکھا، تو اس نے نادانی کی''۔

(المعجم الکبیر للطبرانی: 11077)

(۳) ''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فِي السُّوْقِ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا أَبَا الْقَاسِمِ! فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالَ: إِنَّمَا دَعَوْتُ هٰذَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: سَمُّوْا بِاسْمِيْ وَلَا تَكَنَّوْا بِكُنْيَتِيْ''۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ بازار میں تھے کہ ایک

شخص نے کہا: اے ابوالقاسم! نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے اشارے سے بتایا: میں نے اُس شخص کو پکارا ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے نام پر نام رکھا کرو لیکن میری کنیت پر اپنی کنیت نہ رکھا کرو، (صحیح بخاری:2120)"۔

(۴) "عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ، قَالَ: قَالَ عَلِيٌّ رَحِمَهُ اللهُ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! إِنْ وُلِدَ لِي مِنْ بَعْدِكَ، وَلَدٌ أُسَمِّيهِ بِاسْمِكَ وَأُكَنِّيهِ بِكُنْيَتِكَ، قَالَ: نَعَمْ"۔

ترجمہ: "محمد بن حنفیہ بیان کرتے ہیں: حضرت علی نے مجھ سے کہا: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! اگر آپ کے بعد میرے ہاں لڑکا پیدا ہو تو میں اس کا نام اور کنیت آپ کے نام اور کنیت پر رکھوں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے، (سُنن ابوداؤد: 4967)"۔

نامِ محمد کی تکریم کا حکم بھی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(۱) "إِذَا سَمَّيْتُمُ الْوَلَدَ مُحَمَّدًا فَأَكْرِمُوهُ وَأَوْسِعُوا لَهُ فِي الْمَجْلِسِ وَلَا تُقَبِّحُوا لَهُ وَجْهًا"۔

ترجمہ: "جب تم لڑکے کا نام محمد رکھو تو اس کی عزت کرو اور مجلس میں اس کے لیے جگہ میں کشادگی پیدا کرو اور اسے بدصورتی کا طعنہ نہ دو، (الجامع الصغیر:1570)"۔

(۲) "إِذَا سَمَّيْتُمْ مُحَمَّدًا فَلَا تَضْرِبُوهُ وَلَا تَحْرِمُوهُ"۔

ترجمہ: "جب لڑکے کا نام محمد رکھو تو نہ اسے مارو، نہ اسے محروم رکھو، (مسند البزار:3883)"۔

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں امام شافعی کے نزدیک ابوالقاسم کنیت نہیں رکھنی چاہیے، خواہ نام محمد ہو یا کوئی اور، امام احمد بن حنبل نے کہا: جس کا نام محمد ہو، اس کو اپنی کنیت ابوالقاسم نہیں رکھنی چاہیے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہت کا تاثر نہ ہو، یہی بات حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "إِذَا تَسَمَّيْتُمْ بِي فَلَا تَكْتَنُوا بِي"۔

ترجمہ: "جب تم نے میرے نام (پر اپنا نام) رکھ لیا تو پھر میری کنیت نہ رکھو"۔

(سُنن ترمذی:2842)

علامہ مازری نے کہا: ابوالقاسم کنیت رکھنے کی ممانعت آپ کی حیاتِ ظاہری تک محدود تھی،

اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد جائز ہے''۔
(اکمال المُعلم بفوائد مسلم، ج:7،ص:9-8)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَمَنْ كَانَ اِسْمُهُ مُحَمَّدٌ الَابَأسَ بِاَنْ يُكَنِّيَ أَبَا الْقَاسِمِ، لِاَنَّ قَوْلَهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: سَمُّوا بِاِسْمِيْ وَلَا تَكَنَّوْا بِكُنْيَتِيْ، قَدْ نُسِخَ لِاَنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ كَنَّى ابْنَهُ مُحَمَّدَ بْنَ حَنَفِيَّةَ أَبَا الْقَاسِمِ''۔

ترجمہ: ''اور جس کا نام محمد ہے، اس کے لیے ابوالقاسم کنیت رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان: ''میرے نام پر اپنا نام رکھو اور میری کنیت پر اپنی کنیت نہ رکھو''، منسوخ ہو چکا ہے، کیونکہ حضرت علی نے اپنے بیٹے محمد بن حنفیہ کی کنیت ابوالقاسم رکھی تھی''۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''لَعَلَّ وَجْهَهُ زَوَالُ عِلَّةِ النَّهْيِ السَّابِقَةِ بِوَفَاتِهٖ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، تَأَمَّلْ''۔

ترجمہ: ''شاید اس کا سبب یہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد نہی کی علّت ختم ہوگئی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ظاہری میں امکان تھا کہ کوئی کسی اور شخص کو ابوالقاسم کہہ کر پکارے اور اس شبہے میں آپ اس کی طرف مُتوجہ ہوں کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلایا جا رہا ہے، غور کرو، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد6،ص:417)''۔

امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

''لِلْقَارِيْ فِي ''الْمِرقَاةِ'' كَلَامٌ كَثِيْرٌ فِي هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ، وَصَوَّبَ الشَّيْخُ فِي ''اللَّمْعَاتِ'' عَدَمَ جَوَازِ التَّكَنِّيْ بِكُنْيَتِهٖ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُطْلَقًا فِي زَمَنِهٖ وَبَعْدَهٗ مَعَ اسْمِهٖ وَبِدُوْنِهٖ، فَالْجَمْعُ أَوْلٰى بِالْمَنْعِ''۔

ترجمہ: ''علامہ علی القاری نے ''مرقاۃ المفاتیح'' میں اس مسئلے پر طویل بحث کی ہے اور شیخ عبدالحق مُحدث دہلوی نے ''اَشِعَّةُ اللَّمعات'' میں ابوالقاسم کنیت رکھنے کے عدمِ جواز کے قول کو مطلقاً درست قرار دیا ہے، خواہ آپ کی حیاتِ ظاہری میں ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

وصالِ مبارک کے بعد، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ یا آپ کے نام (محمد) کے بغیر ہو (مطلقاً ممانعت کا قول بھی ہے) تو نام اور کنیت کو جمع کرنا بطریقِ اَولیٰ منع ہوگا، (جدّ الممتار علی ردالمحتار، جلد 7، ص: 151)"۔ الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصالِ مبارک کے بعد بھی آپ کے نام اور کنیت کو جمع کرنے سے احتراز بہتر ہے اور جو شخص برکت حاصل کرنے کے لیے اپنا یا اپنے بیٹے کا نام محمد رکھتا ہے، تو اسے اس کی حُرمت کا پاس بھی رکھنا چاہیے اور اس نام کی لاج بھی رکھنی چاہیے، تبھی صحیح برکات نصیب ہوں گی۔

نوٹ: بعض لوگ اپنے محمد نام پر "ؐ" لکھ دیتے ہیں، یہ وہ درود کے مُخفّف کے طور پر لکھتے ہیں، کیونکہ جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ذات کے لیے محمد آئے تو وہاں پورا درود لکھنا چاہیے، مُخفّف لکھنا خلافِ ادب ہے، کسی اور شخص کا نام محمد ہو تو اس کے آگے درود نہیں لکھا جائے گا نہ مُخفّف نہ مُفصّل، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ خاص ہے۔

الغرض کوئی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمِ مبارک "محمد" سے برکت حاصل کرنے کے لیے اپنے بیٹے کا نام محمد رکھتا ہے، تو اس سے ذاتِ پاک مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد نہیں ہوتی، لہٰذا اس نام کے بولنے، پڑھنے، سننے یا لکھنے پر نہ درود پڑھا جائے گا اور نہ لکھا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامِ نامی "محمد" پر تو نہیں رکھتا، بلکہ اس بابرکت نام کی طرف لفظِ غلام کی اضافت کرتے ہوئے "غلام محمد" رکھتا ہے، اگرچہ یہاں مضاف الیہ "محمد" سے مراد ذاتِ اقدس ہی ہے، لیکن جب یہ مُرکبِ اضافی بتاویلِ مُفردِ عَلَم (Proper Noun) ہو گیا، تو اب "غلام محمد" سے بیٹے کی ذات مراد ہوگی، پس جب کہا جائے گا: "میں نے غلام محمد کو دیکھا"، تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں نے اُس لڑکے کو دیکھا، جس کا نام غلام محمد ہے، لہٰذا نہ یہاں درود پڑھنے یا لکھنے کی کوئی دلیل ہے، نہ یہ عرف ہے، ہاں! اگر یہ عَلَم (نام) نہ ہو، بلکہ فی الواقع کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام ہے، تو درود شریف پڑھا اور لکھا جا سکتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ سَفِينَةَ، قَالَ: رَكِبْتُ الْبَحْرَ فِي سَفِينَةٍ فَانْكَسَرَتْ فَرَكِبْتُ لَوْحًا مِنْهَا فَطَرَحَنِي فِي

أَجَمَةٍ فِيهَا أَسَدٌ فَلَمْ يَرُعْنِي إِلَّا بِهِ فَقُلْتُ: يَا أَبَا الْحَارِثِ! أَنَا مَوْلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَطَأْطَأَ رَأْسَهُ وَغَمَزَ بِمَنْكِبِهِ، شِقِّي فَمَا زَالَ يَغْمِزُنِي وَيَهْدِينِي إِلَى الطَّرِيقِ حَتَّى وَضَعَنِي عَلَى الطَّرِيقِ فَلَمَّا وَضَعَنِي هَمْهَمَ فَظَنَنْتُ أَنَّهُ يُوَدِّعُنِي''۔

ترجمہ: ''حضرت سفینہ بیان کرتے ہیں: میں سمندر پر کشتی میں سوار ہوا، (قضائے الٰہی سے) کشتی ٹوٹ گئی اور میں اُس کی ایک تختے پر سوار ہو گیا، اُس نے مجھے ایک ایسی جھاڑی کے قریب اتار دیا جس میں شیر تھا، اُس نے مجھے خوفزدہ نہیں کیا، میں نے اُس شیر سے کہا: اے ابوالحارث! (عربی میں یہ کلمہ شیر کے لیے استعمال ہوتا ہے) میں رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام ہوں، تو شیر نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنا کندھا میرے پہلو سے رگڑتے ہوئے میری رہنمائی کرنے لگا اور اس طرح مجھے صحیح راستے پر ڈال دیا، پھر راستے پر ڈال کر وہ شیر آواز نکالنے لگا، میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے رخصت کر رہا ہے، (مستدرک للحاکم: 4235)''۔

حاکم نے کہا ہے: یہ حدیث صحیحین کی شرائط پر صحیح ہے، لیکن امام بخاری اور امام مسلم نے اِسے صحیحین میں شامل نہیں کیا۔

علامہ علی القاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سفینہ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے، اُنہوں نے اُسے اس شرط پر آزاد کر دیا تھا کہ وہ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں اُن کی خدمت کریں گے، سفینہ اُن کا لقب ہے اور اُن کے نام کے بارے میں ایک سے زیادہ اَقوال ہیں: رومان، مہران، طُعمان اور عمیر، (حیاۃ الحیوان، جلد 1، ص: 11)۔ ایک روایت میں ہے: یہ ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے، ایک شخص تھک گیا اور اس نے اپنی تلوار، ڈھال اور نیزہ اِن کو تھما دیا اور وہ یہ سارا سامان اٹھائے چلتے رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سفینہ ہو'' (کیونکہ کشتی میں کافی بوجھ ہوتا ہے)۔ ''مولیٰ'' آزاد کردہ غلام کو کہتے ہیں، پس چونکہ ''سفینہ'' فی الواقع اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے اور آزاد ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت پر مامور تھے، تو حدیثِ پاک میں ''أَنَا مَوْلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ''

آیا ہے، یعنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خادم ہوں اور یہ بات واقع کے مطابق ہے، یہ بحیثیتِ مجموعی اُن کا علَم نہیں ہے۔

اسی طرح بالفرض کسی عالمِ دین نے ''مقامِ مصطفیٰ'' نامی کتاب لکھی، چونکہ اُنہوں نے اس مُرکّبِ اضافی کو بحیثیتِ مجموعی کتاب کا ''علَم'' بنایا ہے، لہٰذا یہاں بھی نہ درود لکھا جائے گا اور نہ پڑھا جائے گا، البتہ اگر کوئی خطاب میں ''مقامِ مصطفیٰ'' بیان کررہا ہے تو ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' لکھا اور پڑھا جاسکتا ہے، جیسے کوئی کہے: میں نے مختلف کتابوں سے اَخذ کرکے مقامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عنوان پر مضمون لکھا تھا، اس کے برعکس اگر کوئی یہ کہے: ''میں نے فلاں عالم کی کتاب ''مقامِ مصطفیٰ'' پڑھی ہے، ماشاءاللہ بہت مفید ہے، پڑھ کر ایمان تازہ ہوجاتا ہے''، اس میں ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' نہیں لکھا جائے گا، کیونکہ یہاں مُرکّبِ اضافی ''مقامِ مصطفیٰ'' مجموعی حیثیت میں کتاب کا نام ہے۔

مجھے علامہ مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی نے بتایا: ''ایک عالم دین نے اپنی کتاب ''مقامِ مصطفیٰ'' شیخ الحدیث علامہ پیر سید حسین الدین شاہ صاحب کو پیش کی، کتاب کے ٹائٹل پر مقامِ مصطفیٰ کے آگے ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' لکھا ہوا تھا، تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ''یہاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ لکھو''۔

اسی طرح ہمارے یہاں انجمنوں کے نام ہوتے ہیں، جیسے: انجمنِ میلادالنبی، انجمنِ عاشقانِ مصطفیٰ، بزمِ جاں نثارانِ مصطفیٰ وغیرہ، یہ بھی انجمنوں کے اَعلام یعنی نام ہیں، اس لیے اِن کے آگے بھی ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' نہیں لکھنا چاہیے، مدنی چینل سے وابستہ ایک عالم سے بالواسطہ طور پر معلوم ہوا کہ اب چینل پر ''میٹھے میٹھے اسلامی بھائیو!'' کے بجائے ''عاشقانِ مصطفیٰ'' بولا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' نہیں بولا جاتا۔ ہمارے دو اَکابر کی کتابیں ہیں: ایک حضرت علامہ جسٹس (ر) پیر کرم شاہ الازہری اور دوسرے علامہ منظور احمد فیضی رحمہما اللہ تعالیٰ، اُن کی تصانیفِ مبارکہ کے نام ہیں: ''ضیاء النبی'' اور ''مقامِ رسول''، یہ بھی دونوں کتابوں کے اَعلام ہیں، مگر مطبوعہ کُتب میں کتاب کے نام کے آگے ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم''

لکھا ہوا ہے، جبکہ ضابطے کے مطابق نہیں ہونا چاہیے، بہر حال یہ دونوں حضرات ہمارے اکابر علماء میں سے تھے، ہوسکتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس کی کوئی بہتر توجیہ ہو۔

علامہ فیض احمد اویسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بہت سے ایسے اُمور ہوتے ہیں جو ہمہ گیر بن جاتے ہیں اور لاشعوری کی وجہ سے عادت بن جاتے ہیں، منجملہ ان کے کتابوں اور رسالوں کے نام رکھنا ہے کہ کسی کتاب یا رسالہ کے نام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسمِ گرامی ہے تو اس کتاب و رسالہ والے اسمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ''صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' لکھ دیتے ہیں: مثلاً: کسی کتاب یا رسالہ کا نام ''میلاد النبی، نمازِ رسول، حبُّ النبی، خاتم النّبیین'' وغیرہ ہے، ان اسماء میں ''صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' اور ''عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ'' اور بعض جہلاء تو ''صلعم، ص، ؑ'' وغیرہ لکھ دیتے ہیں، یہ مبنی بر خطا ہے، اس سے احتراز چاہیے، بعض تو اتنی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُلٹا نہ لکھنے والے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ فقیر کا ایک رسالہ ہے: ''علمِ یعقوب''، اس پر انتباہاً ایک صاحب نے فقیر کو زور آور خط لکھا کہ آپ کے مکتبہ اُویسیہ کے کارکنوں کو بارہا کہا ہے کہ علمِ یعقوب میں، یعقوب علیہ السلام کیوں نہیں لکھا جارہا ہے، جبکہ یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہیں۔ فقیر نے جواب بھجوایا: ''اس وقت یہ رسالہ کا نام ہے، یعقوب علیہ السلام کی ذات مراد نہیں، واللہ اعلم، وہ اس سے مطمئن ہوئے یا نہیں، لیکن بعد کو ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ بعض تو ایسے واقع ہوئے ہیں کہ اس مسئلہ پر انتباہ کے بعد لڑائی جھگڑے پر تُل جاتے ہیں اور اپنے طورز وردار باتوں سے ہمیں شکست دینے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنے حلقۂ احباب میں اُلٹا ہمیں بے ادب گردانتے ہیں کہ یہ بے ادب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ودیگر انبیاء علیہم السلام پر ''صلوٰۃ وسلام'' لکھنا گوارا نہیں کرتے، لَاحَوۡلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡعَظِیۡمِ۔

**اصل موقف:** کوئی کلمہ جب کسی نام یا اُس کا جز بن جائے تو وہ کلمہ اپنے معنیٰ میں مراد نہ ہوگا بلکہ اس سے مُسمّٰی (اُس نام والا شخص) مراد ہوگا، اگرچہ وہ اسم، مُسمّٰی (Named,Specified) کے عین مطابق ہو، مثلاً کسی کا نام عبداللہ ہے تو واقعی مُسمّٰی عبد ہے، اپنے رب کا، اب اس اسم عبداللہ کے بعد ''جل جلالہ'' لکھنا جہالت ہے۔ یوں ہی

ایک شخص رسول اکرم ﷺ کا سچا غلام ہے، اُس کا نام غلام رسول ہے، اب یہاں غلام رسول میں ''ﷺ'' لکھنا بے وقوفی ہے۔ یوں ہی سمجھ لیں: فیض احمد، فیض محمد، فیض رسول، منظور احمد، مسعود احمد، سعید احمد، نذیر احمد، بشیر احمد۔ ان اسماء کے بعد اب کتاب کے نام دہرایئے۔ خاتم النّبیین ﷺ، مقامِ رسول ﷺ، عظمتِ رسول ﷺ، اختیارِ رسول ﷺ، میلادِ رسول ﷺ، معراج النبی ﷺ، حمایت النبی ﷺ، نظامِ مصطفیٰ ﷺ، شانِ رسول ﷺ، عظمتِ نام مصطفیٰ ﷺ، صلوٰۃ الرسول ﷺ۔ اس طرح کے اسماء کُتب ورسائل پر ''ﷺ'' لکھنا، پڑھنا جہالت ہے، اگر اب سے پہلے یہ سب لاشعوری میں ہوا تو لا بأس بِہٖ آئندہ احتیاط کریں''۔

(جدید مسائل کے شرعی احکام، ص:53-52)

ذیل میں ہم چند عربی کتابوں کے نام درج کر رہے ہیں، جن کے نام کا حصہ رسول اللہ ﷺ کا اسمِ صفت ہے، مگر اس کے آگے ﷺ نہیں لکھا گیا:

اَلشَّمَائِلُ الْمُحَمَّدِیَّۃُ وَالْخِصَالُ الْمُصْطَفَوِیَّۃُ، (ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی)، أَخْلَاقُ النَّبِیِّ وَآدَابُہٗ، (أبومحمد عبداللہ بن محمد أصبھانی)، اَلْاَنْوَارُ فِیْ شَمَائِلِ النَّبِیِّ الْمُخْتَارِ، (أبومحمد حسین بن مسعود البغوی)، اَلشِّفَاء بِتَعْرِیْفِ حُقُوْقِ الْمُصْطَفٰی، (العلامۃ القاضی عیاض الیحصبی)۔

## شرجیل نام

### سوال:

میرے بیٹے کا نام محمد شرجیل ہے، نام رکھتے وقت معنی کی تحقیق کی تو نام بامعنی تھا، اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام ٹھیک نہیں اور اس کے ساتھ شر بھی آتا ہے، کیا یہ نام تبدیل کر دیا جائے۔

### جواب:

علامہ ابن منظور افریقی نے لفظ ''شرح'' کے معانی بیان کرنے میں کافی بسط وتفصیل

سے کام لیا ہے، چنانچہ اس لفظ کے من جملہ معانی بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اَلشَّرْجَان: اَلفِرْقَتَان، يُقَالُ: أَصْبَحُوْا فِي هٰذَا الْأَمْرِ شَرْجَيْنِ أَيْ فِرْقَتَيْن''۔

ترجمہ: ''اَلشَّرْجَان کا معنی ہے: دوگروہ، کہا جاتا ہے: وہ اس مسئلے میں دوگروہوں میں بٹ گئے''، حدیث پاک میں ہے:

''اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالْفِطْرِ، فَأَصْبَحَ النَّاسُ شَرْجَيْنِ، مِنْهُمُ الصَّائِمُ وَالْمُفْطِرُ''۔ ترجمہ: ''(رمضان المبارک میں سفر کے دوران) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تو ہم دوگروہوں میں بٹ گئے، ایک گروہ بدستور روزے سے رہا اور دوسرے نے روزہ توڑ دیا، (اَلسُّنَنُ الْکُبْرٰی لِلْبَيْهَقِي: 8148)''۔

(لسان العرب، ج: 2، ص: 308)

پس ''شراح'' کے معنی ''حِزب'' کے ہونے اور اس مناسبت سے شرحبیل کے معنی ''حزب اللہ'' کے کیے جاسکتے ہیں، الغرض اس تاویل کی گنجائش نکلتی ہے، تاہم عربی لغت میں ''شرجیل'' کا لفظ نہیں ملا۔ البتہ شُرَحبِیل کئی صحابہ کا نام ہے اور ایک تابعی کا نام بھی ہے، انبیائے کرام علیہم السلام یا اکابر امت کے نام پر نام نسبت وعقیدت اور خیر وبرکت کے حصول کے لیے رکھا جاتا ہے، اس میں ہر نام کا بامعنی ہونا ضروری نہیں ہے، البتہ اس کے علاوہ کوئی نام رکھنا ہو تو اچھے معنیٰ والا نام رکھنا چاہیے۔ شُرَحبِیل نام کے بارے میں کئی اقوال ہیں: بعض کے نزدیک یہ عربی نام ہے، بعض کے نزدیک عجمی ہے، بعض کے نزدیک سُریانی ہے، بعض نے اس کا معنیٰ عبداللہ یا عبیداللہ بتایا ہے۔

## ابلیس نے آدم علیہ السلام کو کہاں سے بہکایا

**سوال:**

جب حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے تو شیطان مردود اس وقت کہاں تھا، کیا اس نے جنت میں داخل ہوکر حضرت آدم علیہ السلام کو پھسلنے والی باتیں کیں؟، (خیام وزیر، لاہور)۔

**جواب:**

شیطان پہلے جنت میں تھا اور اس کو جنت سے نکالا گیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ"۔ ترجمہ: "فرمایا: تو جنت سے نکل جا بے شک تو مردود ہے"، (الحجر: 34)"۔

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَعَنْ مُرَّةَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَعَنْ نَاسٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فَأُخْرِجَ إِبْلِيْسُ مِنَ الْجَنَّةِ حِيْنَ لُعِنَ، وَأُسْكِنَ آدَمُ الْجَنَّةَ"۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عباس، مُرّہ، حضرت ابن مسعود اور دیگر اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتے ہیں: پھر ابلیس کو جب ملعون قرار دیا گیا تو پھر اسے جنت سے نکال دیا گیا اور حضرت آدم کو جنت میں رکھا گیا، (جلد 1، ص: 548)"۔

اس بابت قرآن مجید میں ہے:

"فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ"۔

ترجمہ: "پس شیطان نے اُنہیں اُس (درخت) کے ذریعے پھسلایا، سو جہاں وہ رہتے تھے، وہاں سے ان کو نکال دیا اور ہم نے فرمایا: تم (جنت سے) اتر آؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے زمین میں ایک مقررہ وقت ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے، (البقرہ: 36)"۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے باوجود سجدہ نہ کرنے پر شیطان لعین کو جنت سے نکال دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لیے مردود و ملعون قرار دیا گیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آدم علیہ السلام وحوا علیہما السلام جنت میں اور ابلیس کو جنت سے نکالا جا چکا تھا، تو اس نے انہیں کیسے ورغلایا، اس کی بابت مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں: ایک یہ کہ ابلیس چھپ کر چوروں کی طرح جنت میں گیا تھا اور پھر اس نے کسی صورت میں مُتمثل ہو کر حضرت آدم سے گفتگو کی اور ان کو وسوسہ ڈالا یا وہ جنت کے دروازہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور وہاں

سے آواز دے کر حضرت آدم کو بلایا اور پھر انہیں ورغلایا، یا کسی جانور کی صورت میں جنت میں گیا اور جنت کے محافظ اس کو نہ پہچان سکے یا وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا یا اس نے اپنے بعض چیلوں کو یہ پیغام دے کر جنت میں بھیجا، الغرض قرآن کریم میں ہے:

''فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾''۔ (طٰہٰ: 121-120)

ترجمہ: ''پھر شیطان نے آدم کی طرف وسوسہ کیا (اور) کہا: اے آدم! کیا میں تمہیں دائمی زندگی والا درخت اور ایسی بادشاہت نہ بتاؤں جس پر (کبھی) زوال نہ آئے، تو (آدم وحوا) دونوں نے اس درخت سے کھالیا، سو ان کے سامنے اُن کی ستر گاہیں کھل گئیں اور وہ دونوں جنت کے پتوں سے اپنا جسم چھپانے لگے''۔

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَعَنْ نَاسٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لَمَّا قَالَ اللهُ لِآدَمَ: ''أُسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظَّالِمِيْنَ''، أَرَادَ إِبْلِيْسُ أَنْ يَدْخُلَ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ فَمَنَعَتْهُ الْخَزَنَةُ، فَأَتَى الْحَيَّةَ وَهِيَ دَابَّةٌ لَهَا أَرْبَعُ قَوَائِمَ كَأَنَّهَا الْبَعِيْرُ، وَهِيَ كَأَحْسَنِ الدَّوَابِّ، فَكَلَّمَهَا أَنْ تُدْخِلَهُ فِي فَمِهَا حَتّٰى تَدْخُلَ بِهِ إِلٰى آدَمَ، فَأَدْخَلَتْهُ فِي فَمِهَا، فَمَرَّتِ الْحَيَّةُ عَلَى الْخَزَنَةِ، فَدَخَلَتْ وَلَا يَعْلَمُوْنَ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود اور کئی اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کرتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: ''اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جنت میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ اور (خبردار!) اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم دونوں حد سے بڑھنے والوں میں سے ہوجاؤ گے''، اُس وقت ابلیس نے ان دونوں کے پاس جنت میں جانے کا ارادہ کیا، تو جنت کے محافظوں نے اس کو جانے سے روکا، پس وہ سانپ کے پاس

آیا، اُس وقت سانپ اونٹ کی مانند چار پاؤں والا خوبصورت جانور تھا، ابلیس نے اُس سے کہا: وہ اس کو اپنے منہ میں رکھ کر جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس لے جائے، سو سانپ ابلیس کو اپنے منہ میں رکھ کر جنت میں داخل ہوگیا اور جنت کے محافظوں کو پتا نہ چل سکا، (الجامع البیان، جلد 1، ص: 567)''۔ ہمارے لیے اس قدر ایمان لانا کافی ہے کہ ابلیس جھوٹی قسم کے ساتھ وسوسہ ڈال کر حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے جنت سے اتارے جانے کا سبب بنا، قرآن کریم نے اس کی صورت بیان نہیں کی، پس ہمارے لیے بھی ان تفصیلات کو جاننا ضروری نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتلائے آدم کے لیے اس کو یہ ملکہ دیا ہو کہ جنت سے باہر رہتے ہوئے آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈال دے۔

## ہبہ کے متعلق ایک مسئلہ

**سوال:**

میری والدہ کا انتقال 2007ء میں ہوا، والدہ کا ایک مکان تھا، جو والدین کی باہم رضامندی سے والدہ نے انتقال سے چار سال پہلے مجھے Gift کر دیا تھا اور قانونی کارروائی مکمل کر دی گئی، رجسٹرار نے سب بہنوں کے سامنے والدہ سے تین مرتبہ پوچھا: کیا آپ اپنی مرضی سے یہ مکان اپنے بیٹے کو ہبہ کر رہی ہیں۔ 2013ء میں میں نے وہ مکان فروخت کر کے دوسرا مکان لے لیا۔ اب بہنیں اُس مکان میں سے حصہ مانگ رہی ہیں جبکہ اس وقت بیٹیوں کو دس دس لاکھ روپے دیے گئے۔ والد صاحب کا ترکہ اُن کی وفات کے بعد شریعت کے مطابق تمام بیٹیوں اور بیٹے کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ والدین اُس مکان میں میرے ساتھ ہی رہتے تھے، بعد میں اُس مکان کو میں نے فروخت کر دیا اور اپنے ہی نام پر دوسرا مکان خریدا، اس عمل پر بھی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس دوسرے مکان میں بھی والد صاحب میرے ساتھ رہتے تھے، (محمد اطہر آفتاب، کراچی)۔

**جواب:**

بلا معاوضہ تبرُّع واحسان کے طور پر کوئی چیز کسی کو دی جائے، اُسے ''ہبہ'' (Gift)

کہتے ہیں، ہبہ کرنے والے کو ''واہب'' (Donor)، جسے ہبہ کیا جائے اسے ''موھوب لہٗ'' اور جو چیز ہبہ کی جائے، اُسے ''موہوب'' (Gifted) کہتے ہیں۔ ہبہ اُس وقت صحیح ہے، جب واہب کی زندگی میں موھوب لہٗ موہوب چیز پر قبضہ کرلے، اگر قبضہ سے پہلے واہب فوت ہوجائے، تو ہبہ باطل ہوجاتا ہے۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَاِذَا مَاتَ الْوَاهِبُ قَبْلَ التَّسْلِيْمِ بَطَلَتْ''۔

ترجمہ: ''اگر واہب ہبہ شدہ چیز موہوب لہٗ کو سپرد کرنے سے پہلے فوت ہوجائے تو ہبہ باطل ہوجاتا ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص:400)''۔

جب مَوْھُوْب لہٗ ہبہ شدہ چیز پر قبضہ کرلے، تو ہبہ مکمل ہوجاتا ہے اور وہ شے واہب کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور مَوْھُوْب لَہٗ اس کا مالک بن جاتا ہے اور اُسے شے موہوب پر مالکانہ تصرُّف کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔

قبضہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی (۲) حکمی۔ حقیقی قبضہ سے مراد یہ ہے کہ عملاً (Physically) مَوْھُوْب لہٗ موہوب شے پر قبضہ کرلے اور حکمی قبضے سے مراد یہ ہے کہ واہب اس چیز کو اپنے قبضے اور تصرُّف سے خالی کردے تاکہ موھوب لہٗ کے قبضہ کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قَالَ فِي التَّتَارْخَانِيَةِ: قَدْ ذَكَرْنَا اَنَّ الْهِبَةَ لَاتَتِمُّ اِلَّا بِالْقَبْضِ وَالْقَبْضُ نَوْعَانِ: حَقِيْقِيٌّ وَأَنَّهٗ ظَاهِرٌ، وَحُكْمِيٌّ وَذٰلِكَ بِالتَّخْلِيَةِ''۔

ترجمہ: ''تاتارخانیہ میں فرمایا: ہم ذکر کرچکے ہیں کہ ہبہ قبضے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور قبضے کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی: وہ تو ظاہر ہے اور (۲) حکمی تو وہ تخلیہ سے ہوتا ہے، (مِنْحَةُ الْخَالِقِ عَلٰى حَاشِيَةِ البحر الرّائق، جلد 7، ص:486)''۔ تخلیہ سے مراد یہ ہے کہ شے موہوب کو اپنے قبضے اور تصرُّف سے خالی کردیا جائے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''فَقَدْ أَفَادَ اَنَّ التَّلَفُّظَ بِالْاِیْجَابِ وَالْقَبُوْلِ لَایُشْتَرَطُ، بَلْ تَکْفِی الْقَرَائِنُ الدَّالَّۃُ عَلَی التَّمْلِیْكِ''۔

ترجمہ: ''گزشتہ عبارت سے معلوم ہوا کہ ہبہ میں ایجاب وقبول کے کلمات ضروری نہیں ہیں بلکہ ایسے قرینوں کا پایا جانا کافی ہے، جو تملیک یعنی مالک بنائے جانے پر دلالت کرتے ہوں، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 8، ص:425)''۔ ''ایجاب وقبول'' سے مراد یہ ہے کہ واہب موہوب لہٗ کو کہے: میں نے یہ پلاٹ یا فلیٹ آپ کو ہبہ کیا اور موہوب لہٗ جواباً کہے: میں نے قبول کیا۔

علامہ زین الدین ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَالْقَبُوْلُ تَارَۃً یَکُوْنُ بِالْقَوْلِ وَتَارَۃً بِالْفِعْلِ''۔

ترجمہ: ''ہبہ کا قبول کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی فعل سے، (البحر الرائق، جلد 7، ص: 485)''۔ مثلاً ایک نے ایجاب کیا یعنی یہ کہا: میں نے یہ چیز تمہیں ہبہ کردی، دوسرے نے زبان سے کچھ کہے بغیر عملاً لے لی، تو ہبہ مکمل ہوگیا۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے فقہاء کرام نے تکمیلِ ہبہ کے لیے لازم قرار دیا کہ واہب شے موہوب کو خالی کر کے موہوب لہٗ کے حوالے کرے اور وہ اُس پر قبضہ کرلے، اِس کی بابت فقہائے کرام کی عبارات درج ذیل ہیں:

تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''وَالْاَصْلُ أَنَّ الْمَوْھُوْبَ إِنْ مَشْغُوْلًا بِمِلْكِ الْوَاھِبِ مَنَعَ تَمَامَھَا، وَإِنْ شَاغِلًا، لَا، فَلَوْ وَھَبَ جِرَابًا فِیْہِ طَعَامُ الْوَاھِبِ أَوْ دَارًا فِیْھَا مَتَاعُہٗ أَوْدَابَّۃً عَلَیْھَا سَرْجُہٗ وَسَلَّمَھَا کَذٰلِكَ لَا تَصِحُّ وَبِعَکْسِہٖ تَصِحُّ فِی الطَّعَامِ وَالْمَتَاعِ وَالسَّرْجِ فَقَطْ لِاَنَّ کُلًّا مِنْھَا شَاغِلٌ الْمِلْكَ لِوَاھِبٍ لَا مَشْغُوْلٌ بِہٖ''۔

ترجمہ: ''اصل یہ ہے کہ اگر شے موہوب، واہب کی مِلکیت کے ساتھ مشغول ہو، تو یہ ہبہ

کے تمام ہونے سے مانع ہے اور اگر شاغل ہو تو نہیں، پس اگر کسی نے ایسا توشہ دان ہبہ کیا، جس میں ہبہ کرنے والے کا اناج تھا یا ایسا مکان ہبہ کیا، جس میں ہبہ کرنے والے کا سامان رکھا ہوا تھا، یا ایسی سواری ہبہ کی، جس پر ہبہ کرنے والے کا زین (کجاوہ) رکھا ہوا تھا، تو یہ ہبہ صحیح نہیں ہوگا، لیکن اس کے برعکس (مثلاً مکان یا توشہ دان میں موجود سامان ہبہ کیا یا سواری کے کجاوے کو ہبہ کیا) تو طعام، سامان اور کجاوے کا ہبہ صحیح ہے، کیونکہ اِن میں سے ہر ایک واہب کی مِلک کو شاغل ہے، اس کے ساتھ مشغول نہیں ہے''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت لکھتے ہیں:

''کَاَنْ وَهَبَهٗ دَارًا، وَالْاَبُ سَاكِنُهَا اَوْ لَهٗ فِيْهَا مَتَاعٌ لِاَنَّهَا مَشْغُوْلَةٌ بِمَتَاعِ الْقَابِضِ''۔

ترجمہ: ''جیسا کہ کسی شخص نے اپنے بیٹے کو مکان ہبہ کیا اور باپ اس میں رہائش پذیر تھا یا باپ کا اُس میں سامان تھا (یہ ہبہ تام نہیں ہوگا) کیونکہ وہ مکان قابض کے سامان کے ساتھ مشغول ہے، (جلد 5، ص: 691-690)''۔

شرح مَجلّة الأحکام میں ہے:

''إِنَّ ثُبُوْتَ مِلْكِ الْمَوْهُوْبِ لَهٗ بِالْمَوْهُوْبِ الَّذِیْ هُوَ حُكْمُ الْهِبَةِ أَیْ تَرَتَّبَ حُكْمٌ عَلَى الْهِبَةِ يَتَوَقَّفُ عَلٰى قَبْضِ الْمَوْهُوْبِ فَلِذَا لَيْسَ لِلْهِبَةِ مِنْ حُكْمٍ قَبْلَ الْقَبْضِ بَلْ يَبْقَى الْمَالُ الْمَوْهُوْبُ مِلْكًا لِلْوَاهِبِ كَمَا كَانَ، وَبِتَعْبِيْرٍ آخَرَ إِنَّهٗ لَا يُشْتَرَطُ الْقَبْضُ فِی صِحَّةِ الْهِبَةِ إِلَّا أَنَّهٗ يُشْتَرَطُ الْقَبْضُ فِی ثُبُوْتِ الْمِلْكِ ''اَلْهِدَايَةُ وَجَوَاهِرُ الْفِقْهِ وَأَبُوالسُّعُوْدِ الْمِصْرِیُّ''۔

ترجمہ: ''شے موہوب پر مَوْهُوْب لَهٗ کی مِلکیت کا ثابت ہونا اُس شے پر موہوب کے قبضہ کرنے پر موقوف ہے، یہی وجہ ہے کہ قبضے سے پہلے ہبہ کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ مالِ موہوب بدستور واہب کی مِلکیت میں باقی رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ ہبہ کے صحیح ہونے کے لیے شے موہوب پر موھوب لہٗ کا قبضہ کرنا شرط نہیں ہے، البتہ شے موہوب پر موھوب لہٗ کی مِلکیت کے ثبوت کے لیے قبضہ شرط ہے، بحوالہ: ''ہدایہ''، ''جواہر الفقہ'' اور ''ابوسعود مصری''، (جلد 2، ص: 398، مطبوعہ: دار عالم الکتب، سعودیہ)''۔

مزید لکھتے ہیں:

''إِذَا وَهَبَ أَحَدٌ لِابْنِهِ الْكَبِيْرِ الْعَاقِلِ الْبَالِغِ شَيْئًا يَلْزَمُ التَّسْلِيْمُ وَالْقَبْضُ۔۔ قَالَ الطَّحْطَاوِيُّ: اَلْهِبَةُ لِلْوَلَدِ الْكَبِيْرِ لَا تَتِمُّ إِلَّا بِقَبْضِهٖ وَلَوْ كَانَ فِيْ عِيَالٍ''۔

ترجمہ: ''اگر کسی شخص نے اپنے عاقل بالغ بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کی (تو ہبہ کے تمام ہونے کے لیے) اُس شے کو حوالے کرنا اور موہوب لہٗ کو اس پر قبضہ کرنا لازم ہے''۔۔۔۔''امام طحطاوی'' فرماتے ہیں: بالغ بیٹے کو ہبہ کرنا تام نہیں ہوتا، مگر اُس کے قبضے سے، اگرچہ وہ اپنے والد کے زیرِ عیال ہو، (جلد 2، ص: 18-417، مطبوعہ: دار عالم الکتب، سعودیہ)''۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہٗ العزیز لکھتے ہیں:

''جب واہب نے بعد تخلیہ مکان موہوب لہٗ کو قبضہ کاملہ شرعیہ دلا دیا ہو (نہ یوں کہ خود اس میں ساکن رہا، واہب کا اسباب اس میں رہا اور کرایہ نامہ لکھ دیا اور کہہ دیا کہ پورا قبضہ دے دیا، یہ شرعاً قبضہ نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ مکان اپنی سکونت واسباب سے خالی کر کے قبضہ دے، اگرچہ ایک منٹ کے بعد یوں قبضہ دے کر پھر اس میں آ جائے اور اپنا اسباب لے آئے، اس طرح کا قبضہ کاملہ دیدیا ہو) تو وہ مکان مَوْهُوْب لَہٗ کی مِلک ہو گیا''۔

(فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص: 361)

مزید لکھتے ہیں:

''ہبہ کے مکمل ہونے کے لیے واہب کا موہوب لہٗ کو شے موہوب پر قبضہ کاملہ دلانا شرط ہے، قبضہ کاملہ کے یہ معنی ہیں:

(۱) وہ جائداد یا تو وقت ہبہ ہی مشاع نہ ہو اور واہب اس تمام کو موہوب لہٗ کے قبضہ میں دیدے۔

(۲) مشاع ہو تو اس قابل نہ ہو کہ اُسے دوسرے کی مِلک سے جدا و ممتاز کر لیں، تو قابل انتفاع رہے، جیسے: ایک چھوٹی سی دکان دو شخصوں میں مشترک، کہ آدھی الگ کرتے ہیں تو بیکار ہو جاتی ہے، ایسی چیز کا بلا تقسیم قبضہ دلا دینا بھی کافی و کامل سمجھا جاتا ہے۔

(۳) مشاع قابل تقسیم بھی ہو تو واہب اپنی زندگی میں جدا و منقسم کر کے قبضہ دیدے کہ اب مشاع نہ رہی، یہ تینوں صورتیں قبضہ کاملہ کی ہیں۔

پسر موہوب لہٗ اگر وقت ہبہ بالغ ہو تو خود اس کا اپنا قبضہ شرط ہے ورنہ باپ کا قبضہ اسی کا قبضہ ہے: ''کُلُّ ذٰلِکَ مُصَرَّحٌ بِہٖ فِی الْکُتُبِ الْفِقْهِیَّةِ عَنْ اٰخِرِهَا'' (یہ تمام بحث کتب فقہ میں تصریح شدہ ہے)۔ پس اگر کسی شخص نے اپنی جائداد اپنے پسر کو تحریری، خواہ زبانی ہبہ کر دی اور بشرائط و معانی مذکورہ پسر کو قبضہ کاملہ دلا دیا، تو وہ جائداد خاص اس پسر کی مِلک ہو گئی، دیگر ورثا کا اس میں استحقاق نہ رہا اور اگر ہبہ نہ تھا، نرا اقرار ہی اقرار تھا کہ اسے دے دوں گا، یا ہبہ زبانی، خواہ تحریری کیا مگر قبضہ نہ دیا، تو وہ قبضہ کاملہ نہ تھا، اگرچہ پسر نے بعد موت پدر قبضہ کاملہ کر لیا ہو، تو ان صورتوں میں وہ جائداد بدستور مِلکِ پدر پر باقی رہے گی تمام ورثہ حسب فرائض اس سے حصہ پائیں گے: فَاِنَّ مَوْتَ الْوَاهِبِ قَبْلَ التَّسْلِیْمِ یُبْطِلُ الْهِبَةَ کَمَا فِی ''الدُّرِّ الْمُخْتَارِ (کیونکہ قبضہ دینے سے قبل واہب کی موت ہبہ کو باطل کر دیتی ہے جیسا کہ درمختار میں ہے)، (فتاویٰ رضویہ، جلد 19، ص:219، مُلخصاً)''۔

ہماری رائے میں فقہائے کرام نے یہ شرائط اس لیے لگائی تھیں کہ ہبہ مکمل ہو جائے اور بعد میں کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔ چونکہ تکمیلِ ہبہ کے لیے شے موہوب کو اپنے قبضے سے خالی کرنے کی شرط بڑی کڑی ہے، خصوصاً جبکہ واہب اور موہوب لہٗ اُسی ایک مکان میں رہ رہے ہوں، تو فُقہائے کرام نے اُس کے بارے میں یہ حیلہ بتایا: ''واہب ایک رات کے لیے اس جائداد سے باہر نکل جائے یا کچھ دیر کے لیے اپنا سامان لے کر باہر نکل جائے اور پھر واپس آ جائے یا اپنا سامان موہوب لہٗ کے پاس ودیعت رکھ کر مکان پر قبضہ دیدے، پھر چاہے تو اس کے ساتھ آ کر بدستور رہتا رہے، چنانچہ تنویر الابصار مع الدرالمختار میں ہے:

''فِی ''الْجَوْهَرَةِ'': وَحِیْلَةُ هِبَةِ الْمَشْغُوْلِ اَنْ یُّوْدِعَ الشَّاغِلُ اَوَّلًا عِنْدَ الْمَوْهُوْبِ لَهٗ ثُمَّ یُسَلِّمُهُ الدَّارَ مَثَلًا فَتَصِحُّ لِشُغْلِهَا بِمَتَاعٍ فِیْ یَدِهٖ''۔

ترجمہ: ''جَوْهَرَةُ النَّیِّرَہ'' میں ہے: مشغول کو ہبہ کرنے کا حیلہ یہ ہے کہ شاغل کو پہلے

موہوب لہٗ کے پاس ودیعت کے طور پر رکھ دیا جائے، پھر مشغول کو ہبہ کر کے قبضہ دیدے، مثلاً: مکان میں جو سامان ہے، اسے ودیعت رکھ کر مکان پر قبضہ دیدے، تو ہبہ مکمل ہوجائے گا، (جلد 8، ص:429، بیروت)"۔

صورتِ مسئولہ میں ہبہ کے وقت آپ اپنے مکان میں اپنے والدین کے ساتھ ہی رہتے تھے، شرعی طور پر ہبہ مکمل ہوگیا، کسی جدید قبضے کی ضرورت نہیں تھی۔

امام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر مرغینانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"قَالَ: وَإِذَا كَانَتِ الْعَيْنُ فِي يَدِ الْمَوْهُوْبِ لَهُ مَلَكَهَا بِالْهِبَةِ وَإِنْ لَمْ يُجَدِّدْ فِيهَا قَبْضًا لِاَنَّ الْعَيْنَ فِي قَبْضِهٖ وَالْقَبْضُ هُوَ الشَّرْطُ، بِخِلَافِ مَا إِذَا بَاعَهٗ مِنْهُ، لِاَنَّ الْقَبْضَ فِي الْبَيْعِ مَضْمُوْنٌ فَلَا يَنُوْبُ عَنْهُ قَبْضُ الْاَمَانَةِ، أَمَّا قَبْضُ الْهِبَةِ فَغَيْرُ مَضْمُوْنٍ فَيَنُوْبُ عَنْهُ قَالَ: وَإِذَا وَهَبَ الْاَبُ لِابْنِهِ الصَّغِيْرِ هِبَةً مَلَكَهَا الِابْنُ بِالْعَقْدِ، لِاَنَّهٗ فِي قَبْضِ الْاَبِ فَيَنُوْبُ عَنْ قَبْضِ الْهِبَةِ، وَلَا فَرْقَ بَيْنَ مَا إِذَا كَانَ فِي يَدِهٖ أَوْ فِي يَدِ مُوْدَعِهٖ، لِاَنَّ يَدَهٗ كَيَدِهٖ، بِخِلَافِ مَا إِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا أَوْ مَغْصُوْبًا أَوْ مَبِيْعًا بَيْعًا فَاسِدًا، لِاَنَّهٗ فِي يَدِ غَيْرِهٖ أَوْ فِي مِلْكِ غَيْرِهٖ"۔

ترجمہ: "جب چیز بعینہٖ موہوب لہٗ کے قبضے میں ہو تو ہبہ کرتے ہی اس کا مالک ہوجائے گا، اگرچہ قبضہ کی تجدید نہ کی گئی ہو، یعنی اپنے قبضے سے نکال کر نئے سرے سے قبضہ نہ کیا ہو، کیونکہ عین موہوب اس کے قبضے میں ہے اور (ہبہ میں) قبضہ ہی شرط ہے، اس کے برعکس جب مالک نے وہ چیز اُسے فروخت کردی کیونکہ بیع کا قبضہ مضمون (Guaranteed) ہوتا ہے تو بطور امانت قبضہ اس کے قائم مقام نہیں ہوگا، جبکہ ہبہ کا قبضہ مضمون نہیں ہوتا تو وہ اُس کے قائم مقام ہوجائے گا۔ انہوں نے کہا: اور جب باپ اپنے نابالغ بیٹے کو ہبہ کرے تو ہبہ کرتے ہی بیٹا اُس کا مالک ہوجائے گا، کیونکہ وہ باپ کے قبضے میں ہے، تو باپ کا قبضہ ہبہ کے قبضے کے قائم مقام ہوجائے گا اور اس میں کچھ فرق نہیں کہ وہ اس کے قبضے میں ہو یا جس کے پاس وہ چیز امانت رکھی ہے، اس کے قبضے میں ہو، کیونکہ جس کے پاس چیز ودیعت رکھی

گئی ہے، اس کا قبضہ امانت رکھنے والے کے قبضے ہی کی طرح ہے، اس کے برعکس جب وہ شے رہن رکھی گئی ہو یا غصب کی گئی ہو یا بیعِ فاسد میں بیچی گئی ہو، تو ان صورتوں میں مُرتہن یا غاصب یا بیع فاسد کے نتیجے میں مشتری کا قبضہ اصل مالک کے قبضے کے قائم مقام نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں وہ چیز دوسرے کے قبضے یا دوسرے کی مِلک میں ہے''۔

(ہدایہ، جلد 6،ص:246)

علامہ اکمل الدین محمد بن محمد بن محمود بابُرتی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَإِذَا كَانَ الْعَيْنُ فِي يَدِ الْمَوْهُوْبِ لَهُ لَايَحْتَاجُ إِلَى قَبْضٍ جَدِيْدٍ لِانْتِفَاءِ الْمَانِعِ وَهُوَ عَدَمُ الْقَبْضِ، فَإِذَا وُجِدَ الْقَبْضُ أَمَانَةً جَازَ أَنْ يَنُوْبَ عَنْ قَبْضِ الْهِبَةِ''۔

ترجمہ: ''اور جب عینِ موہوب، موھوب لہٗ کے قبضے میں ہو تو ہبہ تام ہونے کے لیے جدید قبضہ کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ یہاں تکمیلِ ہبہ سے کوئی چیز مانع نہیں ہے اور وہ ہے قبضے کا نہ ہونا، پس جب امانۃً قبضہ پایا جائے تو اس کا ہبہ کے قبضے کے قائم مقام ہونا جائز ہے''۔

(العنایہ فی شرح الھدایہ، جلد 9،ص:32)

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''وَهَبَ اثْنَانِ دَارًا لِوَاحِدٍ صَحَّ لِعَدَمِ الشُّيُوْعِ''۔

ترجمہ: ''دو شرکاء نے ایک مکان ایک شخص کو ہبہ کیا، تو عدمِ اشتراک کی وجہ سے (یہ ہبہ) صحیح ہے، (جلد 8،ص:435، بیروت)''۔ یعنی ہر شریک پر لازم نہیں ہے کہ مکان کو تقسیم کرکے اپنا اپنا حصہ الگ کریں اور پھر موھوب لہٗ کے حوالے کریں۔

عبدالرحمٰن بن محمد شیخی زادہ حنفی لکھتے ہیں:

''وَالْمُرَادُ بِالْقَبْضِ الْكَامِلِ فِي الْمَنْقُوْلِ مَا هُوَ الْمُنَاسِبُ وَفِي الْعَقَارِ أَيْضًا مَا يُنَاسِبُهُ، فَأَخْذُ مِفْتَاحِ الدَّارِ الْمَوْهُوْبَةِ قَبْضٌ لَهَا''۔

ترجمہ: ''اشیائے منقولہ میں کامل قبضے سے مراد اُس شے کے مناسب قبضہ مراد ہے اور اشیائے غیر منقولہ مثلاً جائداد میں بھی اُسی کے مناسب قبضہ مراد ہے، پس موہوبہ مکان کی

چابی لے لینا کامل قبضے کے حکم میں ہے"۔ مزید لکھتے ہیں:

"وَلَوْ وَهَبَتْ امْرَأَةٌ دَارَهَامِنْ زَوْجِهَا وَهِيَ سَاكِنَةٌ فِيهَا وَزَوْجُهَا أَيْضًا سَاكِنٌ فِيهَا جَازَتِ الْهِبَةُ وَيَصِيرُ الزَّوْجُ قَابِضًا لِلدَّارِ، لِأَنَّ الْمَرْأَةَ وَمَتَاعَهَا فِي يَدِ الزَّوْجِ فَصَحَّ التَّسْلِيمُ"۔

ترجمہ: "اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو مکان ہبہ کیا جبکہ وہ عورت اس میں رہائش پذیر تھی اور اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ گھر میں سکونت پذیر تھا، تو ہبہ جائز ہے اور شوہر اُس مکان پر قابض قرار پائے گا، اس لیے کہ وہ عورت خود اور اس کا سامان شوہر کے قبضے میں تھا، تو سپردگی صحیح ٹھہری، (مَجْمَعُ الْاَنْهر، جلد 2، ص: 354)"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر صورت میں تکمیلِ ہبہ کے لیے واہب پر لازم نہیں ہے کہ موہوب یعنی مکان کو خالی کر کے موہوب لہٗ کو اس پر قبضہ دیدے۔

ہمارا عُرف یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی غیر منقولہ جائداد اپنی بیوی یا بیٹے کو ہبہ کرتا ہے، جو اس کے ساتھ رہ رہے ہیں، تو وہ ملکی قانون (Law of The Land) کے تحت اس ہبہ کو سرکاری مقررہ ڈیوٹی دے کر باقاعدہ سرکاری رجسٹرار کے ہاں جا کر موہوب لہٗ کے نام رجسٹرڈ کراتا ہے اور موہوب لہٗ سرکاری کاغذات میں اس ہبہ کو قبول کرتا ہے، یہ کام علیٰ رُؤس الاشہاد یعنی علانیہ ہوتا ہے، اس کے دیگر وارثوں کو بھی پتا ہوتا ہے اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ زیرِ بحث صورت میں تو واہب نے بیٹیوں کو دس دس لاکھ روپے بھی دیے تاکہ وہ بھی ہبہ سے بالکل محروم نہ رہیں، پھر موہوب لہٗ نے مالکانہ حیثیت سے اس مکان کو فروخت بھی کر دیا، اس مالکانہ تصرُّف پر واہب یا موجودہ دعویداروں میں سے کسی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا، جو قبضۂ حکمی پر صریح دلیل ہے، لہٰذا موہوب لہٗ کا قبضہ پایا گیا اور موہوب لہٗ شے موہوب کا مالک ہو گیا۔ پس فقہی قواعد کی روشنی میں ہبہ مکمل ہے اور شرعاً وقانوناً مؤثر ہے۔

قانونِ ہبہ ایسے ہبہ کو مؤثر مانتا ہے، جس میں واہب اور موہوب لہٗ دونوں رہ رہے

ہوں اور ہبہ کا اعلان کر دیا گیا ہو اور سوال میں جو ہبہ کی صورت درج ہے، اس میں قانونی طور پر رجسٹریشن کے علاوہ واضح اعلان بھی ہو گیا کہ رجسٹرار نے بہنوں کے سامنے والدہ سے اس کی بابت پوچھا اور انہوں نے اس کی توثیق کی اور پھر مالکانہ تصرُّف کرتے ہوئے موہوب لہٗ اسے فروخت بھی کر چکا ہے اور اس موقع پر کسی کا اعتراض بھی سامنے نہیں آیا، لہٰذا اس کے مؤثر ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ قانون ہبہ 1908ء و قانون رجسٹری 1908ء کے تحت جائداد ہبہ ہونے کی صورت میں قبضے کی مندرجہ ذیل صورتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) اگر جائداد ہبہ کرنے والے کے اپنے قبضے میں ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہبہ کے بعد جائداد کا قبضہ اس شخص (موہوب لہٗ) کو منتقل کر دے۔

(2) اگر ایسی جائداد کرایہ داروں کے قبضہ میں ہو تو کرایہ داروں کو ہبہ کی اطلاع دے دینا اور جس کے حق میں ہبہ کیا گیا ہو اس کو کرایہ ادا کرنے کی ہدایت کر دینا کافی ہے۔

(3) اگر دونوں فریق (واہب اور موہوب لہٗ) ایسی جائداد میں رہ رہے ہوں تو ایسی جائداد کے ہبہ کی تکمیل کے لیے ہبہ کرنے والے کا اعلان ہی کافی ہے، جس سے قبضہ کے انتقال اور جائداد پر قبضہ چھوڑنے کی واضح نیت ظاہر ہو۔

مُفتیانِ کرام سے گزارش ہے کہ ہر اُس ملکی قانون کا احترام کریں جو شریعت سے مُتصادم نہیں ہے۔ قانونی اعتبار سے رجسٹرڈ ہبہ کو مؤثر مانیں۔ فقہائے کرام کی عبارات بھی اجتہادی آراء ہیں، قرآن وحدیث کی نُصوص نہیں ہیں، عُرف بدلتا رہتا ہے اور اس کا اعتبار ہونا چاہیے۔ پس ہماری رائے میں شریعت اور قانون کی رو سے مذکورہ بالا ہبہ مکمل اور مؤثر ہے اور اسے شرعاً بھی مؤثر ماننا چاہیے۔

علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أَمَّا الْهِبَةُ فَالشَّرْطُ فِيهَا الْقَبْضُ عِنْدَ أَكْثَرِ الْفُقَهَاءِ وَالتَّابِعِينَ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ، إِلَّا أَنَّ أَحْمَدَ يَقُولُ إِنْ كَانَتِ الْهِبَةُ عَيْنًا تَصِحُّ بِدُونِ الْقَبْضِ فِي الْأَصَحِّ، وَفِي الْمَكِيلِ وَالْمَوْزُونِ لَا تَصِحُّ بِدُونِ الْقَبْضِ، وَعِنْدَ مَالِكٍ يَثْبُتُ الْمِلْكُ

فِيهَا قَبْلَ الْقَبْضِ اِعْتِبَارًا بِالْبَيْعِ، وَبِهِ قَالَ اَبُوْ ثَوْرٍ وَالشَّافِعِيُّ فِي الْقَدِيْمِ، وَهُوَ قَوْلُ ابْنِ أَبِي لَيْلٰى"۔

ترجمہ: "اکثر فقہاء اور تابعین کے نزدیک ہبہ (کی تکمیل) کے لیے قبضہ شرط ہے اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی مذہب ہے، البتہ! امام احمد فرماتے ہیں: اگر ہبہ کوئی سامان ہے تو صحیح ترین قول کے مطابق بغیر قبضے کے بھی ہبہ صحیح ہے، مکیلی اور موزونی اشیاء میں بغیر قبضے کے ہبہ صحیح نہیں ہوگا، امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہبہ میں قبضے سے پہلے (موہوب لہٗ کے لیے) مِلکیت ثابت ہوجاتی ہے، وہ اِسے بیع پر قیاس کرتے ہیں، امام ابوثور اور امام شافعی کا قدیم قول یہی ہے اور امام ابن ابی لیلیٰ کا بھی یہی مذہب ہے، (عمدۃ القاری، جلد:13، ص:156)"۔

امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز لکھتے ہیں:

"اور شک نہیں دستاویز بیعنامہ بطور مرسوم ومعہود لکھ کر گواہیاں کرا کر مشتری کو حوالہ کرنا اور اس کا بخوشی لے لینا قطعاً دلیل تراضی ہے۔ عندالانصاف اسی قدر تحقق ایجاب وقبول کے لیے کافی ہے، اگرچہ اس سے پہلے زبانی گفتگو صرف اسی قدر آئی ہو کہ اس نے کہا: میں بیعنامہ تمہیں لکھوا کر دیتا ہوں، اس نے کہا: آمین، یہاں تک اگرچہ صرف وعدو پسند تھا مگر بیعنامہ بطور مذکور لکھوا کر دینا لینا، دلیل تراضی ہو کر ایجاب وقبول ہوگیا، جس طرح شائع وذائع ہے کہ والدین کوئی جائداد اپنے روپے سے خرید کر بیع نامہ اپنے کسی بچے کے نام لکھواتے ہیں، تمام عالم جانتا ہے کہ اس سے مقصود اس کی تملیک ہی ہوتی ہے اور وہ جائداد اسی بچے کی ٹھہرتی ہے، اگرچہ زبان پر ہبہ کا حرف بھی نہ آیا، (فتاویٰ رضویہ، جلد 18، ص:219)"۔

مفتی محمد رفیق حسنی لکھتے ہیں:

"غیر منقولہ اموال پر آج کے عرف میں قبضہ کا مفہوم یہ ہے کہ رجسٹریشن کے کاغذات کی فائل کا انتقال ہو یہ کہ فروخت کنندہ آدمی معاوضہ وصول کر کے پلاٹ یا مکان کے کاغذات خریدار کے نام رجسٹرڈ کرادے اور فروخت کنندہ مکان یا پلاٹ کے ساتھ بے تعلق

ہوجائے۔آج کل غیر منقولہ اشیاء خریدار کو پاور آف اٹارنی اور مختار نامہ دینا بھی قبضہ سمجھا جاتا ہے اور منقولہ اشیاء میں بھی کاغذات کا تبادلہ قبضہ سمجھا جاتا ہے۔خصوصاً جب منقولہ اشیاء بہت وزن منوں اور ٹنوں میں فروخت ہوں، ان میں بھی آج کل کے عرف اور رواج میں بنک کی ضمانت اور گارنٹی کے ساتھ کاغذات کا تبادلہ کافی سمجھا جاتا ہے۔خرید کردہ مال دوسرے کے ملک یا اپنے ملک میں ابھی اسٹور میں پڑا ہوتا ہے یا ہوائی یا بحری جہاز میں روانہ ہوچکا ہوتا ہے اور کاغذات کی منتقلی اور رجسٹریشن سے دوسرے یا تیسرے آدمی کو فروخت ہوجاتا ہے، ہر دور کے تقاضوں اور عرف اور رواج کے مطابق عقد اور نقد اور قبضہ اور فسخ کے مفاہیم اور صورتیں مختلف ہوتی رہتی ہیں''۔۔۔۔مزید لکھتے ہیں:

''یہ امر واضح ہے کہ مال، قبضہ اور مِلک کی تعریفیں نہ قرآن مجید میں ذکر کی گئی ہیں اور نہ حدیث شریف میں، بلکہ مال، قبضہ اور مِلک کی تعریفیں اجتہادی ہیں۔موجودہ عرف کے مطابق اگر قبضے کی یہ تعریف کی جائے کہ ہر وہ صورت کہ جس میں انسان ایسا عمل کرے، جس کی وجہ سے حاصل کردہ چیز اُس کے کنٹرول اور قبضے میں سمجھی جائے، جو کہ اُس کی شان اور حال کے لائق ہو، وہ صورت قبضہ ہوگی۔لہٰذا منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کے قبضے کی مختلف مُروّج صورتیں قبضہ کہلائیں گی، مثلاً: کاغذات کے ذریعے رجسٹریشن اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے بکنگ اور رجسٹریشن وغیرہا جس کی وجہ سے مال کے حقوق دوسرے آدمی کو منتقل ہوجاتے ہیں، دوسرے آدمی کو حاصل کردہ چیز میں اختیار حاصل ہوجاتا ہے، حاصل کردہ چیز کو استعمال کرے یا فروخت کرے۔یہ تعریف عموم کی وجہ سے سب مُروّج صورتوں کو شامل ہوگی، خواہ قبضے کی شکل جیب میں رکھنا ہو یا گھر یا اسٹور پر منتقل کرنا ہو یا مُروّجہ قانونی طریقوں اور رجسٹریشن کے ذریعے محفوظ کرلینا ہو''۔

(رفیق البرکات لاہل الزکوٰۃ، ص:148-147-145)

فتاویٰ دارالعلوم زکریا میں ہے:

سوال: کسی زمین یا دکان کے ہبہ کی تکمیل کے لیے اُن کے کاغذات کا قبضہ کافی ہے یا اس کو

خالی کر کے موہوب لہٗ کے ہاتھ میں دینا ضروری ہے؟۔

الجواب: ''جائداد کے ہبہ کی تکمیل کے لیے کاغذات پر قبضہ کافی ہے، یعنی کاغذات پر قبضہ کر لینے سے ہبہ تام ہو جائے گا۔ جدید فقہی مباحث میں ہے: عرف میں شیئرز کا قبضہ اُسی وقت سمجھا جاتا ہے، جبکہ سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، نیز ہر چیز کے قبضے کا طریقہ عرف ہی سے مُتعین ہوتا ہے، نیز عرف میں اکثر لوگ بغیر کاغذی ثبوت کے قبضے کا اعتبار نہیں کرتے ہیں''۔۔۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''ہر چیز کا قبضہ اس چیز کے مناسب ہوتا ہے، کار کا قبضہ یہ ہے کہ چابی مشتری کے حوالے کر دے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں کاغذات موہوب لہٗ کے حوالے کرنے سے قبضہ ہو جائے گا اور والد کی وفات کے بعد دوسرے وارث اُس بلڈنگ میں اپنا حقِ وراثت نہیں مانگ سکتے۔ جدید فقہی مباحث میں ہے: قرآن وسنت میں قبضے کی کوئی خاص حقیقت نہیں بتائی گئی ہے، بلکہ احادیث میں قبضے کی مختلف کیفیات کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں مقامِ خریداری سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ ''تجّار خرید کردہ مال کو اپنے کجاوے میں منتقل کر لیں''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ناپ تول کو قبضہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس بابت لوگوں کا عرف ہی معیار ہے، جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے، وہی اُس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائے گا، علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''وَلَا یُشْتَرَطُ الْقَبْضُ بِالْبَرَاجِمِ، لِاَنَّ مَعْنَی الْقَبْضِ هُوَ التَّمْكِيْنُ وَالتَّخَلِّيْ وَارْتِفَاعُ الْمَوَانِعِ عُرْفًا وَعَادَةً حَقِيْقَةً''۔

ترجمہ: ''کسی چیز کو ہاتھوں میں لے کر قبضہ کرنا شرط نہیں ہے کیونکہ قبضے کا معنیٰ ہے: کسی چیز پر دوسرے کو قادر کر دینا اور تخلیہ کرنا اور عرفاً وعادتاً موانع کا مُرتفع ہو جانا، (بدائع الصنائع، جلد 5، ص: 148)''۔ (فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلد پنجم، ص: 587-586 - 561-560)

اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے ۲۳ ویں سیمینار منعقدہ مارچ 2014ء میں پیش کیے جانے والے علمی، تحقیقی مقالات میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے مفتی رجب قاسمی لکھتے ہیں:

''مذکورہ مسئلے میں فقہ حنفی میں کچھ مشکلات نظر آتی ہیں، ان مشکلات کا ہمیں حل نکالنا ہے۔ احقر کے نزدیک اس کے دو حل نظر آتے ہیں: (۱) ہبہ کے سلسلے میں فقہِ حنبلی پر فتویٰ دیا جائے، (۲) قبضے کے سلسلے میں اُس کے مفہوم میں کچھ عموم رکھا جائے، جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے یعنی فقہِ حنبلی پر فتویٰ دینا، تو چونکہ مکیلات وموزونات ہی میں اُن کے نزدیک قبضہ ضروری ہے، بقیہ میں اُن کے یہاں قبضہ ضروری نہیں ہے اور ہمارے یہاں جو مشکل مسائل ہیں وہ مکیلات وموزونات کی قبیل سے نہیں ہیں، بلکہ اکثر وبیشتر یہ زمین جائداد کے سلسلے میں ہی ہے اور اس میں مسلکِ حنبلی میں قبضہ شرط نہیں ہے، پس اُن کے نزدیک بغیر قبضے کے ہبہ جائز ہے نیز اُن کے یہاں ''هبةُ المشاع'' بھی جائز ہے، اس لیے اس میں تمام جزئیات حل ہوتے نظر آتے ہیں، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قبضے کے مفہوم کو عام رکھا جائے، یہ فقہ کی رُو سے بھی زیادہ قریب ہے، کیونکہ قبضے کا عموم فقہ کی تمام کتابوں میں درج ہے، چنانچہ کُتُبِ فقہ میں ہے:

''فَاِنَّ قَبْضَ كُلِّ شَيْئٍ وَتَسْلِيْمَهٗ يَكُوْنُ بِحَسَبِ مَا يَلِيْقُ بِهٖ، (البحر الرائق، جلد5، ص: 416)''۔ لیکن آج کل جائداد میں قبضہ کی ایک نئی شکل دَر آئی ہے، وہ یہ ہے کہ سرکاری ادارے سے اُس کا رجسٹریشن کرایا جائے، مکمل تفصیلاتِ ضروریہ کے ساتھ، مثلاً ملکیت سے الگ کیا جانا، جگہ کی حد بندی، مقدار کا تعین وغیرہ۔ یہ تمام تفصیلات حکومت سے منظور شدہ اسٹامپ پیپر پر درج کر کے اُس کے دینے کو قبضہ سمجھا جائے، البتہ گھر کے ہبہ میں یہ بات اکثر وبیشتر پیش آتی ہے کہ واہب عموماً اپنے گھر سے الگ ہوئے بغیر ہبہ کر دیتے ہیں اور اپنا سامان اُسی گھر میں رکھتے ہیں، اس بنا پر ''مَشْغُول بِمِلْكِ الْوَاهِب'' لازم آتا ہے، جو قبضے کے لیے مانع ہے، جیسا کہ فقہائے اَحناف نے صراحت کی ہے۔ جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے، تو یہ مسئلہ شرعی، صریح منصوص نہیں ہے، بلکہ اُس زمانے کے فقہاءِ کرام کا اجتہاد ہے اور اُس وقت جائداد پر قبضے کی یہی ایک شکل تھی، فی زمانہ اس کو نظر انداز

کرنے میں کوئی حرج لازم نہیں آتا، کیونکہ آج کل نت نئے طریقے کی کاغذی کارروائیاں اسٹامپ پیپر وغیرہ پر ہوجاتی ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس موقع پر ودیعت کا جو حیلہ مکتوب ہے کہ واہب اپنا سامان موہوب لہٗ کے پاس ودیعت رکھے، پھر مکان ہبہ کرے، یہ تمام مسائل عوام کی علم سے دوری کی بنا پر پیش آرہے ہیں، اس لیے یہ حیلہ کارآمد نہیں ہوگا، ورنہ اگر فقہِ حنفی کی رُو سے عمل کیا جائے تو اس کی بہت سی شکلیں موجود ہیں''۔

(ہبہ سے متعلق بعض مسائل، ص:309)

آج کل اسلامی بینکاری میں جو ''اَلْمَعَایِرُ الشَّرْعِیَّہ'' یعنی ''Shari'ah Standards'' نافذ ہیں، اس میں قبضے کے بارے میں درج ہے:

''کسی چیز کے سابق قبضہ کو کسی شرعاً معتبر سبب سے حاصل ہونے والے بعد والے قبضہ کے قائم مقام قرار دینے کی دلیل یہ ہے کہ قبضہ سے مراد کسی چیز پر کنٹرول دینا اور مقبوض میں تصرف پر قدرت دینا ہے۔ چنانچہ جب یہ بات پائی جائے گی قبضہ پایا جائے گا اور یہ رائے مبنی ہے مالکیہ اور حنابلہ کی اس رائے پر جس میں ان کے نزدیک اگر کسی شخص نے کوئی چیز فروخت کی یا اس کو ہبہ کیا یا اس کو رہن رکھوایا اور وہ چیز کسی غاصب کے پاس تھی یا مستعیر کے پاس تھی یا مودّع کے پاس تھی یا کرائے دار کے پاس تھی یا وکیل کے پاس تھی یا اس کے علاوہ کسی اور کے پاس تھی، تو سابقہ قبضہ مطلقاً عقد کی وجہ سے ثابت ہونے والے جدید قبضہ کے قائم ومقام ہوگا۔ خواہ قابض کا اس چیز پر ضمان پر مبنی قبضہ ہو یا امانت پر مبنی قبضہ، خواہ جدید قبضہ قبضۂ امانت ہو یا قبضۂ ضمان۔ رہا مقبوض کی نسبت سے یہ سوال کہ وہ قابض کے قبضہ میں بطور ضمان تھی یا بطور امانت، اس سوال کا قبضہ کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کا کوئی اثر ہے، (شرعی معیار نمبر:18، ص:525)''۔

پس اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں ہبہ تام ہو چکا تھا، اس لیے وہ مکان آپ کی والدہ کی وراثت میں شامل نہیں اور آپ کی بہنوں کا اس میں کوئی استحقاق نہیں ہے، اس لیے اُن کا مطالبہ جائز نہیں ہے۔ ہمارے ممتاز مفتی صاحبان مفتی محمد رفیق

حسنی، مفتی محمد ابراہیم قادری، مفتی محمد الیاس رضوی اشرفی، علامہ مفتی احمد علی سعیدی، مفتی محمد وسیم اختر المدنی، مفتی خالد کمال، مفتی محمد اسماعیل نورانی اور مفتی محمد عبداللہ ضیائی اس فتوے کی توثیق کر چکے ہیں۔

## تصدیقات

(۱) مفتی محمد رفیق حسنی عفی عنہ:

دارالافتاء جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، بلاک 15، گلستانِ جوہر، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اَلۡجَوَابُ صَحِیۡحٌ ! مفتی صاحب نے نہایت اَحسن فتویٰ جاری کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ مفتی صاحب نے لوگوں کی مشکل حل فرمادی اور لکیر کے فقیر مفتیوں کی غلط فہمی کا ازالہ فرما دیا۔

(2) مفتی محمد الیاس الرضوی الاشرفی:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الۡمِنۡعَامِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنَامِ وَبَعۡدُ! فَالۡمُجِیۡبُ الۡمُنِیۡبُ الۡمُنِیۡفُ مُصِیۡبٌ وَمُثَابٌ وَالۡعِلۡمُ بِالۡحَقِّ عِنۡدَاللّٰہِ الۡمُقِیۡتِ الۡوَھَّابِ، ثُمَّ أَقُوۡلُ کَمَا قَالَ أَحَدٌ مِّنَ الۡفُحُوۡلِ فِیۡ جَوَابِ مَسۡئَلَۃِ الۡھِبَۃِ بِغَیۡرِ شُبۡھَۃٍ أَنَّہٗ صَحِیۡحٌ بِدُوۡنِ سُلَاسٍ۔

(3) مفتی محمد اسماعیل نورانی:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت قبلہ مفتی منیب الرحمٰن مدّظلہ العالی نے ہبہ کے مسئلے پر بہت عمدہ انداز سے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق فتویٰ تحریر فرمایا ہے اور بلاشبہ دورِ حاضر کے علماء اور صاحبانِ افتاء کو غور وفکر اور تحقیق میں مزید آگے بڑھنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

تاہم یہاں اس فتوے کے قارئین کے لیے ایک دو باتیں تحریر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

فُقہاء نے ہبہ کی بحث میں جو قیودات بیان فرمائیں ہیں، اُن کی اپنی جگہ اہمیت اور افادیت ہے اور فقہاء نے یہ قیودات اس لیے بیان فرمائیں تاکہ حتی الامکان ہبہ کا تحفظ ہو

اور موہوب لہٗ کو نقصان سے بچایا جاسکے۔ خصوصاً شے موہوب اگر مشغول ہو اور اُسی حالت میں ہبہ کیا جائے اور اُس ہبہ پر کوئی گواہ بھی نہ ہو، تو آئندہ کسی وقت واہب اپنے ساز و سامان کی موجودگی کو دلیل بنا کر ہبہ سے منحرف ہوسکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہبہ کی تکمیل اس بات سے مشروط ہو کہ شے موہوب، متاعِ غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو۔ لہٰذا ایسا ہبہ، جس پر کوئی گواہ نہ بنایا گیا ہو اور اس پر کوئی کاغذی کارروائی بھی عمل میں نہ لائی گئی ہو، وہاں فقہاء کی بیان کردہ شرائط کی ضرورت اور افادیت آج بھی برقرار ہے۔

مفتی صاحب دام ظلہ کا فتویٰ خاص اُس صورت میں بہت اہم اور مفید ہے، جہاں موہوب لہٗ کو شرعی گواہوں کے ذریعے یا کسی قانونی Evidence کی بنیاد پر سیکیورٹی حاصل ہو اور اُسے واہب کے منحرف ہونے کا کوئی خطرہ نہ ہو، جیسے فی زماننا مکانات وغیرہ کے ہبہ میں لوگ باضابطہ طور پر Gift Deed اور دیگر Leagal Documents کے ذریعے یا واہب کے سامنے شے موہوب میں مختلف تصرُّفات اور اقدامات کے ذریعے شے موہوب کا تحفظ کر لیتے ہیں اور ہبہ کو یقینی بنا لیتے ہیں، ایسی صورت میں یقیناً فقہاء کی بعض شرائط میں عرف کی بنا پر غور کرنا اور پیش آمدہ حالات کے مطابق مسئلے کا حل تلاش کر کے فتویٰ جاری کرنا، منصبِ افتاء کا لازمی تقاضا ہے، جس کی واضح مثال مفتی صاحب کا زیرِ نظر فتویٰ ہے۔ فَجَزَاهُ اللهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ۔

یہ وضاحت ہم نے اس لیے کر دی تاکہ کسی کو یہ شبہ یا گمان نہ ہو کہ فقہاء کی بیان کردہ مذکورہ شرائط، اب موجودہ عرف کی بنا پر بالکلیہ متروک ہو چکی ہیں، بلکہ آج بھی جہاں ہبہ کی وہ نوعیت ہو، جس کے پیشِ نظر فقہاء نے مذکورہ قیودات بیان فرمائیں، وہاں فقہاء کی بیان کردہ شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا اور جہاں عرف کا تقاضا مختلف ہو، وہاں اُس عہد کے فقہاء کا قول اختیار کرنا بہتر ہوگا تاکہ حرج میں مبتلا ہونے سے حتی الوسع بچا یا جائے، وَلِاَنَّ الْحَرَجَ مَدْفُوْعٌ بِالنُّصُوْصِ، لَاسِیَّمَا فِی الْمُعَامَلَاتِ وَالْعُقُوْدِ۔

## دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کا جواب

ہم نے یہ فتویٰ دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی کو بھی اپنی رائے دینے کے لیے ارسال کیا تھا، انہوں نے ہبہ پر قبضہ کے موضوع پر تفصیلی سوال وجواب لکھنے کے بعد ہمارے فتوے کی بابت جناب مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب کی مُہر اور دستخط سے مندرجہ ذیل مکتوب ہمیں ارسال کیا، ہم ان کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی جناب مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب مد ظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ مکان کے ہبہ کے سلسلہ میں آنجناب کا تحریر کردہ مفصل فتویٰ موصول ہوا، جو آپ نے دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی میں برائے تصدیق ارسال فرمایا تھا، اس مسئلہ پر دارالافتاء کے احباب نے غور کیا، پھر آخر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم کی خدمت میں مشورہ کیلئے پیش کیا گیا۔ حضرت مد ظلہم کے مشورہ اور ہدایت کی روشنی میں ایک فتویٰ (نمبر ۲۰۶۰/۸۹) تیار کیا گیا جس پر حضرت مد ظلہم اور دارالافتاء کے دیگر حضرات نے تصدیقی دستخط فرمائے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ علی الاطلاق ہر صورت میں محض رجسٹریشن کو قبضہ کے قائم مقام کہنا تو مشکل ہے، البتہ بعض صورتوں میں چند شرائط کے ساتھ اُسے قبضہ کے قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہے، جن میں وہ صورت بھی شامل ہے جو آپ کے سوال میں ہے۔ لہٰذا آنجناب نے صورتِ مسئولہ کے جواب میں ہبہ درست ہونے کا جو حکم لکھا ہے وہ حضرت شیخ الاسلام صاحب مد ظلہم کے مصدقہ فتویٰ کی روشنی میں درست ہے۔.................................والسلام

(دستخط)
دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی
۱۱/رجب المرجب ۱۴۴۰ھ
۱۹/مارچ ۲۰۱۹ء

## ہبہ کا ارادہ ظاہر کرنے سے ہبہ لازم نہیں آتا

**سوال:**

میں نے اپنی تمام جائداد اپنے بیٹے اور بیٹیوں میں بالترتیب تقسیم کر دی ہے، میری دو بیویاں تھیں، اس تقسیم کے وقت میں نے اُن سے کہا تھا کہ ان کو بھی اسی مقدار میں دوں

گا، لیکن ایک بیوی فوت ہوگئی، اب بچوں کا مطالبہ ہے کہ آپ نے انہیں دینے کا کہا تھا، اب ہمیں دے دیں۔ کیا میں بیوی کے فوت ہونے کے بعد بچوں کو دینے کا پابند ہوں اور کیا بچے اس مطالبے کا حق رکھتے ہیں؟، (غلام حیدر، نارتھ ناظم آباد کراچی)۔

**جواب:**

آپ کی جو اہلیہ فوت ہوگئی ہیں، ان کا آپ کی جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ اگر آپ نے اُن کا حق مہر ادا نہیں کیا تھا تو اب وہ رقم آپ کے ذمے قرض ہے اور فوت شدہ خاتون کا ترکہ شمار ہوگی اور قانونِ وراثت کے مطابق ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی، جس میں شوہر بھی شامل ہے، البتہ آپ کی وفات کے وقت جو بیوی حیات ہوگی، وہ آپ کی وارث بنے گی۔ جب تمام اولاد کو آپ نے اپنی زندگی میں برابر برابر ہبہ کردیا، تو کسی کو مطالبے کا حق حاصل نہیں، ہاں اگر اب بھی کچھ مال آپ کے پاس موجود ہے، تو آپ کے انتقال کے وقت جو ورثاء موجود ہوں گے، وہ حسبِ تناسب حصہ پائیں گے، اگرچہ پہلے ہبہ کے وقت اُنہیں حصہ ملا ہو۔ نیز آپ کا یہ کہنا کہ ''میں ان کو بھی اسی مقدار میں دوں گا''، یہ ہبہ نہیں ہے، محض ارادۂ ہبہ ہے اور تاوقتیکہ آپ کوئی چیز کسی کو باقاعدہ ہبہ کر کے اس کی مِلک اور قبضے میں نہ دیں، محض ہبہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے سے ہبہ لازم نہیں آیا۔

# حلال وحرام کے مسائل

# مسجد کی دیوار پر ٹی وی نصب کرنا

**سوال:**

کیا اسلامی ملک میں مسجد میں ٹیلی ویژن رکھنا جائز ہے؟، اور کیا اس کی موجودگی میں نماز پڑھنا جائز ہے؟۔ اگر نہیں تو مسجد عاشق بحریہ ٹاؤن کراچی میں منبر اور محراب کے دائیں اور بائیں جانب دو بڑی سکرین یعنی ایل سی ڈی لگے ہوئے ہیں، جن میں مکہ اور مدینہ شریف کے لائیو چینل چل رہے ہیں، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس بارے میں آپ کی رہنمائی کا طلبگار ہوں تاکہ منتظمین بحریہ ٹاؤن سے اس مسئلے پر واضح گفتگو ہو سکے، (محمد عظیم، کوئٹہ)۔

**جواب:**

چند سال قبل ایک مذہبی تنظیم کی جانب سے شہر بھر کی مساجد میں ٹیلی ویژن اسکرین لگائے گئے تھے، جس کے بارے میں ہم نے ایک تفصیلی فتویٰ جاری کیا تھا، تفہیم المسائل، جلد پنجم، ص:139 پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کے مطابق مسجدِ حرام والے چینل پر بیت اللہ کا طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، پانچ وقتہ نمازیں اور دیگر سرگرمیاں لائیو دکھائی جاتی ہوں گی، اسی طرح مسجدِ نبوی والے چینل میں پانچ وقتہ نمازیں، ریاض الجنہ اور روضۂ رسول پر صلوٰۃ وسلام پیش کرنے والوں اور دیگر معمولات کو دکھایا جاتا ہوگا، اس سے لوگوں کی نمازوں اور عبادات میں توجہ بٹے گی۔ مسجد کا ماحول تو پرسکون اور عبادت کے لیے سازگار ہونا چاہیے۔ ہم کوئی ایجابی حکم تو نہیں لگا سکتے، لیکن ہماری رائے میں یہ حکمت دین کے منافی ہے اور اس سے اجتناب بہتر ہے۔

# سرکاری مکان کا غیر قانونی استعمال

## سوال:

بعض سرکاری اداروں میں ملازمین کو رہائشی مکان دیئے جاتے ہیں۔ایک ہی (سرکاری) ڈپارٹمنٹ کے دو ملازم ڈپارٹمنٹ کا مکان ڈپارٹمنٹ کی اجازت کے بغیر رقم لے دے کر خرید وفروخت کر لیتے ہیں،خریدنے والے نے بعد میں ڈپارٹمنٹ سے منظور کرالیا اور رہائش اختیار کر لی۔رہائشی ملازم نے ریٹائرمنٹ سے پہلے کسی اور سے رقم لے کر مکان فروخت کر دیا جبکہ ریٹائرمنٹ کے وقت ڈپارٹمنٹ کو واپس کرنا تھا۔ریٹائر ہونے والے ملازم کی سوچ یہ ہے کہ میں نے بھی رقم دے کر حاصل کیا تھا اور رقم لینا میرا حق ہے؟۔ ان معاملات کا کیا حکم ہے؟،(سرور،گلشن اقبال،کراچی)۔

## جواب:

وزارتِ ہاؤسنگ اینڈ ورکس کا ذیلی شعبہ ''اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ'' سرکاری ملازمین کو جو رہائشی مکانات الاٹ کرتا ہے،وہ حکومتی ملکیت ہوتے ہیں اور ملازمین کو ریٹائرمنٹ تک ان میں رہائش کا حق حاصل ہوتا ہے،اس کے بعد انہیں مکان خالی کر کے حکومت کو قبضہ دینا ہوتا ہے اور پھر حکومت کی صوابدید پر ہے کہ وہ اپنے طے شدہ طریقۂ کار اور معیار کے مطابق وہ مکان آگے کس کو الاٹ کرتی ہے۔اگر اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے با اختیار افسران رشوت لے کر الاٹ کرتے ہیں تو یہ حرام ہے اور اگر اپنے صوابدیدی اختیار کے تحت استحقاق اور سینیارٹی کے اعتبار سے مستحق افراد کو نظر انداز کر کے غیر مستحق شخص کو الاٹ کرتے ہیں،تو یہ ظلم ہے اور حق دار کی حق تلفی اور ناانصافی ہوتی ہے۔

کسی سرکاری ملازم کا بالا بالا رشوت دے کر یعنی سرکاری مکان میں قانونی طور پر مقیم دوسرے ملازم کو رقم دے کر اس مکان پر قابض ہونا اور پھر حیلہ وتدبیر سے اپنے نام پر الاٹ کرانا بھی ناجائز ہے اور اس سلسلے میں تمام فریق اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی طرح اگر کسی سرکاری ملازم نے ناجائز طور پر دوسرے ملازم کو رقم دے کر مکان پر قبضہ

کیا ہے، تو یہ ناجائز فعل کسی دوسرے ناجائز فعل کا جواز نہیں بن سکتا کہ وہ ملازم ریٹائرمنٹ کے بعد کسی دوسرے سرکاری ملازم سے رقم لے کر قبضہ کسی دوسرے سرکاری ملازم کو دیدے۔ عدمِ جواز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض سرکاری ملازمین اپنے نام پر مکان الاٹ کرا کے مکمل طور پر یا جزوی طور پر کچھ حصہ کسی دوسرے شخص کو کرائے پر دیدیتے ہیں، چونکہ اس عقد کی ان کو قانون کی رُو سے اجازت نہیں ہے، اس لیے یہ فعل اور اس کے ذریعے حاصل کردہ کمائی بھی ناجائز ہے۔

حدیث مبارک میں ہے:

''عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰى عَمَلٍ فَرَزَقْنَاهُ رِزْقاً فَمَا اَخَذَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ غُلُوْلٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن بُریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو ہم نے کسی منصب پر فائز کیا ہو اور اسے اس کی اجرت بھی دیدی گئی، تو اپنی اجرت کے علاوہ وہ جو کچھ بھی لے گا، وہ غبن کے زمرے میں آئے گا''۔

(سُنن ابوداؤد:2936)

## ملازم کا خیانت کرنا اور ظلم میں معاون بننا

**سوال:**

زید واپڈا میں ملازم تھا، بجلی چوری کرتے ہوئے کھمبے سے گر کر فوت ہو گیا، اس کے کام کو سرکاری ظاہر کیا گیا، پھر اس کے بیٹے کو میٹر ریڈر کی ملازمت مل گئی۔ واپڈا میٹر ریڈر کو یہ حکم دیتا ہے کہ لوگوں پر ایکسٹرا یونٹ ڈال کر یونٹ پورے کر لے۔ کیا میٹر ریڈر اس گناہ میں شامل ہے اور اس کی آمدنی جائز ہے؟، نیز ایک میٹر ریڈر اپنے ذمے کی ریڈنگ پوری کرتا ہے اور آفس کا وقت پورا نہیں کرتا، کیا اس کی آمدنی جائز ہے؟۔

**جواب:**

جس طرح صارفین کا بجلی کے حصول اور استعمال میں غیر قانونی طریقے اختیار کرنا

ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح بجلی سپلائی کرنے والے ادارے یا محکمے کی طرف سے میٹر کی رفتار تیز کرنا یا زائد بلنگ کرنا یعنی آپ کے کہنے کے مطابق صارفین پر زیادہ یونٹ ڈالنا بھی ناجائز اور حرام ہے۔ میٹر ریڈر بھی اتنا ہی گنہگار ہے، جتنا زائد بلنگ کا حکم دینے والا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''، ترجمہ: ''اور گناہ وظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔ بجلی کی چوری کی اکثر یا بعض صورتوں میں محکمے یا ادارے کے اہلکار اور ذمہ داران شریک ہوتے ہیں اور رشوت لے کر جرم کی ترغیب دیتے ہیں۔ کنڈا مافیا کا تمام تر بوجھ ان حقیقی صارفین کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے جو کوئی خیانت نہیں کرتے، دیانت داری سے بل ادا کرتے ہیں، لہٰذا محکمانہ یا ادارتی سطح پر دانستہ یا نادانستہ غفلت کا بوجھ بے قصور صارفین پر ڈالنا بھی ''اَکْلُ الْاَمْوَالِ بِالْبَاطِلِ'' (باطل طریقوں سے مال کھانے) کے ذیل میں آتا ہے۔

جائز ذرائع آمدنی کو حرام کاموں کے ذریعہ مخلوط کر دینے کا وبال اُس کی نحوست کے طور پر ظاہر ہوتا ہے اور مالِ حرام کا اثر عبادات اور دعاؤں کی قبولیت پر پڑتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) طہارت کے بغیر نماز مقبول نہیں اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں''۔

(سنن ترمذی:1)

بحیثیت ملازم ڈیوٹی کے اوقات کی پابندی کرنا ملازم پر لازم ہے اور اس کی ذمے داریوں کا تعین کرنا ادارے کا کام ہے، اس میں کام کی چوری یا خیانت پر وہ گنہگار ہوگا۔ ہاں! اگر ایک مخصوص علاقے کے میٹروں کی ریڈنگ لینا اس کا کام ہے اور دفتری اوقات کی پابندی اس پر لازم نہیں تو، کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ وفات یافتہ ملازم کے بیٹے کو روزگار دینے

میں اگر ضابطے یا میرٹ کی قصداً خلاف ورزی کی گئی ہے، تو ایسا با اختیار شخص اس کے لیے عنداللہ اور قانون کی نظر میں جوابدہ ہے۔ البتہ چونکہ اس کے بیٹے کو نوکری ان افسران نے دی ہے، جو اس کے مُجاز ہیں، تو اس کا اپنے فرائض ادا کر کے تنخواہ لینا جائز ہے۔

## غیر مسلم کا مال ناجائز طریقے سے کھانا

**سوال:**

کسی غیر مسلم کا مال ناجائز طریقے سے کھانے پر شریعت کیا کہتی ہے''۔

(برکت علی، ملتان)

**جواب:**

اسلام نے ایمان داری اور راست بازی کی تعلیم دی ہے، ایسی دیانت اور امانت کی تعلیم دی ہے، جس سے متاثر ہو کر قرونِ اُولیٰ میں دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے، پس ظلم، خیانت، دھوکا دہی، چوری، ڈاکا زنی یا لوٹ مار، الغرض کسی بھی باطل طریقے سے غیر مسلم کا مال کھانا جائز نہیں، معاملات میں مسلمان اور غیر مسلم میں تفریق نہیں ہے۔ یہ صرف یہودیوں کا نظریہ تھا کہ جو لوگ دین میں ان کے مخالف ہوں، اُن کا مال غیر معروف اور غیر قانونی طریقہ سے لینا جائز ہے، اس کی بابت حدیث آگے آرہی ہے۔ کسی کے مال کو ہڑپ کرنا ناجائز وحرام ہے، اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی نافرمانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ''، ترجمہ: ''اور ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ، (البقرہ:188)''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ''۔

ترجمہ: ''اور (اے مخاطب!) اہلِ کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس دولت کا انبار بھی امانت رکھو تو وہ تم کو (عندالطلب) ادا کر دیں گے اور اُن میں سے بعض

ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو وہ تم کو ادا نہیں کریں گے، سوائے اس کے کہ تم ان کے سر پر مسلسل کھڑے رہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہہ چکے ہیں کہ اَن پڑھ لوگوں کا مال ہڑپ کرنے پر ہماری کوئی گرفت نہیں ہوگی اور وہ دانستہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، (آل عمران:75)"۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کی نمازِ جنازہ اس لیے نہ پڑھائی کہ اُس نے ایک یہودی کے مال میں خیانت کرتے ہوئے نگینہ چرا لیا تھا۔

"عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ، قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ بِخَيْبَرَ، فَمَاتَ رَجُلٌ مِنَّا مِنْ أَشْجَعَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: صَلُّوا عَلَيْهِ، فَذَهَبْنَا نَنْظُرُ فَوَجَدْنَا خَرَزًا مِنْ خَرَزِ يَهُوْدَ، مَا يُسَاوِي دِرْهَمَيْنِ"۔

ترجمہ: "حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم غزوۂ خیبر کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، ہم میں سے قبیلۂ اشجع سے تعلق رکھنے والا ایک شخص فوت ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا (یعنی خود آپ ﷺ نے اس کا نمازِ جنازہ نہیں پڑھایا)۔ پس ہم نے (نمازِ جنازہ نہ پڑھانے) کا سبب معلوم کیا، تو ہم نے (اس کے سامان میں) یہودیوں کے نگینے میں سے ایک نگینہ پایا، جو تقریباً دو درہم کے مساوی تھا، (المستدرک للحاکم:1346)"۔

حدیث پاک میں ہے:

"وَكَانَ الْمُغِيْرَةُ صَحِبَ قَوْمًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَتَلَهُمْ وَأَخَذَ أَمْوَالَهُمْ، ثُمَّ جَاءَ فَأَسْلَمَ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: أَمَّا الْإِسْلَامُ فَقَدْ قَبِلْنَا، وَأَمَّا الْمَالُ فَإِنَّهُ مَالُ غَدْرٍ لَا حَاجَةَ لَنَا فِيْهِ"۔

ترجمہ: "حضرت مغیرہ بن شعبہ نے زمانۂ جاہلیت میں اپنے کافر ساتھیوں کو قتل کر کے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا، پھر وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور مسلمان ہو گئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے اسلام کو ہم نے قبول کر لیا، لیکن جو مال آپ کے پاس ہے،

یہ آپ نے دھوکے سے حاصل کیا ہے، جس کی ہمیں حاجت نہیں، (ابوداؤد:2765)"۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَيُسْتَفَادُ مِنْهُ أَنَّهُ لَا يَحِلُّ أَخْذُ أَمْوَالِ الْكُفَّارِ فِي حَالِ الْأَمْنِ غَدْرًا لِأَنَّ الرُّفْقَةَ يَصْطَحِبُونَ عَلَى الْأَمَانَةِ وَالْأَمَانَةُ تُؤَدّٰى إِلٰى أَهْلِهَا مُسْلِمًا كَانَ أَوْ كَافِرًا وَأَنَّ أَمْوَالَ الْكُفَّارِ إِنَّمَا تَحِلُّ بِالْمُحَارَبَةِ وَالْمُغَالَبَةِ"۔

ترجمہ: "اس حدیث سے معلوم ہوا: حالتِ امن میں دھوکا دہی کے ذریعے کفار کے اموال کو لینا حلال نہیں ہے کیونکہ لوگ امانت کی اُمید پر رفاقت اختیار کرتے ہیں، امانت کو ان کے اہل تک لوٹایا جائے گا خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر اور کفار کے اَموال صرف جنگ کی صورت میں اور اُن پر غلبہ حاصل کرنے کی صورت میں مباح ہوتے ہیں، (فتح الباری، جلد 5، ص:341)"۔ یعنی حالتِ امن اور عام حالات میں ان کے اموال کو تحفظ حاصل ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ صَعْصَعَةَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ: إِنَّا نُصِيبُ فِي الْغَزْوِ أَوِ (الْعَذَقِ)، الشَّكُّ مِنَ الْحَسَنِ مِنْ أَمْوَالِ أَهْلِ الذِّمَّةِ الدَّجَاجَةَ وَالشَّاةَ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَتَقُولُونَ مَاذَا، قَالَ: نَقُولُ لَيْسَ عَلَيْنَا بِذٰلِكَ بَأْسٌ، قَالَ هٰذَا كَمَا قَالَ أَهْلُ الْكِتَابِ: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ! إِنَّهُمْ إِذَا أَدَّوُا الْجِزْيَةَ لَمْ تَحِلَّ لَكُمْ أَمْوَالُهُمْ إِلَّا بِطِيبِ أَنْفُسِهِمْ"۔

ترجمہ: "صعصعہ بیان کرتے ہیں: ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا: ہم ذمیوں کے اَموال میں مرغیاں اور بکریاں پالیتے ہیں، حضرت ابن عباس نے فرمایا: پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟، اس نے کہا: ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ان کا مال کھالینے میں کوئی حرج نہیں ہے، حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ تو اہلِ کتاب والی بات ہوئی کہ وہ کہتے تھے: "اُمّیوں (یعنی حجاز کے مسلمانوں) کا مال کھانے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا"، تحقیق یہ ہے کہ جب اہل کتاب جزیہ ادا کردیں، تو ان کی اجازت کے بغیر ان کا مال کھانا

جائز نہیں ہے، (الجامع البیان للطبری:7274)"۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"وَلَا یُوْجَدُ فِی شَرْعِ اللهِ مُطْلَقًا التَّفْرِیْقُ فِی أَدَاءِ الْحُقُوْقِ وَالْاَمَانَاتِ بَیْنَ الْمُؤْمِنِ وَغَیْرِہٖ لِاَنَّ الْحَقَّ مُقَدَّسٌ، لَا تَتَأَثَّرُ صِفَتُهٗ بِشَخْصِ مُسْتَحِقِّهٖ، أَمَّا الْیَهُوْدُ فَلَمْ یَجْعَلُوا الْوَفَاءَ بِالْعَهْدِ حَقًّا وَاجِبًا لِذَاتِهٖ وَدَلَّ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: "وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللهِ الْکَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ"، عَلٰی أَنَّ الْکَافِرَ لَیْسَ أَهْلًا لِقَبُوْلِ شَهَادَتِهٖ لِاَنَّ اللهَ تَعَالٰی وَصَفَهٗ بِاَنَّهٗ کَذَّابٌ وَفِیْهِ رَدٌّ عَلَی الْکَفَرَةِ الَّذِیْنَ یُحَرِّمُوْنَ وَیُحَلِّلُوْنَ غَیْرَ تَحْرِیْمِ اللهِ وَتَحْلِیْلِهٖ، وَیَجْعَلُوْنَ ذٰلِكَ مِنَ الشَّرْعِ"۔

ترجمہ: "حقوق اور امانات کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کے دین میں مومن اور غیر مومن کی مطلقاً تفریق نہیں ہے، کیونکہ حق مقدس ہے، کسی شخص کے دین کی وجہ سے اس کا حق بالکل متاثر نہیں ہوتا، رہے یہود تو وہ عہد پورا کرنے کو حق واجب نہیں مانتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے: ترجمہ: "اور وہ دانستہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، (آل عمران: 75)"، اس آیت میں فی نفسہ ان کافروں کا رد ہے جو از خود چیزوں کو حرام قرار دیتے تھے اور ان کو شریعت اور دین بتاتے تھے، (اَلتَّفْسِیْرُ الْمُنِیْرُ لِلزُّحِیْلِی، جلد 3، ص:269)"۔

علامہ محمد بن احمد سرخسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَأُکْرِهُ لِلْمُسْلِمِ الْمُسْتَأْمَنِ إِلَیْهِمْ فِی دِیْنِهٖ أَنْ یَّغْدِرَ بِهِمْ، لِاَنَّ الْغَدْرَ حَرَامٌ، قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم: لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ یُرْکَزُ عِنْدَ بَابِ اسْتِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یُعْرَفُ بِهٖ غَدْرَتُهٗ، فَإِنْ غَدَرَ بِهِمْ وَأَخَذَ مَالَهُمْ وَأَخْرَجَهٗ إِلٰی دَارِ الْإِسْلَامِ کُرِهَتْ لِلْمُسْلِمِ شِرَائُهٗ مِنْهُ إِذَا عَلِمَ ذٰلِكَ، لِاَنَّهٗ حَصَّلَهٗ بِکَسْبٍ خَبِیْثٍ، وَفِی الشِّرَاءِ مِنْهُ إِغْرَاءٌ لَهٗ عَلٰی مِثْلِ هٰذَا السَّبَبِ، وَهُوَ مَکْرُوْهٌ لِلْمُسْلِمِ، وَالْاَصْلُ فِیْهِ حَدِیْثُ الْمُغِیْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ حِیْنَ قَتَلَ أَصْحَابَهٗ، وَجَاءَ بِمَالِهِمْ إِلَی الْمَدِیْنَةِ فَاَسْلَمَ، وَطَلَبَ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَنْ یُخَمِّسَ مَالَهٗ فَقَالَ أَمَّا إِسْلَامُكَ فَمَقْبُوْلٌ، وَأَمَّا مَالُكَ فَمَالُ غَدْرٍ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِیْهِ"۔

ترجمہ: ''جو مسلمان کافر ملک میں امان (ویزہ) حاصل کر کے جائے، اس پر اُن کے ساتھ عہد شکنی کرنا اور دھوکا دینا مکروہ (تحریمی) ہے کیونکہ غدر (عہد شکنی) حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن ہر عہد شکن کی دُبر (مقعد) پر ایک جھنڈا گاڑ دیا جائے گا، جس سے اس کی عہد شکنی کی پہچان ہوگی، اگر اس مسلمان نے کافروں سے عہد شکنی اور دھوکا دہی سے ان کا مال حاصل کیا اور اس مال کو دارالاسلام لے آیا تو دوسرے مسلمانوں کو اگر علم ہے تو ان کے لیے اس مال کو خریدنا حرام ہے کیونکہ وہ مال کسبِ خبیث سے حاصل ہوا ہے اور اس مال کو خریدنے سے اس کسبِ خبیث کی حوصلہ افزائی ہوگی اور یہ مسلمانوں کے لیے مکروہ ہے اور اس کی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ جب انہوں نے اپنے کافر ساتھیوں کو قتل کر دیا اور ان کا مال لے کر مدینہ آئے اور اسلام قبول کر لیا اور انہوں نے یہ چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس مال میں سے خمس (پانچواں حصہ) لے لیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہارا اسلام تو قبول ہے، لیکن رہا تمہارا دھوکے سے حاصل کیا ہوا مال تو ہمیں اس مال کی ضرورت نہیں ہے، (المبسوط، جلد 10، ص: 97-96)''۔

علامہ سرخسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَإِذَا أَوْدَعَ الْمُسْلِمُوْنَ قَوْمًا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَلَيْسَ يَحِلُّ لَهُمْ أَنْ يَأْخُذُوْا شَيْئًا مِنْ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا بِطِيْبِ أَنْفُسِهِمْ، لِلْعَهْدِ الَّذِيْ جَرٰى بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ فَإِنَّ ذٰلِكَ الْعَهْدَ فِيْ حُرْمَةِ التَّعَرُّضِ لِلْأَمْوَالِ وَالنُّفُوْسِ بِمَنْزِلَةِ الْإِسْلَامِ فَكَمَا لَا يَحِلُّ شَيْءٌ مِنْ أَمْوَالِ الْمُسْلِمِيْنَ إِلَّا بِطِيْبِ أَنْفُسِهِمْ فَكَذٰلِكَ لَا يَحِلُّ شَيْءٌ مِنْ أَمْوَالِ الْمُعَاهِدِيْنَ وَهٰذَا لِأَنَّ فِي الْأَخْذِ بِغَيْرِ طِيْبِ أَنْفُسِهِمْ مَعْنَى الْغَدْرِ وَتَرْكَ الْوَفَاءِ بِالْعَهْدِ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم يَقُوْلُ فِي الْعُهُوْدِ وَفَاءٌ لَا غَدْرَ فِيْهِ ثُمَّ اُسْتُدِلَّ عَلَيْهِ بِحَدِيْثِ أَبِيْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ نَاسًا مِنَ الْيَهُوْدِ يَوْمَ خَيْبَرَ جَاءُوْا إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بَعْدَ تَمَامِ الْعُهُوْدِ فَقَالُوْا: إِنَّ حَظَائِرَ لَنَا وَقَعَ فِيْهَا أَصْحَابُكَ فَأَخَذُوْا مِنْهَا بَقْلًا أَوْ ثُوْمًا فَأَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ عَوْفٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَنَادٰى فِيْ

النَّاسِ إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ يَقُوْلُ: لَا أُحِلُّ لَكُمْ شَيْئًا مِنْ أَمْوَالِ الْمُعَاهِدِيْنَ إِلَّا بِحَقٍّ"۔

ترجمہ: "جب مسلمان مشرکین کی کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ کریں، تو ان کی اجازت کے بغیر ان کا مال لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ ہمارے اور ان کے درمیان معاہدہ قائم ہے اور اس معاہدہ کی وجہ سے ان کی جان اور مال مسلمانوں کی جان اور مال کی طرح محترم ہے، سو جس طرح مسلمانوں کی اجازت کے بغیر ان کا مال لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح جن مشرکوں سے معاہدہ ہو، ان کی رضامندی کے بغیر ان کا مال لینا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ بغیر رضامندی کے ان کا مال لینا غدر اور عہد شکنی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عہد پورا کیا جائے اور اس میں غدر نہ کیا جائے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: معاہدہ ہونے کے بعد کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: آپ کے لوگوں نے ہمارے کھیتوں میں سے سبزیاں اور لہسن لے لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو یہ حکم فرمایا اور انہوں نے اعلان کیا: بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ جس قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اس کا کوئی مال حق کے سوا لینا جائز نہیں ہے، (شرح السیر، جلد 2، ص:133)"۔

## نابینا کا رہنمائی کے لیے کتا رکھنا

**سوال:**

کیا ایک نابینا انسان کو اپنے ساتھ Seeing Dog (رہنمائی کرنے والا کتا) رکھنے کی شریعت میں رخصت ہے، حالانکہ اُس کا لعاب نابینا کی ہر چیز پر لگ جاتا ہے؟

(ڈاکٹر خالد اعوان، امریکا)

**جواب:**

اسلام میں گھر، کھیتی باڑی اور مویشیوں کی حفاظت اور شکار کی ضرورت کے لیے تربیت یافتہ کتا رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن شوقیہ کتا پالنے اور رکھنے کی اجازت نہیں ہے، چند احادیثِ مبارکہ ملاحظہ فرمائیں ہے:

”عَنْ أَبِي طَلْحَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ“۔

ترجمہ: ”حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: (رحمت کے) فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کتا یا تصویر ہو، (صحیح مسلم:2106)“۔

کتے کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے، ممکن نہیں کہ جو شخص کتے کے ساتھ اختلاط کرے، اس کے بدن اور کپڑوں کو کتے کا نجس لعاب نہ لگے، اس کے کپڑے بھی پاک نہیں رہ سکتے اور نجس ہونے کے علاوہ اس کا لعاب زہر بھی ہے، جس شخص کو کتا کاٹ لے اس کے بدن میں یہی زہر سرایت کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا:

”إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيُرِقْهُ ثُمَّ لِيَغْسِلْهُ سَبْعَ مِرَارٍ“۔

ترجمہ: ”جب تم میں سے کسی شخص کے برتن میں کتا منہ ڈال دے، تو اس کو الٹ دو اور اس کو سات مرتبہ دھوو، (صحیح مسلم:279)“۔ ایک روایت میں: ”وَعَفِّرُوهُ الثَّامِنَةَ بِالتُّرَابِ“ یعنی آٹھویں مرتبہ اس کو مٹی سے دھوو، (صحیح مسلم:280) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت تین مرتبہ برتن دھونے کی بابت بیان کی گئی ہے، علامہ بدرالدین عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

”وَأَمَّا الْحَنَفِيَّةُ فَلَمْ يَقُولُوا بِوُجُوبِ السَّبْعِ، وَلَا التَّتْرِيبِ قُلْتُ: لَمْ يَقُولُوا بِذٰلِكَ لِأَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، الَّذِي رَوَى السَّبْعَ، رُوِيَ عَنْهُ غَسْلُ الْإِنَاءِ مَرَّةً مِنْ وُلُوغِ الْكَلْبِ ثَلَاثًا فِعْلًا وَقَوْلًا مَرْفُوعًا وَمَوْقُوفًا“۔

ترجمہ: ”فقہائے احناف کتے کے جھوٹے برتن کو نہ تو سات مرتبہ دھونے کے وجوب کے قائل ہیں نہ مٹی کے ساتھ صاف کرنے کے۔ میں نے کہا: اُنہوں نے یہ بات نہیں کہی، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے کتے کے جھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونے کی روایت کی ہے، اُنہی سے کتے کے جھوٹے برتن کو تین مرتبہ دھونے کی قولاً اور فعلاً روایت ہے، مرفوعاً اور موقوفاً بھی، (عمدۃ القاری، جلد 3، ص:61-60)“۔ یہ حکم اس کے

زہر کو دُور کرنے کے لیے ہے۔ کتے سے اختلاط کرنا اس زمانے میں غیر مسلموں اور اہلِ مغرب کا شعار ہے، مسلمانوں کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

احادیثِ مبارکہ میں ہے:

(۱) ''عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: أَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ فَأَرْسَلَ فِيْ أَقْطَارِ الْمَدِيْنَةِ أَنْ تُقْتَلَ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور مدینہ کے اطراف میں کتوں کو قتل کرنے کے لیے لوگ روانہ کیے، (صحیح مسلم: 1570)''۔

(۲) ''عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، فَنَنْبَعِثُ فِي الْمَدِيْنَةِ وَأَطْرَافِهَا فَلَا نَدَعُ كَلْبًا إِلَّا قَتَلْنَاهُ، حَتّٰى إِنَّا لَنَقْتُلُ كَلْبَ الْمُرَيَّةِ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ يَتْبَعُهَا''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے، پھر مدینہ اور اس کے اطراف میں کتوں کا پیچھا کیا گیا اور ہم نے کوئی کتا مارے بغیر نہیں چھوڑا، حتیٰ کہ دیہاتیوں کی اونٹنی کے ساتھ جو کتا رہتا تھا، ہم اس کو بھی مار ڈالتے، (صحیح مسلم: 1570)''۔

(۳) ''أَبُو الزُّبَيْرِ، أَنَّهُ سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يَقُوْلُ: أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، حَتّٰى إِنَّ الْمَرْأَةَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِيَةِ بِكَلْبِهَا فَنَقْتُلُهُ، ثُمَّ نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ قَتْلِهَا، وَقَالَ: عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ الْبَهِيْمِ ذِي النُّقْطَتَيْنِ، فَإِنَّهُ شَيْطَانٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ کوئی عورت دیہات سے اپنا کتا لے کر آتی تو ہم اس کتے کو بھی قتل کر دیتے، پھر نبی ﷺ نے اس کو قتل کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا: اس کالے سیاہ کتے کو قتل کر دو جو دو نقطے والا ہو، کیونکہ وہ شیطان ہے، (صحیح مسلم: 1572)''۔

(۴) ''عَنِ ابْنِ الْمُغَفَّلِ قَالَ: أَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِقَتْلِ الْكِلَابِ، ثُمَّ قَالَ:

مَا بَالُهُمْ وَبَالُ الْكِلَابِ، ثُمَّ رَخَّصَ فِي كَلْبِ الصَّيْدِ وَكَلْبِ الْغَنَمِ"۔

ترجمہ: "حضرت ابن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، پھر فرمایا: کتے لوگوں کو کیا تکلیف دیتے ہیں! پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شکاری کتے اور بکریوں (کی حفاظت) کے کتوں کی اجازت دی، (صحیح مسلم:1573)"۔

(5) "عَنْ أَبِي الْحَكَمِ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قَالَ: مَنِ اتَّخَذَ كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ زَرْعٍ أَوْ غَنَمٍ أَوْ صَيْدٍ، يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ"۔

ترجمہ: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو شخص تین مقاصد یعنی کھیت اور مویشیوں کی نگرانی یا شکار، کے علاوہ کتا رکھے تو اس کے اجر سے ہر روز ایک قیراط کم ہوتا رہے گا، (صحیح مسلم:1574)"۔

فقہائے احناف کے نزدیک دشمن یا چور کے خطرہ سے گھر کی حفاظت کے لیے کتا رکھنا جائز ہے، علامہ کمال الدین ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَأَمَّا اقْتِنَاؤُهُ لِلصَّيْدِ وَحِرَاسَةِ الْمَاشِيَةِ وَالْبُيُوتِ وَالزَّرْعِ فَيَجُوزُ بِالْإِجْمَاعِ، لٰكِنْ لَا يَنْبَغِي أَنْ يَتَّخِذَهُ فِي دَارِهِ إِلَّا إِنْ خَافَ لُصُوصًا أَوْ أَعْدَاءً لِلْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا إِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ أَوْ مَاشِيَةٍ نَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطَانِ"۔

ترجمہ: "شکار کے لیے، مویشیوں، گھروں اور کھیتوں کی حفاظت کے لیے کتا رکھنا بالاجماع جائز ہے، لیکن گھر کے اندر کتا نہیں رکھنا چاہیے، البتہ چوروں اور دشمنوں کا خوف ہو تو جائز ہے، صحیح حدیث (مسلم:1574) میں ہے: "جس شخص نے شکار کے کتوں یا مویشی کی حفاظت کے علاوہ کتا رکھا، اس کے اجر سے ہر روز دو قیراط کم ہوتا رہے گا"۔

(فتح القدیر، جلد7، ص:119)

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قَالَ: لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيهَا كَلْبٌ وَلَا جَرَسٌ"۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: (رحمت

کے) فرشتے ان مسافروں کے ساتھ نہیں رہتے، جن کے پاس کتا یا گھنٹی ہو، (صحیح مسلم: 2113)''۔ اس سے مراد رحمت اور استغفار کے فرشتے ہیں، ورنہ کراماً کاتبین ہر وقت ساتھ رہتے ہیں۔

علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَفِي الْأَجْنَاسِ: لَا يَنْبَغِي أَنْ يَتَّخِذَ كَلْبًا إِلَّا أَنْ يَخَافَ مِنَ اللُّصُوصِ أَوْ غَيْرِهِمْ''۔

ترجمہ: ''الاجناس میں ہے: کتا نہیں رکھنا چاہیے البتہ اگر چوروں وغیرہ کا خوف ہوتو پھر جائز ہے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص: 361)''۔

علامہ کمال الدین الدمیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَفِي الْكَلْبِ مِنَ اقْتِفَاءِ الْأَثَرِ، وَشَمِّ الرَّائِحَةِ مَا لَيْسَ لِغَيْرِهِ مِنَ الْحَيَوَانَاتِ، وَالْجِيفَةُ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنَ اللَّحْمِ الْغَرِيضِ وَيَأْكُلُ الْعَذِرَةَ وَيَرْجِعُ فِي قَيْئِهِ''۔

ترجمہ: ''قدموں کے نشانات کے پیچھے چلنا اور بو سونگھنے کا ملکہ کتوں کے علاوہ دوسرے جانوروں میں نہیں ہے، لیکن کتا مردار اور ناپاکی کھانے کو تازہ گوشت سے زیادہ پسند کرتا ہے، یہ اکثر گندی چیزیں ہی کھاتا ہے، بعض دفعہ اپنی قے چاٹ لیتا ہے''۔

مزید لکھتے ہیں:

''وَتَعْرِضُ لَهُ أَمْرَاضٌ سَوْدَاوِيَّةٌ فِي زَمَنٍ مَخْصُوصٍ، وَيَعْرِضُ لَهُ الْكَلَبُ (بِفَتْحِ اللَّامِ) وَهُوَ دَاءٌ يُشْبِهُ الْجُنُونَ، وَعَلَامَةُ ذٰلِكَ أَنْ تَحْمَرَّ عَيْنَاهُ وَتَعْلُوَهُمَا غِشَاوَةٌ، وَتَسْتَرْخِيَ أُذُنَاهُ، وَيَنْدَلِعُ لِسَانُهُ وَيَكْثُرُ لُعَابُهُ، وَسَيَلَانُ أَنْفِهِ، وَيُطَأْطِئُ رَأْسَهُ وَيَنْحَدِبُ ظَهْرُهُ، وَيَتَعَوَّجُ صُلْبُهُ إِلٰى جَانِبٍ، وَلَا يَزَالُ يُدْخِلُ ذَنَبَهُ بَيْنَ رِجْلَيْهِ وَيَمْشِيْ خَائِفًا مَغْمُوْمًا كَأَنَّهُ سَكْرَانُ، وَيَجُوْعُ فَلَا يَأْكُلُ، وَيَعْطَشُ فَلَا يَشْرَبُ، وَرُبَّمَا رَأَى الْمَاءَ فَيَفْزَعُ مِنْهُ، وَرُبَّمَا يَمُوْتُ مِنْهُ خَوْفًا، وَإِذَا لَاحَ لَهُ شَبَحٌ حَمَلَ عَلَيْهِ مِنْ غَيْرِ نُبَاحٍ، وَالْكِلَابُ تَهْرُبُ مِنْهُ، فَإِنْ دَنَا مِنْهَا غَفْلَةً، بَصْبَصَتْ لَهُ وَخَضَعَتْ، وَخَشَعَتْ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَإِذَا عَقَرَ هٰذَا الْكَلْبُ إِنْسَانًا عَرَضَ لَهُ أَمْرَاضٌ رَدِيئَةٌ، مِنْهَا أَنْ يَمْتَنِعَ مِنَ

شْرَبِ الْمَاءِ حَتّٰى يَهْلِكَ عَطَشًا، وَلَا يَزَالُ يَسْتَقِي حَتّٰى إِذَا سَقَى الْمَاءَ لَمْ يَشْرَبْهُ، فَإِذَا اسْتَحْكَمَتْ هٰذِهِ الْعِلَّةُ بِهٖ، فَقَعَدَ لِلْبَوْلِ خَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ عَلٰى هَيْئَةِ الْكِلَابِ الصِّغَارِ"۔

ترجمہ: ''کچھ خاص ایام میں کتے کو سوداوی امراض لاحق ہوتے ہیں، اس کے اندر ایک قسم کا جنون جس کو ہَڑک کہتے ہیں، عارض ہوتا ہے۔ اس مرض کی علامات یہ ہیں: دونوں آنکھوں کا سرخ ہونا اور ان پر تاریکی چھا جانا، کانوں کا ڈھیلا پڑ جانا، زبان کا لٹک جانا، رال بکثرت بہنا، ناک بہنا، سر نیچے لٹک جانا اور کمر میں کبڑا پن اور پیٹھ کا ٹیڑھا ہو جانا یعنی ایک طرف جھکاؤ ہونا، دُم کا ٹانگوں کے درمیان داخل کر دینا، چلنے میں لڑکھڑانا۔ باؤلے پن کی حالت میں کتا غمزدہ اور خوف زدہ حالت میں اس طرح چلتا ہے، جیسے نشے کی حالت میں ہو، بھوک، پیاس کے باوجود کھاتا پیتا نہیں ہے۔ اور بعض اوقات پانی کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور بعض اوقات اسی سے خوفزدہ ہو کر مر جاتا ہے۔ جب جنون کی حالت میں کوئی بھی جاندار شے اس کے سامنے آتی ہے، یہ بھونکے بغیر اس پر حملہ کرتا ہے۔ ایسی حالت میں صحت مند کتے بھی اس سے بھاگنے لگتے ہیں اور اگر کبھی غفلت میں کوئی کتا اس کے سامنے آ بھی جاتا ہے، تو چاپلوسی کرتے ہوئے اس کے سامنے دُم ہلاتا ہے اور جھک جاتا ہے (یعنی مزاحمت نہیں کرتا) اور جب یہ پاگل کتا کسی انسان کو کاٹ لے تو اسے مہلک بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ پانی نہیں پی سکتا، یہاں تک کہ پیاس سے ہلاک ہو جاتا ہے، وہ پیاس کے سبب پانی مانگتا ہے، یہاں تک کہ جب پانی پینے لگے تو پی نہیں سکتا۔ اور جب یہ بیماری پختہ ہو جاتی ہے تو جب وہ پیشاب کرنے بیٹھتا ہے تو اس سے کتے کے چھوٹے پلّوں جیسی چیزیں خارج ہوتی ہیں، (حیاۃ الحیوان، جلد 2، ص: 379-378)''۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی آفات سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

ہم نے یہ تفصیل اس لیے لکھی ہے کہ شریعت کی نظر میں کتے میں جو نحوست اور بیماریاں ہیں، اُن سے لوگ محتاط رہیں۔ بعض عقل پرست لوگ کہتے ہیں کہ اہلِ مغرب کتے پالتے ہیں، اُن کو اپنے ساتھ بٹھاتے اور لٹاتے ہیں، وہ کتے اُنہیں چومتے چاٹتے ہیں اور اُنہیں

کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ اُن کی صفائی اور غذا کا بہت اہتمام کرتے ہیں، اُنہیں ان جرثوموں اور وائرس سے بچاؤ کے لیے خصوصی ویکسین بھی دیا جاتا ہے، سو اگر ہمارے ہاں بھی ایسے انتظامات ہوں تو کیا کتے پالنا، کتوں کا چومنا چاٹنا جائز ہوجائے گا، جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے نابینا شخص پر نماز کی جماعت کے وجوب کو ساقط کردیا ہے، لیکن اگر مسجد تک لانے اور لے جانے کے لیے کوئی معاون شخص دستیاب ہو، تو اُسے جماعت میں حاضر ہونا چاہیے، علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی لکھتے ہیں:

''وَفِي ''التُّحْفَةِ'': اَلْجَمَاعَةُ إِنَّمَا تَجِبُ عَلٰى مَنْ قَدَرَعَلَيْهَا مِنْ غَيْرِ حَرَجٍ وَتَسْقُطُ بِالْعُذْرِ حَتّٰى لَا تَجِبُ عَلَى الْمَرِيْضِ وَالْاَعْمٰى وَالزَّمِنِ وَنَحوِهِم إِذَا لَمْ يَجِدِ الْاَعْمٰى قَائِدًا، وَالزَّمِنُ مَنْ يَّحْمِلُهُ، وَكَذَا إِذَا وَجَدَ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ، وَعِنْدَهُمَا تَجِبُ''۔

ترجمہ: ''''تحفہ'' میں ہے: جماعت صرف اس پر واجب ہے جو کسی حرج کے بغیر اس پر قادر ہو اور عذر کی وجہ سے ساقط ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ مریض، نابینا اور اپاہج پر واجب نہیں ہے، جب نابینا کو کوئی راہ دکھانے والا نہ ملے اور اپاہج کو کوئی اٹھانے والا نہ ہو، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قائد مل جائے تب بھی واجب نہیں ہے اور صاحبین کے نزدیک قائد (معاون) ملنے کی صورت میں نابینا پر جماعت میں حاضر ہونا واجب ہے، (البنایہ شرح الہدایہ، جلد 2، ص: 324)''۔ اسی طرح اگر نابینا شخص حافظ و عالم ہے، تو اُسے امام بنانے کے لیے دیکھنا ہوگا کہ جسم ولباس کی طہارت میں کوئی اس کا مددگار ہے یا نہیں، نابینا شخص پر صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود حج کی فرضیت بھی ساقط ہوجاتی ہے۔

پاکستان یا مسلم ممالک میں الحمدللہ اتنی دینی قدریں اب بھی باقی ہیں کہ لوگ نابینا شخص کی مدد کرنا کارِثواب سمجھتے ہیں، مغرب میں بھی نابیناؤں اور معذوروں کے لیے خصوصی رعایات ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگر مغربی معاشرے میں کتے اتنے تربیت یافتہ دستیاب ہوتے ہوں کہ اپنے مالک سے فاصلہ رکھ کر چلیں، کتے کا خشک یا گیلا جسم بشرطیکہ اس پر ظاہری نجاست نہ لگی ہو، کپڑوں کے ساتھ ٹکرانے سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے، تو ''اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِيْحُ

اَلْمَحْظُوْرَات'' (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ: 21) کے تحت اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔
البتہ ناروے وغیرہ کی بابت ہم نے سنا ہے کہ وہاں ایسے معذوروں کے لیے ریاست خدمت گار فراہم کرتی ہے، اگر یہ درست ہے تو پھر کتے کی خدمات کا جواز نہیں رہتا، کیونکہ عام حالات میں وہاں ذاتی طور پر ہر شخص کے لیے خادم رکھنا استطاعت سے باہر ہوتا ہے۔

## ثالثی کا معیار

### سوال:

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی معاملہ ہو تو ایسے لوگ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں جن کو شرعی احکام کا علم تو کجا نماز بھی درست پڑھنا نہیں آتی، پھر ان فیصلوں پر عمل کرانے میں زبردستی کی جاتی ہے، کیا ایسے فیصلوں میں کسی عالم یا مفتی کا ہونا لازم ہونا چاہیے، اس بارے میں رہنمائی فرمائیں، (عابد علی ترک، آگرہ تاج کالونی)۔

### جواب:

کسی تنازعے کے ایک سے زائد فریقوں کے درمیان تصفیہ کرنے کے لیے ثالث یا حَکَم بنانا قرآن وسنت سے ثابت ہے، اسے ہمارے عرف میں ''پنچ یا پنچایت'' اور انگریزی میں ''Arbitrator'' کہتے ہیں، مغربی ممالک میں بھی عدالتیں اس بات کو ترجیح دیتی ہیں کہ لوگ عدالت سے باہر آپس میں معاملات طے کرلیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا''۔

ترجمہ: ''اور (اے مسلمانو!) اگر تمہیں اُن دونوں (میاں بیوی) کے درمیان جھگڑے کا اندیشہ ہو، تو ایک منصف مرد کے خاندان سے اور ایک منصف عورت کے خاندان سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں (ثالث) صلح کرانا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا، بے شک اللہ بڑا جاننے والا، بہت خبر رکھنے والا ہے، (النساء: 35)''۔

اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ تنازعات کو طے کرنے کے لیے ایسے اشخاص کو ثالث

بنانا چاہیے، جو فسادی ذہن کے نہ ہوں، بلکہ صلح پسند ہوں، معاملہ فہم ہوں اور خاندانی وقبائلی عصبیت سے بالاتر ہو کر حق پسندی پر مبنی فیصلے کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عصبیت کی تعریف یہ فرمائی ہے: ''عصبیت یہ ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرو، (سنن ابوداؤد: 5119)''۔

حضرت سعد بن معاذ بنوقریظہ کے حلیف رہے تھے، غزوۂ بنوقریظہ کے موقع پر جب اُن پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، بنوقریظہ حضرت سعد کو حَکَم مان کر قلعے سے اتر آئے اور پھر حضرت سعد نے اُن کے بارے میں جو فیصلہ کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''حَکَمْتَ بِحُکْمِ اللّٰہِ، تم نے اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ دیا ہے، (صحیح البخاری: 3043)''۔ فیصلے کی تفصیل یہاں موضوعِ بحث نہیں ہے۔

باہمی تنازعات میں حَکَم بنانے کی مشروعیت قرآن وسنّت اور تعاملِ صحابہ سے ثابت ہے۔ فریقین کے مابین درست فیصلے کے لئے جس تیسرے شخص کو مقرر کیا جائے، اُسے ''حَکَم''، ''ثالث'' یا ''پنچ'' کہتے ہیں۔ تحکیم یعنی حَکَم بنانے کا رکن ایجاب وقبول ہے یعنی فریقین یہ کہیں کہ ہم نے فلاں کو حَکَم بنایا اور وہ شخص جسے حَکَم بنایا، قبول کرلے۔ ہر مسلمان عاقل، بالغ، آزاد، صحت مند (یعنی دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت کا حامل)، جس پر حدِ قذف نہ لگی ہو، حلال وحرام اور اَحکامِ شرعیہ کا جاننے والا ہو، فریقین کے مابین حَکَم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ البتہ حدود وقصاص میں اُس کا حکم صحیح نہیں، اگر کسی اجتہادی مسئلے میں وہ حکم دے اور وہ مسئلہ قاضی کے پاس لے جایا جائے تو قاضی اپنے اجتہاد سے اس حکم کو فسخ کرسکتا ہے۔

جو شخص احکامِ شرعیہ سے واقف نہ ہو، اُسے لوگوں کے درمیان حَکَم نہیں بننا چاہیے، ایسا شخص اگر اپنی رائے سے فیصلہ کرے گا تو اصلاح کے بجائے فساد کا سبب بنے گا اور لاعلمی کی وجہ سے غلط اور باطل فیصلے کرے گا، حدیث پاک میں ہے:

''عَنِ ابْنِ بُرَیْدَۃَ عَنْ أَبِیْهِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: اَلْقُضَاۃُ ثَلَاثَۃٌ: وَاحِدٌ فِی الْجَنَّۃِ، وَاثْنَانِ فِی النَّارِ، فَأَمَّا الَّذِیْ فِی الْجَنَّۃِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰی بِهٖ، وَرَجُلٌ عَرَفَ

اَلْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ، فَهُوَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ''۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: قاضیوں کی تین قسمیں ہیں، ایک جنت میں ہوگا اور دو جہنم میں ہوں گے۔ جنت میں وہ شخص ہوگا جس کو حق کا علم ہوگا اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے گا اور جس شخص کو حق کا علم ہو اور پھر وہ فیصلہ میں ظلم کرے، وہ جہنم میں ہوگا اور جو شخص بغیر علم کے لوگوں کے فیصلے کرے، وہ بھی جہنم میں ہوگا، (سُنن ابوداؤد: 3573)''۔ البتہ اگر وہ علماء سے شرعی حکم معلوم کر کے حق اور انصاف کے مطابق فیصلہ کرے تو جائز ہے، لیکن یہ قبیح لغیرہٖ ہے۔

کسی خاص شعبے کے بارے میں اُس شعبے کے ماہرین سے رہنمائی حاصل کرنا سنت ہے، جیسا کہ حضرت زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید کی صحت نسب کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیافہ شناس کی رائے کو تائیدی شاہد کے طور پر لیا اور اس پر مسرت کا اظہار فرمایا''۔ (صحیح مسلم: 1459)

اگر مسئلہ شرعی ہو تو اس کے لیے کسی مستند، ثقہ اور صاحبِ علم مفتی کو حَکم بنایا جائے۔ اگر مسئلہ کا تعلق کسی خاص شعبے سے ہے، جس کے لیے عرف، عادت سے آگاہی یا فنی مہارت درکار ہے، تو مفتی کو چاہیے کہ شرعی حکم کے اطلاق سے پہلے اس شعبے کے ماہرین سے ضروری معلومات حاصل کرلیں۔ آج کل پاکستان کے بعض علاقوں میں برادری کی پنچایت بیٹھ جاتی ہے اور جہالت پر مبنی غیر شرعی اور غیر قانونی فیصلے کر کے اسے برادری کے بڑوں کے دباؤ سے منواتے ہیں، اس پر پابندی کے لیے باقاعدہ قانون سازی ہونی چاہیے۔ ثالثی کا ادارہ اپنی جگہ عوام کے لیے مفید بھی ہے اور بہت سی دشواریوں، وکلاء کے ناجائز فائدہ اٹھانے اور عدالتی پیچیدگیوں سے بچنے کا ذریعہ ہے، اگر حکومت اسے قانونی تحفظ دے تو لوگوں کے لیے آسانی پیدا ہوں گی۔ آزاد قبائل میں بھی ثالثی نظام ہمارے عدالتی نظام کے طولانی عمل کے مقابلے میں زیادہ سہل ہے اور فوری انصاف کی فراہمی کا ذریعہ ہے، اسلام کی آمد سے پہلے قریش کے قبائل میں بھی یہ نظام کارفرما تھا۔

## مغرب میں دین پر چلنے میں مشکلات

**سوال:**

ایک اچھے مسلمان نے ایک عیسائی عورت سے شادی کی اور وہ مسلمان ہوگئی، میں اُس مسلمان کے درج ذیل سوال کا جواب دینے میں کافی مشکل کا سامنا کررہا ہوں:
وہ مسلمان بتاتا ہے کہ اُس کی بیوی نماز (صلوٰۃ) باقاعدگی سے پڑھتی ہے، مگر جب وہ حیض یا جنابت کا غسل کرتی ہے تو سر کے بالوں پر پانی ڈالنے سے اجتناب کرتی ہے۔ جب اُس کو وہ مسلمان خاوند بالوں کو بھی گیلا کرنے کو کہتا ہے تو بس سر پر گیلے ہاتھ پھیر لیتی ہے۔ وہ بالوں کو گیلا کرنے سے اجتناب اس لیے کرتی ہے کیونکہ اُس نے بال خاص امریکن (مغربی) طرز پر بیوٹی پارلر سے بنوائے ہوتے ہیں اور اُن پر پانی ڈالنے سے بالکل خراب ہوجاتے ہیں اگرچہ وہ بال خشک کرنے کا آلہ (Hair Dryer) استعمال کرتی ہے۔ اُس کی بیوی کا بالوں کا بنایا ہوا یہ ایک مشکل مسئلہ بن گیا ہے۔ وہ اُن بالوں کو خراب نہیں کرنا چاہتی اور غسل میں ایسا کرنے سے انکار کرتی ہے، خاوند نے پوچھا ہے: کیا وہ غسل میں صرف گیلا ہاتھ پھیر کر نماز پڑھ سکتی ہے؟، اگر وہ اِس کا انکار کرے کہ بالوں کو دھوئے تو کیا یہ اس کو مرتد بنادے گا؟، وہ مسلمان خاوند زور نہیں دینا چاہتا کہ وہ کہیں اِس سے انکار کرکے مرتد نہ ہوجائے، (ڈاکٹر خالد اعوان، ورجینیا، امریکہ)۔

**جواب:**

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ''۔
ترجمہ: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، (البقرہ:۲۰۸)''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''یَقُوْلُ تَعَالٰی آمِرًا عِبَادَهُ الْمُؤْمِنِیْنَ بِهِ الْمُصَدِّقِیْنَ بِرَسُوْلِهٖ اَنْ یَّاْخُذُوْا بِجَمِیْعِ عُرَی الْاِسْلَامِ وَشَرَائِعِهٖ، وَالْعَمَلِ بِجَمِیْعِ اَوَامِرِهٖ وَتَرْكِ جَمِیْعِ زَوَاجِرِهٖ مَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ ذٰلِكَ''۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر ایمان رکھنے والے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق کرنے والے بندوں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: وہ اسلام اور اس کے تمام شرائع کو مضبوطی سے تھامے رکھیں، اسلام کے جملہ احکامات پر عمل کریں اور ناجائز امور سے اپنی استطاعت کے مطابق اجتناب کریں''۔ مزید لکھتے ہیں:

''وَهُوَ اَنَّهُمْ اُمِرُوْا كُلُّهُمْ اَنْ یَّعْمَلُوْا بِجَمِیْعِ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَشَرَائِعِ الْاِسْلَامِ، وَهِیَ كَثِیْرَةٌ جِدًّا مَا اسْتَطَاعُوْا مِنْهَا''۔

ترجمہ: ''ایمان کے شعبے بہت زیادہ ہیں، تمام اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق ایمان کے تمام شعبوں اور اسلام کے جملہ احکامات پر عمل کریں''۔
(تفسیر ابن کثیر: ج:۱،ص:۵۶۶)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ''۔

ترجمہ: ''پس جو لوگ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، وہ اس سے ڈریں کہ انہیں کوئی مصیبت پہنچ جائے یا انہیں کوئی دردناک عذاب پہنچ جائے، (النور: ۶۳)''۔

نومسلم خاتون کا باقاعدگی سے نماز پڑھنا قابلِ تحسین فعل اور خوش آئند بات ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ''، ترجمہ: ''سو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کافروں سے کہہ دیجیے! اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں تو اُن کے پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے، (الانفال:38)''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اَنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ''، ترجمہ: ''اسلام گزشتہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے، (صحیح مسلم:

121)''۔ کاش کہ کفر کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے والے افراد فکری اور عملی طور پر ایک نئی پاکیزہ زندگی شروع کرنے پر آمادہ ہو جائیں، لیکن:

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اسی لیے مرتبۂ احسان کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے: ''انسان کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ پاکیزہ ہو جائے''، ہماری اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اُس نومسلم دینی بہن کی روح کو اللہ تعالیٰ پاکیزہ فرمادے تاکہ اسلامی احکام پر عمل کرنا اسے بار اور ناگوار محسوس نہ ہو۔

غسلِ جنابت کا تیسرا اور آخری فرض تمام ظاہر بدن یعنی سر کے بالوں سے پیروں کے تلووں تک جسم کے ہر حصے پر اچھی طرح سے پانی بہانا ہے۔ محض اوپر سے بال گیلے کر لینا کافی نہیں ہوگا بلکہ بالوں کی جڑیں تر ہونا ضروری ہے، حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ ضَفْرَ رَأْسِي فَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الْجَنَابَةِ، قَالَ: لَا إِنَّمَا يَكْفِيكِ أَنْ تَحْثِي عَلَى رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ ثُمَّ تُفِيضِينَ عَلَيْكِ الْمَاءَ فَتَطْهُرِينَ''۔

ترجمہ: ''حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: میں نے عرض کی: یارسول اللہ! میں اپنے سر کی چوٹی مضبوط گوندھتی ہوں، تو کیا غسلِ جنابت کے لیے اسے کھولوں؟، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! تجھ کو صرف یہی کفایت کرتا ہے کہ سر پر تین لپ پانی ڈالے، پھر اپنے اوپر پانی بہالے، پاک ہو جائے گی، (صحیح مسلم: 330)''۔ یعنی جب کہ بالوں کی جڑیں تر ہو جائیں تو کافی ہے، اگر اتنی سخت گُندھی ہوں کہ جڑ تک پانی نہیں پہنچے گا تو کھولنا فرض ہے۔

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: إِنَّ تَحْتَ كُلِّ شَعْرَةٍ جَنَابَةً فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ وَأَنْقُوا الْبَشَرَ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بال کے نیچے جنابت ہے، پس بال دھوؤ اور جلد کو صاف کرو، (سُنن ابوداود: 248)''۔

جمہور فقہاء کا مذہب یہی ہے کہ جب غسل کرنے والی عورت کے سر کے بالوں کو کھولے بغیر جڑوں تک پانی پہنچ جائے تو اس کے لیے سر کے بالوں کو کھولنا ضروری نہیں ہے اور اگر بالوں کو کھولے بغیر جڑوں تک پانی نہ پہنچے تو بالوں کو کھولنا واجب ہے۔

تنویر الابصار مع الدرّ المختار میں ہے:

"وَكَفٰى، بَلَّ أَصْلِ ضَفِيْرَتِهَا أَيْ شَعْرِ الْمَرْأَةِ الْمَضْفُوْرِ لِلْحَرَجِ، أَمَّا الْمَنْقُوْضُ فَيُفْرَضُ غَسْلُ كُلِّهِ اتِّفَاقًا وَلَوْ لَمْ يَبْتَلَّ أَصْلُهَا يَجِبُ نَقْضُهَا مُطْلَقًا هُوَ الصَّحِيْحُ، وَلَوْ ضَرَّهَا غَسْلُ رَأْسِهَا تَرَكَتْهُ، وَقِيْلَ تَمْسَحُهُ وَلَا تَمْنَعُ نَفْسَهَا عَنْ زَوْجِهَا"۔

ترجمہ: عورت کے گُندھے ہوئے بالوں کی جڑوں کا تر ہونا کافی ہے، یعنی حرج کی وجہ سے عورت کے گُندھے ہوئے بالوں کی جڑوں کو تر کرنا کافی ہے (ہر صورت میں بالوں کا کھولنا ضروری نہیں ہے) اور کھلے ہوئے تمام بالوں کا دھونا بالاتفاق فرض ہے، اگر عورت کے بالوں کی جڑیں تر نہ ہوں تو مطلقاً ان کو کھولنا واجب ہے، یہی صحیح ہے اور اگر سر دھونے کے سبب تکلیف بڑھنے کا اندیشہ ہو تو سر کو چھوڑ دے، بعض نے کہا: مسح کرلے اور اپنے شوہر کو حقوقِ زوجیت سے نہ روکے، (حاشیہ ابن عابدین شامی، ج:1،ص:509-511، دمشق)"۔

علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"سر کے بال گندھے نہ ہوں تو ہر بال پر جڑ سے نوک تک پانی بہنا اور گندھے ہوں تو مرد پر فرض ہے کہ ان کو کھول کر جڑ سے نوک تک پانی بہائے اور عورت پر صرف جڑ تر کرلینا ضروری ہے کھولنا ضروری نہیں، ہاں اگر چوٹی اتنی سخت گُندھی ہو کہ کھولے بغیر جڑیں تر نہ ہوں گی تو کھولنا ضروری ہے، (بہارِ شریعت، جلد اول، ص:317)"۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

ترجمہ: "سر کے بالوں کا دھونا واجب ہے، خواہ بال گھنے ہوں یا خفیف، گُندھے ہوئے بالوں کے بارے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے۔ فقہاءِ احناف کے نزدیک حرج اور تکلیف سے بچنے کے لیے ان بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا کافی ہے، ان کو کھولنے کی

ضرورت نہیں ہے۔یہی فقہاء مالکیہ کا مذہب ہے کہ اگر بالوں کو کھولے بغیر پانی بالوں کی جڑ تک پہنچ سکتا ہے تو بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: حیض ونفاس سے پاک ہونے کی صورت میں غسل کے وقت بالوں کو کھولنا واجب ہے۔ البتہ غسلِ جنابت کے وقت کھولنا ضروری نہیں ہے جبکہ پانی بالوں کی جڑ تک پہنچے۔امام شافعی فرماتے ہیں: اگر کھولے بغیر گُندھے ہوئے بالوں کی جڑوں تک پانی نہ پہنچ سکے تو غسلِ جنابت کے وقت کھولنا واجب ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ ائمۂ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر گُندھے ہوئے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچے تو بالوں کا کھولنا واجب نہیں ہے، اس کی دلیل حضرت اُمّ سلمہ والی حدیث ہے''۔

(فقہ الاسلامی واَدِلّتہٗ ،جلد اول،ص:525،مُلخصاً)

جنابت، جس سے غسل واجب ہوتا ہے، یہ محض حسّی نہیں بلکہ معنوی نجاست ہے اور یہ ظاہرِ بدن کے انگ انگ اور روئیں روئیں میں سرایت کرتی ہے، لہٰذا اس کی تطہیر کے لیے ہر بال کی جڑ تک پانی کا پہنچنا ضروری ہے، اس کے بغیر غسلِ جنابت مکمل نہیں ہوگا اور عورت پاک نہیں ہوگی تاوقتیکہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے، جب عورت ناپاک رہے گی تو اس ناپاکی کے ساتھ نماز بھی ادا نہیں ہوگی۔اس نجاست کا مدار عقل پر نہیں ہے بلکہ مَہبَطِ وحی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود بیان فرمایا ہے اور اسے ہم عقل کی بنیاد پر رد نہیں کر سکتے۔محض اوپر سے بالوں کو تر کرنے سے جنابت زائل نہیں ہوگی۔شوہر کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو طہارت کے احکام سکھائے اور اسے بتائے کہ کامل غسل کیے بغیر نماز ادا نہیں ہوسکتی۔ فقہائے کرام نے لکھا ہے: اگر کوئی نماز کو ہلکا جان کر حالتِ جنابت میں یا کامل طہارت کے بغیر نماز کو جائز سمجھے، تو یہ کفر ہے۔

تنویر الابصار مع الدر المختار میں ہے:

''مُنْكِرُ الْوُضُوْءِ هَلْ يُكْفَرُ إِنْ أَنْكَرَ الْوُضُوْءَ لِلصَّلَاةِ، نَعَمْ''۔

ترجمہ:''وضو کا منکر کیا کافر ہوگا اگر نماز کے لیے وضو کا انکار کرے؟، (جواب یہ ہے:)

ہاں!''۔علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''قَوْلُهٗ مُنْكِرُ الْوُضُوْءِ أَوْ وُجُوبِهٖ، قَوْلُهٗ نَعَمْ لِإِنْكَارِهِ النَّصَّ الْقَطْعِيَّ وَهُوَ آيَةُ إِذَا قُمْتُمْ وَالْإِجْمَاعَ''۔

ترجمہ:''منکر وضو یعنی وضو کے وجوب کا منکر، اس لیے کافر ہوگا کہ اُس نے نصِ قطعی اور اجماع کا انکار کیا، نصِ قطعی یہ ہے:''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا''۔

ترجمہ:''اے ایمان والو جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو (اور تم بے وضو ہو) تو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو اور اگر تم جنبی ہو تو اچھی طرح پاکیزگی حاصل کرلو، (المائدہ:6)، (حاشیہ ابن عابدین شامی، جلد 1، ص:499، دمشق)''۔

اگر اس کے شوہر کی مالی حیثیت اتنی ہے کہ وہ غسل جنابت کے بعد اپنی بیوی کو دوبارہ بال بنوانے کا خرچ دے سکتا ہے تو ایسا کرلے، ورنہ اسے اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضی سے ڈرائیں اور دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو قبولِ حق کے لیے نرم فرمادے، قرآن کریم میں مومن کا یہ وصف بیان فرمایا ہے:

''اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۖۗ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ''۔

ترجمہ:''اللہ نے بہترین کلام کو نازل کیا، جس کے مضامین ایک جیسے ہیں، بار بار دہرائے ہوئے، جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اس سے اُن کے جسموں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، پھر ان کے جسم اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہوجاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ جس کو چاہتا ہے، اُسے ہدایت دیتا ہے، اور جس کو اللہ گمراہی پر چھوڑ دے،

اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں، (الزمر:23)''۔

بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچائے بغیر یعنی مکمل غسلِ جنابت ادا نہ کرنے کے سبب وہ مستقل حالتِ جنابت میں رہے گی۔ اگر وہ غسلِ جنابت کی فرضیت کو مانتی ہے، لیکن اپنی بشری کوتاہی کے سبب اُس پر عمل نہیں کرتی تو فرض کے ترک کی وجہ سے وہ فاسقہ وفاجرہ ہوگی اور مستحقِ عذابِ الٰہی ہوگی، مگر گنہگار ہونے کے باوجود اس کو مرتدہ اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جائے گا۔ فاسقہ عورت کو طلاق دینا مرد پر واجب نہیں اور اگر شوہر کو اندیشہ ہے کہ طلاق دینے سے وہ مرتدہ ہو جائے گی، تو کبھی پیار سے اور کبھی سختی سے اُسے سمجھاتا رہے، شاید اللہ تعالیٰ کسی وقت اُس کے دل کو قبولِ حق پر آمادہ فرما دے، اللہ تعالیٰ شوہر کو صبر پر اجر عطا فرمائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

''فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِىَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ أَنْ يَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ''۔

ترجمہ: ''بخدا! تمہاری وجہ سے اللہ ایک شخص کو ہدایت دیدے تو یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں کے ریوڑ سے بہتر ہے، (صحیح البخاری:4210)''۔ واضح رہے کہ اس دور میں سُرخ اونٹوں کا ریوڑ بڑی دولت تھی۔ نوٹ: سختی سے مراد مار پیٹ نہیں ہے، بلکہ رویہ اور لہجے میں سختی کرنا مراد ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ بیان رضی اللہ عنہ کرتے ہیں:

''اِنِّي أَتَيْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قُلْتُ: أُبَايِعُكَ عَلَى الْاِسْلَامِ، فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ''۔

ترجمہ: ''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: میں (آپ کے دست اقدس پر) بیعت علی الاسلام کرتا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی کی شرط پر میری بیعت لے لی، (صحیح بخاری:58)''۔ ابتدائے اسلام میں بیعت علی الاسلام کی اصطلاح قبولِ اسلام کے لیے استعمال ہوتی تھی اور بیعت کا لفظ ہی اس امر پر دلالت کرتا تھا کہ وہ شعوری طور پر اس پر آمادہ ہے کہ اسے اسلام میں داخل ہونے کے

بعد احکام کی پابندی کرنی ہوگی۔

## اسلامی چینل کھولنا

**سوال:**

میں ایک انجینئر ہوں، حرکت پذیری اور ویڈیو گرافکس کا فن جانتا ہوں، میں youtube.com پر حرکت پذیر (Animation) چینل بنانا چاہتا ہوں، لیکن اس کے لیے مجھے اپنی ویڈیوز میں موسیقی شامل کرنا ہوتا ہے اور میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔ اس سے بچنے کے لیے میں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ یوٹیوب پر ایک اسلامی چینل کھولوں، لیکن اس پر میرے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوا کہ آیا قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے، ازراہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں، (انجینئر فیصل رحمان)۔

**جواب:**

قرآنِ مجید اور علومِ دینیہ کی تدریس وتعلیم پر اجرت لینا جائز ہے، حفظِ قرآن اور دینی علوم کی تدریس کے لیے قائم دینی مدارس وجامعات میں بھی تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دینے والے اساتذہ کرام کو مشاہرہ دیا جاتا ہے، تعلیمِ قرآن پر اجرت لینا اَحادیث صحیحہ سے ثابت ہے:

(۱) ’’قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَحَقُّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ‘‘۔

ترجمہ: ’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جن چیزوں پر تم اجرت لیتے ہو، اُن میں کتاب اللہ پر اجرت لینے کا سب سے زیادہ حق ہے، (صحیح بخاری، بَابُ مَا يُعْطَى فِي الرُّقْيَةِ عَلَى أَحْيَاءِ الْعَرَبِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)‘‘۔

(۲) ’’عَنِ الْوَضِينِ بْنِ عَطَاءٍ، قَالَ: كَانَ بِالْمَدِينَةِ ثَلَاثَةُ مُعَلِّمِينَ يُعَلِّمُونَ الصِّبْيَانَ، فَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَرْزُقُ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ خَمْسَةَ عَشَرَ كُلَّ شَهْرٍ‘‘۔

ترجمہ: ’’وضین بن عطاء بیان کرتے ہیں: مدینہ میں تین معلم تھے، جو بچوں کو تعلیم دیتے تھے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان میں سے ہر ایک کو ماہانہ پندرہ درہم دیتے

تھے“۔ (مُصنف ابن ابی شیبہ: 20835)

(۳) ”عَنْ أَبِي سَعِيدٍ، أَنَّ رَهْطًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم انْطَلَقُوا فِي سَفْرَةٍ سَافَرُوهَا، حَتّٰى نَزَلُوا بِحَيٍّ مِنْ أَحْيَاءِ الْعَرَبِ، فَاسْتَضَافُوهُمْ فَأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمْ، فَلُدِغَ سَيِّدُ ذٰلِكَ الْحَيِّ، فَسَعَوْا لَهُ بِكُلِّ شَيْءٍ لَا يَنْفَعُهُ شَيْءٌ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَوْ أَتَيْتُمْ هٰؤُلَاءِ الرَّهْطَ الَّذِينَ قَدْ نَزَلُوا بِكُمْ، لَعَلَّهُ أَنْ يَكُونَ عِنْدَ بَعْضِهِمْ شَيْءٌ، فَأَتَوْهُمْ فَقَالُوا: يَا أَيُّهَا الرَّهْطُ! إِنَّ سَيِّدَنَا لُدِغَ، فَسَعَيْنَا لَهُ بِكُلِّ شَيْءٍ لَا يَنْفَعُهُ شَيْءٌ، فَهَلْ عِنْدَ أَحَدٍ مِنْكُمْ شَيْءٌ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: نَعَمْ، وَاللهِ إِنِّي لَرَاقٍ، وَلٰكِنْ وَاللهِ لَقَدِ اسْتَضَفْنَاكُمْ فَلَمْ تُضَيِّفُونَا، فَمَا أَنَا بِرَاقٍ لَكُمْ حَتّٰى تَجْعَلُوا لَنَا جُعْلًا، فَصَالَحُوهُمْ عَلٰى قَطِيعٍ مِنَ الْغَنَمِ، فَانْطَلَقَ فَجَعَلَ يَتْفُلُ وَيَقْرَأُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ حَتّٰى لَكَأَنَّمَا نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ، فَانْطَلَقَ يَمْشِي مَا بِهِ قَلَبَةٌ، قَالَ: فَأَوْفَوْهُمْ جُعْلَهُمُ الَّذِي صَالَحُوهُمْ عَلَيْهِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: اقْسِمُوا، فَقَالَ الَّذِي رَقٰى: لَا تَفْعَلُوا حَتّٰى نَأْتِيَ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَنَذْكُرَ لَهُ الَّذِي كَانَ، فَنَنْظُرَ مَا يَأْمُرُنَا، فَقَدِمُوا عَلٰى رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَذَكَرُوا لَهُ، فَقَالَ: وَمَا يُدْرِيكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ، أَصَبْتُمْ، اقْسِمُوا وَاضْرِبُوا لِي مَعَكُمْ بِسَهْمٍ“۔

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب میں سے چند لوگ ایک سفر میں گئے، سفر کے دوران انہوں نے ایک عرب قبیلے کے پاس پڑاؤ کیا اور ان سے مہمانداری کے لیے کہا، انہوں نے صحابہ کی ضیافت سے انکار کردیا، پھر اس قبیلے کے سردار کو بچھو نے ڈس لیا، انہوں نے اس کے لیے ہر جتن کیا، لیکن کسی چیز سے اس کو فائدہ نہ ہوا، تو ان میں سے کسی نے کہا: اگر تم ان لوگوں کے پاس جاؤ جو تمہارے قبیلہ میں آکر ٹھہرے ہیں، شاید ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس سے اس کو شفا ہو، وہ صحابہ کے پاس آئے،، پس انہوں نے کہا: اے جماعت! ہمارے سردار کو ڈس لیا گیا ہے، ہم نے اس کے لیے ہر جتن کرلیا اور کسی سے اس کو فائدہ نہیں ہوا، کیا تم میں سے کسی کے پاس کوئی چیز ہے؟، پس ان میں سے ایک نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم! میں ضرور دم کرنے والا ہوں، لیکن بخدا ہم

نے تم سے ضیافت طلب کی تھی، تم نے ہماری ضیافت نہیں کی، سواب میں تم کو دَم کرنے والا نہیں ہوں، حتیٰ کہ تم ہمارے لیے اجرت مقرر کرو، پس انہوں نے چند بکریوں کے ریوڑ پر صلح کر لی۔ پھر وہ گئے اور تھوکتے تھے اور الحمدللہ رب العالمین پڑھتے تھے، یہاں تک کہ اس کی برکت سے وہ ایسا ہو گیا جیسے اس کی رسی کھل گئی ہو اور اس طرح چلنے لگا، جیسے اسے کوئی تکلیف ہی نہ رہی ہو۔ راوی کا بیان ہے کہ انہوں نے مصالحت کے مطابق وعدہ پورا کر دیا، پس بعض صحابہ نے کہا: ان بکریوں کو تقسیم کر دو، سو جنہوں نے دَم کیا تھا، انہوں نے کہا: ابھی نہ کرو، حتیٰ کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جائیں اور آپ سے اس کا ذکر کریں، پھر ہم دیکھیں گے کہ آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟، پھر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس گئے اور اس کا آپ سے ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ دَم ہے؟، تم نے صحیح کیا، ان بکریوں کو تقسیم کرو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ، (صحیح بخاری:5749)''۔

پس مُعلِّم قرآن کی اجرت یا مشاہرہ العیاذ باللہ! تعلیمِ قرآن کا معاوضہ یا بدل نہیں ہوتا، بلکہ مدرس اپنے وقت کا معاوضہ لیتا ہے، کیونکہ وہ ایک محدود وقت کے لیے اپنے آپ کو ایک خاص مقام پر ایک خاص فریضے کی ادائیگی کے لیے پابند کرتا ہے۔ اسی طرح آپ جو سیٹ اپ بنائیں گے اور اس نظام کو چلانے اور جاری رکھنے کے لیے آپ کے مصارف آئیں گے اور آپ کا وقت بھی خرچ ہوگا، تو اس کی اجرت لینا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ جو لوگ اسلامی چینل چلا رہے ہیں، وہ اس کے مصارف کو پورا کرنے کے لیے عام مخیر حضرات یا اپنے کارکنان سے عطیات لیتے ہیں، ورنہ بصورتِ دیگر جیسے آپ کا منصوبہ ہے، اس سے استفادہ کرنے والوں سے فیس بھی لے سکتے ہیں۔ لیکن دینی تعلیمات کا چینل خرافات سے پاک ہونا چاہیے، Animation اور میوزک کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ آپ یہ پروگرام کس طرح تشکیل دیتے ہیں، اس کی تفصیلات جاننے کے بعد ہی فقہی حکم بیان کیا جا سکتا ہے۔

## ذبیحہ سے متعلق چند سوالات

میرے کچھ سوالات ہیں، اگر جواب عنایت ہو جائیں تو نوازش ہوگی، یہاں کوئی عالم یا مفتی صاحبان نہیں ہیں، سنی بھی بہت تھوڑے سے ہیں۔

**سوال:**(1،2،3):

یہاں جانور ذبح کرنے سے پہلے بیل یا گائے کو شوٹ کیا جاتا ہے، رائفل میں بے ہوش کرنے کی گولیاں/ چھرے ہوتے ہیں، کیا رائفل شوٹ کرنے والا مسلمان ہونا ضروری ہے یا پھر کافر بھی شوٹ کر سکتا ہے، مسلمان شوٹ کرتے وقت کچھ پڑھے گا یا بغیر پڑھے ہی شوٹ کر سکتا ہے۔ جانور شوٹ ہو جانے کے بعد اگر مرا نہ ہو تو ذبح کیا جا سکتا ہے اور اگر شوٹ کرنے کے بعد مر گیا تو کیا حلال ہوگا؟۔ کیا بے ہوش کرنا جائز ہے، ایک لاٹھی سے یا کسی چھوٹی مشین سے کرنٹ لگایا جاتا ہے جس سے جانور بے ہوش ہو جاتا ہے، بے ہوش کرنے والا مسلمان ہونا ضروری ہے یا کافر بھی کر سکتا ہے، مسلمان کچھ پڑھ کر بے ہوش کرے گا یا بغیر پڑھے بھی کر سکتا ہے، کیا آٹو میٹک مشین بے ہوش کرے تو وہ ذبیحہ حلال ہوگا۔ (4): کیا ذبح کرتے وقت تکبیر کا زور سے کہنا ضروری ہے یا آہستہ آواز میں تکبیر کہی جا سکتی ہے اور دل میں تکبیر کہی جا سکتی ہے؟ (5): اگر جانور کو حرام کھانا/ غذا کھلائی جا رہی ہو تو کیا ذبح حلال ہوگا؟، (عبدالرافع اشرفی، معرفت مفتی محمد اطہر نعیمی، آکلینڈ، نیوزی لینڈ)۔

**جواب:**

مغرب کے ذبح خانوں (Butcheries) میں یہ خود کار (Automatic) نظام ہے کہ گائے بیل کو ذبح کرنے سے پہلے لائن میں لگا کر اس کے سر پر ہتھوڑا مارتے ہیں یا جیسا کہ آپ نے بتایا اس کو چھرے دار گولی سے شوٹ کرتے ہیں تاکہ وہ سُن (Unconscious) ہو جائے اور ذبح کے وقت مزاحمت نہ کرے، اسے Stun کرنا کہتے ہیں۔ اگر اس عمل سے جانور میں حیات باقی رہتی ہے اور ذبح کرتے وقت اس کی رگوں سے دمِ مسفوح (ذبح کے وقت بہنے والا خون) نکل جاتا ہے، تو یہ حلال ہے اگرچہ

بے ہوش کرنے کا یہ عمل مکروہ ہے کہ جانور کو بلاوجہ ایذا دینا ہے۔ جانور کے سر پر یہ ضرب کوئی بھی لگائے، جانور کا گوشت ذبح ہونے کے بعد حلال رہے گا، بشرطیکہ ذبح کے وقت وہ زندہ ہو اور دمِ مسفوح (Poured Blood) رگوں سے نکل جائے، اس کے سر پر چوٹ لگانا یا اُسے شوٹ کرنا ذبح کا عمل نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس عمل سے مرجائے، تو پھر وہ مردار ہے، اسے ذبح کیا جائے یا نہ کیا جائے، اس کا گوشت کھانا حلال نہیں ہے، کیونکہ مردار ہونے کے بعد اس کا خون رگوں میں رہ جاتا ہے اور وہ حرام ہوجاتا ہے۔ جانور کو بے ہوش کرتے وقت کچھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ ذبح کرتے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہنا واجب ہے، دل میں تکبیر پڑھ لینا کافی نہیں ہے، یہ تکبیر کم از کم اتنی آواز سے پڑھی جائے کہ خود اپنے کانوں کو آواز آجائے اور بہتر یہ ہے کہ آواز اتنی بلند ہو کہ وہاں موجود دوسرے افراد سن سکیں، ذبح کرنے والے کا تکبیر کہنا واجب ہے، سامنے کھڑے دوسرے شخص کا تکبیر پڑھنا ذبح کے حلال ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔

جانور کی غذا کا حلال ہونا ضروری نہیں ہے، بہت سے لوگ یہ سوال اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کے کہنے کے مطابق مرغیوں کی خوراک (Feed) میں ذبیحے کا خون یا کوئی حرام اجزا ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں دیہاتی علاقوں میں مرغیاں چل پھر کر کیڑے مکوڑے بھی کھاتی تھیں، غلاظت بھی کھالیتی تھیں، آج کل ان کی خوراک کیمیائی طریقے سے تیار کی جاتی ہے اور جب ایک مرکب (Compound) بننے سے اس کے اجزا کی ماہیت بدل جائے، تو اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے۔ جو مرغیاں کھلی پھرتی ہوں، گندگی یا غلاظت کھاتی ہوں، اُنہیں تین دن تک بند کر کے رکھا جائے اور پاک غذا دی جائے تاکہ اس کے پیٹ سے کھائی ہوئی نجاست کا اثر زائل ہوجائے۔ ان مسائل کی تفصیلات دس مجلّدات پر مشتمل ہمارے فتاویٰ کے مجموعہ "تفہیم المسائل" میں موجود ہیں، آپ چاہیں تو قیمت اور ڈاک خرچ بھیج کر ڈی ایچ ایل کے ذریعے منگوا سکتے ہیں۔

## پرندوں کے لیے پانی اور باجرہ ڈالنا صدقہ ہے

**سوال:**

کیا پرندوں کو پانی یا باجرہ ڈالنا صدقہ ہے؟،(انیس الرحمٰن، کراچی)۔

**جواب:**

اللہ تعالیٰ انسان کی کسی نیکی کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَإِنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ''۔ ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ نیکیاں کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا، (یوسف:90)''۔ نیکی چھوٹی ہو یا بڑی، اس کا فائدہ انسان کو پہنچے یا کسی دوسرے جاندار کو، لہٰذا کسی بھی نیکی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

اَحادیثِ مبارکہ میں معمولی باتوں پر اجر کو بیان کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''لَاتَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَّلَوْتَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ''۔ ترجمہ: ''کسی بھی نیک بات کو حقیر مت جانو، خواہ تم اپنے بھائی کے ساتھ ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملو''۔ (صحیح مسلم:6567)

جس طرح انسانوں کے ساتھ نیکی کرنے کا اجر وثواب ہے اسی طرح جانوروں کے ساتھ بھلائی کرنے کا بھی صلہ ملتا ہے، حدیثِ پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِيْ، فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ الْعَطَشُ، فَنَزَلَ بِئْرًا، فَشَرِبَ مِنْهَا، ثُمَّ خَرَجَ فَإِذَاهُوَ بِكَلْبٍ يَلْهَثُ يَأْكُلُ الثَّرٰى مِنَ الْعَطَشِ، فَقَالَ: لَقَدْ بَلَغَ هٰذَا مِثْلُ الَّذِيْ بَلَغَ بِيْ، فَمَلَأَ خُفَّهٗ، ثُمَّ أَمْسَكَهٗ بِفِيْهِ، ثُمَّ رَقِيَ، فَسَقَى الْكَلْبَ، فَشَكَرَ اللهُ لَهٗ، فَغَفَرَ لَهٗ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ! وَإِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا، قَالَ: فِيْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ایک شخص جا رہا تھا کہ اسے شدید پیاس لگی، وہ ایک کنویں میں اترا، پھر اس نے پانی پیا اور نکل آیا، اس نے دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدت سے مٹی چاٹ رہا ہے، اُس نے اپنے دل

میں سوچا: اسے بھی پیاس اسی طرح ستارہی ہے، جیسے مجھے لگی تھی۔ پھر اس نے (کنویں میں اتر کر) اپنے موزے میں پانی بھرا اور موزے کو منہ میں پکڑ کر کنویں سے باہر آیا اور پیاسے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس شخص کے اس نیک عمل کو قبول فرمایا اور اس کی مغفرت فرما دی۔ صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے پر بھی ہمارے لیے اجر ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہر جاندار کے ساتھ نیکی کرنے کا ثواب ملتا ہے، (صحیح بخاری: 2363)"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جانوروں کو کھلانا پلانا بھی نیکی ہے اور ہر نیک عمل صدقہ ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ" ترجمہ: "ہر نیک کام صدقہ ہے، (صحیح بخاری: 6021)"۔

کسی شخص کے لگائے ہوئے پھل دار درخت، فصل یا اناج کو انسان، پرندے اور جانور کھاتے ہیں، اس پر بھی اُسے اجر ملتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

(۱) "عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ، إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ"۔

ترجمہ: "حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا فصل کاشت کرتا ہے۔ پھر اس سے پرندے یا انسان یا مویشی کھاتے ہیں، تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے، (صحیح بخاری: 2320)"۔

(۲) "عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنْ غَرَسَ غَرْسًا أَوْ زَرَعَ زَرْعًا، فَأَكَلَ مِنْهُ إِنْسَانٌ أَوْ طَيْرٌ أَوْ سَبُعٌ أَوْ دَابَّةٌ، فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ"۔

ترجمہ: "حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس نے درخت لگایا یا فصل کاشت کی، پھر اس سے انسان، پرندے، درندے یا چوپائے کھائیں تو اس کے لیے صدقہ ہے، (مسند احمد بن حنبل: 15201)"۔ اس مضمون کی دیگر روایات بھی موجود ہیں۔ الغرض انسان ہوں یا چرند و پرند یا درندے یا چوپائے یا حشرات الارض، جس انسان

کی محنت سے اُنہیں روزی ملتی ہے، وہ اُس انسان کے لیے باعثِ اجر ہے، لہٰذا پرندوں کو پانی اور باجرہ ڈالنا بھی صدقہ ہے، البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کے لیے مسجد کے صحن یا عام گزرگاہ سے ہٹ کر جگہ کا انتخاب کیا جائے۔

## اذکار و اوراد کی محافل کا انعقاد

**سوال:**

ہمارے گھر میں کچھ عورتیں جمعرات کے دن جمع ہو کر درود شریف پڑھتی ہیں، ایک صاحب اعتراض کر رہے ہیں کہ یہ بدعت ہے، کیا یہ بدعت ہے؟

(ایک سائل، بفرزون نارتھ کراچی)

**جواب:**

اجتماعی طور پر درود شریف کا ورد کرنا شرعاً درست ہے، کارِ خیر کے لئے لوگوں کو دعوت دینا باعثِ سعادت اور موجبِ خیر و برکت ہے۔ اس حوالے سے صحیح مسلم میں باب کا عنوان ہے: ''بَابُ فَضْلِ الْاِجْتِمَاعِ عَلٰی تِلَاوَةِ الْقُرآنِ وَعَلَی الذِّکْرِ'' (قرآن کی تلاوت اور ذکر کے لیے اجتماع کی فضیلت) اس عنوان کے تحت ایک قدرے طویل حدیث نمبر 6847 درج ہے، اس کے آخر میں لکھا ہے:

''وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللهِ، یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللهِ وَیَتَدَارَسُوْنَهٗ بَیْنَهُمْ، اِلَّانَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّکِیْنَةُ وَغَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِکَةُ، وَذَکَرَهُمُ اللهُ فِیْمَنْ عِنْدَهٗ وَمَنْ أَبْطَاَبِهٖ عَمَلُهٗ، لَمْ یُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ''۔

ترجمہ: ''جب بھی کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر (یعنی مسجد) میں جمع ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے اور دیتے ہیں، تو (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) اُن پر تسکین نازل ہوتی ہے اور رحمتِ باری تعالیٰ اُنہیں ڈھانپ لیتی ہے اور ملائکہ انہیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے مُقرّبین کی مجلس میں اُن کا ذکر فرماتا ہے اور جس کا عمل اُسے (خیر کو پانے کا) اہل نہ بنا سکے تو (محض) نسب (کا شرف) اُسے سرخرو نہیں کر سکتا''۔

اس کی شرح میں علامہ نووی لکھتے ہیں:

''یہ حدیث مسجد میں جمع ہوکر قرآن کی تلاوت کرنے کی فضیلت پر دلیل ہے اور یہ ہمارا اور جمہور فقہاءِ امت کا مذہب ہے، اس کے بعد والی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ فضیلت مسجد تک محدود نہیں ہے، بلکہ مدرسہ، رِباط اور تمام مقامات کے لیے عام ہے، مسجد کا ذکر کثرتِ وقوع کے طور پر ہے (کیونکہ بالعموم ایسے اجتماعات مساجد میں ہوتے ہیں)''۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ان دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق یہ گواہی دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''لَا یَقْعُدُ قَوْمٌ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اِلَّاحَفَّتْہُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَغَشِیَتْہُمُ الرَّحْمَۃُ، وَنَزَلَتْ عَلَیْہِمُ السَّکِیْنَۃُ، وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ''۔

ترجمہ: ''جوقوم بھی اللہ عزوجلّ کے ذکر کے لیے بیٹھتی ہے، اس کو فرشتے گھیر لیتے ہیں، رحمتِ باری تعالیٰ انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا اپنے فرشتوں میں ذکر کرتا ہے، (صحیح مسلم: 6849)''۔

درود شریف کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا''۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود پڑھتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود پڑھو اور بہ کثرت سلام پڑھو، (احزاب: 56)''۔

حدیث پاک میں ہے:

''عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قَالَ: مَاجَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ یَذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْہِ، وَلَمْ یُصَلُّوْا عَلٰی نَبِیِّہِمْ، إِلَّا کَانَ عَلَیْہِمْ تِرَةً، فَإِنْ شَاءَ عَذَّبَہُمْ وَإِنْ شَاءَ غَفَرَ لَہُمْ''۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور اللہ کا ذکر نہ کریں اور نہ اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود پڑھیں تو قیامت کے دن ان کی وہ مجلس ان کے لیے باعثِ ندامت ہوگی، اللہ چاہے گا تو ان کو معاف فرما

دے گا اور اگر چاہے گا تو مواخذہ فرمائے گا، (سُنن ترمذی: 3380)''۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے عرض کی:

''یَارَسُوْلَ اللهِ! إِنِّی أُکْثِرُ الصَّلَاةَ عَلَیْكَ فَکَمْ أَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِیْ، فَقَالَ: مَا شِئْتَ قَالَ: قُلْتُ: الرُّبُعَ، قَالَ: مَا شِئْتَ فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَكَ، قُلْتُ: النِّصْفَ، قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَكَ، قَالَ: قُلْتُ: فَالثُّلُثَیْنِ، قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَكَ، قُلْتُ: أَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِی کُلَّهَا قَالَ: إِذًا تُکْفٰی هَمَّكَ، وَیُغْفَرُ لَكَ ذَنْبُكَ''۔

ترجمہ: ''یارسول اللہ! میں آپ پر بہت درود پڑھتا ہوں، میں اپنی دعاؤں میں سے آپ پر کتنا وقت درود کے لیے مختص کروں؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم جتنا چاہو، میں نے عرض کی: کیا میں اپنی دعاؤں میں سے چوتھائی حصہ آپ پر درود پڑھوں؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم جتنا چاہو اور اگر تم زیادہ کرو تو وہ بہتر ہے، میں نے عرض کی: کیا نصف حصہ؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم جتنا چاہو اور اگر تم زیادہ کرو تو وہ بہتر ہے، میں نے عرض کی: دوتہائی؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تم جتنا چاہو اور اگر تم زیادہ کرو تو وہ بہتر ہے، میں نے عرض کی: میں اپنی تمام دعاؤں کے اوقات میں آپ پر درود شریف پڑھوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ تمہاری مہم کے لیے کافی ہے اور تمہارا گناہ بخش دیا جائے گا، (سُنن ترمذی: 2457)''۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''(قَوْلُهٗ وَمُسْتَحَبَّةٌ فِی کُلِّ أَوْقَاتِ الْإِمْکَانِ) أَیْ حَیْثُ لَا مَانِعَ وَنَصَّ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اِسْتِحْبَابِهَا فِیْ مَوَاضِعَ: یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَیْلَتِهَا، وَزِیدَ یَوْمُ السَّبْتِ وَالْأَحَدِ وَالْخَمِیسِ، لِمَا وَرَدَ فِی کُلٍّ مِنَ الثَّلَاثَةِ، وَعِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ، وَعِنْدَ دُخُوْلِ الْمَسْجِدِ وَالْخُرُوْجِ مِنْهُ، وَعِنْدَ زِیَارَةِ قَبْرِهِ الشَّرِیفِ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وَعِنْدَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، وَفِی خُطْبَةِ الْجُمُعَةِ وَغَیْرِهَا، وَعَقِبَ إِجَابَةِ الْمُؤَذِّنِ، وَعِنْدَ الْإِقَامَةِ، وَأَوَّلِ الدُّعَاءِ وَأَوْسَطِهٖ وَاٰخِرِهٖ، وَعَقِبَ دُعَاءِ الْقُنُوتِ، وَعِنْدَ الْفَرَاغِ مِنَ التَّلْبِیَةِ، وَعِنْدَ الِاجْتِمَاعِ وَالِافْتِرَاقِ، وَعِنْدَ الْوُضُوْءِ، وَعِنْدَ طَنِینِ الْأُذُنِ، وَعِنْدَ نِسْیَانِ الشَّیْءِ، وَعِنْدَ الْوَعْظِ وَنَشْرِ الْعُلُومِ، وَعِنْدَ قِرَاءَةِ

الْحَدِيثِ ابْتِدَاءً وَانْتِهَاءً، وَعِنْدَ كِتَابَةِ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا، وَلِكُلِّ مُصَنِّفٍ وَدَارِسٍ وَمُدَرِّسٍ وَخَطِيبٍ وَخَاطِبٍ وَمُتَزَوِّجٍ وَمُزَوِّجٍ وَفِي الرَّسَائِلِ وَبَيْنَ يَدَيْ سَائِرِ الْأُمُورِ الْمُهِمَّةِ، وَعِنْدَ ذِكْرِ أَوْ سَمَاعِ اسْمِهِ ﷺ أَوْ كِتَابَتِهِ عِنْدَ مَنْ لَا يَقُولُ بِوُجُوبِهَا، كَذَا فِي شَرْحِ الْفَاسِيِّ عَلَى دَلَائِلِ الْخَيْرَاتِ مُلَخَّصًا"۔

ترجمہ:" جب کوئی مانع نہ ہوتو ہر وقت صلوٰۃ وسلام پڑھنا مستحب ہے اور فقہاء نے حسبِ ذیل مواقع پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے مستحب ہونے کی تصریح کی ہے:" جمعہ کے دن وشبِ جمعہ، ہفتہ، اتوار اور جمعرات کے دن بھی، کیونکہ ان تین دنوں کے متعلق احادیث وارد ہیں، صبح اور شام کے اوقات میں، مسجد میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے وقت، رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور کی زیارت کے وقت، صفا ومروہ کے پاس، جمعہ کے خطبہ وغیرہ میں، مؤذن کی اذان کے کلمات کے جواب دینے کے بعد، اقامت کے وقت، دعا کے اول، اَوْسَط اور آخر میں، دعاءِ قنوت کے بعد، (حج میں) تلبیہ کہنے کے بعد، لوگوں کے ساتھ باہم ملنے اور جدا ہونے کے وقت، وضو کے وقت، کان میں بھنبھناہٹ کے وقت، کسی چیز کے بھولنے کے وقت، وعظ کہنے، علوم کی اشاعت کے وقت، حدیث پڑھنے کی ابتدا اور انتہاء کے وقت، سوال اور فتویٰ لکھتے وقت، ہر تصنیف، درس اور خطبہ کے وقت، منگنی اور نکاح پڑھانے کے وقت، رسائل میں اور ہر اہم کام کے وقت، نبی ﷺ کا اسمِ مبارک لینے اور سننے اور آپ ﷺ کا اسمِ مبارک لکھتے وقت درود شریف لکھنے یا پڑھنے کا استحباب ان کے نزدیک ہے، جو ان مواقع پر درود پڑھنے کے وجوب کے قائل نہیں ہیں، اس کی تفصیل علامہ فاسی نے دلائل الخیرات کی شرح میں کی ہے، (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 2، ص: 204، بیروت)"۔

## مُقدّس اوراق کی حُرمت اور اُنہیں دوبارہ کارآمد بنانے کا جواز

**سوال:**

پاکستان میں اخبار پڑھنے کے علاوہ ردی اور صفائی وغیرہ کے کاموں میں بھی استعمال ہوتا ہے، اخبار کے صفحات پر قرآنی آیات اور احادیث بھی درج ہوتی ہیں، اخبار کے غیر

ضروری استعمال سے قرآنی آیات کی بے حرمتی ہوتی ہے، کیا اخبار میں قرآنی آیات دینا ضروری ہیں؟، (زینب، کراچی)۔

**جواب:**

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اس کی تکریم ہر مومن پر لازم ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کی تعظیم لازمی ہے اور کسی بھی قسم کی دانستہ بے حرمتی ایمان سے محروم ہونے کا سبب ہے۔ بلکہ مُصحَف کے علاوہ کہیں بھی اور کسی بھی چیز پر قرآنی آیات تحریر ہو تو اس کا بھی ادب اور تعظیم لازمی ہے اور بے وضو ان کو ہاتھ لگانا ناجائز ہے۔

اخبارات میں درج قرآنی آیات کا بھی یہی حکم ہے۔ اخبارات میں قرآنی آیات شائع نہیں کرنی چاہئیں، ضرورت کے تحت آیات کے تراجم اور مفہوم پر اکتفا کیا جائے اور اُس کے بھی احترام کی ہدایت درج کی جائے۔ ایسا کاغذ جس پر آیاتِ قرآنی، اسمائے الٰہی وغیرہ درج ہوں، اُنہیں کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کرنا یا اُن کی پڑیا وغیرہ بنانا مکروہ ہے، علامہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَيُكْرَهُ أَنْ يَّجْعَلَ شَيْئًا فِي كَاغَذَةٍ فِيْهَا اِسْمُ اللهِ تَعَالٰى كَانَتِ الْكِتَابَةُ عَلٰى ظَاهِرِهَا أَوْ بَاطِنِهَا، بِخِلَافِ الْكِيْسِ عَلَيْهِ اِسْمُ اللهِ تَعَالٰى، فَإِنَّهُ لَا يُكْرَهُ، كَذَا "فِي الْمُلْتَقَطْ"۔۔ وَلَا يَجُوْزُ لَفُّ شَيْءٍ فِيْ كَاغَذٍ فِيْهِ مَكْتُوْبٌ مِنَ الْفِقْهِ، وَفِي الْكَلَامِ أَوْلٰى أَنْ لَا يَفْعَلَ"۔

ترجمہ: "جس کاغذ پر اللہ تعالیٰ کا نامِ مبارک درج ہو، اس میں کوئی چیز رکھنا (خلافِ ادب ہونے کی بنا پر) مکروہ ہے، خواہ وہ تحریر اُس کاغذ کے اندر (کی جانب) ہو یا باہر درج ہو، تھیلی پر اسمائے الٰہی لکھے ہوں، اس میں روپیہ رکھنا مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ "مُلتقط" میں ہے"۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: "ایسا کاغذ جس پر فقہی عبارات درج ہوں، اُن میں کسی چیز کو لپیٹنا جائز نہیں ہے اور جس چیز پر علم الکلام (یعنی عقائد کے مسائل) درج ہوں، اس میں تو بطریقِ اَولیٰ ایسا نہیں کرنا چاہیے، (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، ص:322)"۔ کیونکہ علم العقائد کی کتابوں میں لازماً اللہ تعالیٰ، انبیائے کرام علیہم السلام قرآن وحدیث اور دیگر مُقدسات

کے حوالے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری اُمور یہ ہیں:

(الف): عام مشاہدہ یہ ہے کہ اخبارات و جرائد میں درج آیاتِ قرآنی یا اُن کے تراجم، اسمائے مبارکہ کی بے حرمتی معمول بن گئی ہے۔ حکومت، اخباری اداروں اور عام مسلمانوں کو اس سنگینی کا پورا پورا احساس کرنا چاہیے، عوامی سطح پر زیادہ سے زیادہ یہ شعور اجاگر کیا جائے اور قرآنی آیات کے احترام کی بابت مسلسل اور نمایاں طور پر تشہیر کی جاتی رہے۔

(ب): سرکاری سطح پر مُقدّس اوراق کی حفاظت کے لئے مساجد، رفاہی اداروں اور عام شاہراہوں پر جگہ جگہ کنستر رکھوا دیئے جائیں اور عوام کو ہدایت کی جائے کہ جس کو بھی کسی جگہ ایسا قابلِ احترام کاغذ پڑا ہوا ملے، اسے ان ڈبوں میں محفوظ کر دیا جائے اور مناسب وقت پر اُن کے خالی کرانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ بہت سی انجمنیں انفرادی طور پر یہ خدمات انجام دے رہی ہیں، اُن کی سرپرستی کر کے اس کام میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

(ج): ایسے کاغذات کو تلف کرنے کی مختلف صورتوں مثلاً زمین میں دفن کرنے یا بہتے ہوئے پانی یا سمندر میں ڈال دینے یا کیمیکل سے ان کی روشنائی اور تحریر مٹانے کے بعد بقیہ اوراق کو جلا دینے کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔ زمین میں دفن کرنے کی صورت میں لحد بنائی جائے یا گڑھے میں ڈال کر اس کے اوپر چھت ڈال دی جائے۔ موجودہ دور میں بہترین صورت یہ ہے کہ کیمیکل کے ذریعے مطبوعہ حروف کو مٹا (Wash Out) دیا جائے اور اس کیمیکل سیّال مادّے (Liquid) کو کسی گہرے گڑھے میں بہا دیا جائے۔ اس طرح جو کچھ باقی بچے گا، وہ کاغذ نہیں رہے گا بلکہ گودے (Pulp) کی شکل میں ہوگا، اُس کی ماہیت بدل جائے گی، اس کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ماہیّت کے بدل جانے کے بعد چیز کا حکم بھی بدل جاتا ہے، لہٰذا اب وہ اوراق قرآن نہیں ہیں۔ پس انہیں دوبارہ کارآمد بنا کر یعنی Recycling کر کے کام میں لایا جاسکتا ہے، خواہ اس گودے سے کاغذ بنایا جائے یا گتا بنایا جائے یا کوئی اور چیز، الغرض Recycling کے بعد اس کا استعمال جائز ہے، اس کے لیے تفصیلی اور مُدلّل فتویٰ ہمارے مجموعۂ فتاویٰ "تفہیم المسائل" جلد ششم، ص:480 میں

موجود ہے، اہلِ علم اور فہمِ دین میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ فرمائیں۔

## ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کا شرعی حکم

### سوال:

کیا ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرنا حرام ہے؟، (سید سعد علی، نارتھ کراچی)۔

### جواب:

آج کل تمام متمدن ممالک میں شہری قوانین (Civic Laws) نافذ ہیں، ان میں ٹریفک قوانین بھی شامل ہیں، یہ قوانین بالعموم ٹریفک کو رواں دواں رکھنے اور ٹریفک حادثات کے امکان کو ممکن حد تک کم کرنے کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے ان قوانین کی پابندی خود انسان کے اپنے مفاد میں ہوتی ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ذلت سے دوچار نہ کرے، صحابہ نے عرض کی: یارسول اللہ! کوئی اپنے آپ کو ذلت سے کیوں دوچار کرے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنے آپ کو ایسی مصیبت سے دوچار کرے جس سے وہ (باعزت طور پر) نجات نہیں پاسکتا، (سنن ترمذی:2254)''۔ لہٰذا ٹریفک قوانین کا بنیادی طور پر اسلام کے احکامِ حلال و حرام سے تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ قانون شکنی کی صورت میں انسان ممکنہ طور پر حادثے سے دوچار ہوسکتا ہے اور مومن پر اپنی جان کا تحفظ لازم ہے، مزید یہ کہ مومن کی عزتِ نفس خطرے سے دوچار ہوسکتی ہے، جس میں قید و جرمانہ اور تحقیر شامل ہے، لہٰذا ہم اسے فقہی اعتبار سے ''حرام لغیرہٖ'' کہہ سکتے ہیں۔ فقہ میں ''حرام لغیرہٖ'' اُسے کہتے ہیں کہ شریعت کی رو سے کوئی چیز فی نفسہٖ حرام نہ ہو، لیکن ایک امرِ خارج لاحق ہونے کی وجہ سے وہ ممنوع قرار پائے۔ مثلاً: دوافراد کا باہمی رضامندی سے خرید وفروخت کا عقد کرنا جائز ہے، لیکن سورۂ جمعہ میں فرمایا: ''جب نمازِ جمعہ کے لیے پکارا جائے، تو اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف دوڑے چلے آؤ اور کاروبار چھوڑ دو، (الجمعہ:9)''۔ مفسرین کرام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ''سعی الی ذکر اللہ'' کو ترک کر کے کاروبار میں مشغول رہتا ہے، تو یہ حرام ہے،

لیکن اگر وہ کشتی میں یا گاڑی میں یا سواری پر بیٹھ کر نماز کے لیے چل پڑا ہے اور راستے میں چلتے ہوئے کسی کے ساتھ خرید وفروخت کی بات چیت کر رہا ہے، تو یہ ممنوع نہیں ہے، کیونکہ یہ ''سعی الی ذکر اللہ'' میں حرج کا سبب نہیں ہے۔ پس ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی بھی فقہی حکم کے اعتبار سے ''حرام لغیرہٖ'' ہے۔

## لاعلاج مریض کو تکلیف سے نجات دینے کے لیے موت کا انجکشن لگانا جائز نہیں

**سوال:**

کیا شدید تکلیف میں مبتلا لاعلاج مریض زندگی کے کرب سے نجات پانے کے لیے موت کا انجکشن لگوا سکتا ہے؟، (ایم۔منور، ملیر)۔

**جواب:**

بعض ممالک میں مرض الموت میں مبتلا مریضوں سے لائف سپورٹنگ آلات ہٹانے کی اجازت دی گئی ہے اور بعض میں زہریلے انجکشن یا کسی دوا کے ذریعے موت کو آسان بنانے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے، بشرطیکہ مریض خود بحالتِ ہوش یا اُس کے قانونی ورثا اور میڈیکل ٹیم اس کی اجازت دیں۔ علاج سنت ہے، زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، البتہ مومن کو اس ضمن میں بشارت ضرور دی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(1): ''عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِاَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ، صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ''۔

ترجمہ: ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کے ہر کام میں اس کے لیے بھلائی ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اسے خوش حالی پہنچتی ہے اور وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، تو یہ تشکر اس کے لیے بہتر ہے (یعنی اس میں اس کے لیے اجر ہے) اور اگر اسے تکلیف لاحق ہوتی ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر کرنا اس کے لیے بہتر ہے (کیونکہ صبر کرنا بجائے خود نیک عمل اور باعث اجر ہے)، (صحیح مسلم: 2999)''۔

(2): ''مَا یُصِیبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ یُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللهُ بِهَا مِنْ خَطَایَاهُ''۔

ترجمہ: ''مسلمان کو جو بھی کوئی تکلیف، مصیبت، غم اور اذیت پہنچتی ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اُسے چبھ جائے، تو اللہ تعالیٰ (اس مصیبت پر صبر کرنے کے صلے میں) اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، (صحیح البخاری: 5641)''۔

(3): ''إِنَّ الرَّجُلَ لَیَكُونُ لَهُ عِنْدَ اللهِ الْمَنْزِلَةُ، فَمَا یَبْلُغُهَا بِعَمَلٍ فَمَا یَزَالُ اللهُ یَبْتَلِیهِ بِمَا یَكْرَهُ، حَتَّى یُبَلِّغَهُ إِیَّاهَا''۔

ترجمہ: ''بے شک جب اللہ کے ہاں کسی شخص کے لیے کوئی بلند مرتبہ مقدر ہو جاتا ہے اور وہ (اپنے اعمال کے ذریعے) اس کا حق دار نہیں بن پاتا تو اللہ تعالیٰ اُسے کسی ناگوار مصیبت میں مبتلا فرما دیتا ہے (پھر وہ اس پر صبر کرتا ہے) یہاں تک کہ وہ اس مقام کا حق دار ہو جاتا ہے، (مسند ابو یعلیٰ: 6095)''۔

(4): ''عَطَاءُ بْنُ أَبِي رَبَاحٍ، قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ عَبَّاسٍ: أَلَا أُرِیكَ امْرَأَةً مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، قُلْتُ: بَلَى، قَالَ: هَذِهِ الْمَرْأَةُ السَّوْدَاءُ أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ: إِنِّي أُصْرَعُ، وَإِنِّي أَتَكَشَّفُ، فَادْعُ اللهَ لِي، قَالَ: إِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَكِ الْجَنَّةُ، وَإِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللهَ أَنْ یُعَافِیَكِ، فَقَالَتْ: أَصْبِرُ، فَقَالَتْ: إِنِّي أَتَكَشَّفُ، فَادْعُ اللهَ لِي أَنْ لَا أَتَكَشَّفَ، فَدَعَا لَهَا''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے (عطا بن ابی رباح سے) کہا: میں تمہیں جنتی عورت نہ دکھاؤں؟، عطا بن ابی رباح نے کہا: ضرور دکھایئے، حضرت ابن عباس نے کہا: یہ وہ سیاہ فام عورت ہے جو نبی ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: مجھ پر مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرا ستر کھل جاتا ہے، آپ میرے لیے اس مرض سے شفا کی دعا فرمائیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو صبر کرو اور تمہارے لیے جنت ہے اور اگر تم چاہو تو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ تمہیں اس مرض سے نجات دیدے۔ اس عورت نے عرض کی: میں صبر کروں

گی، اُس نے پھر یہ التجا کی: مرگی کے دورے کے دوران میرا ستر کھل جاتا ہے، آپ بس اتنی دعا فرما دیجیے کہ دورے کے دوران میرا ستر قائم رہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے (دورے کے دوران ستر قائم رہنے کی) دعا فرمائی، (صحیح البخاری:5652)''۔

(5): ''یَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيضِ''۔

ترجمہ: ''جب قیامت کے دن (دنیا میں) مصیبتیں برداشت کرنے والے لوگوں کو اُن کے صبر پر ثواب عطا کیا جائے گا تو (دنیا میں) عافیت میں زندگی گزارنے والے اس وقت تمنا کریں گے: کاش! دنیا میں قینچیوں سے ان کی کھالیں کاٹ دی گئی ہوتیں (اور وہ آج اس کا اجر پاتے)، (سنن ترمذی:2402)''۔

ایسا مہلک مرض جس کی بابت ماہر طبیب یہ کہے کہ مریض کی صحت مند بحالی کے ظاہری امکانات معدوم ہیں، اُسے زبردستی اذیت دے کر وینٹی لیٹر یا طبی مشینوں کے ذریعے زندہ رکھا جائے، اسلام اس کا مکلف نہیں بناتا۔ یہ بھی آخری درجے کے مریض کے لیے انتہائی کرب کے لمحات ہوتے ہیں، آلات پر صرف اس صورت میں زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے، جب کہ بظاہر اُس کے بچنے اور مفید زندگی گزارنے کے امکانات ظنِ غالب یا ظنِ محض کے درجے میں ہوں، ایسے مرحلے پر ماہر ڈاکٹر کی رائے کا اعتبار ہوگا، لیکن محض اسپتالوں کا بل بنانے کے لیے مریض کو کرب میں مبتلا کرنا شریعت کا مطلوب نہیں ہے۔

لیکن اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ماہر ڈاکٹر کی رائے کے مطابق جس مریض کے بظاہر بچنے کے امکانات معدوم ہیں، کوئی زہریلا انجکشن لگا کر یا کسی کیمیکل طریقے سے تکلیف میں مبتلا اُس مریض کی موت کو آسان بنا دیا جائے، خواہ اس میں اُس کی اپنی اور اس کے قانونی ورثا کی رضامندی بھی شامل ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حیات وموت کا قطعی علم اللہ کے پاس ہے، انسان نیک نیتی سے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں قیاسات اور ظنیات پر رائے قائم کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:(1)''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا''۔
ترجمہ:''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر نہایت مہربان ہے،(النساء:29)''۔
(2):''وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ''،ترجمہ:''اور اپنے ہاتھوں آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو،(البقرہ:195)''۔اسلام میں مطلقاً موت کی تمنا کرنا بھی منع ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:''لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ أَصَابَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا، فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِيْ، وَتَوَفَّنِيْ إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِيْ''۔
ترجمہ:''تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کے پہنچنے کے سبب موت کی تمنا نہ کرے اور اگر وہ ضرور ایسا کرنا ہی چاہتا ہے تو یہ کہے: اے اللہ!(تیرے علم کے مطابق) اگر میرے لیے حیات بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ اور اگر(تیرے علم کے مطابق) وفات میرے لیے بہتر ہو تو مجھے وفات عطا کر،(صحیح البخاری:5671)''۔یعنی یہ فیصلہ خود نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو تقدیر الٰہی کے سپرد کردے، احادیثِ مبارکہ میں ہے:
(1)''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهُ فِيْ يَدِهٖ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِيْ بَطْنِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا، وَمَنْ شَرِبَ سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدّٰى فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيْهَا أَبَدًا''۔
ترجمہ: جس نے اپنے آپ کو آہنی ہتھیار سے قتل کیا، تو وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا، وہ نارِ جہنم میں ہمیشہ رہے گا اور وہ ہتھیار اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا اور جس نے زہر پی کر اپنے آپ کو ہلاک کیا، تو وہ نارِ جہنم میں ہمیشہ رہے گا اور زہر پیتا رہے گا اور جس نے کسی پہاڑ سے گر کر اپنے آپ کو ہلاک کیا تو وہ نارِ جہنم میں ہمیشہ رہے گا اور(جہنم کی وادیوں میں) لڑھکتا چلا جائے گا،(صحیح مسلم:109)''۔یعنی خودکشی اور اپنے آپ کو ہلاک کرنا حرام فعل ہے اور اس پر آخرت میں سزا ہے، کیونکہ انسان اپنی جان کا مالک نہیں ہے۔

(2) حضرت جابر ایک طویل حدیث میں بیان کرتے ہیں:

"فَلَمَّا هَاجَرَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْمَدِينَةِ، هَاجَرَ إِلَيْهِ الطُّفَيْلُ بْنُ عَمْرٍو وَهَاجَرَ مَعَهُ رَجُلٌ مِنْ قَوْمِهِ، فَاجْتَوَوُا الْمَدِينَةَ، فَمَرِضَ، فَجَزِعَ، فَأَخَذَ مَشَاقِصَ لَهُ، فَقَطَعَ بِهَا بَرَاجِمَهُ، فَشَخَبَتْ يَدَاهُ حَتَّى مَاتَ، فَرَآهُ الطُّفَيْلُ بْنُ عَمْرٍو فِي مَنَامِهِ، فَرَآهُ وَهَيْئَتُهُ حَسَنَةٌ، وَرَآهُ مُغَطِّيًا يَدَيْهِ، فَقَالَ لَهُ مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ، فَقَالَ غَفَرَ لِي بِهِجْرَتِي إِلَى نَبِيِّهِ ﷺ، فَقَالَ: مَا لِي أَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ، قَالَ: قِيلَ لِي لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا أَفْسَدْتَ، فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ"۔

ترجمہ: "جب نبی ﷺ نے مدینے کی طرف ہجرت کی تو آپ کے ساتھ حضرت طفیل بن عمرو دَوسی اور اُن کی قوم کے ایک شخص نے بھی ہجرت کی، اس شخص کو مدینے کی آب وہوا راس نہ آئی، سو وہ بیمار ہوگیا اور فریاد کرنے لگا۔ پس (تکلیف سے بے قابو ہوکر) اس نے چوڑے پھل کا ایک تیر لیا اور اپنی انگلیوں کو جوڑوں سے کاٹ دیا اور اس کے ہاتھوں سے خون بہتا رہا یہاں تک کہ (خون کی کمی کے سبب) وہ فوت ہوگیا۔ پھر اسے طفیل بن عَمرو نے اپنے خواب میں اچھی حالت میں دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں پر ڈاٹا بندھا ہوا ہے، طفیل نے اس سے پوچھا: آپ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟، اس نے جواب دیا: نبی ﷺ کے ساتھ ہجرت کی برکت سے اللہ نے مجھے بخش دیا۔ پھر انہوں نے پوچھا: یہ آپ کے ہاتھوں پر ڈاٹا بندھا ہوا میں کیا دیکھ رہا ہوں؟، اس نے جواب دیا: مجھے فرمایا گیا: جس چیز کو تم نے خود بگاڑا ہے، ہم اُسے ہرگز درست نہیں کریں گے، پس جب طفیل نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ نے دعا کی: اے اللہ! اس کے دونوں ہاتھوں کی خطا کو بھی بخش دے، (صحیح مسلم: 116)"۔ صحابۂ کرام خوش نصیب تھے کہ اُن کی مشکل آسان کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ اُن کے درمیان موجود تھے، ہم صرف شرعی احکام پر سختی سے عمل کرنے کے پابند ہیں۔

# سوشل میڈیا کا استعمال

## سوال:

کیا فیس بک و دیگر سوشل میڈیا کا استعمال جائز ہے، نیز ٹیلی ویژن کی مرمت کی آمدنی اور سوشل میڈیا اور یوٹیوب سے حاصل ہونے والی آمدنی جائز ہے۔

(محمد رمیز، سرجانی ٹاؤن)

## جواب:

ٹیلی وژن، فیس بک اور سوشل میڈیا وغیرہ دودھاری تلوار ہے، اس کا مثبت اور منفی دونوں طرح کا استعمال ہوسکتا ہے، مقاصد خیر کے لیے ان چیزوں کا استعمال جائز اور مباح ہے، واجب اور لازم نہیں ہے۔ مباح امور کے لیے ان اشیاء کا استعمال مباح ہے اور حرام امور کے لیے حرام ہے، لیکن اگر قرائن وشواہد کی روشنی میں حکومت سمجھتی ہے کہ اس کا شر خیر پر غالب آرہا ہے تو وہ اس کے استعمال پر پابندی لگاسکتی ہے یا وہ ایسی مہارت حاصل کرے کہ ان پر چیک رکھا جائے اور نقصان دہ چیزوں کو فلٹر کرنے کا کوئی انتظام ہو۔ ابتدائے اسلام میں حرمت خمر کا قطعی حکم آنے سے پہلے اسلام نے اسی اصول کی بنیاد پر شراب اور جوئے کو روکا تھا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''(یہ) آپ سے خمر اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں، اور ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے، (البقرہ:219)''۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے گناہ کے غلبے کو قلیل نفع پر ترجیح دیتے ہوئے اس سے منع فرمایا، بعد میں شراب کی حرمت کا واضح حکم قرآنِ کریم میں نازل ہوا اور اس کی حرمت کو کئی تاکیدات کے ساتھ مؤکد فرمایا۔ تاہم سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ پر محرمات کو دیکھنے سے ہر صورت میں اجتناب لازم ہے، الغرض ان کا خیر، خیر ہے اور شر، شر ہے۔

مفتی وقار الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ریڈیو اور ٹیلی ویژن مشینی آلات ہیں، ان سے جائز کام بھی لیے جاتے ہیں اور ناجائز کام

بھی، یہ صرف حرام کاموں کے لیے استعمال نہیں ہوتے اور نہ محض غلط کاموں کے لیے بنائے جاتے ہیں، جس طرح چھری اور بندوق اور دیگر مہلک آلات سے جہاد بھی کیا جاتا ہے اور اپنے ذاتی کاموں اور شکار میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور انہی سے انسان کو قتل کرنے والا قبیح فعل بھی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جو آلات صرف معصیت کے لیے متعین نہ ہوں، ان کا بنانا اور مرمت کرنا جائز ہے، تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مرمت کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح اس کی مرمت کی اجرت بھی حلال ہے، (وقار الفتاویٰ، ج:1، ص:219)"۔

آج کل سوشل میڈیا پر لوگ اپنے مخالفین کی تذلیل اور تضحیک کرتے ہیں، یہ کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے، حدیث پاک میں ہے:

"وَیْلٌ لِلَّذِی یُحَدِّثُ بِالْحَدِیثِ لِیُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ فَیَكْذِبُ، وَیْلٌ لَهُ وَیْلٌ لَهُ"۔

ترجمہ: "اس کے لیے افسوس ہے جو قوم کو ہنسانے کے لیے جھوٹی باتیں گھڑ کر بیان کرتا ہے، اس کے لیے افسوس ہے، اس کے لیے تباہی ہے، (سنن ترمذی:2315)"۔ اسی طرح جھوٹ پر مبنی باتیں پھیلانا بھی ناجائز ہے، جنہیں عرفِ عام میں "افواہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

"قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ یُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ"۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو (تحقیق کے بغیر) آگے پھیلاتا پھرے، (صحیح مسلم:5)"۔ سوشل میڈیا کے غلط استعمال میں وقت کا ضیاع، لوگوں کی اذیت رسانی، غیر مستند اقوال کو حدیث بنا کر پیش کرنا وغیرہ یہ سب امور شریعت کی رو سے ممنوع ہیں، البتہ اُسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے استعمال کرنا مستحسن ہے۔

## خون کا عطیہ دینا

**سوال:**

کیا خون کا عطیہ کرنا اور اس کی خرید و فروخت جائز ہے، نیز غیر مسلم کو خون کا عطیہ دینا یا

لینا کیسا ہے؟، (آدم، ٹھٹھہ سندھ)۔

**جواب:**

محض جسمانی تقویت کے لیے کسی کو خون دینا اور ایسے شخص کا لینا جائز نہیں ہے، البتہ "اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْظُوْرَاتِ" کے تحت کسی شخص کی زندگی بچانے کے لیے خون کا عطیہ دیا بھی جاسکتا ہے اور لیا بھی جاسکتا ہے، بشرطیکہ خود خون کا عطیہ دینے والے کی زندگی کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ اجنبی مرد اور عورت ایک دوسرے کو خون دے سکتے ہیں اور اس سے ان کے درمیان حرمتِ نکاح کا رشتہ قائم نہیں ہوتا اور اگر شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو خون دیں تو ان کے نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ حرمتِ نکاح کا رشتہ صرف نسب، رضاعت اور مصاہرت سے قائم ہوتا ہے، کسی کا خون چڑھانے سے حرمتِ نکاح کا رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اسی طرح جان بچانے کے لیے غیر مسلم کو خون دیا بھی جاسکتا ہے اور لیا بھی جاسکتا ہے، تاہم مسلمان کے خون کو ترجیح دینی چاہیے۔ خون کی قیمتاً خرید و فروخت ناجائز اور حرام ہے، حدیث پاک میں ہے:

"إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الدَّمِ"۔

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے خون کا ثمن لینے سے منع فرمایا ہے، (صحیح البخاری: 2238)"۔ تاہم فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر بقائے حیات کے لیے خون کی ضرورت ہو اور بلا قیمت خون دستیاب نہ ہو تو بر بنائے ضرورت قیمت دے کر خریدا جاسکتا ہے، لیکن خون بیچنے والے کے لیے یہ قیمت لینا جائز نہیں ہے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور (انڈیا) کی مجلس شرعی نے انتقالِ خون پر تفصیلی بحث کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا:

مندرجہ ذیل صورتوں میں خون چڑھانے کی اجازت ہے:

(۱) مریض کی جان بچانے کے لیے۔

(۲) اعضا کو بے کار ہونے سے بچانے کے لیے۔

(۳) جمالِ مقصود کے تحفظ، حلقۂ چشم کی حفاظت یا کسی اور عضو کی حفاظت کے لیے، بشرطیکہ کسی

اور جائز ذریعے سے اس کا تحفظ نہ ہو سکے، جمالِ غیر مقصود کے تحفظ کے لیے اجازت نہیں۔
(۴) الف: خون نہ چڑھانے سے جب مریض کو زیادہ دنوں تک مرض کی تکلیف ہو، اگر یہ ناقابلِ برداشت حد تک ہو تو خون چڑھانا جائز ہے، ورنہ نہیں، ب: خون کی کمی کے باعث انسیجنل ھرنیا ہونے کا خطرہ ہو تو بھی جائز ہے، (جیسا کہ آپریشن کے بعد خون کی کمی سے ایسا ہو جاتا ہے)۔
(۵) مریض ٹھیک ہے، کوئی گھبراہٹ یا تناؤ نہیں ہے، خون کی کمی 15% سے کم ہے تو خون چڑھانا جائز نہیں، البتہ درج ذیل صورتوں میں خون چڑھانے کی اجازت ہے:
(الف) ہلکا تناؤ، بے چینی، پیلا پن، بدن ٹھنڈا ہو جانا، پسینہ، پیاس، کھڑے ہونے سے اس طرح بے ہوشی طاری ہونا کہ گر جائے، خون کی کمی ایک سے دو لیٹر، یعنی 20% سے 39%۔
(ب) بہت زیادہ تناؤ، ہوش وحواس میں اختلال، شدید تنفس، یعنی تیز اور گہرا سانس چلنا، ہاتھ، پیر کا برف کی مانند ٹھنڈا ہو جانا، نیز پورے بدن کا ٹھنڈا ہو جانا، بہت زیادہ پیاس، خون کی کمی ۲ سے ساڑھے تین لیٹر یعنی 40% سے 70%، پیشاب کی مقدار صفر۔
(ج) خون نہ چڑھانے کے باعث عضو کے بے کار ہو جانے کا ظنِ غالب ہو تو بھی خون چڑھانے کی اجازت ہے، ان تمام صورتوں میں اجازت بس اسی مقدار میں خون چڑھانے کی ہے جتنے سے کام چل سکے، واللہ تعالیٰ اعلم۔
آخر میں لکھتے ہیں:
''مریض کو حاجت وضرورت کی حالت میں خون اگر بلاعوض نہیں ملتا تو بعوض خریدنا جائز ہے، مگر بائع کے لیے خون کا ثمن طیب نہیں، مسلم مریض کو مذکورہ حالت میں مسلم یا غیر مسلم کسی سے بھی خون لینا یا خریدنا جائز ہے، نوٹ: جو حضرات دلائل کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ اصل کتاب کا مطالعہ کریں، (مجلس شرعی کے فیصلے، ج:1، ص:194-193)''۔

نیز مفتی نظام الدین رضوی مصباحی لکھتے ہیں:

''ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ کسی انسان کی جان بچانے کے لیے اپنے خون کا ہبہ یا عطیہ جائز ہے۔ غیر مسلم کو اگر خون کی ضرورت یا حاجت ہے، تو اس سے خون کا معقول معاوضہ لے کر خون دینا جائز ہے، جیسے غیر مسلم بچے کو دودھ پلانے کے لیے مسلم دایہ کا اجارہ جائز ہے، درمختار کے قول: ''جَازَ اِجَارَةُ الظِّئْرِ بِاَجْرٍ مُعَيَّنٍ'' کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''وَالْإِطْلَاقُ مُشِيْرٌ إِلٰى أَنَّهُ يَجُوْزُ لِلْمُسْلِمَةِ أَنْ تُؤَجِّرَ نَفْسَهَا لِإِرْضَاعِ وَلَدِ الْكَافِرِ وَبِهِ صَرَّحَ فِي ''الْخَانِيَّة''۔

ترجمہ: ''علامہ علاء الدین حصکفی کا اجازت کو مطلق رکھنا اس بات کی طرف مُشیر ہے کہ مسلمان عورت کو کافر کے بچے کو دودھ پلانے کے لیے اپنا اجارہ کرنا جائز ہے اور فتاویٰ ''خانیہ'' میں اس کی تصریح کی ہے''، (ردالمحتار، ج:6،ص:53)''۔

نیز آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''غیر مسلم سے خون لینا جائز ہے یا نہیں؟ مسلمان کو خون کی ضرورت یا حاجت متحقق ہے تو وہ مسلمان سے بھی خون لے سکتا ہے اور غیر مسلم سے بھی اور اس باب میں دارالحرب اور دارالاسلام میں کوئی فرق نہیں، اس کی نظیر رَضاعت کا یہ مسئلہ ہے کہ اپنے بچے کو مسلم دایہ سے بھی دودھ پلوانا جائز ہے اور غیر مسلم دایہ سے بھی، حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رضاعی ماں ہیں، جو آپ کی رضاعت کے وقت کافرہ تھیں، پھر بہت بعد میں مشرّف بہ اسلام ہوئیں، فقہ حنفی کی معتمد کتاب ''مبسوط سرخسی'' میں ہے:

''وَلَا بَأْسَ بِاَنْ يَسْتَأْجِرَ الْمُسْلِمُ الظِّئْرَ الْكَافِرَةَ أَوِ الَّتِيْ قَدْ وَلَدَتْ مِنَ الْفُجُوْرِ، لِاَنَّ خُبْثَ الْكُفْرِ فِيْ اعْتِقَادِهَا دُوْنَ لَبَنِهَا وَالْاَنْبِيَاءُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَالرُّسُلُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمْ فِيْهِمْ مَنْ أُرْضِعَ بِلَبَنِ الْكَوَافِرِ، وَكَذٰلِكَ فُجُوْرُهَا لَا يُؤَثِّرُ فِيْ لَبَنِهَا''۔

ترجمہ: اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان کافرہ دائی یا اس عورت کو جس کے ہاں ناجائز تعلق سے بچہ پیدا ہوا، (اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے) اجرت پر لے، کیونکہ کفر کا

خُبث اس کے اعتقاد میں ہے، اس کے دودھ میں نہیں ہے، اور انبیائے کرام ورسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں ایسی شخصیات ہیں کہ جن کو کافرہ کا دودھ پلایا گیا اور اسی طرح اس کا فجور اس کے دودھ میں اثر انداز نہیں ہوتا، (المبسوط، ج:15،ص:127)"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: نیز ائمۂ مذاہب کے یہاں اس کی صراحت بھی ہے، جیسا کہ اُن کی عبارتیں گزشتہ صفحات میں منقول ہیں اور ان سب میں دم کا لفظ مطلق ہے، جو دمِ کافر کو بھی عام ہے، اس لیے بوقتِ ضرورت غیر مسلم کا خون لینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور یہی حکم بوقتِ حاجت بھی ہونا چاہیے، (صحیفۂ مجلسِ شرعی، ج:2،ص:388-387)"۔

مفتی نظام الدین صاحب نے خون کے جواز کے مسئلے کو دودھ پر قیاس کیا ہے، یہ قیاس جزوِ انسان سے انتفاع کی حد تک تو درست ہے، ورنہ دودھ پاک ہے، جب کہ خون ناپاک ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم کی جان بچانے کے لیے اجرت کے بغیر خون دے دیتا ہے تو اپنی اصل کے اعتبار سے مباح ہے، کیونکہ قرآنِ کریم میں ایک بے قصور انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی بقائے حیات سے تعبیر کیا ہے اور اس میں "نفس (جان)" مطلق آیا ہے، نفسِ مسلم نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے کوئی یہ کہے کہ غیر مسلم زندگی پاکر کفر وشرک کرے گا، تو عرض ہے کہ کوئی اس کے لیے ہدایت کی دعا بھی کرسکتا ہے اور کس کا انجام کس حالت پر ہوگا، اس کا حقیقی اور قطعی علم اللہ کے پاس ہے، ہمیں سب کے لیے ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"(فقہی اصول ہے): ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں، لیکن ان اعضاء کی کسی بھی صورت میں بیع جائز نہیں ہے جس طرح خون کی بیع جائز نہیں ہے۔ انسانی خون یا عضو کی بیع ناجائز ہے، بطورِ تبرُّع یا ہبہ دینا جائز ہے۔ خون نہ ملنے کی صورت میں ہلاکت یا انتہائی نقصان کا اندیشہ ہو تو تبرُّعاً خون دینا جائز ہے، اگر معاوضے پر ملنا یقینی ہو اور اقارب میں سے کوئی بھی تبرُّعاً دینے والا دستیاب نہ ہو تو بربنائے ضرورت (خون کا) مالی معاوضہ دینا جائز ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج:4،ص:2609)"۔ البتہ معاوضہ لینا کسی صورت

میں جائز نہیں ہے۔

علامہ نظام الدین لکھتے ہیں:

''يَجُوْزُ لِلْعَلِيْلِ شُرْبُ الدَّمِ وَالْبَوْلِ وَاَكْلُ الْمَيْتَةِ لِلتَّدَاوِیْ إِذَا اَخْبَرَهٗ طَبِيْبٌ مُسْلِمٌ اَنَّ شِفَاءَهٗ فِيْهِ وَلَمْ يَجِدْ مِنَ الْمُبَاحِ مَا يَقُوْمُ مَقَامَهٗ''۔

ترجمہ:''بیمار کے لیے خون اور پیشاب پینا اور بطورِ علاج مردار کھانا جائز ہے، جب کہ مسلم طبیب اُسے بتائے کہ اس کی اس میں شفا ہے اور (اس کے متبادل) کوئی مباح چیز دستیاب نہ ہو جو اُس کے قائم مقام ہو سکے، (فتاویٰ عالمگیری، ج:5،ص:355)''۔اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ ''تَدَاوِیْ بِالْحَرَام'' جائز ہے، بشرطیکہ علاج کے لیے اس کے متبادل کوئی حلال چیز دستیاب نہ ہو۔

صحیح البخاری:2263 میں ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر نے سفرِ ہجرت کے موقع پر ایک غیر مسلم کو اُجرت پر رکھا اور ایک شخص کو راستے کے ماہر اور کھوجی کے طور پر رکھا، اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت غیر مسلم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور اُسے راز دار بنایا جا سکتا ہے۔

## جوتے پہن کر کھانا کھانے کا شرعی حکم

**سوال:**

کھانے کے دوران جوتے پہنے رکھنے کا کیا حکم ہے؟، (محمد ابدال، سرجانی ٹاؤن)۔

**جواب:**

حدیث پاک میں کھانے کے وقت جوتے اتارنے کا ذکر آیا ہے:

''عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِذَا قُرِّبَ إِلَى أَحَدِكُمْ طَعَامُهٗ وَفِي رِجْلِهِ نَعْلَانِ فَلْيَنْزِعْ نَعْلَيْهِ فَإِنَّهٗ أَرْوَحُ لِلْقَدَمَيْنِ''۔

ترجمہ:''انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کا کھانا چن لیا جائے اور اس کے پاؤں میں جوتے ہیں، تو وہ اپنے جوتے اتار لے،

کیونکہ اس سے یہ پاؤں کے لیے زیادہ راحت کا باعث ہے، (مجمع الزوائد: 7911)"۔
حدیث میں اس کا سبب آرام اور راحت بیان کیا گیا ہے۔ البتہ اگر جوتے اتارنا مشکل ہو یا اس میں سہولت نہ ہو جیسے میز کرسی پر کھانے کی صورت میں ہوتا ہے، تو جوتے پہن کر کھانا کھانا بھی جائز ہے۔

امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا خان قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز نے کئی کتب احادیث سے مندرجہ بالا حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا: "کھانا کھاتے وقت جوتا اتار لینا سنت ہے، اگر اس عذر کے سبب جوتا پہن کر کھا رہا ہو کہ فرش نہیں ہے، تو یہ ایک سنتِ مستحبہ کا ترک ہے اور کرسی میز پر جوتا پہن کر کھانا خاص نصاریٰ کی وضع ہے، اس سے اجتناب کرے، پھر انہوں نے اس حدیث کا حوالہ دیا: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ، فتاویٰ افریقہ، بتصرف، ص: 42-43)"۔

ہمارے علم کے مطابق موجودہ دور میں جوتا پہنے ہوئے کرسی میز پر کھانے کا شعار اکثر اقوام میں رائج ہے اور یہ نصاریٰ کا خاص مذہبی شعار نہیں ہے، لہٰذا اس پر "تَشَبُّهٌ بِالنَّصَارٰی" کا اطلاق دین میں یُسر کے منافی ہے اور ایسا کرنے والا اس وعید کا مستحق نہیں ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو سنت پر کاربند رکھنے کے لیے اکابر علمائے امت شدّت فرماتے ہیں، اس کو اسی معنیٰ میں لینا چاہیے۔ ہوٹلوں، اکثر دعوت اور بعض گھرانوں کی مجالس میں بھی طعام کے لیے کرسی میز ہی کا اہتمام ہوتا ہے اور فرشی نشست کی سہولت نہیں ہوتی اور ایسے میں کسی کا الگ فرش پر بیٹھ کر کھانا عرف وعادت کے خلاف ہے۔ ایسے اُمور پر "تَشَبُّه بِالْكُفَّار" کی بابت علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: "تاہم اس پر یہ اشکال ہے کہ اس حدیث میں اُس مشابہت کی ممانعت ہے جو کفار ومشرکین کے دینی شعائر میں سے ہو اور اُن کی کسی بدعقیدگی پر مبنی ہو، جیسے صلیب لٹکانا، مطلقاً مشابہت مراد نہیں ہے، ورنہ بہت سی باتوں میں دیگر مذاہب کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے"۔
(شرح صحیح مسلم، ج:6، ص:282)

## والدین سے حسنِ سلوک

**سوال:**

میں یو کے میں رہتا ہوں، اپنی والدہ کو خرچہ کے لیے رقم بھیجتا تھا، ایک بار میں نے صرف یہ جاننے کے لیے کہ ان کے اخراجات پورے ہوجاتے ہیں یا نہیں، ان سے پوچھا کہ آپ ان پیسوں کا کیا کرتی ہیں؟، انہیں یہ لگا کہ شاید میں پیسوں کا حساب مانگ رہا ہوں، جس کا اظہار انہوں نے کسی رشتے دار سے کیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد مجھے یہ خلش ہے کہ کہیں مجھ سے نافرمانی یا بے ادبی یا دل آزاری تو نہیں ہوگئی؟

(محمد منیر، یو۔ کے)

**جواب:**

اسلام نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور اُن کے سامنے عاجزی سے پست آواز میں بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایسی کوئی بات نہ کرے جس سے اُن کی دل شکنی ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَـقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝''۔

ترجمہ: ''اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور اگر تمہاری زندگی میں وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچ جائے تو اُن کو اُف تک نہ کہنا اور نہ اُنہیں جھڑکنا اور ان سے ادب سے بات کرنا اور اُن کے سامنے عاجزی اور رحم دلی کا بازو جھکائے رکھنا اور یہ دعا کرنا: اے میرے رب! ان پر رحم فرمانا جیسا کہ انہوں نے بچپن میں (شفقت ومحبت سے) میری پرورش کی تھی، (بنی اسرائیل:24-23)''۔

عموماً والدین اولاد کی بڑی خطاؤں کو بھی معاف کردیا کرتے ہیں، آپ کے بقول آپ نے صرف اُن کا بہتر خیال رکھنے کے لیے پیسوں کا مصرف پوچھا تھا، بظاہر اس میں

کوئی بے ادبی کا پہلو نہیں ہے، یہ اچھی بات ہے کہ آپ اس پر ندامت محسوس کر رہے ہیں۔ تاہم اگر کسی موقع پر آپ کی والدہ نے اظہار کیا ہو کہ اس بات سے اُن کی دل آزاری ہوئی ہے، تو آپ اُسی وقت اُن کی زندگی میں اپنے مقصد کی وضاحت کر کے معافی مانگ لیتے، البتہ اب آپ اپنے احساسِ ندامت کو دور کرنے کے لیے والدہ کے ایصالِ ثواب کے لیے دعائے مغفرت اور صدقاتِ جاریہ کا اہتمام فرمائیں، حدیث پاک میں ہے:

''مَا عَلٰی أَحَدِکُمْ إِذَا تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ تَطَوُّعًا أَنْ یَجْعَلَهَا عَنْ أَبَوَیْهِ، فَیَکُوْنَ لَهُمَا أَجْرُهَا، وَلَا یُنْتَقَصُ مِنْ أَجْرِهٖ شَیْءٌ''۔

ترجمہ: ''تم میں سے کوئی شخص نفلی صدقہ کرے اور اس کو اپنے والدین کی طرف سے کردے، تو اس کے والدین کو اس کا اجر ملتا ہے اور اس کے اجر سے کچھ کمی نہیں ہوتی''۔ (المعجم الاوسط:7726)

## مالِ حرام کی بابت چند سوالات

### سوال:(1)

میری بہن اور بہنوئی یورپ (اسپین) میں رہتے ہیں، بہنوئی پہلے ایک ریسٹورنٹ میں منیجر تھے، وہاں سے جاب چھوٹ گئی، اب وہ ایک شراب خانے میں جاب کرتے ہیں، اُن کے لیے کیا حکم ہے؟۔

### جواب:

ہر وہ ملازمت جس میں براہِ راست اور بلا واسطہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے اَحکام کی خلاف ورزی اور حرام و ناجائز کاموں کا ارتکاب یا اُن میں معاونت کرنی پڑتی ہے، جیسا کہ شراب خانوں میں شراب خریدنے بیچنے، پینے پلانے اور اُس کے حساب کتاب یعنی کیشیئر کی ملازمت کرنا یا مثلاً بینک کے وہ ملازمین جن کے ذمے سودی لین دین یا اُس کا حساب کتاب ہو، ایسی ملازمت خواہ مسلم ممالک میں ہو یا غیر مسلم ممالک میں، ناجائز و حرام ہے، اس پر دی جانے والی تنخواہ بھی حرام ہوگی، خواہ اس کی تنخواہ خالص حلال مال سے

دی جاتی ہو اور وہ مالِ حلال بھی اُس کے لئے حرام ہے اور اگر اُس کی تنخواہ مالِ حرام سے دی جاتی ہو تو ایسی صورت میں حرمت دو چند ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''،

ترجمہ: ''اور تم گناہ اور ظلم وزیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ إِلَيْهِ وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَآكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُشْتَرِيَ لَهَا وَالْمُشْتَرَاةَ لَهُ''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے حوالے سے دس لوگوں پر لعنت فرمائی ہے: شراب کشید کرنے اور کشید کرانے والا، شراب اُٹھانے والے اور جس کی طرف اُٹھا کر لے جائی جائے، شراب پلانے والا، شراب فروخت کرنیوالا، شراب کی کمائی کھانے والا، شراب خریدنے والا اور جس کے لیے خریدی جائے (ان سب پر لعنت ہے)''۔

(سنن ترمذی:1295)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

''إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم أَتَاهُ جِبْرِيْلُ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ اللهَ لَعَنَ الْخَمْرَ وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ إِلَيْهِ، وَشَارِبَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَسَاقِيَهَا مُسْقَاهَا''۔

ترجمہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جبریل امین آئے اور اُنہوں نے فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بیشک اللہ تعالیٰ نے شراب پر، اسے کشید کرنے والے، کشید کرانے والے، اُسے اُٹھانے والے اور جس تک اُٹھا کر پہنچائی جائے، شراب پینے والے، اُسے فروخت کرنیوالے، خریدنے والے، اسے پلانے والے اور جسے پلائی جائے، (ان سب پر لعنت فرمائی ہے)، (صحیح ابن حبان:5356، مسند احمد:2897)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''لَعَنَ اللّٰهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُولَةَ إِلَيْهِ''۔

ترجمہ: ''شراب پر اللہ کی لعنت ہو، اُس کے پینے اور پلانے والے پر، اسے فروخت کرنیوالے اور خریدار پر، اسے کشید کرنے اور کشید کرانے والے پر، اُسے اُٹھانے والے اور جس تک اُٹھا کر پہنچائی جائے اُس پر، (سنن ابوداوٗد: 3674، سنن ابن ماجہ: 3380)''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ اللّٰهَ إِذَا حَرَّمَ عَلٰى قَوْمٍ أَكْلَ شَيْءٍ حَرَّمَ عَلَيْهِمْ ثَمَنَهُ''۔

ترجمہ: ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر کسی چیز کو حرام فرماتا ہے تو اُس کی کمائی کو بھی حرام فرمادیتا ہے، (سنن ابوداوٗد: 3488)''۔

پس آپ پر اپنی استطاعت کے مطابق لازم ہے کہ آپ کسی کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر اپنی بہن اور بہنوئی کو اِس حرام ملازمت کو چھوڑنے کی تلقین کریں، اُنہیں نصیحت کریں اور حلال وطیب روزگار کی تلاش وجستجو کی ترغیب دلائیں۔ رزقِ حلال کے ذرائع بہت زیادہ ہیں، اس کے لیے جستجو کرنی پڑتی ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے، تو اللہ تعالیٰ اسے عنایت بھی فرماتا ہے اور اس کی مدد بھی فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝٢ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝٣''۔

ترجمہ: ''اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ بنادیتا ہے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے اُمید بھی نہیں ہوتی اور جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرے تو وہی اسے کافی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نافذ کرنے والا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی لیے مقدار مقرر کردی ہے، (الطلاق: 3-2)''۔

## سوال:(2)

میری بہن ہمارے لیے تحائف لاتی ہے اور ہمارے ساتھ پکنک پر جاتی ہے تو ہمیں کچھ نہ کچھ لا کر کھلاتی ہیں تو کیا ہم وہ تحائف اور اُن کا کھانا قبول کر سکتے ہیں؟۔

## جواب:

آپ کے لیے اپنی بہن سے تحفہ وصول کرنا یا اُن کی دعوت قبول کرنا حرام وناجائز تو نہیں، مگر احتیاط بہتر ہے، امام محمد بن حسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وَبِهٖ نَاْخُذُ مَا لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهٖ، وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى وَاَصْحَابِهٖ''۔

ترجمہ: ''ہم اِسی بات کو اختیار کرتے ہیں کہ جب تک ہمیں کسی معین شے کے متعلق اُس کا حرام ہونا واضح نہ ہو جائے (ہمارے لیے اُسے لینا جائز ہے) اور یہی امام ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب کا مذہب ہے، (فتاویٰ ہندیہ، ج:5،ص:342)''۔

چنانچہ بعض فقہائے کرام واہلِ علم حضرات نے ذکر کیا ہے کہ حرام کمائی سے حاصل ہونے والی رقم سے خریدی ہوئی اشیاء مثلاً غلہ واناج اور دیگر سامان میں حرمت اُس وقت واقع ہوتی ہے جب عَقد ونقد دونوں اُسی مالِ حرام پر جمع ہوئے ہوں، مثلاً زید کے پاس شراب کی کمائی کے پانچ سو روپے تھے اور اُس نے شراب کی کمائی سے حاصل ہونے والا وہ پانچ سو کا نوٹ کسی دکاندار کو دکھایا اور کہا کہ اِس نوٹ کے عوض مجھے فلاں شے (مثلاً: پرس) دیدو، یہ حرام پر عقد کہلایا، پھر جب زید نے وہی پانچ سو کا نوٹ اُسے دیدیا تو یہ حرام کا نقد ہوا، سو جب عقد ونقد دونوں حرام پر ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں وہ خریدی ہوئی شے بھی حرام ہو جائے گی اور جب تک عقد ونقد دونوں حرام مال پر جمع نہیں ہونگے اُس وقت تک خریدی ہوئی شے میں حرمت واقع نہیں ہوگی اور ہمارے یہاں عام طور پر خرید وفروخت کا جو طریقہ کار ہوتا ہے، اُس میں چونکہ عقد ونقد دونوں جمع نہیں ہوتے، پس حرام کمائی کرنا اور اس سے کوئی چیز خریدنا بلاشبہ فعلِ حرام ہے اور گناہ ہے، لیکن اس سے وہ خریدی ہوئی حلال

چیز حرام نہیں ہو جاتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''مختار قول تو یہ ہے کہ حرام مال کے ذریعے خریدی ہوئی اشیاء بھی حرام ہونی چاہئیں، لیکن ہمارے زمانے میں حرام کی کثرت کے پیشِ نظر لوگوں سے حرج ونقصان کو دور کرنے کے لیے فتویٰ امام کرخی کے قول پر ہے (یعنی اگر عقد ونقد جمع نہ ہوں تو حرام مال سے خریدی ہوئی شے کی طرف حرمت سرایت نہیں کرے گی اور وہ شے حلال ہوگی)''۔

(ردالمحتار، جلد 5، ص:235)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا: ''ایک شخص جوئے باز ہے، جس کا جوئے کے علاوہ کوئی اور پیشہ نہیں ہے یا کوئی طوائف ناچنے گانے والی یا کوئی حرافہ حرام پیشہ بارہویں شریف یا گیارہویں شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت غوث اعظم قدس سرہٗ کی نیاز کرے، اُس کا کھانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟''۔

اس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں: ''جس شخص کا پیشہ خالص حرام کا ہو، اُس سے میل جول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ''۔

ترجمہ: ''اگر شیطان تمہیں نسیان میں ڈال دے، تو پھر یاد آنے کے بعد ہرگز ظالموں کے پاس مت بیٹھو، (الانعام:68)''۔ ایسے افراد کے ہاں کھانا اگرچہ بہت زیادہ معیوب ہے، مگر صحیح مذہب کے مطابق اُس کا وہ کھانا حرام نہیں ہے، ہاں! اگر بعینہٖ وہ کھانا اُسے حرام وجہ سے ملا ہو، مثلاً گانے یا زنا کی اُجرت کے طور پر اُسے اناج دیا گیا اور وہ اناج اُس نے کھانے میں استعمال کیا تو پھر ایسی صورت میں وہ کھانا حرام ہے یا اُسے گانے، ناچ یا زنا کی اُجرت کے طور پر رقم دی گئی اور اُس نے اُس رقم سے وہ اناج اِس طرح خریدا کہ خریداری میں عقد ونقد دونوں کو اُسی مالِ حرام پر جمع کر دیا، تو اِس صورت میں بھی وہ کھانا حرام ہے، ان دو صورتوں میں وہ کھانا حرام ہے، ورنہ نہیں، (فتاویٰ رضویہ، ج 21 ص 654)''۔

**سوال:(3)**

اگر ہم اپنی بہن کو سمجھائیں اور وہ ہماری بات مان جائے تو اُس کے پاس جو حرام کمائی کی بقایا رقم ہے وہ اُس کا کیا کرے؟۔

**جواب:**

کسی شخص کے پاس ایسا مال ہے، جو اُس نے ناجائز اور حرام طریقے سے کمایا، مثلاً: شراب، سینما، رقص یا فحاشی پر مشتمل وڈیو کیسٹ کی آمدنی جمع کی ہو، پھر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ اس ناجائز مال سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے، تو وہ اس مال کی ذمے داری سے بچنے کے لیے اسے فُقراء و مساکین پر خرچ کرے اور اس میں ثواب کی نیت نہ کرے، بلکہ یہ نیت کرے کہ وہ اپنے ذمہ سے عہدہ برآ ہو رہا ہے۔

## جسم پر گدوانے کا شرعی حکم

**سوال:**

میں آپ کا مستقل قاری اور دین کا طالب علم ہوں۔ حضرت 6-7 سال قبل میں نے نادانی سے اپنے دائیں بازو پر انگریزی میں لفظ: G لکھوایا تھا جو کہ انمٹ ہے، اب اگر مٹایا جائے تو شاید وہ تیزاب لگائیں جس سے مسئلہ تکلیف دہ اور نقصان والا ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ نادانی ناسمجھی کی وجہ سے ہوا، جس پر میں شرمندہ ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اس طرح لکھوانے سے نماز نہیں ہوتی، اب کیا شرعی حکم ہوگا؟، (ایچ۔اے، خوشاب)۔

**جواب:**

بازو پر نام کھدوانا یا ہاتھ کی پشت پر کوئی ڈیزائن بنوانا شرعاً ناجائز و ممنوع ہے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی چیز میں تبدیلی کرنا ہے اور اللہ کی تخلیق میں تبدیلی ناجائز و حرام ہے۔ نیز یہ نام اور ڈیزائن عموماً مشین یا سوئی کے ذریعے کھدوایا جاتا ہے، جس سے کافی تکلیف ہوتی ہے اور اپنے آپ کو بلا وجہ شرعی تکلیف پہنچانا بھی جائز نہیں۔ اگر کسی شخص نے اپنے بازو پر اس طرح نام لکھوایا ہے تو اس پر توبہ لازم ہے اور اگر دوبارہ تغییر کے بغیر اس نام کو ختم کرنا ممکن

ہوتو اس کو ختم کردے اور اگر تغییر کے بغیر ختم کروانا ممکن نہ ہو بلکہ ختم کروانے کے لیے دوبارہ اسی طرح کا عمل کرنا پڑے جیسا نام لکھواتے وقت کیا تھا تو اس کو اسی حال میں رہنے دے اور توبہ واستغفار کرتا رہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا''۔

ترجمہ: ''(شیطان نے کہا:) اور میں ضرور ان کو حکم دوں گا تو وہ ضرور اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو تبدیل کریں گے اور جس نے اللہ کے بجائے شیطان کو اپنا کارساز بنالیا تو وہ کھلے ہوئے نقصان میں مبتلا ہو گیا، (النسا:119)''۔

''عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ، وَالنَّامِصَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ، وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَیِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ قَالَ: فَبَلَغَ ذٰلِكَ امْرَأَةً مِنْ بَنِی أَسَدٍ یُقَالُ لَهَا أُمُّ یَعْقُوبَ وَكَانَتْ تَقْرَأُ الْقُرْآنَ، فَأَتَتْهُ فَقَالَتْ: مَا حَدِیْثٌ بَلَغَنِی عَنْكَ أَنَّكَ لَعَنْتَ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ، لِلْحُسْنِ الْمُغَیِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ، فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: وَمَا لِی لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم، وَهُوَ فِی كِتَابِ اللّٰهِ فَقَالَتِ الْمَرْأَةُ: لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَیْنَ لَوْحَیِ الْمُصْحَفِ فَمَا وَجَدْتُهُ، فَقَالَ لَئِنْ كُنْتِ قَرَأْتِیهِ لَقَدْ وَجَدْتِیهِ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا، (الحشر:7)''۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ان عورتوں پر اللہ کی لعنت ہو جو اپنے جسم پر گدواتی ہیں اور اپنے بال اکھاڑتی ہیں اور خوب صورتی کے لیے اپنے دانتوں کے درمیان جھرّی کرواتی ہیں اور اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں، اس بات کی اطلاع قبیلۂ بنو اسد سے تعلق رکھنے والی ام یعقوب کو ہوئی تو اس نے کہا: آپ اُن پر کیوں لعنت کرتے ہیں؟، فرمایا: میں اُن پر کیوں لعنت نہ کروں، جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لعنت کی ہے اور اللہ کی کتاب میں اُن پر لعنت ہے۔ اس عورت نے کہا: میں نے تو پورا قرآن پڑھا ہے، مجھے اس

میں یہ آیت نہیں ملی ،حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اگر تم قرآن پڑھتیں تو تم کو یہ آیت مل جاتی ،کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی: (اور رسول تم کو جو احکام دیں وہ لے لو اور جن کاموں سے تم کو منع کریں، ان سے رک جاؤ، الحشر: 7)، (صحیح مسلم: 2125)"۔

لفظ "وَاشِمَات" کی شرح میں مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "واشمہ: وہ عورت جو سوئی وغیرہ کے ذریعہ اپنے اعضاء میں سرمہ یا نیل گودوالے جیسا کہ ہندو عورتیں اور بعض ہندو مرد کرتے ہیں، مستوشمہ: جو دوسری عورت کو گودے، دونوں پر لعنت فرمائی ،حرام کام فاعل و مفعول دونوں کی لعنت کا باعث ہوتا ہے، (مرآۃ المناجیح ،جلد 6،ص 153)"۔

اسی طرح بازو وغیرہ پر نام لکھوانا اپنے آپ کو تکلیف پہنچانا ہے اور بلا وجہ شرعی اپنے آپ کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے، علامہ احمد بن محمد بن ابوبکر بن عبدالملک القسطلانی لکھتے ہیں:

"أَنَّ جِنَايَةَ الْإِنْسَانَ عَلٰى نَفْسِهٖ كَجِنَايَتِهٖ عَلٰى غَيْرِهٖ فِى الْإِثْمِ لِأَنَّ نَفْسَهٗ لَيْسَتْ لَهٗ مِلْكًا مُطْلَقًا بَلْ هِيَ لِلّٰهِ فَلَا يَتَصَرَّفُ فِيْهَا إِلَّا فِيْمَا أُذِنَ فِيْهِ"۔

ترجمہ: بے شک انسان کی اپنے نفس پر زیادتی گناہ ہے، جیسا کہ دوسرے پر زیادتی گناہ ہے، کیونکہ انسان اپنے نفس کا مطلقاً مالک نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے پس اس میں وہی تصرف جائز ہے، جس کی اجازت دی گئی ہے۔

(ارشاد السّاری لشرح صحیح البخاری، جلد 9، ص: 379)

آپ پر توبہ لازم ہے، اگر بغیر تغییر کے ختم کرانا ممکن نہ ہو تو اس کو اسی حال میں رہنے دیں اور توبہ و استغفار کرتے رہیں۔

امام اہل سنت امام احمد رضا قادری قُدِّسَ سِرُّہُ الْعَزِیْز سے سوال ہوا: "میں نے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت میں ایک بازو پر یا اللہ اور دوسرے پر یا محمد بذریعہ مشین کھدوایا، میرا تعلق چشتیہ خاندان سے ہے اور تصوف کے چاروں بڑے سلسلوں سے مجھے نسبت ہے، میں نے اپنی سوچ کے مطابق یہ کام اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں کیا ہے، یہ مٹانے سے مٹ اور چھیلنے سے چھل بھی نہیں سکتا، شریعت کی رو سے یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟"۔

آپ جواب میں لکھتے ہیں: ''یہ غالباً خون نکال کر اسے روک کر کیا جاتا ہے جیسے نیل گدوانا، اگر یہی صورت ہو تو اس کے ناجائز ہونے میں کلام نہیں اور اگر اس کا ازالہ ناممکن یا باعثِ اذیت ہے تو اب سوائے توبہ و استغفار کے اس کا کوئی حل نہیں ہے، توبہ کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتا ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد 23، ص: 387 مُلخصاً)''۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ضرورت شرعی اور حاجت، جس میں آپریشن سمیت علاج کی تمام صورتیں شامل ہیں، کے بغیر ایذائے نفس یا ایذائے غیر جائز نہیں ہے اور یقیناً گودنا یا ٹیٹو بنانا ضروریات وحاجات میں سے نہیں ہے، یہ محض طبیعت کی اوباشی، عیاشی اور آوارگی ہے اور اپنے آپ کو دوسروں کے لیے مرکزِ نگاہ بنانا یا شمعِ محفل بننا ہے، البتہ خواتین کے جسم کے ظاہری حصے میں ایسا داغ یا عیب ہو، جیسے چہرے پر بالوں کی کثرت وغیرہ اور اس کا چہرہ بدنما معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے شوہر کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کر سکتی ہے، فقہائے کرام نے بعض صورتوں کی اجازت دیتی ہے۔ یہ اُن باحیا اور عفت مآب خواتین کے لیے جو اپنی جان اور جسم کا مالک اللہ تعالیٰ کو سمجھتی ہیں اور جن کا سلوگن ''میرا جسم، میری مرضی'' ہے، ہم ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہیں۔

## افسرِ اعلیٰ کا قواعد کے خلاف ماتحت کو رعایت دینا

**سوال:**

میں نے ایک سرکاری تعلیمی ادارے میں سربراہ کی حیثیت سے کام شروع کیا ہے، یہاں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے یا اس کو کوئی ناگہانی حادثہ پیش آجائے تو ادارہ رجسٹر پر حاضری لگا کر اس کے اکاؤنٹ میں تنخواہ بھجواتا رہتا ہے، یہ عمل کئی ماہ اور بعض اوقات سال بھر تک رہتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں: سوال: جو شخص بیمار ہے اور رخصت کے بغیر گھر بیٹھا بغیر کام کیے تنخواہ لے رہا ہے، کیا یہ اس کے لیے حلال ہے؟۔ ادارے کے جو افراد صرفِ نظر کرتے ہیں، کیا وہ بھی اعانتِ جرم کے مرتکب ہوئے؟۔ کیا ایسے بیمار شخص کی اس انداز سے مدد کرنے کی کوئی شرعی گنجائش ہے؟۔ ادارے

کے مفادات کا تحفظ کرنے میں سربراہ کی فلاح ہے یا کسی شدید مرض میں مبتلا فرد کی اعانت کرنے میں؟۔(ڈاکٹر ابو حمیس، مسلم بازار، حیدر آباد)۔

**جواب:**

جس دور میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں ملازمین کے لیے قانون میں کچھ مراعات مقرر ہیں، مثلاً: باتنخواہ اتفاقی رخصت، سال میں مقررہ ایام کی باتنخواہ رخصت اور طبی رخصت وغیرہ۔ اسی طرح حاملہ عورت کے لیے زچگی کے ایام کی رخصت، بلکہ حال ہی میں حکومتِ پاکستان نے ایسے شوہر کے لیے بھی جس کی بیوی کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی ہے، دس دن کی رخصت کا اعلان کیا ہے، بیوہ کے لیے شوہر کی وفات کی صورت میں عدتِ وفات کی رخصت وغیرہ۔ مختلف اقسام کی ان رخصتوں میں انہیں مقررہ اجرت یا مشاہرہ کا حق دار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملازم کو بلاتنخواہ بھی رخصت کی رعایت ہوتی ہے، یعنی مقررہ اجرت یا تنخواہ نہیں دی جاتی، لیکن ملازمت جاری رہتی ہے اور واپس آکر اپنی ڈیوٹی پر کام شروع کر دیتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں قواعد وضوابط (Service Rules) طے شدہ ہوں یا عرف وعادت میں مُسلّم اور معمول بہا (IN Practice) ہوں، ان پر عمل درآمد جائز ہے۔

ایسا ملازم جو ڈیوٹی سے غیر حاضر ہو اور اس کے دفتر یا محکمے کے ساتھی رجسٹر پر اس کی حاضری لگا دیتے ہوں اور وہ باقاعدگی سے تنخواہ لیتا ہو، تو شرعاً یہ تنخواہ اس کے لیے جائز نہیں ہے اور اس کے دفتر یا محکمے کے ساتھی کا اپنے غیر حاضر ساتھی کی جگہ دستخط کرنا خیانت، جھوٹی شہادت اور گناہ میں تعاون ہے، جو قرآن کریم کی رُو سے ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ''، ترجمہ: ''اور گناہ وظلم پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو، (المائدہ:2)''۔

بیمار کے ساتھ ہمدردی اچھی بات ہے، لیکن اس کے لیے نہ مالِ سرکار میں خیانت درست ہے اور نہ متعلقہ محکمے یا افسران کی منظوری کے بغیر ملازم کا یہ تنخواہ لینا درست ہے،

البتہ اگر کسی ملازم کو دائمی مہلک بیماری یا معذوری لاحق ہوگئی ہو اور وہ قابلِ کار نہ رہا ہو، تو چونکہ حکومت کی حیثیت مُربّی کی سی ہوتی ہے، اس لیے اسے ایسے لوگوں کی کفالت اپنے ذمے لینی چاہیے، خواہ پوری تنخواہ یا اس کے نصف یا کسی حصے کے برابر ضابطہ بنالیں۔ اسی طرح جو بڑے صنعتی اور کاروباری ادارے ہیں، اُن کے ہاں بھی ایسے قوانین ہونے چاہئیں۔

بعض فقہائے کرام نے اپنے عہد کے اعتبار سے زیادہ چھٹیوں یا غیر حاضری کی بنا پر معزولی یا چھٹیوں کی تنخواہ کے استحقاق کے حوالے سے بات کی ہے، لیکن آج کل ملازمین کے لیے حکومتوں نے ملازمت کے قواعد وضوابط (Service Rules) کو قانونی شکل دیدی ہے، اب سرکاری ملازمین پر وہی قواعد وضوابط حاکم ہوں گے، اسی طرح صنعتی اور کاروباری اداروں کے لیے لیبر لاز ہیں، مگر آپ کا ادارہ چونکہ سرکاری ادارہ ہے، تو آپ کو حکومتی قواعد وضوابط کی پابندی کرنی چاہیے۔ آپ کا منصب آپ پر اپنے ماتحت ملازمین کے حوالے سے جو ذمے داری عائد کرتا ہے، آپ پر اس کی پابندی لازم ہے، آپ اپنے ماتحت ملازمین کو وہی مراعات دے سکتے ہیں، جن کا اختیار قواعد ملازمت کی رُو سے آپ کو حاصل ہے۔ اپنے دائرۂ اختیار سے زیادہ کسی ماتحت کو رعایت دینا خیانت ہے، قانون شکنی ہے اور شریعت کی رو سے منع ہے، یہ تو اردو محاورے کے مطابق ''حلوائی کے دکان پر نانا جی کی فاتحہ'' والی بات ہوجائے گی۔ آپ اپنے ذاتی وسائل سے مصیبت میں مبتلا کسی شخص کی اعانت کریں تو عنداللہ اجر پائیں گے۔

## غیر مسلم ملک میں اسٹور پر ملازمت کا حکم

**سوال:**

ایک شخص امریکا میں کسی پرائیویٹ کمپنی کی ٹیکسی چلاتا ہے، کمپنی کی طرف سے آرڈر ملتا ہے کہ فلاں ریسٹورنٹ سے کھانا لے کر فلاں گاہک کے گھر پہنچا دو، اُس میں حلال وحرام کچھ بھی ہوسکتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟۔ اسی طرح ایک شخص امریکا میں اسٹور پر کیشئر ہے، اسٹور میں حلال وحرام ہر طرح کی اشیاء ہوتی ہیں، کیا ایسی جاب کرنا جائز

ہے؟۔ (سہیل عطاری، کراچی)۔

**جواب:**

مسلمان کو شریعتِ مُطہرہ رزقِ حلال کے حصول کے لیے جائز وحلال ذرائع اختیار کرنے اور حرام سے بچنے کا حکم دیتی ہے۔ بعض مواقع پر یُسر (آسانی) اور رخصت و عزیمت کے پہلو بھی پیش کرتی ہے، جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کا آسان حل نکالا جائے۔ فقہی قاعدہ ہے: ''اَلْأُمُوْرُ بِمَقَاصِدِهَا'' ترجمہ: ''اعمال اور معاملات کا مدار اُن کے مقاصد پر ہے، (المجلّہ، مادہ:2)''۔ یعنی کسی چیز کے جائز یا ناجائز ہونے، حلال یا حرام ہونے یا کسی عمل پر اجر یا سزا کا دارومدار اس کے مقصد اور نیت پر ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور کا کسی سامان یا کھانے کو اس کے مقام تک پہنچانا اُس کے اجارہ میں شامل ہے اور اس کی اجرت اُس کے لیے حلال ہے۔

علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''وَجَازَ تَعْمِیْرُ کَنِیْسَةٍ وَ (حَمْلُ خَمْرِ ذِمِّیٍّ) بِنَفْسِهٖ أَوْ دَابَّتِهٖ (بِأَجْرٍ) لَا عَصْرُهَا لِقِیَامِ الْمَعْصِیَةِ بِعَیْنِهٖ''۔

ترجمہ: ''اور (کسی شخص کا) کنیسہ (یہودیوں کی عبادت گاہ) کی تعمیر، غیر مسلم کی شراب خود یا اپنی سواری پر اجرت پر اٹھانا جائز ہے اور شراب نچوڑنے کی اجرت جائز نہیں کہ یہ بعینہٖ معصیت ہے، (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 9، ص: 478-477، بیروت)''۔

علامہ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مَنْ حَمَلَ لِذِمِّیٍّ خَمْرًا فَإِنَّهٗ یَطِیْبُ لَهُ الْأَجْرُ عِنْدَ أَبِیْ حَنِیْفَةَ وَقَالَ اَبُوْیُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ: یُکْرَهُ لَهٗ ذٰلِكَ، لِاَنَّهٗ اِعَانَةٌ عَلَی الْمَعْصِیَةِ، وَقَدْ صَحَّ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم لَعَنَ فِی الْخَمْرِ عَشْرًا حَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَ اِلَیْهِ، وَلَهٗ أَنَّ الْمَعْصِیَةَ فِیْ شُرْبِهَا وَهُوَ فِعْلُ فَاعِلٍ مُخْتَارٍ، وَلَیْسَ الشُّرْبُ مِنْ ضَرُوْرَاتِ الْحَمْلِ، وَلَا یُقْصَدُ بِهٖ، وَالْحَدِیْثُ مَحْمُوْلٌ عَلَی الْحَمْلِ الْمَقْرُوْنِ بِقَصْدِ الْمَعْصِیَةِ''۔

ترجمہ: ''(امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:) جس نے غیر مسلم کے لیے شراب کی بار برداری کی، تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اُس کے لیے اس کی اجرت حلال ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ اُجرت اس کے لیے مکروہ ہے کیونکہ یہ معصیت پر مدد کرنا ہے اور حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس اشخاص پر لعنت فرمائی: (ان میں) شراب اٹھانے والا اور جس کے لیے اٹھائی جائے (دونوں) شامل ہیں، امام اعظم کی دلیل یہ ہے کہ معصیت پینے میں ہے اور وہ ایک فاعلِ مختار کا (دانستہ) فعل ہے اور اٹھانے کے لیے پینا لازم نہیں ہے اور نہ یہ (ہر صورت میں) مقصود ہوتا ہے اور حدیث میں بیان کی گئی لعنت اُس اٹھانے پر محمول ہے جو معصیت کے ارادے سے ہو''۔

(ہدایہ، جلد 7، ص:235)

اسٹور پر کیشیر اپنے وقت کا اجارہ کرتا ہے، بظاہر اکثر سامان جس کا وہ بل بنا کر قیمت وصول کرتا ہے، حلال اور مباح ہوتا ہے، لیکن اس میں ایک عنصر حرام کا بھی شامل ہوتا ہے، امام اعظم کے مذہب کے مطابق یہ مباح ہے اور صاحبین (امام یوسف و امام محمد) کے مذہب کے مطابق مکروہ ہے، پس اسے چاہیے کہ ناگواری کے ساتھ یہ کام کرے اور خالص حلال روزگار کے لیے کوشش کرتا رہے، خواہ اس کی تنخواہ نسبتاً کم ہو۔ تاہم شراب خانے اور جوا خانے میں ملازمت کرنا بہر صورت ناجائز ہے، کیونکہ وہاں متعین ہے کہ اجارہ حرام کام کے لیے ہو رہا ہے۔ مندرجہ بالا تفصیل کی روشنی میں مذکورہ شخص کی ملازمت جائز ہے، کیونکہ اُس کا اجارہ یا ملازمت حرام کام کے لیے متعین نہیں ہے۔

گنج بخش روڈ، لاہور۔ فون 7221953-7220479 فیکس 7238010
الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 7225085-7247350
انفال سینٹر، اردو بازار، کراچی 2210212-2212011-2630411